لوحِ ایام

مختار مسعود

از کہ می پرسی کہ دَور روزگاراں راچہ شد

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ الآية

اور اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا،
جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرے (القرآن)

مختار مسعود

طبع اول .... جنوری 1996ء

طبع دوم .... فروری 1996ء

طبع سوم .... مئی 1996ء

بسم اللہ __________ حبیب اللہ فضائلی

ناشر : العطاء ۱۷۷۔شادمان ۲۔لاہور

طباعت : نقوش پریس

تزئین : خورشید عالم خورشید رقم

سرورق : اسلم کمال

قیمت : ۱۷۵/ روپیہ
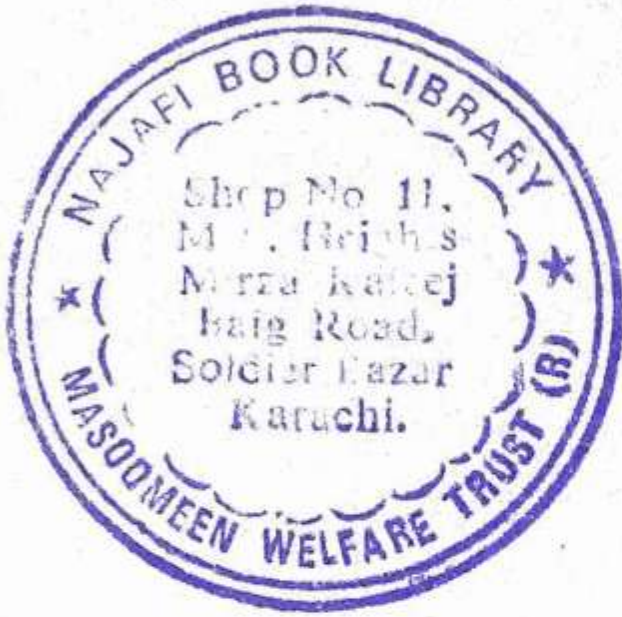
اِنتساب

چراغ اور دریچہ

کے نام

وہ چراغ جس سے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ اُجالا ہی اُجالا ہوگا۔
بے سمت سفر کو سمت میسّر آئے گی۔

اور

وہ دریچہ جو ایک روشن مستقبل کی جانب کھلتا ہے
جس سے تازہ ہوا آئے گی اور جہانِ تازہ کی خبر لائے گی۔

اِس وقت مَیں رُوپوش ہُوں،
زیرِ زمیں چھُپا ہُوا ہُوں،
اور یہ جانتے ہُوئے بھی کہ خُدا، اَدب اور شعر کا تعلّق
رُوئے زمین سے ہے مَیں ہرگز سطحِ زمین پر نہیں آؤں گا،
مَیں اُن درسی کتب کے لِئے پَیدا نہیں ہُوا جو اسکول
اور کالج میں پڑھائی جاتی ہیں۔
اگر تم دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو تو کوہِ ایورسٹ کی
چوٹی سے تیل کے ایک کنوئیں میں جھانک کر دیکھو۔
دیا سلائی جلا کر نیچے پھینکو،
تاکہ مَیں دُنیا کو جلا کر خاک کر دوں۔
مَیں اِس وقت زیرِ زمین ہُوں،
صِرف میری آگ رُوئے زمین پر ظاہر ہو گی۔

(ایک ایرانی انقلابی شاعر)

دیباچہ

اِس کتاب کو لکھنے میں اتنا وقت نہیں لگا جتنا یہ طے کرنے میں کہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے۔ اور اگر لکھا جائے تو اس کی حد بندی کیسے کی جائے۔ وجہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو کتاب پڑھنی ہوگی۔ اِسکے بعد گریبان میں جھانکنا ہوگا۔ اگر وہ سلامت نظر آیا تو گویا اِنقلاب کے موضوع پر لکھنے کا فیصلہ کچھ ایسا درست نہ تھا۔

اِنقلاب خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے اسکی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ اُمید اور عمل، بیداری اور خود شناسی، جنوں اور لہو کی داستاں بھی کہیں پرانی ہو سکتی ہے۔ زمانہ اِس کو بار بار دُہراتا ہے۔ فرق صِرف نام، مقام اور وقت کا ہوتا ہے۔

از اِنقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ
ازیں فسانہ و افسوں ہزار دارد یاد

مختار مسعود
۹ نومبر ۱۹۹۵ء

العطاء
۱۷۷۔ شادمان ۲
لاہور

فہرس

شاہنامہ

آمد نامہ

منظر نامہ

شاہنامہ

باب اول

مارگلہ سے البرز تک

میں وہاں موجود نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ بات ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔
ایران کے جنوب سے ایک زیر فرمان اٹھا اور فرمانروا کو شکست دے کر بادشاہ بن گیا۔
حوصلہ مند شخص تھا۔ محض ایک ملک کی بادشاہت پر کیونکر قناعت کرتا۔ شہروں شہروں اپنا
جھنڈا گاڑتا ہوا اور ملکوں ملکوں دوسروں کے جھنڈے سرنگوں کرتا ہوا دریائے فرات کے
کنارے بابل تک جا پہنچا جو اس زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ دیوتاؤں کا شہر۔ بہت بڑی
سلطنت کا دارالسلطنت۔ تین طرف تہ بہ تہ مضبوط فصیل۔ چوتھی جانب فرات کا دریا۔
قلعہ بندی مکمل۔ بظاہر یہ شہر ناقابل تسخیر نظر آتا تھا۔ مگر ایک کسر تھی۔ وہ یہ کہ لوگوں میں
اتحاد اور اتفاق نہ تھا۔ آپس میں ان بن، حکومت سے بیزار، بادشاہ سے ناراض، ملک اور
مستقبل سے لاتعلق۔ بے چینی کے کئی اسباب تھے۔ ایک سبب یہ بے ڈھب اعتراض تھا کہ
مقامی دیوتاؤں کی بہتات کے باوجود بادشاہ نے پوجا پاٹ کے لئے غیر ملکی دیوتاؤں کے بت
کیوں در آمد کئے ہیں۔ لوگ بتوں سے ان کی قومیت اور خداؤں سے ان کی شہریت پوچھتے
تھے۔ جہاں انسانوں کے ساتھ دیوتا بھی مقامی اور مہاجر کی بحث میں شامل ہو جائیں اور
در آمد بر آمد کے جائز یا ناجائز ہونے کے جھگڑے میں فریق بن جائیں وہاں حملہ آور کا کام
آسان ہو جاتا ہے۔ بابل پر چڑھائی کرنے والے کا راستہ یہ پراگندہ حال لوگ کیسے
روکتے۔ اگر ذرا سی دیر کے لئے اسے کسی نے روکا تو وہ دریائے فرات تھا۔ حملہ آور نے

حکم دیا کہ دریا کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ حکم بجا لانے والوں نے نہریں کھودیں اور دریا کا رخ موڑ دیا۔ تاریخ کے دھارے کا رخ خود بخود تبدیل ہو گیا۔

اس جنگجو بادشاہ نے. نہ جانے کیوں، چن چن کے وہ سارے علاقے فتح کیے جن کے نام آنے والے زمانہ میں متروک ہونے والے تھے۔ آج کل ایسے نام سننے میں آتے ہیں نہ کہیں نقشہ پر دکھائی دیتے ہیں۔ مشکل اتنے کہ نام لینا چاہیں تو زبان موٹی پڑ جائے۔ شاید وہ ان لوگوں کو سزا دینا چاہتا تھا جنہوں نے اپنی بستیوں کے نام رکھنے میں عام آدمی کی سہولت کا خیال نہیں رکھا۔ ان غیر معروف علاقوں کا محلِّ وقوع معلوم کرنے کے لئے میں زمان قدیم کے آثار شناس سے رجوع کرتا ہوں۔ میڈیا، شمال مغربی ایران ہے۔ لیڈیا، مغربی ترکیہ ہے۔ پارتھیا، شمالی ایران کا پرانا نام ہے۔ باکتریا، افغانستان ہے۔ بلخ کو ان دنوں باختر کہتے تھے اور ہمدان کو اکبتانہ۔ رہا گیڈروشیہ تو وہ اپنے مکرانیوں والا مکران ہے۔ الغرض وہ مقامات جنہیں ہم کسی دوسری دنیا کا حصہ سمجھتے تھے اپنے گرد و پیش کے جانے پہچانے علاقے نکلے۔ وہ شخص اپنے قرب و جوار کا بادشاہ نکلا۔ اس کی فتوحات کی فہرست میں ملکوں اور شہروں کے ناموں کے بعد وغیرہ وغیرہ لکھا ہوا ہے۔ یہ وغیرہ وغیرہ وہ مقامات ہیں جنہیں بادشاہ مؤرّخ کی مدد سے فتح کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے نام میں وقت کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ کل بھی وغیرہ وغیرہ تھے اور آئندہ بھی اسی نام سے پکارے جائیں گے۔ بے مصرف زندگیاں بھی ان بے نام بستیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جئے تو ایرا اور غیرا۔ مرے تو وغیرہ وغیرہ۔

اس بادشاہ کے مقبوضات اور اس کے کارنامے مشرق میں دریائے سندھ اور سرزمین ترکستان سے لے کر مغرب میں ساحل اناطولیہ اور خطہ یونان تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ شکل و صورت اچھی، کسرتی جسم جیسے مرمر کا مجسمہ، دلیر اور فیاض۔ شکست خوردہ بادشاہ کو خودکشی سے روک کر تخت و تاج واپس کر دینے والا۔ دانا اور خوش کلام۔ گفتگو اس طرح کرتا تھا جیسے گلستان سعدی کی کوئی حکایت سنا رہا ہو۔ جب اس نے لیڈیا فتح کیا تو اس ملک کی دو ذیلی ریاستوں کے موقع شناس سربراہ اسے ملنے کے لئے آئے اور یہ پیش کش کی کہ وہ انہی شرائط پر فارس کی ذیلی ریاستیں بننے کے لئے تیار ہیں جو لیڈیا کے ساتھ معاہدہ میں شامل تھیں۔ فاتح بادشاہ نے کہا، میں آپ کو ایک حکایت سناتا ہوں۔

ایک شخص ساحل کے کنارے دیر تک بانسری بجاتا رہا مگر مچھلیاں بے تعلق رہیں اور کوئی توجہ
نہ کی۔ اس نے غصہ میں آکر جال پھینکا اور جب بہت سی مچھلیاں اس میں پھنس گئیں تو کھینچ
کر باہر نکال لیا۔ مچھلیوں نے تڑپنا اور پھڑکنا شروع کر دیا۔ اس نے مچھلیوں سے مخاطب ہو
کر کہا، یہ بے وقت کا ناچ بند کرو۔ جب میں ساز بجا رہا تھا اس وقت تم میں سے کسی نے
ساتھ دینے اور ناچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ موقع کھو دینے کے بعد اب اس تکلف کا کیا فائدہ۔
وہ شخص ایک کامیاب مچھیرا تھا۔ اس کے جال میں شرق و غرب کی چھوٹی بڑی ساری مچھلیاں
موجود تھیں۔ کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ لوگوں نے سر پر بٹھایا۔ مورخین نے اپنے
تذکروں میں اور ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اسے جگہ دی۔ فارس کا گمنام رئیس دنیا کا
سب سے طاقتور اور نامور بادشاہ بن گیا۔

تاریخ نے اس کے سارے نام محفوظ کر لئے۔ سائرس، خورس، خورش،
کیخسرو، کوروش۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جس شخص کو
ذوالقرنین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے وہ یہی سائرس ہے۔ بعض لوگ اتنے بڑے ہوتے
ہیں کہ ان کا نام چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شخص کے نام کے ساتھ اعظم، عظیم یا
کبیر کا لاحقہ لگا کر اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ ایران میں وہ آج کل کوروشِ کبیر کے نام سے
مشہور ہے۔ باقی دنیا کے لئے وہ سائرس دی گریٹ ہے۔

پتھروں پر کندہ عبارت کی رو سے سائرس کے دو خطاب ایسے بھی تھے جن کا صحیح
ترجمہ جہانگیر اور شاہجہاں ہو گا۔ وہ اپنی فتوحات کی کثرت اور سلطنت کی وسعت کے اعتبار
سے مغل شہزادگان سلیم اور خرّم کے مقابلہ میں ان خطابات کا زیادہ حقدار تھا۔ انتقال ہوا تو
نورالدین جہانگیر اور ابو المظفر شہاب الدین شاہجہاں خوش نما مرمریں مقبروں میں دفن
ہوئے مگر سائرس کی مٹیالے رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی قبر کو چھت بھی میسر نہ آئی۔
سائرس کی قبر ایک وسیع اور خاموش وادی میں واقع ہے۔ زندگی کے شور اور ہنگاموں سے
بہت دور، فطرت کے بے حجاب نظاروں سے بہت قریب، کھنڈرات کے پراسرار اور پرسکون
ماحول میں۔ وہ کوئی تاج محل نہیں کہ لوگ مرنے والے کو مرنے کے بعد بھی دم نہ لینے
دیں۔

ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ وادی پاسارگاد کی خاموشی اور سائرس کی خلوت

میں ہیلی کاپٹر کے شور سے خلل پڑا۔ ایک جشن شاہی کا پر تصنع آغاز ہو رہا تھا۔ ہز امپیریل میجسٹی شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر بڑی سج دھج کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے اترے اور چبوترے پر چڑھ کر ایک کہنہ قبر اور ٹی وی کیمرہ کی طرف منہ کر کے سائرس سے یک طرفہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ "اے کوروش، اے عظیم الشان بادشاہ، اے بادشاہوں کے بادشاہ، اے ہخا منشی شہنشاہ، میں شہنشاہ ایران آپ کو قوم کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں ـــــ ہم آج آپ کی ابدی آرام گاہ کے سرہانے صرف یہ کہنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ اب آپ اطمینان کے ساتھ سو سکتے ہیں کیونکہ ہم بیدار ہو چکے ہیں"۔ ان الفاظ کی گونج ابھی فضا میں باقی تھی کہ ایران بیدار ہو گیا۔ وہ ہنگامہ آرائی ہوئی کہ کوروش نے خواب میں رضا شاہ پہلوی سے پوچھا۔ یہ ایران میں کیا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کوروش سٹور کو آگ لگا دی ہے۔ کوروش بنک کا دوالا پٹنے والا ہے۔ خیابان کوروش کبیر پر ایک ملین آدمی جمع ہیں اور مرگ بر شاہ کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں آرام سے سو جاؤ۔ میری تو نیند اڑ گئی ہے۔ یہ بیداری ہے یا انقلاب۔

اس بیداری کے ساتھ سائرس کی جرأت و حکمت کے بل پر تعمیر کی ہوئی سلطنت سے لے کر خود ساختہ پہلوی خاندان کی حکومت تک، ایران میں بادشاہت کا جو طویل تسلسل تھا وہ بالآخر ڈھائی ہزار سال کے بعد اچانک ختم ہو گیا۔ سائرس ایران کا پہلا بادشاہ تھا اور رضا شاہ آخری شہنشاہ۔ جس دن ایران میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا میں اس روز وہاں موجود تھا۔ وہ دن بھی کیا دن تھا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے۔ یہ انہی دنوں کی داستان ہے۔

(2)

یہ 1978ء کا ایک گرم دن ہے۔ سہ پہر کا وقت، مئی کا مہینہ، بے یقینی کا زمانہ، جمہوری سیاست کی ایک بار پھر نامرادی، مارشل لا کا ایک بار پھر تجربہ، گرتے ہوئے معیار، مٹتی ہوئی روایات، انتظامیہ کا زوال۔ میں انتظامیہ کا ایک رکن ہوں اور پہلی صف میں وہاں کھڑا ہوں جہاں سورج ہمیشہ سوا نیزے پر ہوتا ہے۔ گرمی سے تنگ آ کر میں ٹیرس پر ٹہل رہا

ہوں۔ نظریں بار بار اور بے اختیار مار گلہ کی پہاڑیوں کی طرف اٹھتی ہیں جیسے اس عمل سے آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جائے گی حالانکہ ان پہاڑیوں کی جھلسی ہوئی جھاڑیوں میں ہر سال گرمیوں کے موسم میں کئی بار آگ خود بخود بھڑک اٹھتی ہے۔ یکایک ہوا کا ایک خنک اور خوشگوار جھونکا سلسلہ کوہ البرز سے چلا اور میری تلاش میں اسلام آباد آنکلا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ گفتگو پہلودار ہے۔ دونوں طرف سے الفاظ کے استعمال میں کفایت سے کام لیا جارہا ہے۔ آپ سامان باندھ لیں۔ چلنے کی تیاری کریں۔ کہاں جانا ہے۔ ایران۔ کتنے دن کے لئے۔ صرف چار سال کے لئے۔ کس سلسلہ میں۔ وہی آر سی ڈی (ایران پاکستان اور ترکی کا ادارہ برائے علاقائی ترقی) کے سلسلہ میں۔ گڈلک ٹویو۔ تھینک یو۔ میں نے ٹیلیفون بند کیا۔ سلام اور وعلیکم السلام کے درمیانی وقفے میں جو بمشکل ایک منٹ کا ہوگا موسم اور منظر دونوں بدل چکے تھے۔ مار گلہ، مری اور قراقرم کی جگہ البرز، دماوند اور زاگروس۔ راوی، چناب اور جہلم کی جگہ کرج، سفید اور زندہ رود۔ دریائے سندھ کی جگہ نہر کارُون۔ چولستان اور تھرپار کر کی جگہ دشتِ کاویر اور دشتِ لوط۔ موہنجو داڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کی جگہ نقشِ رستم، طاقِ بوستاں اور تختِ جمشید۔ مہمند، محسوداور، وزیری کی جگہ کرد، قشقائی اور بختیاری۔ آم اور کینو کی جگہ خاویار اور زعفران۔ مونگ پھلی کی جگہ پستہ۔ اکھاڑے کی جگہ زورخانہ۔ ضلع کی جگہ شہرستان۔ کمشنری کی جگہ اوستان۔ جمہوریہ اسلامی کی جگہ بادشاہت اور وہ بھی پہلوی اور آریامہری۔

ایران جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ میں یادوں، کتابوں اور مشوروں میں گھرا ہوا ہوں۔

ایک یاد کا تعلق اس دن سے ہے جس دن میں نے بچپن کو رخصت کیا اور لڑکپن کو خوش آمدید کہا۔ مسلم یونیورسٹی اسکول کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ پہلے حصہ میں بچے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کرتے اور دوسرے میں پانچویں سے دسویں جماعت تک۔ چوتھی جماعت کا نتیجہ سنانے کے بعد کلاس ماسٹر نے ہمیں لڑکپن کی اہمیت پر لکچر دیا اور پاس ہونے والوں کو ایک قطار کی صورت میں میل ڈیڑھ میل پیدل چلا کر بڑے اسکول لے گئے۔ پانچویں جماعت کے ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں ہمارا ہاتھ دیا اور واپس چلے گئے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے باہر اور اندر ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ ظہور وارڈ کی

چھوٹی سی عمارت کے بعد منٹو سرکل کی وسیع اور شاندار عمارت۔ دروازہ اتنا کشادہ کہ انگلش ہاؤس کی بس اس میں داخل ہو جاتی۔ دیواریں فصیل کی مانند کنگورہ والی۔ بڑے اسکول کا بڑا میدان۔ چھوٹے اسکول میں قمیص اور نیکر کے ساتھ لمبے موزے پہنتے تھے جو ٹخنوں پر خالی ھتیلہ کی صورت گرے رہتے اور اگر انہیں کس کر باندھتے تو پنڈلیوں پر نیلا نشان پڑ جاتا۔ اب ہم علی گڑھ کٹ پاجامہ کے ساتھ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنیں گے۔ بکلس کی جگہ تسمہ ہو گا۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہو گی کہ پڑھائی کے بارے میں پہلی بار ہماری رائے لی جائے گی۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ کون سا اختیاری مضمون لینا چاہتے ہو۔ وہ زمانہ گزر گیا جب اہل مدرسہ ہم سے پوچھے بغیر جو ان کے جی میں آتا وہ پڑھا دیتے تھے۔ اب اسکول کو ہماری رائے کا احترام کرنا ہو گا۔ ہم کوئی بچے تھوڑی ہیں۔

اختیاری مضامین کی مختصر سی فہرست سنانے کے بعد کلاس ماسٹر نے ہر مضمون کے لئے باری باری ہمارے رائے معلوم کی۔ جب فارسی کی باری آئی تو میں نے بڑے کیف و سرور کے ساتھ اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ عربی کی باری آئی اور میرے دل میں کسک اٹھی کہ میں ہاتھ اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوں۔ ماسٹر جواد کہتے ہیں کہ ایک شخص بنگالی زبان محض اس لئے سیکھ رہا ہے کہ وہ ٹیگور کو پڑھ سکے۔ ادھر مسلمانوں کی اولاد کلام اللہ کی وارث ہونے کے باوجود عربی زبان سیکھنے سے جی چراتی ہے۔ یہ جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے اور نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ خوشی عارضی ہوتی ہے مگر کسک زندگی بھر ساتھ دیتی ہے۔ خواہشات کی فہرست طویل اور اس میں سے انتخاب کرنے کا حق محدود ہے۔ یہ زندگی نامکمل ہے۔ مکمل وہ ہو گی جس میں جو بھی جی میں آئے وہ پورا ہو جائے۔ زندگی کی حقیقت سے ایک معصوم ذہن کا پہلا اور سرسری تعارف ہو رہا ہے۔ ہم لوگ بڑے اسکول کی چھوٹی جماعت میں کیا داخل ہوئے گویا ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ بچپن واقعی بہت پیچھے اور بہت دور رہ گیا ہے۔ یہی کوئی میل ڈیڑھ میل دور مارسین کورٹ کے پچھواڑے جہاں ظہور وارڈ کی عمارت واقع ہے۔ زندگی کے اس سنگِ میل پر ماضی ایک مختصر یادداشت ہے اور مستقبل ایک بڑا سوالیہ نشان۔ آنے والی کل پردہ غیب میں چھپی ہوئی ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ چالیس برس کے بعد میری تعیناتی اس ملک میں ہو گی جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے جسے آج میں نے اختیاری مضمون قرار دیا ہے۔ اگر فرشتوں کو معلوم تھا تو

انہوں نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا۔ سوچتے ہوں گے۔ انسان ہے غیب کا بوجھ سہارنا اس کے بس کی بات نہیں۔ دب جائے گا یا پھٹ پڑے گا۔

میں نے یادوں پر ایک طرح سے بند باندھا ہوا ہے وگرنہ یہ مجھے سیلاب کی طرح بہا کر لے جائیں اور کوئی کام نہ کرنے دیں۔ ایران جانے سے پہلے ابھی مجھے بہت سے کام نبٹانے ہیں۔ ایک واقعہ البتہ ایسا ہے کہ میں اسے نہ صرف یاد کرتا ہوں بلکہ اس پر بار بار غور کرتا ہوں۔ قرار داد پاکستان کو منظور ہوئے چار سال گزر چکے تھے۔ جنگ عظیم کو شروع ہوئے ساڑھے چار سال ہو چکے تھے۔ نازی فوجوں کی پیش قدمی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ دفاعی دور میں داخل ہو چکی تھیں۔ پسپائی کا دور بہت دور نہ تھا۔ ایران کی آزادی اور خودداری کو اتحادیوں کی خود غرضی نے بڑی زک پہنچائی تھی۔ رضا خاں معزول اور جلاوطن، رضا شاہ کم عمر، ناتجربہ کار اور بے بس۔ کہنے کو یہ لڑکا خود مختار شہنشاہ تھا مگر ایران عملی طور پر ایک تقسیم شدہ مقبوضہ ملک تھا۔ اسے روس اور برطانیہ نے آپس میں بانٹ لیا تھا۔ شمال تمہارا، جنوب ہمارا، باقی مشترکہ۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ بچ جائے تو وہ شہنشاہ ایران کا۔ ایسے میں ایران سے ایک سہ رکنی وفد برطانوی ہند کے دورے پر آیا۔ سرکاری مہمانداری کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے لئے کیا جارہا ہے۔ وفد کے تینوں رکن استاد یا ادیب تھے۔ ایک کا نام علی اصغر حکمت تھا اور دوسرے کا پُورِ داؤد۔ تیسرے رکن کا نام شاید رشید یاسمین تھا۔

دہلی پہنچتے ہی ایرانی وفد نے ہندوستان کی عظمت کو سلام کیا۔ پور داؤد نے جن کے بارے کہا جاتا تھا کہ اچھے بھلے شعر کہہ لیتے ہیں بغیر کسی تامل کے یہ بیان داغ دیا کہ اقبال ایک مقامی شاعر تھا اور ٹیگور ایک عالمی پایہ کا ادیب ہے۔ پور داؤد کے بیان سے کچھ ایسا تاثر ملتا تھا جیسے وہ مسلم لیگ کی سیاست اور مطالبہ پاکستان کو نادرست اور ناقابل توجہ سمجھتا ہے۔ جس دن یہ بیان چھپا اسی دن مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد نے روزنامہ سٹیٹسمین کے ایڈیٹر کے نام ایک احتجاجی خط لکھا اور پور داؤد پر اعتراض کیا کہ اس نے دو ایسے ممتاز لکھنے والوں کا بے جواز موازنہ کیا ہے جو زبان، ایمان، روایات، ماحول اور مقاصد حیات کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ فکر اور فلسفہ کے اعتبار سے وہ دونوں عظیم اور آفاقی ہیں۔ ٹیگور نے ایک صوبائی زبان میں لکھا ہے۔ ادھر اقبال نے دو بڑی زبانوں میں شاعری کی اور تیسری بڑی

زبان میں تشکیل فلسفہ الٰہیات اسلامی کے بارے میں لکھا ہے۔ اس خط کی اشاعت نے پور داؤد کے خلاف اعتراضات کی بوچھاڑ لگا دی۔ خطوط، بیانات، تقاریر، قرار داد ہائے مذمت۔ ایرانی وفد پر مسلم ہند کی سیاست اور اسلامیانِ ہند کے جذبات سے ناواقفیت کا الزام لگا۔ پور داؤد کی ایک غزل کا بڑا چرچا ہوا۔ اس غزل کی ردیف "پرستد" ہے۔ نیشنلسٹ اور سیکولر ذہن اپنی پسند کا بے باکانہ اقرار اور اظہار کرتے ہوئے اپنے قبلہ کا رخ متعین کرتا ہے۔ یوں تو ساری غزل غور طلب ہے مگر مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات۔ اگر پرسی زکیشِ پور داؤد۔ جوانِ پارسی ایران پرستد۔ اگر تم پور داؤد کے دین و آئین کے بارے میں پوچھتے ہو تو سنو کہ پارس کا یہ جوان اپنے وطن ایران کی پرستش کرتا ہے۔ وہی زمانہ ماقبل اسلام والا ذہن۔ وہی دھرتی پوجا کا غیر اسلامی تصور۔

ایرانی وفد کے رئیس علی اصغر حکمت نے کفارہ کے طور پر ایک بیان اقبال کی تعریف میں دیا۔ نیم دلانہ اور گول مول وضاحتی بیان پور داؤد کی طرف سے بھی جاری ہوا۔ لیکن فضا مکدّر ہو چکی تھی صاف نہ ہو سکی۔ وفد کے طویل قیام کے دوران مسلم ہند کی ناخوشی کے گھرے بادل چھائے رہے۔ وفد علی گڑھ بھی آیا۔ وہاں کا دو روزہ قیام اس پر بہت گراں گزرا۔ رشید خاموش رہے۔ پور داؤد بے حد ناراض نظر آئے۔ علی اصغر حکمت کے کاندھوں پر سفار تکاری کا سارا بوجھ آن پڑا۔

تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ ہمسایہ ملک کے پڑھے لکھے لوگ اس حقیقت سے کتنے بے خبر ہیں کہ تاریخی شعور کے اعتبار سے اسلامیان ہند اس وقت کس مقام پر کھڑے ہیں۔ پھر لوگ خود ہی جواب دے کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے کہ آخر ایران کی صورت حال سے ہم ایسے کون سے باخبر ہیں جو کسی اور پر بے خبری کی تہمت لگا سکیں۔ پُورِ داؤد والا واقعہ مارچ 1944ء کا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام کی ایک دوسرے کے بارے میں واقفیت یا عدم واقفیت کا سوال چونتیس برس کے بعد بھی آر سی ڈی کے نامزد سیکرٹری جنرل کو تنگ کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ مسلمان ملک آزاد ہو چکے ہیں۔ ملت بیدار ہو چکی ہے۔ امت وحدت کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم، اسلامی ترقیاتی بنک اور آر سی ڈی جیسے ادارے وجود میں آ چکے ہیں۔ حج کا اجتماع بہت بڑا ہوتا ہے۔ آدمیوں کو آمدورفت کی سہولتیں میسر ہیں۔ سامان تجارت کو نقل و حمل کی آسانی

حاصل ہے۔ خبر کو سفر کرتے دیر نہیں لگتی۔ ان حالات میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اہل اسلام باخبر اور متحد ہوں گے۔ خوش فہمی نے بس یہاں تک سفر کیا۔ بدگمانی نے کہا آگے بڑھنے سے پہلے مسلمان ملکوں میں نیشنلزم کے حد سے تجاوز کرنے والے جذبہ کی خراب کاریوں پر نظر ڈالو۔ ان بے شمار بےبس مسلمان ملکوں کی سیاست پر غور کرو جو ایک دوسرے کے خلاف غیر مسلم ممالک کو اپنا نجات دہندہ اور بخشائندہ بنائے بیٹھے ہیں۔ سیکرٹری جنرل بدگمانی کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اداس ہوئے اور خاموش ہو گئے۔

ایک دن معزّالدین احمد، سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان، ہفتہ واری چائے کلب میں اپنی ملازمت کے ابتدائی دنوں کا ذکر کر رہے تھے۔ کہنے لگے میں برطانوی ہند کے ایک صوبہ سے ٹرانسفر ہو کر دوسرے صوبہ میں جانے کے لئے دہلی پہنچا۔ مرکزی حکومت نے مجھے فارغ اور فالتو سمجھا اور چند ہفتوں کے لئے ایرانی کلچرل ڈیلیگیشن کے ساتھ افسر رابطہ کی حیثیت سے نتھی کر دیا۔ چھ ہفتے برطانوی ہند کے طول و عرض کی سیاحت اور مہمانی سے لطف اندوز ہونے میں گزر گئے۔ بنگلور میں مہاراجہ سے ملاقات کے لئے پندرہ منٹ کا وقت طے ہوا تھا۔ ہم محل میں پہنچے اور پہلی منزل پر جانے کے لئے لفٹ میں داخل ہو گئے۔ مدت سے استعمال نہ ہونے کی وجہ سے لفٹ ایک منزل کا سفر بھی آرام سے طے نہ کر سکی۔ بیچوں بیچ پھنس کر رہ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد جب ایرانی وفد کمرا ملاقات میں ایک دروازہ سے داخل ہوا تو مہاراجہ دوسرے دروازہ سے باہر جا رہے تھے۔ وہ ٹھٹھکے، ہیلو ہیلو ایسے کیا جیسے ہم سے فون پر مخاطب ہیں۔ ہاتھ ملایا اور یہ جا وہ جا۔ وفد کے سربراہ نے میری طرف دیکھا اور کہا، مسٹر احمد سیڑھیاں کدھر ہیں۔

معزّالدین احمد نے ایک واقعہ اور سنایا۔ کہنے لگے، علی گڑھ کے دورے کے بعد جب ایرانی وفد یوپی کے دوسرے شہروں میں گیا تو ہر جگہ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ فارسی جناب ڈاکٹر ہادی حسن کو موجود پایا۔ وفد کے سربراہ نے افسر رابطہ سے کہا، ہماری وجہ سے ڈاکٹر ہادی حسن کو خواہ مخواہ تکلیف ہو رہی ہے۔ ہم ان کی محبت کی بڑی قدر کرتے ہیں مگر وہ کب تک ہمارا ساتھ دے سکیں گے۔ دلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ۔ بس کافی ہو گیا۔ وفد الہ آباد پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب وہاں بھی پہلے سے موجود تھے۔ گارڈن پارٹی کے دوران ان کو شہد کی مکھیوں نے کاٹ کھایا اور وہ سوجھے ہوئے منہ اور موندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ

علی گڑھ جانے کے لئے طوفان میل میں سوار ہو گئے۔ ایرانی وفد کے ایک رکن نے کہا، جو کام ایک آئی سی ایس افسر رابطہ سے نہ ہو سکا وہ بالآخر شہد کی مکھیوں نے کر دکھایا۔ آئی سی ایس افسر نے جواب دیا۔ جنابِ من، سورۂ نحل کی رو سے شہد کی مکھیوں کو پروردگار کی طرف سے وحی آتی ہے۔ میرا ان سے کیا مقابلہ۔

(3)

میری میز پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہیرو ڈوٹس، تھوسیڈ آئی ڈس، طبری، سائیکس، ول دیورنٹ، آربری، براؤن۔ ایک دوست نے یہ ڈھیر دیکھا اور طنزاً کہا، آپ تہران جانے کے لئے تیاری کر رہے یا کسی امتحان میں بیٹھنے کے لئے۔ آر سی ڈی کے حوالہ سے یہ ساری کتابیں بالکل بیکار ہیں۔ آپ کے لئے پچھلے تین برس کی آر سی ڈی کی سالانہ رپورٹ کا مطالعہ ان سب کتابوں پر بھاری ہو گا۔ ایک بات اور یاد رہے۔ مستشرقین کو پڑھنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا بلکہ بہت کچھ کھونے کا امکان اور خطرہ ہے۔ آپ ایڈورڈ براؤن کے بہت قائل ہیں مگر علامہ اقبال اس سے بہت ناخوش تھے۔ وہ ادبیات ایران کے بارے میں اس کی تحقیق کو وحدت ملت کے خلاف سازش کی ایک کڑی قرار دیتے تھے۔

میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا مقصد ان تمام کتابوں میں ایسے واقعات اور تصورات تلاش کرنا ہے جن کی بنا پر آر سی ڈی کا نیا نقشہ کار تجویز کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر ہیروڈوٹس (425 ق۔ م) نے ایرانیوں اور مصریوں کی جنگ کا حال لکھتے ہوئے اپنا ایک مشاہدہ درج کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میدان جنگ میں ایک طرف ایرانیوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے بکھرے پڑے تھے اور دوسری طرف مصریوں کے۔ گائیڈ نے مجھے بتایا کہ ایرانیوں کی کھوپڑیاں نری پھوٹک اور مصریوں کی بڑی ٹھوس ہیں۔ کنکر لے کر ماریں تو اس میں سوراخ ہو جاتا ہے۔ پتھر لے کر اس کو ماریں تو اچٹ جاتا ہے۔ مورخ کا خیال ہے کہ مصری چونکہ بچپن میں سر کی حجامت کراتے رہتے ہیں اور گھٹے ہوئے سر کو دھوپ لگاتے ہیں اس لئے کھوپڑی کی ہڈی سخت ہو جاتی ہے۔ اگر وہ بھی شروع سے ہی سر کو پگڑی میں چھپا لیتے

توان کے سر بھی ایرانیوں کی طرح بڑے نازک ہوا کرتے۔ ہیروڈوٹس کے صرف اس ایک مشاہدہ کی بنا پر آر سی ڈی میں کام کرنے کے کتنے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ ایک جامع Feasibility study کے لئے کنسلٹنٹ مقرر کئے جائیں گے۔ اہم سوالات کے جواب تلاش کئے جائیں گے۔ کیا پختہ اور ناپختہ کھوپڑی اور عقل کے خام یا پختہ ہونے کا کوئی باہمی تعلق ہے۔ کیا سر کی صحت اور فکر کی سلامتی کے لئے جبہ و دستار کے بے دریغ استعمال پر پابندی لگانی چاہیئے۔ کیا ہیروڈوٹس نے کبھی شاہدولہ کے چوہے دیکھے تھے۔ اور ان کے سر کی ساخت کے بارے میں کوئی رائے یا نظریہ پیش کیا تھا۔ کیا آر سی ڈی ممالک کے تعلیمی اداروں کو ہر سال داخلہ کے وقت طلباء کے سروں پر استرا پھروانا چاہیئے۔ امتحان کے نتائج کے وقت جو طلبا کی حجامت ہوتی ہے کیا وہ مشقِ ستم بھی جاری رہنی چاہیئے۔ کیا آر۔ سی۔ ڈی کے زچہ بچہ مراکز میں تاریخ کا مضمون پڑھانا چاہیئے تاکہ پرامید خواتین کو ایران اور مصر کی جنگ کا حال اور میدان جنگ کی اصل کیفیت کا علم ہو سکے۔ اس طرح ان کو کیلشیم کی گولیوں کے استعمال کے لئے آمادہ کرنا شاید آسان ہو گا۔

ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ایرانی غیر معمولی ذہنی خصوصیات اور صفات کے حامل ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا جوہر حیات موجود ہے۔ دوسری میں لکھا ہے کہ وہ خوش باش، زندہ دل اور رومان پسند ہیں۔ تیسری کتاب کے مطابق یہ لوگ اپنی فضیلت اور برتری پر یقین رکھتے ہیں اور دوسرے ممالک کے باشندوں کی قابلیت کو ایران سے فاصلہ کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ جو جتنا نزدیک ہے وہ اتنا فاضل ہے۔ جو جتنا دور ہے وہ اسی قدر فضول ہے۔ اس فارمولا کی رو سے آر سی ڈی افضل ترین ممالک کا ادارہ ہے۔ ایک طرف پاکستان، دوسری طرف ترکی، بیچ میں ایران۔ ایک مصنف کہتا ہے کہ ایران قدیم کی عظمت کا راز ایرانی بچوں کی تربیت میں پوشیدہ ہے۔ پانچ سال سے بیس سال کی عمر تک بچوں کو صرف تین باتوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ شہسواری، تیر اندازی اور راست گوئی۔ دوسرا مصنف اسباب عظمت کی تلاش میں اوستا کے تین سنہری اصول نقل کرتا ہے۔ دشمن کو دوست بناؤ۔ گمراہ کو راستہ دکھاؤ۔ بے علم کو علم سکھاؤ۔ اس کے بعد عظمت خود تمہارے دروازہ پر دستک دے گی۔ تیسرا مصنف کہتا ہے کہ ایران کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں عروج کی وجوہات کے علاوہ زوال کے اسباب کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ظلم ہو اور انصاف نہ

ملے۔ رشوت چلے اور حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ اخلاق پست ہو جائیں اور صحت تباہ۔ لوگ لذات میں کھو کر مستقبل سے غافل ہو جائیں۔ اس کے بعد تمہیں کسی دشمن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تم خود ہی اپنے سب سے خطرناک دشمن بن جاتے ہو۔ مجھے اس آئینہ میں اپنی صورت نظر آ رہی ہے۔ میں گھبرا کر کتاب بند کر دیتا ہوں۔

تیاری کا سب سے سنگین مرحلہ بھی ایک الاؤ جگانے سے طے ہو گیا۔ وہ تیں کیلو گرام سامان جو میں نے ہوائی جہاز میں ہمراہ لے جانا ہے اس کا انتخاب کرنے اور اسے باندھنے میں دو چار گھنٹے صرف ہوئے۔ مگر وہ سامان جو لاہور میں کوپر روڈ والی کوٹھی کی انیکسی میں چار سال کے لئے چھوڑ کر جانا ہے اس کے چھانٹ چھٹاؤ اور بندوبست میں دو ہفتہ لگ گئے۔ پرانی کتابوں اور متفرق کاغذات نے بہت تنگ کیا۔ کیا ساتھ لے جاؤں، کیا گودام میں رکھوں، کیا ضائع کر دوں۔ کاغذات دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ ضروری اور غیر ضروری۔ ایک دن جو کاغذ ایک طرف رکھا ہوتا وہ دوسرے دن دوسری طرف پہنچ جاتا۔ ایک ہی کاغذ ہفتہ بھر میں کئی بار ضروری معلوم ہوا اور کئی بار غیر ضروری۔ متفرق کاغذات کی تقسیم اور درجہ بندی بڑی مشکل ہے۔ کمیاب اور فراموش شدہ سرکاری رپورٹیں، شماریاتی اور تحریری یادداشتیں، کاربن کاپیاں، تراشے، پٹوار کا کام سکھانے والے استاد کے نوٹس، تحصیل اور خزانہ کے معائنہ کے وہ گر جو محکمہ مال کے گرگ ہائے باراں دیدہ سے سیکھے تھے۔ ڈاک بنگلوں کے خانساماؤں سے حاصل کی ہوئی رسیدیں، گمنام مگر دلچسپ عرضیاں اور خط وغیرہ وغیرہ۔ ایک دن میں نے جی کڑا کیا اور ان تمام کاغذات کو گھر کی پچھلی جانب ایک جگہ جمع کیا اور آگ لگا دی۔ ان کاغذات کے ساتھ پیشہ ورانہ توزک اور تذکرہ لکھنے کے تمام امکانات راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

تیاری کا سب سے دلچسپ مرحلہ آ پہنچا ہے۔ میں یادوں اور کتابوں کو دہرا چکا ہوں۔ اب مشورت کی جائے گی۔ اہل مشورہ کی فہرست بنائی اور سب سے عمر رسیدہ شخص سے اس کام کا آغاز کیا۔ صاحبِ موصوف تقریباً ساٹھ سال پہلے ایک صوبیدار کی حیثیت سے ایران گئے تھے۔ دو سال قیام کے بعد وطن واپس آئے اور پھر کبھی گوالمنڈی سے باہر نہیں نکلے۔ بات وہ اس اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں گویا ایران کے بارے میں ان کا فرمایا ہوا نہ صرف مستند ہے بلکہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ مجھ سے سوال کیا کہ آپ کس قسم کی

اطلاعات چاہتے ہیں۔ عرض کیا، مذہب کو چھوڑ کر باقی ہر معاملہ میں رہنمائی چاہتا ہوں۔ کہنے لگے بڑا وسیع میدان ہے۔ کہاں سے شروع کروں۔ کیا بیان کروں اور کیا نہ کروں۔ میں آدھ گھنٹے سے ان کی باتیں سن رہا ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایران ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔ بجلی نہیں، ریل گاڑی نہیں، موٹریں اور بسیں نہیں۔ اونٹ اور گھوڑے پر سفر ہوتا ہے۔ کاروان مال تجارت اور مسافروں کو لے کر نکلتے ہیں۔ راستے محفوظ ہیں۔ لوٹ مار کے واقعات کم ہوتے ہیں۔ کھانے کے لئے نان، چاول، پنیر اور پیاز مل جاتا ہے۔ لوگ اچھے ہیں۔ شکل کے اچھے اور دل کے اچھے۔ وہ ان دنوں گبرو جوان تھے اور انگریز کی نوکری کرتے تھے۔ اتنے رشتے آئے کہ بس پوچھئے مت۔ اور ایک خانم اتنی خوبصورت تھی کہ چھ دہائیاں گزر گئیں مگر ویسی صورت دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ میں ان سے اجازت طلب کرتا ہوں۔ وہ دروازہ تک چھوڑنے آتے ہیں۔ میں نے خدا حافظ کہا۔ فرمایا، واہ کیا خوب یاد دلایا، حافظ شیرازی کی بادہ مستی ملاحظہ ہو، کہتا ہے۔ بر سر تربت من بامے و مطرب بنشیں۔ تا بہویت ز لحد رقص کناں بر خیزم۔ میری قبر کے سرہانہ شراب اور گانے والے کے بغیر مت بیٹھنا تا کہ میں تمہاری مہک پاتے ہی قبر سے رقص کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوں۔ دراصل میں اسی غزل کا دوسرا شعر سنانا چاہتا تھا، وہی جواں بر خیزم والا، مگر یہ سوچ کر شعر بدل دیا کہ آپ دل میں یہ نہ سوچیں کہ اس بڈھے کو کیا ہو گیا ہے۔ ویسے میں اتنا بوڑھا نہیں ہوں۔ عمر یہی کوئی اسی بیاسی سال کی ہو گی۔ الحمدللہ، والدہ صاحبہ حیات ہیں۔ یہ بات وہ چھپا گئے کہ والدہ سوتیلی اور عمر میں ان سے چھوٹی ہیں۔

میں ایک اور ایران شناس کے گھر جاتا ہوں۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ استاد ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا کہ کیا آپ نے ایران دیکھا ہے۔ وہ بات جو میں چھپانا چاہتا تھا زبان پر لانی پڑی۔ جی ہاں، دو بار۔ اور دونوں بار ایک سفارتی وفد کے ہمراہ۔ 1973ء کی آخری سہ ماہی میں جب معدنی تیل کا عالمی بحران پیدا ہوا تو حکومت پاکستان نے ایک وفد تیل برآمد کرنے والے ممالک میں بھیجا۔ میں اس وفد کا رکن تھا۔

دوسرے وفد کا قصہ بہت پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ تاریخ میں اس روایت کو مختلف

طریقوں پر بیان کیا جاتا ہے۔ جنگ قادسیہ کے لئے مورچہ بندی ہو رہی تھی۔ فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ اتمام حجت کے لئے مسلمانوں کا ایک وفد رستم سے ملا۔ رستم ابن زال ابن سام ابن آغا حشر ڈرامہ نویس سے نہیں بلکہ رستم ابن فرخ زاد ابن طبری تاریخ نویس سے جو یزدگرد کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ وفد نے اسے قبول اسلام کی دعوت دی اور حضورؐ کی یہ پیشین گوئی بھی سنائی کہ مسلمان اس سرزمین کے وارث ہوں گے۔ رستم نے ازراہ تمسخر تھوڑی سی خاک منگائی اور کہا کہ اس زمین میں بس یہی تمہارا حصہ ہے۔ عمرو بن معدی نے دامن پھیلایا اور مٹی اس میں ڈال لی کہ شگون اچھا ہے۔ چند ہی دنوں میں پورا ملک اسلام کی جھولی میں آن گرا۔ یہ بات اگرچہ بہت پرانی ہے مگر مجھے یقین سا ہے کہ میں اس وفد میں شامل تھا۔ یہ واقعہ تاریخ اسلام کے ان چند واقعات میں سے ایک ہے جو میرے خون میں سرخ ذرات کی طرح رواں دواں ہیں۔ روح جسم میں قید کئے جانے سے پہلے آزاد تھی۔ معلوم نہیں وہ اپنی حاضری لگوانے کے لئے تاریخ کے کون کون سے لمحات پر کہاں کہاں جا پہنچی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو بعض بہت پرانے تاریخی واقعات اتنے جانے پہچانے کیوں لگتے جیسے اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔

میری بات سننے کے بعد پروفیسر صاحب دیر تک خاموش رہے۔ بات ہی ایسی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بولے، آپ بھی ان رومان پسند ناول نگاروں اور اسلام پسند نادانوں کی طرح ہیں جو تاریخ اسلام کو طلسم ہوشربا کا ایک باب سمجھتے ہیں۔ عرض کیا، جی نہیں۔ یہ اس لئے ممکن نہیں کیونکہ میں معاشیات کا طالب علم ہوں اور عملاً ملکی، علاقائی اور بین الاقوامی معاشی معاملات سے وابستہ رہا ہوں۔ حقیقت پسندی نے میری رومان پسندی کی حد بندی کی ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب کہنے لگے، تصوریت اور مثالیت آپ کے اس جواب میں بھی جھلک رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ذہن میں ایران کا ایک رومانٹک تصور موجود ہے۔ آپ کو وہاں جا کر ایک صدمہ پہنچے گا مگر آپ تجربہ کار سرکاری ملازم ہیں اس لئے کسی کو اس کی خبر تک نہ ہونے دیں گے۔ پھر پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بھارتی مسلمان پروفیسر کے وہ خط پڑھے ہیں جو انہوں نے ایران سے لکھے تھے۔ یہ لیجئے نومبر 1955ء کے ایک خط کی نقل۔ "اگر یہاں کے حالات کا صحیح اندازہ ہوتا تو مشکل سے آنے کا قصد کرتے ...... ایران کی زندگی کا جو خوبصورت رومانی خیال مدتوں سے بندھ گیا تھا وہ جاتا

رہا۔ اس کو پر فریب تخیل کہئے یا کچھ اور۔ ہمارے یہاں کے بیشتر لوگ اسی میں مبتلا ہیں ...... فارسی ادب اور کلچر سے جو مضبوط وابستگی تھی اب اس میں کمزوریاں پا رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ہم نے جو مضبوط دلائل قائم کر رکھے تھے وہ من گھڑت معلوم ہونے لگے ہیں۔ اب ان میں وزن باقی نہیں رہا۔ گل و بلبل کا کشور، آبِ رکناباد و گلگشتِ مصلیٰ کا ملک، سعدی و حافظ (کا) وطن ...... جس متاع گراں مایہ کے حصول کے لئے ساری زندگی وقف کر دی تھی وہی بے حقیقت نکلا...... بہر حال وہ طلسم ٹوٹ گیا اور اس کا ٹوٹ جانا ہی اچھا ہوا"۔

ایک اور استاد کا گھر۔ وہ سوال سننے کا بھی انتظار نہیں کرتے۔ مبارک باد دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ وہاں بہت خوش رہیں گے۔ آپ کو کلاسیکی ادبیات اور تمدن کے ساتھ جو لگاؤ ہے وہ آپ کے قیام کو بڑا مفید و مفیض بنا دے گا۔ ایرانیوں کو سمجھنے کے لئے ان کی شاعری کو سمجھنا ضروری ہے۔ قصیدہ نے ان کے مزاج میں مبالغہ بھر دیا ہے۔ تعریف و توصیف ایک میکانکی اور مشینی عمل بن گیا ہے۔ وہ ممدوح میں ایسی ایسی خوبی ڈھونڈ لیں گے جو اس کی پشتوں میں بھی کہیں نہیں ملتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ اظہار اور بیان پر ہماری قدرت دیکھو اور سر دھنو۔ غزل نے انہیں رومان پسندی اور حقیقت سے فرار کا سبق دیا ہے۔ خیالی محبوب کی یاد میں شعر پڑھیں گے اور جونہی موقع ملا اپنی بیوی کی پٹائی کر دیں گے۔ اپنی بات ہو گی تو اسے مثنوی کی طرح طول دیں گے۔ دوسرا بات کرے تو رباعی کی طرح اختصار سے کام لینے کی تلقین کریں گے۔ مرثیہ نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے۔ ناچ گھر میں بھی کسی کی یاد آ گئی تو وہ زنجیر پاؤں سے اتار کر سینہ کوبی شروع کر دیں گے۔ خود انحصاری ان کے ماحول اور موسم کا تقاضا ہے۔ زمین بنجر ہے۔ ذہن زرخیز ہے۔ تضاد ان کے یہاں کئی ملیں گے۔ سب سے بڑا یہ کہ حضرت امام حسینؓ کا دم بھرتے ہیں مگر صدیوں سے مطلق العنان بادشاہوں کی رعایا ہیں۔

میں ایک کرنل سے ملا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے تجربات پرانے ہو گئے ہیں۔ آپ کے کام کے نہیں رہے۔ دراصل مجھے واپس آئے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں رہنمائی کرنے کے بجائے آپ کو غلط راہ پر ڈال دوں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، صوبیدار صاحب نے اپنا ساٹھ سال پرانا علم مجھے منتقل کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا اور آپ پانچ سال کی مدت کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ کرنل کہنے لگے، میں اس لئے متذبذب ہوں کہ

میرے واپس آنے کے بعد اکتوبر 1973 ء میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی اور اس کے نتیجہ میں تیل کا بحران پیدا ہوا اور اس کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ تیل بر آمد کرنے والے درجن بھر ممالک ایک صبح بیدار ہوئے تو ان کے سامنے دولت کا اتنا بڑا انبار لگا ہوا تھا جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ دنیا کی معاشی تاریخ میں یوں چھپر پھاڑ کر پہلے کبھی کسی کو اتنی دولت نہیں ملی۔ ایران کے پہلے معاشی منصوبہ پر کل خرچ تقریباً ستر ملین ڈالر تھا۔ مدت سات سال تھی۔ آٹھواں معاشی منصوبہ اس سال ختم ہونے والا ہے۔ مدت پانچ سال ہے۔ کل خرچ کا اندازہ ستر بلین ڈالر ہے۔ یعنی ستر کی جگہ ستر ہزار ملین ڈالر۔ 1970 ء میں تیل کی رائیلٹی سے ایک بلین ڈالر کی سالانہ آمدنی ہوئی تھی۔ 1978 ء میں یہ آمدنی چوبیس پچیّس بلین ڈالر ہونی چاہئے۔ پچھلے پانچ برس کی بے پناہ دولت کی وجہ سے آج کا ایران وہ ایران نہیں رہا جسے میں 1972 ء میں چھوڑ کر آیا تھا۔ دولت میں اچانک اور بے حساب اضافہ ایک آزمائش ہوتا ہے۔ ایران آج کل بہت بڑی آزمائش سے دوچار ہے۔ آپ ایران کو تاریخ کے ایک اہم موڑ پر راستہ کی تلاش میں سرگرداں پائیں گے۔ آپ کا قیام بڑا دلچسپ اور پراز واقعات ہونا چاہئے۔

میں ایک نوجوان سول سرونٹ سے ملا۔ اسے ایران سے واپس آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ سر، آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ایک علاقائی سفارتی تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے ایران جا رہے ہیں۔ ان دنوں اس ملک کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ تیل کی دولت حاصل کرنے والے دوسرے مشرقی ممالک چھوٹے ہیں یا ان کی آبادی کم ہے۔ تیل بر آمد کرنے والا کوئی اور ملک تاریخ، تمدن، وسعت اور طبائع کی اپج کے لحاظ سے ایران کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اہل ایران کی خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰ حضرت جیسا منتظم اور دور رس نگاہ رکھنے والا شہنشاہ انہیں تاریخ کے اس مرحلہ پر عطا ہوا ہے۔ ایران نے دیکھتے ہی دیکھتے بے حد ترقی کی ہے۔ دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کے بعد وہ ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو گا۔ میں شادی کے فوراً بعد ایران گیا تھا۔ آٹھ برس کے قیام کے بعد واپس آیا ہوں۔ میرے تینوں بچے وہیں پیدا ہوئے تھے۔ ہم سب ایران کو بے انتہا مس کرتے ہیں۔ اگر کوئی سبیل نکل آئے تو آپ مجھے بھی اپنے سٹاف میں شامل کر لیں۔

ایک دوست سے میں نے مشورہ مانگا ہی نہیں مگر وہ مشورہ دینے پر مصر ہیں۔ اور مشورہ مجھے نہیں بلکہ میری معرفت حکومت پاکستان کو دینا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت کے فیصلوں میں کوئی منطق نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ جیسے آدمی کو ان دنوں ایران بھیجا جاتا۔ کیا یہ ان تمام افسروں کی حق تلفی نہیں جو چمکتے دمکتے ایران کی آسائشوں، لذتوں اور آزادیوں کا بھرپور استعمال کر سکتے ہیں۔ ایران ایک رنگ محل ہے وہاں کسی رنگ رسیا کو بھیجا ہوتا۔ آپ جس سفارتی حلقہ میں داخل ہونے کے لئے تہران جا رہے ہیں وہ بے حد سرگرم اور مستعد ہے۔ آپ کو ہر ہفتہ کم و بیش پندرہ بیس سفارتی تقریبات میں شرکت کرنی ہو گی۔ ہفتہ میں تین چار دن بالخصوص آخر ہفتہ آپ کو ہر شب تین دعوتوں میں شریک ہونا پڑے گا۔ ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے شام کو کئی مقامات پر راہ بندی ہو جاتی ہے۔ ذرا سا فاصلہ بھی وقت کے لحاظ سے بہت طویل ہو جاتا ہے۔ سفارتی حلقہ میں یہ رواج بن چکا ہے کہ مہمان پہلی دعوت میں نو تا دس بجے رات اور دوسری میں گیارہ اور بارہ بجے رات کے درمیان اور تیسری میں ایک بجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ تیسری دعوت وہ ہوتی ہے جس کا سفیر تقرری کی رو سے باقی دونوں سفراء سے جونیئر ہو۔ پہلی دو سفارتوں کے مہمان غول در غول آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ایک گروہ سفارت خانہ سے نکلتا ہے، دوسرا داخل ہوتا ہے اور تیسرا اجازت لینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ دوسرے سفارت خانہ میں بھی اسی طرح آمدورفت لگی رہتی ہے۔ تیسری دعوت میں سب اکٹھے پہنچتے ہیں۔ پہلی دعوت مے نوشی کے لئے دوسری کھانے کے لئے اور تیسری لطیفہ بازی اور سکینڈل کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ دعوتیں عام طور پر عشاء سے تہجد تک اور بسااوقات فجر تک بڑی شد و مد سے جاری رہتی ہیں۔ محفل شبینہ کا سا منظر ہوتا ہے۔ رخصت اذان کے وقت ہوتی ہے مگر آپ کو شمالی تہران میں اذان کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ وہاں مسجدیں ہی بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں تالا لگا ہوا ہے۔

تیاری مکمل ہے۔ دو ایک دن میں ہوائی جہاز کی نشستیں بھی رزرو ہو جائیں گی۔ بس دو احباب سے مشورہ لینا باقی رہ گیا ہے۔ ایک سے کل اسلام آباد میں ملاقات ہو گی دوسرے سے پرسوں لاہور میں۔ اس کے بعد ایران کی دریافت بذریعہ مشورت کا یہ دلچسپ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ ذہنی آزمائش کا ایک مشغلہ ہاتھ آیا تھا وہ بھی جاتا رہے

گا۔ دل اس خیال سے اداس ہو جاتا ہے۔ میں اسے یاد دلاتا ہوں کہ چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد، من و گرز و میدان و افراسیاب۔

میں وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل کے کمرے میں وقت پر پہنچا اور اتنی دیر تک گفتگو کرتا رہا کہ ان کی اگلی ملاقات کا وقت تبدیل کرنا پڑا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مرنج و مرنجاں شخص کتنی سوجھ بوجھ کا آدمی ہے اور علاقائی خارجہ پالیسی کے بارے میں اس کی معلومات کس قدر وسیع اور نظر کتنی گہری ہے۔ اور وہ اپنے علم اور خیالات کی تقسیم میں کتنا فیاض ہے۔ کہنے لگے، سفارت کار کا فرض ہے کہ وہ جس ملک میں تعینات ہو اسے سمجھنے کی سنجیدہ اور پر خلوص کوشش کرے۔ اس ملک کے معاملات میں بے بناوٹ دلچسپی لے۔ وہاں کے باشندوں کا دل سے احترام کرے۔ ان کے مسائل پر ہمدردانہ غور کرے۔ جہاں کہیں مفادات یا نظریات میں اختلاف ہو وہاں اس کی حد بندی کی کوشش کرے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو۔

میں نے ملاقات کو کامیاب جانا اور کاغذات سمیٹنے لگا۔ کراس کا سنہری بال پوائنٹ قلم بند کیا اور جیب میں رکھا۔ شاہنواز خاں کہنے لگے، آپ کی تقرری کو ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے اور آپ ابھی تک تہران نہیں گئے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب رودکی نے اپنی غزل امیر نصر کو سنائی تھی تو وہ جس طرح بیٹھا ہوا تھا اسی حالت میں اٹھا اور بخارا کی جانب سفر پر روانہ ہو گیا۔ غلام اس کے موزے اور جوتے لے کر پیچھے بھاگے اور کہیں دو فرسنگ کے فاصلہ پر پہنچ کر اس کی قدم بوسی کی اور اسے جوتے پہنائے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پہلے ننگے پاؤں تہران جاتا اور چارج لیتا۔ واپس آکر جوتے پہنتا اور سامان بند کرتا۔ میں نے وجہ بتائی۔ ایک حساس مسئلہ پر گفت و شنید کے دوسرے دور کا انتظار۔ وہ بولے، پہلے دور کے اچانک ختم ہو جانے کے بعد دوسرے فریق نے ہفتہ بھر کی مہلت مانگی تھی۔ اس اثنا میں آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ اب وہ آپ کے تہران جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ سن کر میں کرسی سے اٹھا اور الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ خان صاحب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہنستے ہوئے بولے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ چارج لینے کے بعد آپ کی نگرانی شروع ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر نگران

ادارہ یہ لکھ کر آپ کی فائل داخل دفتر کر دے گا کہ یہ شخص اتنی توجہ اور نگرانی کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد صرف ایک خطرہ باقی رہ جاتا ہے۔ سنا ہے کہ قصر شاہی میں جو صاحب رہتے ہیں ان کو سفار تکاروں اور معزز مہمانوں کی حالت غسل میں فلمیں بنوانے اور انہیں دیکھنے کا شوق ہے۔ ملاقات اس جملہ پر ختم ہو گئی۔ اب کہنے سننے کے لئے اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ افسری بھی کیا پر خطر پیشہ ہے۔ ہر وقت عزت سادات داؤ پر لگی رہتی ہے۔ کیا دفتر اور کیا گھر۔ نہ وہاں چین نہ یہاں محفوظ۔ عہدہ دار بند غسلخانہ میں بھی زد پر ہوتا ہے۔ عہدہ داری کے حمام میں وہ کتنا بے بس اور کتنا عریاں ہوتا ہے۔

میں خوش ذوق اور طرحدار چھوٹے لاٹ سے ملنے کے لئے پنجاب سیکرٹریٹ پہنچا۔ استقبال، تپاک، گرم اختلاطی، چائے اور تفصیلی بریفنگ ۔ چیف سیکرٹری مسعود نبی نور کچھ عرصہ پہلے آر سی ڈی میں ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہوا کرتے تھے۔ اعلیٰ سطح کا براہ راست تجربہ رکھنے کی وجہ سے انہوں نے اس ادارہ کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ کوئی اور کیسے بتا سکتا تھا۔ ماحول، مسائل، امکانات، افراد، کمیٹیاں، کونسل اور Summit ۔ یادداشتیں لکھتے لکھتے میری انگلیاں تھک گئیں۔ جب انہوں نے فرداً فرداً آر سی ڈی سیکرٹریٹ کے عملہ کی کارکردگی کا جائزہ لینا شروع کیا تو میں نے لکھنا بند کر دیا۔ جب وہ کارکردگی سے کردار کی طرف آئے تو میں نے پنسل سے اپنی ڈائری پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔ دائرہ، ضلع، زاویہ، تکون، مستطیل، مربع اور ان کے علاوہ وہ تمام شکلیں جو ہمیں جیومیٹری کی کتاب میں نہیں ملتیں۔ طرح طرح کے نقش ہائے بے خیالی۔ البتہ میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف لگا رہا۔ کار آمد باتیں ہیں جو اگلے ہفتہ حقیقت بن کر سامنے آنے والی ہیں۔ میں ان کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ بات ختم ہوئی۔ بڑی طمانیت کا احساس ہوا۔ بے مزہ رسمی بریفنگ کے دور میں خال خال ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہو گا جس کی بریفنگ اتنی کشادہ دلی اور خلوص سے کی گئی ہو۔

مسعود نبی نور کہنے لگے، خواہش تو میری بھی تھی کہ ایک بار پھر آر سی ڈی کے سلسلہ میں تہران جانے کا موقع ملے مگر میں خوش ہوں کہ اگر ایک مسعود وہاں نہ گیا تو دوسرا جا رہا ہے۔ آپ کی وجہ سے آر سی ڈی سے تعلق خاطر اور اپنایت برقرار رہے گی۔ بس ایک چھوٹا سا کام آپ کے ذمہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ شہنشاہ ایران کو تخت سے اتارنا ہے۔ آپ چار سال

کے لئے ایران جارہے ہیں۔ خاصی طویل مدت ہے۔ اس عرصہ میں یہ کام ہو جانا چاہئے۔ یہ کہہ کر مسعود نبی نور ہنسنے لگے۔ میں نے ہنسی میں ان کا ساتھ دینے کی ناکام کوشش کی۔ میرا دل اندر ہی اندر گہرے اور بے کنار وسوسوں میں ڈوب گیا۔ میں گوشہ عافیت کی تلاش میں ایران جارہا ہوں۔ فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے ۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سکون ملے گا۔ کام کم ہو گا۔ انعام زیادہ۔ فرصت اور آسائش اس سے بھی زیادہ۔ سوچنے سمجھنے، پڑھنے لکھنے، گھومنے پھرنے، دیکھنے بھالنے، اور ملنے جلنے کا موقع ملے گا۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے باہر بھیجیں گے۔ دنیا کے گرد چکر لگائیں گے۔ توفیق ملی تو ایک کتاب اور لکھیں گے۔ ادھر یہ دانشمند دوست ایک ایسی سیاسی تبدیلی کی پیشین گوئی کر رہا ہے جس کا فساد اور ہنگامہ، ہڑتال اور تالا بندی، گولی اور گرفتاری اور ان سب سے کہیں بڑھ کر، بے بہا اور بے تحاشا خون بہائے بغیر وجود میں آنا ممکن نہیں۔ اس تبدیلی کے لئے گلی گلی اور سڑکوں سڑکوں خون کو بہنا ہوتا ہے۔ اتنا خون کہ سڑکیں وینس کی نہریں بن جائیں۔ اتنی بڑی تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں۔ کیا ایران اس کے لئے تیار ہے۔ کم از کم میں تو تیار نہیں ہوں۔

ہوائی جہاز میں عذرا نے مجھے ایک غیر ملکی اخبار دیتے ہوئے ایک خبر کی طرف اشارہ کیا۔ لکھا تھا کہ ایران میں جہاں جلسہ کرنے کی اجازت ہے نہ جلوس نکالنے کی روایت، حکومت کے خلاف ایک چھوٹا سا احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ میں نے کہا، اخبار کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے امریکہ کے صدر کارٹر نے بڑے وثوق سے یہ کہا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے طوفانی اور پر شور سمندر میں صرف سرزمین ایران ہی سکون اور آسودگی کا ایک جزیرہ ہے۔ چند گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم دونوں اس جزیرہ پر جا اترے۔

باب دوم

ایک تھا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ پرانے زمانہ میں کہانی کا آغاز ہمیشہ اس چھوٹے سے جملے سے ہوا کرتا تھا۔ وہ کہانی جو میں سنانے لگا ہوں اگرچہ نئے زمانہ کی ہے مگر اس کے باوجود مجھے بات شروع کرنے کے لئے اس سے بہتر اور برمحل فقرہ سوجھتا ہے نہ ملتا ہے۔ یہ سیدھا سادا عمر رسیدہ جملہ اگر مفید اور کار آمد نہ ہوتا تو پھر اتنا دیرپا کیسے ثابت ہوتا اور آج مجھے اس کو مستعار لینے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور کبھی کبھی یہ ماں دوسرے کا بچہ گود لے لیتی ہے۔

میری زندگی میں کل چار بادشاہ داخل ہوئے۔ پہلا دادی اماں کی کہانیوں میں ملا، دوسرا شعر و ادب میں، تیسرا تاریخ کے اوراق میں اور چوتھا مال روڈ پر۔ پہلے بادشاہ سے میری ملاقات بہت سرسری رہی اور اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ وہ ایک خدا ترس انسان تھا۔ بیٹے بیٹیاں نیک اور فرمانبردار تھے۔ اس کے عہد میں بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ ایک احساس یہ بھی ہے کہ کہانی سنانے والی دادی اماں کی نظر میں اس کا اپنا بیٹا بادشاہ اور پوتا شاہزادہ ہوتا ہے اس لئے وہ شاہی خاندان کی خوبیاں بڑے چاؤ سے بیان کرتی ہیں۔ کہانی کے اس بادشاہ سے میری ملاقات بہت کم ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری دادی اماں نے جو ساٹھ سال کی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں اپنی بیوگی کے تیس سال سات بچوں کے گھروں کے باری باری پھیرے لگانے میں صرف کر دیئے۔ خاندان کے بیشتر افراد ان شہروں میں

رہتے تھے جن کا درمیانی فاصلہ دو تین گھنٹہ میں طے ہو جاتا تھا۔ البتہ ہم لوگ بہت دور تھے۔ ریل کا چوبیس گھنٹے کا سفر۔ دو جگہ گاڑی بدلنے کا مرحلہ۔ اس لئے ہماری باری بہت دیر میں آتی تھی۔ ایک بار وہ آئیں اور کہانیاں سنا گئیں۔ دوسری بار جب آئیں تو میں کہانیاں سننے کی عمر سے نکل کر نماز روزہ کی باتیں سننے کی عمر میں داخل ہو چکا تھا۔ اس پھیرے کا تاثر یہ ہے کہ دادی اماں ایک خوبصورت کشمیری خاتون تھیں۔ چہرہ نورانی، قد لانبا، صحت اچھی، طبیعت سادہ اور دل اتنا کشادہ کہ ساری دنیا اس میں سما جائے۔ شوق ان کے دو تھے۔ عبادت کرنا اور دعا مانگنا۔ وہ اپنی سفید چادر ہاتھوں پر ڈال کر اس کی جھولی بناتیں اور پھر دیر تک دعا مانگتیں۔ اپنے پرائے سبھی ان کی دعا میں شامل ہوتے۔ اپنوں کے نام لے لے کر دعا مانگنے کے بعد پرائے کی باری آتی۔ یا اللہ، سب بیماروں کو شفا دے۔ ہر بھٹکے ہوئے کو ہدایت دے۔ ہر مسافر کو خیریت سے اس کے گھر پہنچا۔ اس کے بعد وہ دعا کو ہمیشہ ان الفاظ پر ختم کرتیں۔ یا اللہ، کل عالم دی خیر۔ جو دادی خدا سے کائنات کی بھلائی مانگتی ہو اس کی کہانیوں کا بادشاہ نیک اور خدا ترس نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔

دوسرے بادشاہ سے پہلی ملاقات الف لیلہ کی کہانیوں میں ہوئی۔ اس کے بعد قدرے تفصیلی ملاقات گلستان سعدی کے باب در سیرت پادشاہاں میں ہوئی۔ ان دو ملاقاتوں کے بعد وہ بادشاہ جابجا نظر آنے لگا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں، قاآنی کے قصائد میں، غالب کی رباعی میں، اقبال کی مثنوی میں۔ الف لیلہ کا بادشاہ کہانیوں کا رسیا تھا۔ گلستان کا بادشاہ پند و نصائح پر عمل کرتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ نصیحت کرنے والا سعدی ہو یا غزالی۔ مریدوں نے نصیحت کو پلے باندھا اور شاہ نشین پر یہ کندہ کرا دیا کہ زنہار دنیا سے دل نہ لگانا، اس پر تکیہ نہ کرنا، اس نے تمہارے جیسے کتنے ہی بادشاہوں کی پرورش کی اور پھر ان کا صفایا کر دیا۔ سعدی نے گلستان میں جتنے صفحے بادشاہوں کے بارے میں لکھے اتنے اخلاق درویشاں پر لکھے نہ فضیلت قناعت پر۔ حد تو یہ ہے کہ عشق و جوانی کا باب بھی بادشاہت کے باب سے چھوٹا ہے۔ سعدی اختیار و اقتدار اور حرکت کا قائل ہے اس لئے بادشاہوں کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ از معدۂ خالی چہ قوت آید واز دست تہی چہ مروت واز پای بستہ چہ سیر واز دست گرسنہ چہ خیر۔ خالی پیٹ قوت سے خالی۔ خالی ہاتھ مروت سے خالی۔ پابند کیسے سیر کر سکتا ہے۔ فاقہ کش کیسے خیرات کر سکتا ہے۔

شاہنامہ کے بادشاہ کی زندگی جنگ و جدال سے عبارت ہے۔ جنگ جیتے تو تعاقب، ہارے تو فرار۔ قرار کی کوئی صورت اس کی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ گاہے شاہزادہ غلام بنتا ہے، بکریاں چراتا ہے، مارا مارا پھرتا ہے۔ وقت مقررہ پر پہچانا جاتا ہے۔ اولاد نرینہ سے محروم بادشاہ کا داماد اور جانشین بن جاتا ہے۔ کم از کم ساسان کے ساتھ یہی ماجرا ہوا وگرنہ ایران باستان کی تاریخ بنجر ہوتی اور کسی فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی تحریک نہ ہوتی۔ محمود غزنوی وعدہ شکنی سے بچ جاتا۔ خزانہ کو ساٹھ ہزار اشرفیوں کی بچت ہوتی۔

غالب کا بادشاہ بس نام کا بادشاہ ہے۔ عملداری انگریز کی ہے۔ بے اختیار بادشاہ کی جیب خالی ہے۔ وہ دال پکا کر غالب کو تحفہ میں بھیجتا ہے۔ غالب شعر اور لفظ کا بااختیار بادشاہ ہے۔ وہ اس تحفہ کے بارے میں ایک رباعی کہتا ہے اور اس دال کو دولت و دین و دانش و داد کی دال قرار دیتا ہے۔ جب غالب ایسے بے بس بادشاہ کا قصیدہ لکھتا ہے تو کہتا ہے کہ اس کے لشکر کا جھنڈا بلند ہونے پر چرخ کو چکر آ گیا، اس کا نام خطبہ میں آیا تو منبر کا مرتبہ بلند ہو گیا، ملک و سلطنت کا ایسا عظیم الشان وارث دیکھا تو لوگ طغرل و سنجر کو بھول گئے۔ بادشاہ اتنا بے خبر ہے کہ قلعہ سے باہر دنیا بدل گئی اور اسے پتہ نہ چلا مگر شاعر کہتا ہے اس کے علم کا یہ عالم ہے کہ لوح ازل میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ بادشاہ پر عیاں ہے۔ پھر شاعر دعا دیتا ہے کہ ایسے شخص کی بادشاہت اس وقت تک سلامت رہے جب تک، ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا۔ قصیدہ گو شاعر بھی دراصل بازی گر ہوتا ہے۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔ وقت نے ثابت کیا کہ غالب کا شعر زور دار ہے مگر بادشاہ کمزور۔ بادشاہ گرفتار ہوا، مقدمہ چلا، جلا وطن کیا گیا۔ غالب نے ایک بغل میں بیاض اور دوسری میں درخواست دبائی اور کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں داد اور پنشن لینے پہنچ گئے۔

ایک بادشاہ وہ ہے جو نام بدل بدل کر اقبال کے کلام میں جابجا داخل ہو جاتا ہے۔ سلطان غازی، سلطان شہید، سلطان مظفر، سلطان فاتح، سلطان مراد۔ وہ بھی اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی اندلس میں کھجور کا پہلا پودا لگاتا ہے جو سات سو سال تک پھل دیتا رہتا ہے۔ وہ ان پودوں سے مختلف تھا جو ہمارے سیاست دان برسات میں شجر کاری کی مہم کے دوران ایک سال ایک جگہ دھوم دھام سے لگاتے ہیں مگر دوسرے سال پھر اسی جگہ نیا پودا لگانے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ میدان سیاست بنجر قدیم ہے۔ سیاست دان بے فیض ہے۔

جمہوریت کا پودا جڑ پکڑتا ہے نہ پھل دیتا ہے۔ اس سے تو بادشاہ ہی بھلے تھے۔

کلامِ اقبال والا بادشاہ کبھی قصاص کی آیت سن کر بے چون و چرا قاضی کے سامنے اپنا ہاتھ سزا کے لئے پھیلا دیتا ہے۔ کبھی اقرار کرتا ہے کہ بادشاہوں کی جنگ لوٹ مار کے لئے ہوتی ہے مگر مومن کی جنگ ایک سنت ہے۔ کبھی نصیحت کرتا ہے کہ شیر کی زندگی کا ایک دن گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ کبھی وصیت کرتا ہے کہ اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز۔ ایسی اچھی باتیں اچھے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ بادشاہ لوگ بھلے اور اچھے ہی ہوں گے جو اس بے ڈھب دنیا کو تاریکی اور جہالت کے جنگل سے ہانک کر اٹھارویں اور انیسویں صدی تک لے آئے۔

میں نے چند فارسی قصائد پڑھے۔ کچھ سمجھ میں آئے، کچھ مشکل نکلے۔ ان کے پڑھنے سے پہلی بار میرے دل میں بادشاہوں اور ساتھ ہی شاعروں کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے۔ ان دنوں میں یونیورسٹی رائڈنگ اسکول کے شہسواروں کے دستہ میں شامل تھا۔ جست لگا کر گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتا اور جہلمی صوبیدار صاحب سے داد وصول کرتا۔ رکاب میں پاؤں کا تہائی حصہ ڈالنے اور چاروں لگاموں کو انگلیوں میں اس طرح پرونے کے بعد کہ اوپر کی دو کسی ہوئی اور نیچے کی دو ڈھیلی ہوں، میں یہ سوچتا کہ آخر وہ بادشاہ گھوڑے پر کیسے سوار ہوتا ہو گا جس کی رکاب چومنے کے لئے گمان اور خیال کو نو آسمانوں کی کرسی پر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اتنا طول کھینچنے کا کیا فائدہ۔ یوں طومار باندھنے سے کیا حاصل۔ یہ مضمون ظہیر فاریابی جیسے معقول شخص نے اپنے ایک قصیدہ میں قزل ارسلان کی مدح میں باندھا ہے جس سے وہ کچھ عرصہ بعد ناراض ہو کر مبالغہ اور لفاظی کا پشتارہ اٹھائے کسی اور بادشاہ کے دربار میں جا نکلا۔ ان دنوں بادشاہ اور شاعر دونوں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ اب صرف شاعروں کی کثرت رہ گئی ہے۔

سیاسیات کے چند ابواب اور تاریخ عالم کے چند اوراق نے بادشاہی کا وہ طلسم ہی توڑ دیا جو کہانیوں، قصیدوں اور شاہناموں نے باندھا تھا۔ وہاں راوی چین ہی چین لکھتا تھا اور یہاں راوی بے چینی ہی بے چینی لکھتا ہے۔ وہ راوی داستان گو اور شاعر تھا، مبالغہ کی فضا میں سانس لینے اور خیال آرائی میں مگن رہنے والا۔ یہ راوی مورخ اور عالم ہے۔ واقعیت اور اصلیت کا گواہ۔ حقیقت نما اور حقیقت نگار۔ میں طے کرتا ہوں کہ دو قدم مورخ کے

ساتھ اٹھاؤں گا اور ایک قدم درباری اہل قلم کے ساتھ۔ رفتار سست ہو گئی مگر سفر دلچسپ ہو گیا۔

تاریخ ہنگامہ پسند ہے اور بادشاہ کی ساری زندگی ہنگاموں میں بسر ہوتی ہے۔ تاریخ میں درج ہے کہ دو ہنگامے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ایک بادشاہ کی آمد کا ہنگامہ اور دوسرا اس کی رخصت کا۔ اور اگر اس آمدورفت میں کسی بادشاہ کو ذرا سا وقفہ مل جائے تو وہ عیش محل کی رونق بڑھانے میں گزر جاتا ہے۔ بادشاہوں کی آمد کا سلسلہ ایسا ہے کہ بڑے نیک سیرت شاہزادے بھی تخت نشینی کی خاطر انتہائی ظلم و ستم اور ہر طرح کے مکر و فریب میں ذرا قباحت محسوس نہیں کرتے۔ بعض اوقات حالات اتنی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں کہ مورخ بادشاہوں کی آمدورفت کا حال لکھتے لکھتے تھک جاتا۔ اشوک اور زرکسیر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اشوک کو تاریخ میں ایک عظیم مگر نیک اور پارسا راجا کی حیثیت حاصل ہے۔ رحمدلی کا یہ عالم کہ اس کے راج میں کسی جانور کو مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ جانور کی ہتیا کرنے والے پر قتل کا مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ نرم دلی اتنی کہ جب کلنگہ کی لڑائی میں فتح حاصل کی تو ہارنے والی فوج کی تباہی اور بربادی سے غمزدہ ہو کر اس نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کی توسیع کا کام فوراً بند کر دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ نیکی اور پارسائی سے اچانک رغبت کی وجہ سے سات لاکھ فوجی بیروزگار، دس ہزار جنگی رتھ ناکارہ اور نو ہزار سدھائے ہوئے ہاتھی آوارہ ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط ہو گا کہ اشوک ملک کے قانون اور اس کی خارجہ پالیسی بے سوچے سمجھے محض ہنگامی اور جذباتی وجوہات کی بنا پر وضع کرتا تھا۔ اس نے تو اپنی تخت نشینی کی خاطر سولہ ماؤں سے جو ایک سو سوتیلے بھائی پیدا ہوئے تھے ان سب کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک ایک کر کے قتل کر دیا تھا۔ کیسی ہتیا اور کون سا مقدمہ۔ اگر وہ اس سلسلہ میں ذرا بھی ہچکچاتا تو تخت پر بیٹھنے کے بعد کمر بھی سیدھی نہ ہوتی کہ تختہ الٹ جاتا۔

ایران میں زرکسیز دوم کو بادشاہت ملنے کے چند ہفتہ بعد ایک سوتیلے بھائی نے ہلاک کر دیا۔ چھ ماہ کی حکمرانی کے بعد وہ خود دارا دوم کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ دارا کے خلاف ناکام بغاوت ہوئی۔ باغی قتل ہوا۔ اس کی آل اولاد کا حشر برا ہوا۔ بیوی کی لاش کے

ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور باقی اہل خانہ کو زمین میں زندہ گاڑ دیا۔ دارا دوم کے جانشین کو تخت نشینی کے بعد پہلے اپنے بھائی کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد ایک سازشی بیٹے کو قتل کرنا پڑا۔ جب اسے پتہ چلا کہ دوسرا برخوردار بھی اس کے خلاف سازش میں مصروف ہے تو وہ اس خفیہ خبر کی تاب نہ لاسکا اور صدمہ سے مر گیا۔ اس کے بعد آنے والے بادشاہ نے کچھ دیر جم کر حکومت کی مگر اسے آخر کار ایک جنرل نے زہر دے دیا۔ ایک وفادار اور نمک خوار نے مقتول بادشاہ کے نوجوان بیٹے کو تخت پر بٹھایا اور دعویداروں سے نجات دلانے کے لئے اس کے سارے بھائیوں کو قتل کر دیا۔ یہ نوجوان فرمانروا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے محسن کا احسان کس طرح چکائے کہ اس کے حمایتی نے آنکھیں بدل لیں۔ بادشاہ گر نے نوجوان شاہ اور اس کے کم سن بچوں کا خون کر دیا اور اپنے ایک زن صفت دوست کو اورنگ کی زیب و زینت بنا دیا۔

ایک تھا بادشاہ۔ اور وہ ایسے گمراہ کن ماحول میں رہتا تھا اور ایسے مفت خور بلکہ حرام خور جی حضوری مصاحبوں میں گھرا ہوا تھا کہ اس کے لئے معمول کے مطابق زندگی بسر کرنا اور عام آدمی کی طرح سوچنا، سمجھنا اور عمل کرنا ممکن ہی نہ رہا۔ اس کی اکثر باتیں اور حرکتیں خلاف عقل ہوتی تھیں۔ ایک بار یہ بادشاہ اپنی والدہ کے ساتھ جوا کھیلنے لگا۔ کھیل بہت آسان تھا اور لمحہ بھر میں ختم ہو جاتا تھا۔ ایک پاسا تھا جس پر ایک سے لے کر چھ تک ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ ایک نمبر بادشاہ لے لیتا اور ایک اس کی والدہ۔ پاسا پھینکا جاتا۔ اگر دونوں نمبر نہیں آتے تو کھیل برابر۔ بادشاہ کا نمبر نکل آتا تو والدہ اسے شرط پر لگائی ہوئی رقم دے دیتی۔ والدہ کا نمبر آجاتا تو بادشاہ شرط میں لگایا ہوا غلام ہار جاتا جسے محترمہ کی فتح کی خوشی میں شوقیہ ذبح کر دیا جاتا۔ ماں بیٹے کے آدھ گھنٹے کے کھیل کے نتیجہ میں سو پچاس غلام بے موت مارے جاتے۔

قطع نظر اس کے کہ ملک، زمانہ اور خاندان کونسا تھا، ایک بار تیر اندازی کی مشق کرتے ہوئے بادشاہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے تختہ مشق کی جگہ تفریحاً ایک لڑکے کو کھڑا کیا اور اس کے باپ کی آنکھوں کے سامنے نشانہ اڑا دیا۔ لڑکا ہلاک ہو گیا۔ خوف زدہ باپ نے بڑھ کر قدم چومے اور بادشاہ کی نشانہ اندازی پر اسے مبارکباد پیش کی۔ زبردست مارتا ہے اور رونے نہیں دیتا۔ بادشاہ مارتا ہے اور پسماندگان سے مبارکباد بھی وصول کرتا

ہے۔

ایران کے تین بادشاہوں نے عدل و انصاف کے سلسلہ میں اپنے اپنے زمانہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ نوشیروان، کیقباد اور کمبوجیہ۔ نوشیروان عادل اور اس کے اداشناس وزیر کی گفتگو اور جنگل میں شب بیدار پرندوں کا خانگی مکالمہ بہت مشہور ہے مگر دوسرے دو بادشاہوں کے عدل کا قصہ تاریخ کے گمشدہ اوراق میں درج ہے۔ 550 ق.م میں ایران کا شمال مغربی حصہ میڈیا چھوٹے چھوٹے خود مختار اضلاع میں بٹا ہوا تھا۔ ایک ضلع کا حاکم اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ دوسرے علاقوں سے بھی لوگ اپنے جھگڑے اور مقدمے لے کر اس کے پاس آنے لگے۔ پہلے اس تفریق کے بغیر کہ مقدمہ اس کی اپنی ریاست کا ہے یا کسی دوسرے علاقہ کا وہ سب کی بات سنتا اور فیصلے صادر کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ بیرونی ممالک سے انصاف کی تلاش میں آنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ اسے مجبوراً اعلان کرنا پڑا کہ آئندہ صرف ان علاقوں کے مقدمات سنے جائیں گے جو براہ راست اس کے ماتحت ہیں۔ اپنے اپنے حریص اور بے انصاف حاکموں سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کیقباد کو سارے میڈیا کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ جس حاکم سے انصاف نہ ملے لوگ اس کی جگہ باہر سے نیا حکمران در آمد کر لیتے ہیں۔ جس ملک میں انصاف دستیاب نہ ہو لوگ اسے کسی دوسرے ملک میں ضم کر دیتے ہیں۔

عدالتوں میں انصاف رائج کرنے کی ایک انوکھی ترکیب کمبوجیہ نامی بادشاہ نے نکالی تھی۔ اس کے عہد سے پہلے کسی کو یہ ترکیب سوجھی نہ اس کے بعد کسی کو اس پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی۔ بادشاہ کمبوجیہ کے حکم کے مطابق بے انصاف اور بے ایمان جج کی کھال بطور سزا جیتے جی کھینچ لی جاتی۔ چونکہ یہ کھال یتیم خانہ کے کسی مصرف کی نہ ہوتی اس لئے اس سے سرکاری فرنیچر کی پوشش کا کام لیا جاتا۔ جج صاحب کی کھال ان کی کرسی عدالت پر مڑھوا دی جاتی۔ پھر آنجہانی جج کی جگہ اس کے بیٹے کا تقرر کیا جاتا تاکہ وہ اس کرسی پر بیٹھ کر آغوش پدر کی گرمی اور انجام پدر کی تپش محسوس کرے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت انصاف اور صرف انصاف سے کام لے۔ اولاد کی اصلاح کا یہ اصول، باپ کے گناہوں کے کفّارہ کا یہ قاعدہ، عدلیہ کو عبرت دلانے کا یہ سبق، معاشرہ میں عدل و انصاف رائج کرنے کا یہ دستور اور مظلوم کی حمایت کا یہ نسخہ جو ول ڈیورنٹ کی داستان تہذیب میں درج ہے نہ

جانے کیوں پاکستان کے ہر اس کمیشن کی نظروں سے اوجھل رہا جو وقتاً فوقتاً انصاف کو فوری اور یقینی بنانے اور رشوت کا قلع قمع کرنے کے لئے قائم کئے جاتے رہے۔ اگر Cambyses کے اس قانون کو آج ہر سرکاری اور نیم سرکاری ادارہ میں نافذ کر دیا جائے تو گودام بے انصاف اور بد دیانت حکمرانوں کی کھالوں سے بھر جائیں اور ملک میں صوفوں اور کرسیوں کی پوشش بنانے والے تمام کارخانے بند ہو جائیں۔

(2)

ایک تھا بادشاہ۔ زمانہ کی دست برد اور دنوں کی الٹ پھیر سے بچ رہنے والے درجن بھر بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ۔ جیتا جاگتا، نوجوان اور زندہ سلامت۔ خود ساختہ بادشاہت کی دوسری نسل کا بادشاہ سلامت۔ مگر جب میں نے مدت ہوئی اسے لاہور کی مال روڈ پر دیکھا تو وہ کسی طرح میری نظروں میں نہ جچا۔ وجہ اس کی چند فرشتے اور ایک پروفیسر۔ جب اس کا جلوس گزرا تو بینڈ باجا کی تیز استقبالی دھن کی بجائے میرے کانوں میں کہیں بہت دور سے ایک آواز آ رہی تھی۔ مدھم مگر صاف۔ شاید قدسی ہوں گے جو کہیں آسمانوں پر علامہ اقبال کے لکھے ہوئے فرشتوں کے گیت کا یہ ٹکڑا قوالوں کی طرح بار بار اور پلٹے کھا کھا کر گا رہے تھے۔ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ۔ اور جب سننے والے کو گانے والوں کے اصرار اور تکرار سے یہ یقین ہو گیا کہ شخصی بادشاہت کا زمانہ لد گیا ہے تو پھر گانے والوں نے بات آگے بڑھائی اور اس مصرع پر تان توڑ دی۔ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ یہ بات کہ نقش کہن کو کس طرح مٹایا جاتا ہے۔ مجھے ایک پروفیسر نے بتائی تھی۔ بی۔ اے کا سال آخر، سیاسیات کا مضمون، استاد شیخ عبدالرشید، موضوع جمہوریت، ذیلی موضوع انقلاب فرانس۔ شیخ صاحب کا لکچر اتنا دلچسپ ہوتا کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔ جب وہ لکچر ختم کرتے تو معلوم ہوتا کہ اکٹھے دو پیریڈ پڑھا گئے ہیں اور دوسرے پیریڈ کا استاد گھنٹہ بھر خالی کلاس میں بیٹھ کر واپس سٹاف روم چلا گیا ہے۔ لکچر کے بعد گاہے یہ بھی نہ پتہ چلتا کہ مضمون کیا تھا۔ فرانسیسی یا انگریزی ادب، سیاسیات، تاریخ، ملوکیت، جمہوریت،

معاشرت، طوائف الملوکی، والٹیئر، روسو، پیرس کی راتیں یا انقلاب کے دن۔

ان دنوں ایسا لگتا تھا جیسے بادشاہت کے بارے میں میرے طالب علمانہ نظریات کا ساتھ دینے والے زیر زمین چلے گئے ہیں اور پاک سرزمین کا ہر باشندہ بادشاہ کے دورہ کی وجہ سے بے حد excited ہے۔ لوگوں نے پھر کبھی اتنی دلچسپی کسی اور سربراہ ریاست کی آمد پر نہیں دکھائی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان کا اولین دور ہجرت، شہادت، حد بندی کی بے انصافیوں، جہاد کشمیر، قائداعظم کی علالت، کپڑے اور کوئلہ کی قلت، سریئے اور سیمنٹ کی گرانی اور بہت سی اداسیوں اور افسردگیوں پر مشتمل ہے۔ لوگ اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے تھک گئے تھے اور دو گھڑی دل بہلانے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ کام جو دوسری جنگ عظیم کے بعد فیسٹیول آف برطانیہ اور برسلز کی نمائش نے طویل لڑائی سے تھک کر چور ہونے والے یورپی باشندوں کے لئے سرانجام دیا تھا وہی کام اہل پاکستان کے لئے ہزامپیریل میجسٹی شہنشاہ ایران کے دورے نے کیا۔ یہ پاکستان میں کسی بھی سربراہ مملکت کا پہلا دورہ تھا۔ پہلے پہل تجربہ کا نیاپن اور اشتیاق کا عالم۔ اور یہ خوف بھی فطری تھا کہ کہیں استقبال میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بات بات پر عجم سے اپنے دیرینہ تعلقات کا حوالہ دے رہا تھا۔ فارسی جاننے والے پاؤں زمین پر نہ رکھتے تھے۔ عام آدمی یہ سوچ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے ایک مسلمان بادشاہ کو دیکھ سکے گا۔ اور چھوٹے بڑے سب اس تقریب کو قیام پاکستان کا فیضان قرار دے رہے تھے۔

یہ یکم مارچ 1950ء کی بات ہے۔ رائل پاکستان ایرفورس کے فیوری لڑاکا ہوائی جہازوں کے ایک سکواڈرن نے زاہدان سے شہنشاہ ایران کے فلائنگ فوٹرس ہوائی جہاز کو اپنی حفاظت میں لیا اور کراچی کی جانب پرواز شروع کی۔ چار جہاز فضا میں شہنشاہ کے جہاز کے اوپر تھے اور باقی چار اس کے نیچے۔ شہنشاہ کا جہاز کراچی اترا۔ وہ دروازہ سے نکل کر سیڑھی پر کھڑے ہوئے تو فیوری سکواڈرن نے جھک کر سلامی دی اور فضا میں گم ہو گیا۔ استقبال کے لئے خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خان کے علاوہ ایک لاکھ شہری بھی تھے جو ہوائی اڈا سے گورنر جنرل ہاؤس کے درمیان جگہ جگہ کھڑے تھے۔ فوج کے جوان بھی سارے راستہ دورویہ پرا باندھے کھڑے تھے۔ ہوائی اڈے پر گارڈ آف آنر کے دستہ کی کمان لیفٹننٹ کرنل

یحییٰ خاں نے کی۔ شاہ کے اے ڈی سی کا کام بریگیڈیئر حق نواز کو ملا۔ چیف آف پروٹوکول لال شاہ بخاری تھے۔ وزیر خارجہ کشمیر پر بحث کے لئے اقوام متحدہ کا دورہ کر رہے تھے۔ اقوام متحدہ کے اجلاس ان دنوں لیک سکسس میں ہوا کرتے تھے۔ نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر محمود حسین ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ مسلح افواج کے تینوں بدیسی سربراہ بھی سج دھج کر وہاں کھڑے تھے۔ ریر ایڈمرل جے ڈبلیو جیفورڈ، جنرل سر ڈگلس گریسی، ایئر وائس مارشل آر ایل. آر ایچرلے۔

جلوس شہر کی طرف روانہ ہوا۔ ان دنوں ڈرگ روڈ اسٹیشن سے صدر کراچی تک سارا درمیانی علاقہ غیر آباد ہوا کرتا تھا۔ رونق کے لئے جگہ جگہ آرائشی دروازے بنائے گئے اور ان کے نام بھی رکھے گئے۔ سعدی، حافظ، اقبال، محمد بن قاسم، وزیراعظم اور گورنر جنرل کے حصہ میں ایک ایک دروازہ آیا۔ غلام محمد ابھی اتنے اہم نہ تھے کہ کسی استقبالی محراب پر ان کا نام لکھا جاتا۔ یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ سال سوا سال کے بعد وہ ملک کی سب سے اہم اور طاقتور شخصیت بن جائیں گے۔ اپنی اہمیت کا غلط اندازہ لگائیں گے۔ اپنی طاقت کا غلط استعمال کریں گے۔ اپنے نام کا دروازہ بنوائیں گے۔ اس نئے اور کشادہ دروازہ سے عارضی دستور، آئین ساز اسمبلی، کم سن جمہوریت اور دو چار حکومتوں کا جنازہ نکلے گا۔ غلام محمد نے رضا شاہ سے ہاتھ ملایا۔ کل کے بے تاج بادشاہ نے آج کے تاجدار سے مصافحہ کیا۔

کراچی سے شہنشاہ ایران مشرقی پاکستان گئے اور وہاں کا دورہ مکمل کرنے کے بعد چاٹگام سے سیدھے لاہور آئے۔ گورنر جنرل ناظم الدین ہمراہ تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں اور گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے جادۂ جہازی پر استقبال کیا۔ گورنر کے سیکرٹری غیاث الدین احمد اور ملٹری سیکرٹری میجر وین رائٹ سے ہاتھ ملانے کے بعد فوجی دستہ کی سلامی پریڈ دیکھی۔ اس کے بعد معززین سے تعارف ہوا۔ چیف جسٹس فیڈرل کورٹ عبدالرشید، چیف جسٹس پنجاب محمد منیر، ہائی کورٹ کے دو چار جج، پنجاب حکومت کے تین چار مشیر، چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجید، کمشنر فدا حسن۔ جلوس فوجی ہوائی اڈا سے چلا۔ پہلی موٹر سائیکل گورنر کے پائلٹ کی تھی۔ اس کے پیچھے پنجاب کے آئی جی قربان علی خاں کی

موٹر، ان کے بعد ڈی آئی جی میاں انور علی کی موٹر، پھر چند پولیس کے موٹر سائیکل سوار۔ اس کے بعد اصل جلوس۔ سولہ فوجی موٹر سائیکل سواروں کے جلو میں مہمان خصوصی کی موٹر۔

مال روڈ کے کنارے پنجاب کلب سے لے کر گورنر ہاؤس کے دروازہ تک دونوں طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر وہ شہری بیٹھے ہوئے تھے جنہیں دعوت نامہ جاری کیا گیا تھا۔ مال روڈ ان دنوں اکہری ہوا کرتی تھی اور کچھ ایسی چوڑی بھی نہ تھی۔ پنجاب کلب کی عمارت میں اب سٹاف کالج قائم ہے۔ دوسری جانب کلب روڈ سے لے کر ریس کورس روڈ تک برلب سڑک کوئی عمارت نہیں تھی۔ بس درخت ہی درخت تھے اور سبزہ ہی سبزہ۔ درخت اونچے اونچے اور بھرے بھرے تھے۔ سبزہ بڑا سبز تھا۔ تہ بھی موٹی تھی۔ باغ جناح کے باہر قد آدم لوہے کا جنگلہ تھا نہ اندر اتنی چوڑی اسفالت کی سڑکیں۔ آپ ہر طرف سے باغ میں داخل ہو سکتے تھے اور باغ بھی ہر سمت سے لاہوریوں کی زندگی میں داخل ہو جاتا تھا بالخصوص بہار کے دنوں میں۔ یہ موسم بہار کا ایک دن تھا اور سہ پہر کا وقت، میں مال روڈ کے کنارے دوسری قطار میں لکڑی کی بغیر بازو والی اور بید کی پشت اور نشست والی کرسی پر گرے رنگ کے ڈبل بریسٹ سوٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس جگہ دو درجن کرسیاں پاکستان میں مقابلہ کے پہلے امتحان میں کامیاب ہونے والے ایڈمنسٹریٹو سروس کے زیر تربیت افسروں کے لئے رزرو تھیں۔ انتظار کا وقت آپس کی نوک جھونک میں گزر گیا۔ انور عادل اور آفتاب احمد خاں کی ذہانت اور بلند آوازی کا مظاہرہ۔ منیر حسین اور محبوب حسن کی باہمی جملہ بازی۔ دربار علی شاہ کا بے محابا قہقہہ اور موسیٰ کی دلفریب مسکراہٹ۔ شفیع الاعظم اور امتیازی کی بڑے قرینہ کے ساتھ سرگوشیاں۔ ثناالحق کی مصنوعی جھنجھلاہٹ اور اے کے ایم احسن کے طنزیہ جملے۔ روئیداد کا کسی ساتھی کی حرکتوں کی طرف انصاری کی توجہ دلانا اور اکسانا۔ انصاری کا صورت حال پر انگریزی اور بلیغ پنجابی میں بے لاگ تبصرہ۔ مسرور حسن خاں نے ٹائی کے میل کا ریشمی رومال جیب میں رکھا ہوا ہے۔ پوچھتے ہیں، کیمرا ہے۔ اسلم اولیس نفی میں سر ہلاتے ہیں۔ کیا شاہ کی تصویر بناؤ گے۔ نہیں اس میں کیا رکھا ہے۔ اپنی تصویر کھینچیں گے۔ چند ہفتہ بعد یہ کورس ختم ہو جائے گا۔ پھر یوں مال روڈ کے کنارے مل بیٹھنا خواب و خیال ہو جائے گا۔ روجهان، ڈیرہ غازی خاں کے عاشق مزاری جو نواب گنج

ڈھاکہ کے معظم حسین کے ساتھ ایک کمرے میں رہتے ہیں معظم کو چھیڑتے ہیں کہ تم نے غسلخانہ اور باورچی خانہ کا فرق مٹا دیا ہے۔ جب دیکھو بیرا وہاں سٹوو پر مچھلی پکا رہا ہوتا ہے۔ معظم ہنستے ہوئے جواب دیتے ہیں۔ اچھا کل سے سٹوو بیڈروم میں رکھ لیتے ہیں۔ اسی بہانہ کمرہ گرم رہے گا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ لاہور میں مارچ کے مہینہ میں اتنی سردی پڑتی ہے۔ ابوالاحسان اپنی کرسی چھوڑ کر ان کے پاس آتے ہیں۔ میں سمجھا تھا تم لوگ جم خانہ کی بات کر رہے ہو۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ بات جم خانہ کی نہیں غسلخانہ کی ہو رہی ہے۔ تم کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ گئے ہو۔ ابوالاحسان آج کل جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں انہیں اٹھتے بیٹھتے جم خانہ کلب یاد آتا ہے۔ وہ شام کو کھیل کے بعد ٹینس کی ایک خاتون کھلاڑی کو کرائے کی نئی سبز رنگ کی سائیکل کے کیریئر پر بٹھا کر باغ جناح کا ایک چکر لگاتے ہیں۔ ابوالاحسان کہتے ہیں کہ باغ کا یہ چکر ورزش کے سلسلے میں ہے۔ ساتھی مان کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کوئی اور چکر ہے۔

یکایک سڑک پر ہلچل پڑی۔ سب کی آنکھیں اس موٹر کی طرف اٹھیں جس کی کینوس کی چھت تہ کی ہوئی تھی اور پچھلی نشست پر پاکستان کے گورنر جنرل اور ایران کے شہنشاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ خواجہ ناظم الدین پختہ عمر، پختہ رنگ، فربہ جسم اور چھوٹا قد ہونے کے باوجود خوش شکل بلند قامت صاف رنگت والے شاہی وردی میں ملبوس نوجوان سے کہیں زیادہ باوقار نظر آئے۔ ایک تحریک پاکستان کا بے لوث سپاہی جس نے آزادی اور مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر برطانوی امپیریلزم کی مخالفت کی۔ دوسرا کٹھ پتلی شہزادہ جس کے باپ کو انگریزوں نے تخت سے اتار کر اسے بادشاہِ وقت بنا دیا تھا۔

دعوتیں، انعام، اسپیچیں، قواعد، فوج، کمپ - یہ مصرع اکبرالہ آبادی کا ہے۔ اور اگرچہ 1911ء کے دلی دربار کے بارے میں ہے مگر شہنشاہ ایران کے دورۂ لاہور پر بھی صادق آتا ہے۔ گورنر ہاؤس میں کھانا، شالیمار باغ میں چائے، یونیورسٹی کو فارسی تعلیم کے لئے عطیہ، ہر روز کم از کم ایک تقریر، کیولری گراؤنڈ میں معائنہ پریڈ۔ پریڈ میں بیس ہزار فوجیوں نے حصہ لیا۔ جنرل اعظم ان دنوں جی او سی تھے۔ عوام نے کبھی اتنے فوجی ایک جگہ جمع ہوئے دیکھے نہ تھے۔ ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا اور اس میں طرح طرح کے خیالی منصوبے جنم لینے لگے۔ الحمرا جو پیلے رنگ کی ایک بوسیدہ کوٹھی ہوا کرتی تھی اس میں شہنشاہ

نے چغتائی کی تصاویر کی نمائش دیکھی۔ مال روڈ پر واقع یونیورسٹی ہال میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری وصول کی۔ نشتر صاحب نے اس موقع پر بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے مختلف امتحانات میں پچھلے سال پینتیس ہزار افراد نے شرکت کی اور ان میں سے تیرہ ہزار نے زبان فارسی کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھا تھا۔ شہنشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فارسی کتابوں کی اشاعت کے لئے مبلغ تین ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ کا اعلان فرمایا۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایران میں جدید تعلیم پر بڑی توجہ دی جا رہی ہے۔ وہاں دو یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ایک تہران میں اور دوسری تبریز میں۔ غربت میں تین ہزار روپیہ ایک بڑی رقم ہے۔ جہالت کے دور میں دو دانش گاہوں کا قیام بھی ایک بڑا قدم ہے۔

شالیمار باغ کے فوارے عرصہ سے بند تھے۔ اس دورہ کی وجہ سے ان کی مرمت ہو گئی۔ یہ کام انجینئر نذیر احمد جیا باجی کی نگرانی میں ہوا۔ وہ ایک دن مجھ سے کہنے لگے، حیرت کی بات ہے کہ زیر زمیں فواروں تک پانی پہنچانے والے پائپ سب مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ کمہار نے چاک پر بنائے اور آوا میں پکائے۔ تین سو سال کے بعد بدلنے کی نوبت آئی۔ میری تحقیق ہے کہ مٹی گوندھتے ہوئے اس میں کچھ روئی بھی ملائی گئی تھی۔ یہ ہمارے لوہے کے پائپ ان کا کیا مقابلہ کریں گے۔ زنگ لگے گا، پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی، **السر** ہو گا، پانی آر پار نکل جائے گا۔

شالیمار میں شہنشاہ حوض کے درمیان چبوترہ پر بیٹھے۔ ان کے ہمراہ لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خاں اور علی اصغر حکمت تھے۔ چبوترہ سے حوض، آبشار، فواروں، پھولوں، درختوں، سبزے اور عصرانہ میں شامل ہونے والے خوش پوش مہمانوں کا نظارہ قابل دید تھا۔ شالیمار میں عصرانہ اب بھی دیا جاتا ہے مگر مہمان خصوصی کو تختہ اول کی بھدی سی بارہ دری کلاں میں بٹھایا جاتا ہے۔ حوض کے وسط میں چبوترہ پر نشست حفاظت اور سلامتی کے پیش نظر ترک کر دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اصل وجہ کچھ اور ہے۔ چبوترہ پر دس بارہ افراد سے زیادہ کے لئے جگہ نہیں ہے۔ جس اہم شخصیت کو وہاں جگہ نہ ملے اس کی ناراضگی بلکہ دشمنی مول لینی پڑتی ہے۔ حکمرانوں نے آسان حل یہ نکالا کہ مہمان خصوصی کو ایسی جگہ لا بٹھایا جہاں اس کے اردگرد سوسوا سو وی آئی پی افراد

بیٹھ سکیں۔ نظارہ کا خوں ہو گیا مگر حکمرانوں کی جان بچ گئی۔ رنجیت سنگھ نے بارہ دری کلاں کی جالیاں اور سنگ مرمر اتار کر دربار صاحب بھیج دیا تھا۔ پتھر کی قسمت کہ سیر گاہ سے اتارا اور عبادت گاہ میں لگایا گیا۔ بارہ دری کی بدقسمتی کہ اس کی بحالی کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔

شالیمار میں اس روز لوگ نوجوان شہنشاہ کی ازدواجی زندگی کی بحالی کی باتیں کرتے رہے۔ رضا شاہ کی پہلی شادی مصر کے شاہ فاروق کی بہن فوزیہ سے ہوئی تھی۔ جب شہزادی نے یہ دیکھا کہ تہران میں دریائے نیل ہے نہ ایران میں بحیرۂ روم کا ساحل۔ لوگ عربی کے بجائے فارسی بولتے ہیں اور سسرال والوں کو بادشاہت کا زیادہ تجربہ بھی نہیں تو شادی ناکام ہو گئی۔ ادھر یہ شکایت تھی کہ جب دوسری جنگ عظیم کے بعد رضا خاں کی میت مصر سے تہران لائی گئی تو اس کے تابوت میں وہ زر نگار تلوار موجود نہ تھی جو ملکہ تاج الملوک نے خود اس میں رکھی تھی۔ شاہ فاروق نے دیکھی، پسند آئی، رکھ لی۔ پہلے سسرال والوں کو طعنہ سننا پڑتا تھا کہ نو دولیتے ہیں۔ اب ان کو طعنہ زنی کا موقع ملا کہ جیسے بھی ہیں خاندان محمد علی کی طرح چور نہیں ہیں۔

زبان فارسی کے استعمال کا کوئی موقع اہل پاکستان نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ پہلے دن سے سفر کے آخری دن تک شہنشاہ کو ہر روز ہماری فارسی برداشت کرنی پڑی۔ صدیوں پرانی کتابی نثر کا گفتگو میں استعمال۔ لہجہ اتنا دیسی کہ صحیح جملہ بھی اہل ایران کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے باوجود فارسی بولنے کا اتنا شوق کہ ہر وہ شخص جو صرف ایک جملہ بول سکتا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر خاموش رہا تو پاک ایران دوستی میں گرمجوشی کی کمی رہ جائے گی۔ کراچی ہوائی اڈا پر انگریزی میں استقبالی کلمات کہتے ہوئے خواجہ ناظم الدین نے فارسی کا ٹکڑا لگایا۔ اے آمدنت باعث آبادی ما۔ گانے کی محفل برپا ہوئی تو اقبال کی فارسی غزل چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما سنائی گئی۔ لاہور میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے قصیدہ کے لئے وہی رودکی والی زمین منتخب کی۔ بوئے جوئے مولیاں آید ہمی۔ رودکی کی پیروی کا ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔ حیدر آباد دکن سے کوئی یار جنگ علی گڑھ آئے۔ فارسی کے استاد جناب حاذق صاحب جیسے موقع دیکھ رہے تھے۔ فوراً ایک قصیدہ کہہ دیا۔ گویا دولت آصفیہ اور خاندان سامانیہ میں کوئی فرق نہ ہو۔ غیر معروف یار جنگ اور امیر نصر بن محمد سامانی ایک

ہوں۔ حیدر آباد دکن اور بخارا جڑواں شہر ہوں۔ اور حاذق صاحب فارسی پڑھانے، اردو فارسی شعر کہنے اور طلباء کی طعام گاہ اور تنور خانہ کی نگرانی کے باوجود اپنی جامعہ کے رودکی بھی ہوں۔ ان دنوں تعلیمی اداروں میں ہر ایک کا اپنا رودکی اور اپنا قاآنی ہوا کرتا تھا جو اس روز بڑے کام کا آدمی ثابت ہوتا جس دن مدرسہ کے معائنہ کے لئے انسپکٹر مدارس کا دورہ ہوتا یا دانش گاہ میں کسی چندہ دینے والے رئیس اور نواب کی آمد آمد ہوتی۔ ک ۲ ۱

شیخ محمد اکرام برطانوی عہد کے آئی سی ایس افسر تھے مگر مزاج کے اعتبار سے وہ ایک استاد. مورخ اور محقق تھے۔ مسلمانانِ ہند کی دینی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آبِ کوثر، موجِ کوثر، رودِ کوثر، اسی تاریخی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ بظاہر وہ شعر کی دنیا کے آدمی نہ تھے مگر شہرت انہیں غالب نامہ سے ملی۔ شہنشاہِ ایران آئے تو شیخ صاحب نے بڑی محنت اور بڑے سلیقہ سے برِ عظیم کے فارسی شعرا کا انتخاب ارمغانِ پاک کے نام سے مرتب کیا۔ لیتھو گرانی کا زمانہ تھا۔ پیلے کاغذ پر حنائی روشنائی سے کتابت۔ پتھر پر منتقلی۔ ست رفتار چھاپہ مشین۔ ہاتھ سے کاغذ رکھنے اور اٹھانے کا سلسلہ۔ اکرام صاحب نے کتاب بڑے اہتمام سے چھپوائی۔ کاڑھے ہوئے دودھ کے رنگ کا کاغذ، سبز رنگ کی روشنائی، سرورق پر نقشِ چغتائی، ضخامت 264 صفحات، مجلد، قیمت مبلغ چار روپیہ۔ اسے دین محمدی پریس نے چھاپا تھا۔ آج بھی بل روڈ پر واقع ایک پرانی عمارت کے بند دروازے کے اوپر اس چھاپہ خانہ کے نام کا جہازی بورڈ لگا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ پریس بند ہو چکا ہے یا اس کا دروازہ سال کے ان دو دنوں اتفاقاً بند ہوتا ہے جب میں ایک بار گرمیوں میں اور دوسری بار سردیوں میں وہاں سے گزرتا ہوں۔ بادام خرید کر لاؤں تو کھدر کی خریداری تک اس سڑک سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ تاہم میں ہر چھ ماہ کے بعد دین محمدی پریس کی اس پیشہ ورانہ کوشش کو سراہتا ہوں جو انہوں نے شہنشاہ ایران کو تحفہ میں دی جانے والی کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں کی تھی۔

ارمغان پاک کی پہلی دو غزلوں کا عنوان نگارِ لاہور اور یادِ لاہور ہے مگر لاہور کا املا لہاوور اور لاوہور ہے۔ وہ شہر بھی کتنی خوبیوں کا مرکب ہو گا جس کے نام کو اتنا غیر شاعرانہ ہونے کے باوجود مسعود سعد سلمان نے شعر میں باندھ دیا۔ ارمغانِ پاک کا آخری شاعر اقبال ہے۔ اس کے فارسی کلام کا انتخاب زبورِ عجم کے ان اشعار سے شروع ہوتا ہے

جن میں شاعر ایرانی نوجوانوں کو براہ راست مخاطب کرتا ہے۔ اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما۔ اس غزل کے ایک شعر میں وہ انہیں مژدہ سناتا ہے کہ میں تمہارے قید خانہ کے روشندان سے اس مرد حق کی آمد کو دیکھ رہا ہوں جو تمہاری غلامی کی زنجیروں کو توڑ دے گا۔ معلوم نہیں کہ نوجوان عجمی شہنشاہ نے اس شعر کو پڑھا، سوچا اور سمجھا یا دوسرے تحائف کی طرح ارمغان پاک کو دور سے دیکھا اور شاہی توشہ خانہ میں بھیج دیا۔ دوسرے تحائف میں سونے کا وہ سگریٹ لائٹر شامل تھا جو قائداعظم استعمال کرتے تھے۔ شہنشاہ جب مس فاطمہ جناح سے ملنے گئے تو انہوں نے یہ قیمتی اور تاریخی تحفہ انہیں دیا تھا۔

لاہور کے قیام کے دوران شہنشاہ ایران کو کم از کم دس لاکھ افراد نے دیکھا۔ بیشتر نے انہیں سڑک پر گزرتے ہوئے یا فوجی پریڈ کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھا۔ ان لاکھوں لوگوں میں میرے ایک بی۔ اے پاس عمر رسیدہ کزن بھی تھے جو گجرات سے چھٹی لے کر آئے تھے۔ وہ اپنے فیصلہ اور کامیاب تجربہ پر بہت خوش تھے مگر ان کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں کوئی ایسی خبر چھپی تھی جو ان کی خوشی میں کھنڈت ڈال رہی تھی۔ میں نے پوچھا، ایسی کونسی خبر ہے۔ انہوں نے اخبار مجھے دے دیا کہ خود دیکھ لیجئے۔ میں نے خبروں پر نظر ڈالی۔ میر لائق علی سابق وزیراعظم ریاست حیدر آباد دکن جو نظربند تھے بھارت سے فرار ہو گئے ہیں۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ دوسری خبر۔ شہنشاہ نے پاکستان کا دورہ شروع کرنے سے پہلے نئی کابینہ تشکیل دی۔ جو شخص امریکہ میں ایران کا سفیر تھا اسے بلا کر وزیراعظم بنا دیا۔ اس میں بھی ناراض ہونے کی کونسی بات ہے کہ سفیر حسین اعلیٰ وزیراعلیٰ ہو گئے۔ ایک اور خبر۔ پاکستان کے وزیراعظم نے امریکہ کے دورہ کی دعوت قبول کر لی ہے۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ کیا ان دو خبروں اور شہنشاہ کے دورے میں کوئی باہمی تعلق ہے۔ اگر ہے تو وہ اس وقت مجھے نظر نہیں آرہا۔ میں فکر مند ہوں کہ وہ روس کے دورہ کی دعوت کا کیا بنا۔

ان خبروں کے علاوہ ایک اور خبر۔ ایران نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ ہوئی ناراض ہونے والی اصل بات۔ میں نے کزن سے کہا، غاصب کو مالک اور مالک کو غلام تسلیم کر لینا افسوسناک ہے۔ کہنے لگے، میں فلسطین کا حشر دیکھ کر پاکستان کے بارے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ جو قومیں اپنی ترجیحات متعین نہیں کرتیں اور اپنی روایات کی حفاظت کرنے

کے بجائے کھیل کود اور ہنسی مذاق کو آزادی کا حاصل سمجھ لیتی ہیں ان سے سرزمین کا حق ملکیت، ان کی حکومت سے حق حکمرانی اور بالاخر لوگوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ ہمارا ہلکا پن اور ہماری بے نتیجہ مصروفیات کا اندازہ اس خبر سے لگائیے۔ انہوں نے خبر پر انگلی رکھ دی۔ یہ کھیلوں کی خبروں والا حصہ ہے۔ خواتین کی دو ٹیموں کے درمیان جم خانہ گراؤنڈ میں گیارہ مارچ کو پانچ بجے سہ پہر ہاکی کا میچ ہو رہا ہے۔ مسز کارنیلیس کی ٹیم اور مسز فدا حسن کی ٹیم۔ کھلاڑی خواتین کے نام۔ مسز بی شیخ، مسز تقی بٹ، مس این غیاث الدین، مس آئی غیاث الدین، مس آر بو گا، مس پی بو گا، مس روشن عزیز، مس ہالووے، مسز ٹرنر، مس پروین شیخ وغیرہ وغیرہ۔ میری نظر ان ناموں سے ہٹ کر فلم کے اشتہاروں پر پڑی۔ رتن سینما میں فلم لارے، رٹز میں برسات اور ہیلیس میں غلط فہمی چل رہی ہے۔ میں نے اپنے کزن کی ناراضگی کو پرانی نسل کی نئی نسل کے بارے میں غلط فہمی قرار دیا اور اخبار انہیں واپس کر دیا۔ وہ میو ہسپتال کے پاس رتن چند کی سرائے میں واقع گجرات بس سروس کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔

(3)

محمد رضا شاہ کے پہلے اور دوسرے دورے میں چند سال کا وقفہ ہے۔ پھر یہ وقفہ بہت کم ہو گیا اور جلالت مآب بڑی باقاعدگی کے ساتھ آنے جانے لگے۔ ہر بار ان کا قیام طویل ہوتا گیا اور تکلّفات کم ہوتے چلے گئے۔ ان کے خاندان کے وہ افراد جو پہلے ان کے ہمراہ آنے کی وجہ سے نظر انداز ہو جاتے تھے انہوں نے بھی علیٰحدہ علیٰحدہ آنا شروع کر دیا۔ سگے سوتیلے بھائی، اوپر تلے کی بہنیں اور سب سے بڑھ کر ان کی جڑواں بہن محترمہ شہزادی اشرف صاحبہ۔ ایک بھائی کو بنگال ٹائیگر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑی دھوم دھام سے اس کام کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک بار سلہٹ میں گراں گوش آئی. سی. ایس رحمت اللہ شہاب کی ڈپٹی کمشنری کے زمانہ میں ایک ایسا شیر مارا گیا جو بیچارہ پیٹ کی خاطر سرکس میں نوکری کرتا تھا۔ اس کے بعد شکار کے لئے آنے والا شہزادہ کبھی نظر نہیں آیا۔ شہزادی

اشرف بھی آیا کرتی تھیں۔ ان کی آمدروفت بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ ہوتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بھی شکار کے لئے آیا کرتی تھیں۔ لوگوں کی زبان بھلا کس نے روکی ہے اور وہ بھی ایسی دخترِ پسروار کے بارے میں جس کی مردانگی سے متاثر ہو کر باپ نے تخت پہلوی کی حفاظت کے خیال سے یہ کہا تھا، اے کاش ان جڑواں بہن بھائی میں محمد رضا لڑکی ہوتا اور اشرف لڑکا ہوتی۔ اگر قدرت نے کہیں رضا خاں کی یہ خواہش پوری کر دی ہوتی تو اعلیٰ حضرت ہز میجسٹی اشرف رضا پہلوی ہوا و ہوس کا وہ طوفان اٹھاتے کہ ایران کو آفت زدہ علاقہ قرار دینا پڑتا۔

شہنشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کی آمد ایک عرصہ تک فارسی غزل گانے والیوں، فارسی قصیدہ کہنے والوں اور فارسی کے اساتذہ کے لئے اپنی اہمیت جتانے کا ایک اہم موقع ہوا کرتا۔ لیکن ہر دورے کے بعد کچھ ایسے لطیفے مشہور ہو جاتے کہ ایک ایک کر کے ان تینوں قسم کے ہنروروں کی چھٹی ہو گئی۔ کہتے ہیں ایک بار فارسی غزل گانے والی ان پڑھ گائیکہ نے جس کا اردو کا تلفظ بھی انتہائی ناقص تھا فارسی کی وہ ریڑھ ماری کہ شہنشاہ نے پوچھا یہ گانا کس زبان میں تھا، اگر اردو میں ہوتا تو میں پہچان لیتا کیونکہ وہ فارسی سے بہت قریب ہے۔ اسی طرح رودکی کی بحر میں بار بار قصیدہ سن کر ایرانی تشریفات کے افسر نے ایک بے تکلف پاکستانی دوست سے کہا، آپ ہمارا اور رودکی کا قصور کب معاف کریں گے۔ فارسی اساتذہ کا حال بھی کوئی زیادہ مختلف نہ تھا۔ ایک نامور استاد کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ ایرانی جب ان سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بفرمائید کہتے وہ بیٹھنے کے بجائے وہاں کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دیتے۔ یہاں تک کہ ان کا گلا بیٹھ گیا اور ایرانی زچ ہو گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بفرمائید کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک طرح کا محاورہ اور تکیہ کلام ہے۔ کرسی پیش کریں گے تو بسم اللہ بفرمائید۔ حقہ پیش کریں گے تو میل بفرمائید۔ جب ایرانیوں کو پتہ چلا کہ پاکستان میں فرمودن کے صرف ایک ہی معنی ہوتے ہیں تو انہیں بڑی تشویش ہوئی۔ انہوں نے وظیفے دینے شروع کئے تاکہ وہ فارسی داں پاکستانی جو اپنے مفروضوں کی دنیا میں مگن رہتے ہیں ایران جا کر یہ دیکھیں کہ فارسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ، محاورات، روزمرہ، تلفظ اور لہجہ میں کتنا فرق آ چکا ہے۔ یہ کیا ہوا کہ وہ فارسی جو ہمایوں کے حواری سولھویں صدی میں سیکھ کر آئے تھے بس اسی پر قناعت کر لی۔

وظیفوں، دوروں اور ایرانی خطابات کی تقسیم کے سنہری دور میں ایک علاقائی زبان کی اکادمی کی کتابوں میں شروع کا ایک صفحہ شہنشاہ کی تعریف کے لئے وقف ہونے لگا اور کراچی میں واقع اقبال اکادمی نے ایک سال اقبال کے خطوط کی اشاعت کو اس لئے موخر کر دیا تاکہ ایران کے شہنشاہ سے متعلق جو کچھ چھپ رہا ہے وہ پہلے شائع ہو جائے۔ شہنشاہ تو خیر بڑے میاں تھے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ان دنوں سفیر ایران سے جو کوئی گرم جوشی سے مصافحہ کر لے وہ اسے ایران کی سرکاری سیر کی دعوت دے دیتے۔ ایک دن پتہ چلا کہ ہمارے سول سروس کے ساتھی دربار علی شاہ کمشنر کراچی اپنی فارسی دانی کے بل بوتا پر ثقافتی خیر سگالی دورہ کے لئے ایران جا پہنچے ہیں۔ مرکزی مالیات کے ایک افسر شاکی ہوئے کہ اس طرح ان کی حق تلفی ہوئی ہے کیونکہ وہ فارسی بیت بازی میں دربار علی شاہ ہی نہیں بلکہ ہر سینئر سرکاری ملازم کو شکست دے سکتے ہیں۔ فارسی شعر گوئی کا مقابلہ ہو تو وہ بھی جیت سکتے ہیں۔ ایک رات لاہور کے گورنر ہاؤس میں پہلی منزل پر واقع استقبالی کمرے میں یہ افسر قطار میں میرے ساتھ کھڑے تھے۔ جونہی شہنشاہ ایران نے ان کی طرف رسمی مصافحہ کے لئے بے دلی سے ہاتھ بڑھایا انہوں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں کس کر دبا لیا اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک شہنشاہ کی شان میں کہے ہوئے فارسی قصیدۂ نو تصنیف کا ایک بند انہیں فرفر سنا نہیں دیا۔

شہنشاہ کی دلچسپی رفتہ رفتہ پاکستانی فارسی سے پاکستانی معاشی منصوبہ بندی کی طرف منتقل ہو گئی۔ کلچرل شو اور دھوم دھامی کی جگہ ان کے پروگرام میں سندھ طاس منصوبہ کے مطالعاتی دورے شامل ہونے لگے۔ چغتائی کی تصویروں کی جگہ تعمیر کے تحقیقی ادارے کی نمائش میں وقت صرف ہونے لگا۔ شہنشاہ کی ترجیحات میں تبدیلی آ گئی۔ ایک دن شہنشاہ مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی کے لان میں محکمہ پی ڈبلیو ڈی کی نمائش دیکھ رہے تھے۔ انجینئر اشفاق نے جو ان دنوں بے ریش ہوا کرتے تھے انہیں نقشہ سازی کا ایک ایسا تختہ دکھایا جو زمین کے محور کے مطابق گھومتا اور مدار کے رخ پر مڑ جاتا۔ اشفاق کہنے لگے ہم مکان کا نقشہ بنا کر اس تختہ کو ٹیبل لمپ کے سامنے رکھ کر گھماتے ہیں اور ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کس مہینے اور موسم میں دھوپ گھر کے کونسے حصے پر پڑے گی اور اس کے مطابق حسب ضرورت تبدیلی کر لیتے ہیں۔ شہنشاہ نے فوراً ایک ہمراہی کو اشارہ کیا اور پوچھا کیا ایسا کم

خرچ بالانشیں آلہ ایران میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ شخص پہلے تو آنکھیں جھکائے مودب اور خاموش کھڑا رہا جیسے اس کے منہ میں زبان نہیں اور جونہی شہنشاہ نے آگے قدم بڑھایا اس شخص نے پاکستانی انجینئروں پر تیز تیز جرح شروع کر دی۔ کچھ ایسا ہی منظر میں نے کراچی میں دیکھا جہاں ایرانی بحریہ کے افسر بڑی سج دھج کے ساتھ قیمتی وردیاں پہنے ہوئے پاکستانی بحریہ کے افسروں کے سامنے اچھے بچوں کی طرح زانوئے ادب تہ کئے ان کی پیشہ ورانہ گفتگو سن رہے تھے۔ جب کھانا شروع ہوا تو ایک ایرانی افسر نے مجھ سے کہا کہ ہماری بحریہ چھوٹی سی اور غیر اہم سی شے ہے۔ ایک عرصہ سے بے توجہی کا شکار رہی ہے اور اب اس کی یہ حالت ہے کہ مچھلیوں کے شکار اور رسمی سلامی دینے کے علاوہ وہ کسی اور کام کے قابل نہیں رہی۔ شہنشاہ کو یکایک بحریہ کو وسعت دینے اور ماڈرن بنانے کا خیال آیا ہے لہٰذا ہم جائزہ لینے کے لئے گھر سے نکلے ہیں۔ کھانا ختم ہوا تو مجھے ایک پاکستانی افسر نے بتایا کہ ہم نے جتنے جہاز پچھلے دس سال میں خریدے ہیں ایران ان سے زیادہ جہاز ایک سال میں خریدنا چاہتا ہے۔ اس رفتار سے پانچ برس کے بعد ہم اپنے ہمسایوں سے پوچھنے جائیں گے کہ بحریہ میں جدید طرز کی جنگی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کیا کارروائی کی جاتی ہے۔

ایک بار شہنشاہ کے پروگرام میں سب سے اہم کام منگلا بند کی تعمیر کا معائنہ تھا۔ بند ان دنوں تکمیل کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکا تھا۔ منظر پر اثر تھا۔ شہنشاہ نے بھی اثر قبول کیا۔ دن بھر وہ ایک ٹیکنو کریٹ بنا رہا۔ تعارفی لکچر سنا، بند کا دورہ کیا، نقشوں کی مدد سے منصوبے کے مختلف مقامات اور مراحل کا علم حاصل کیا، مقامی اور بدیسی انجینئروں سے سوال و جواب کی بیٹھک ہوئی، کھانے پر بھی تکنیکی گفتگو ہوتی رہی۔ نقشہ کس نے بنایا، جگہ کس نے منتخب کی، سیمنٹ کا پختہ بند کیوں نہیں بنایا، جھیل کی تہ سے پانی کے رسنے کا علاج کیا ہے، بند میں ہر سال کتنے ہزار ٹن مٹی تہ میں بیٹھ جائے گی، بند کی کار آمد عمر کتنی ہو گی، پچاس برس کے بعد اس کا متبادل کیا ہو گا۔ ثقیل گفتگو اور مرغن کھانے کے بعد فیلڈ مارشل اور شہنشاہ قیلولہ کے لئے بڑے ریسٹ ہاؤس میں اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ غلام اسحاق خاں چیئرمین واپڈا کسی دوسرے ریسٹ ہاؤس کی طرف نکل گئے۔ واپڈا کے دو ممبر درخت کے نیچے کرسیاں بچھا کر سستانے لگے۔

نورالحسن کہنے لگے، صبح سے تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔

میزبان ادارے کے علاوہ ہر ادارے اور محکمے کے نمائندے تصویر کشی کے وقت شہنشاہ کو اس طرح گھیر لیتے ہیں جیسے وہ میزبان ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ واپڈا کی سہ رکنی انتظامیہ کے ہمراہ شہنشاہ اور فیلڈ مارشل کا ایک خصوصی گروپ فوٹو بنایا جائے۔ سند رہے کہ کون مہمان تھا اور کون میزبان۔ میں نے لان کا جائزہ لیا۔ اندازہ لگایا کہ گھنٹہ بھر کے بعد دھوپ کس زاویئے پر ہو گی۔ لان کے مشرقی سرے پر دو کرسیاں رکھوا دیں۔ پس منظر میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن سے میں نے درخواست کی کہ وہ تصویر کے کھچنے تک اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ دراصل پچھلے ڈیڑھ دو سال سے میں جب بھی منگلا آیا ہر بار میں نے کئی پہاڑیوں کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔ منگلا کے بدیسی ٹھیکہ دار کے نمائندہ نے ایک بار ہنستے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں کوئی ماہر انجینئر نہیں ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک ماہر خاکروب ہوں۔ پہاڑیوں پر جھاڑو دیتا ہوں۔ خاک کی ٹوکری بھرتا ہوں اور دریائے جہلم میں ڈال آتا ہوں۔ جس طرح قطرہ قطرہ دریا بن جاتا ہے اسی طرح ٹوکری ٹوکری خاک دریا میں ڈالتے جائیں تو بند بن جاتا ہے۔ اس خاکروب نے کل ایک سو نو ملین مکعب میٹر مٹی سلسلہ کوہ سے ڈھو کر دریائے جہلم میں ڈال دی جس کے نتیجہ میں ایک طرف دریا پر بند مکمل ہو گیا اور دوسری طرف بہت سی پہاڑیاں جو سروے آف پاکستان کے نقشے پر اب بھی موجود ہیں اپنی اپنی جگہ سے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئیں۔

سہ پہر کو وقت مقررہ پر شہنشاہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں ان کے ساتھ بر آمدے میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد فیلڈ مارشل معذرت کرتے ہوئے آن ملے۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کے باوجود آنکھوں میں سرخی کی لکیر اور نیند کا بوجھل پن موجود تھا۔ پوچھنے لگے اب کیا پروگرام ہے۔ کہیں اس کے لئے دیر تو نہیں ہو گئی۔ میں نے کہا جی نہیں۔ اگلا پروگرام ایک گروپ فوٹو ہے۔ دونوں کرسیوں پر شہنشاہ اور فیلڈ مارشل بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے غلام اسحاق خاں کو بیچ میں لے کر میں اور نور الحسن کھڑے ہو گئے۔ کھلی فضا میں کھچی ہوئی یہ غیر رسمی تصویر بہت اچھی آئی اور اس کا ایک انلارجمنٹ آج بھی پی ای سی ایچ، بلاک 6 ، کی ایک کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں لگا ہوا ہے۔ کرسیوں پر اپنے وقت کے دو سربراہان مملکت بیٹھے ہوئے ہیں پچھلی قطار میں کھڑے ہوئے چیئرمین واپڈا بھی درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ایک دن سربراہ مملکت بن گئے۔ ان تینوں سربراہان میں ایک قدر

مشترک ہے۔ شدید سیاسی مخالفت اور عہدوں سے دستبرداری۔ تصویر میں جو خوبصورت پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں وہ بھی ان سربراہان ریاست کی طرح دریا برد ہو چکی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

شہنشاہ اور اس کے ہمراہیوں نے منگلا میں فرداً فرداً کئی آدمیوں سے یہ پوچھا کہ اس بند کی تعمیر میں پاکستانیوں کا حصہ کتنا ہے۔ ایک روایت کے مطابق سارا کام پاکستانیوں نے کیا تھا اور دوسری روایت کے مطابق سوائے صادقین کی دیواری نقاشی کے باقی تمام کام بدیسیوں نے انجام دیا تھا۔ شہنشاہ نے یہ سوال مجھ سے بھی کیا۔ میں نے جواب دیا کہ پہلے ایک حقیقت کا اعتراف کر لیں تو یہ مشکل سوال آسان ہو جائے گا۔ ترقی یافتہ دنیا کی سیاسی، معاشی، تجارتی اور مالیاتی گرفت اتنی مضبوط ہے اور وہ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ کسی ترقی پذیر ملک کے لئے نہ یہ ممکن ہے اور نہ ہی یہ اس کے حق میں ہے کہ وہ اپنے کثیر المقاصد بڑے بڑے منصوبوں کو تنہا مکمل کرے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ عقلمندی، مہارت، محنت اور حب الوطنی سے کام لیتے ہوئے مغرب کی اجارہ داری کو درجہ بدرجہ ختم کیا جائے۔ یہ کام بڑی مستقل مزاجی کا ہے۔ ایک دو نسلوں تک اس میں ڈھیل نہیں ڈالنی چاہئے۔ جو ملک بھی اس سمت میں چلے گا اسے مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ مغرب اپنے معاشی مفاد کا تحفظ بڑی بیباکی اور سفّاکی کے ساتھ کرتا ہے۔ حکومتیں بدلنا تو آسان سی بات ہے۔ یہ لوگ ملکوں کی سرحدیں بدلنے سے باز نہیں آئیں گے۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔

ستمبر 1965ء کی جنگ کے دوران شہنشاہ نے پندرہ سولہ سالہ مہمانی کا حق ادا کر دیا۔ ایران پر ہمارے اور کئی حق بھی ہیں لیکن اس وقت ان حقوق کا ذکر بات کا رخ بدل دے گا۔ جب بھارت سے جنگ شروع ہوئی تو شہنشاہ اس وقت دن بھر کے آرام کے لئے تہران سے باہر کہیں ایسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے جہاں ان کی ہدایات کے مطابق ان سے چند گھنٹہ کے لئے رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وزیراعظم کو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ان ہنگامی حالات میں ان کی ایک رشتہ دار خاتون نے حامی بھری کہ میں شہنشاہ کے پاس جاتی ہوں اور ان سے بات کرتی ہوں۔ یہ خاتون اپنے چال چلن کے اعتبار سے خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو مگر اس روز اس نے سب سے بڑی اسلامی مملکت اور اس کے کروڑوں

باشندوں کے دفاع کے لئے جو کردار ادا کیا وہ ضرور اس کی بخشش کے کام آئے گا۔

جنگ کے بعد شہنشاہ نے اپنے اعلیٰ فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایرانی فوج میں دو خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جن کا مظاہرہ پاک فوج نے بھارت کے ساتھ جنگ میں کیا ہے۔ ایک تو اپنے سے کئی گنا بڑی فوج سے مقابلہ کا حوصلہ اور دوسرے بریگیڈیئر جنرل کے عہدہ پر فائز فوجی افسروں کا محاذ جنگ پر جانا اور جان دے دینا۔ جنگ کے بعد جب شہنشاہ ایران نے پاکستان کا دورہ کیا تو ان کے استقبال میں جو خلوص اور والہانہ جذبہ دیکھنے میں آیا اس نے شہنشاہ کے 1950ء کے دورہ کی یاد تازہ کر دی۔ جب وہ لاہور پہنچے تو سڑک کے کنارے میرے ایک کزن بھی اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ وہ گجرات سے آئے تھے۔ اس مرتبہ انہیں اس کام کے لئے چھٹی نہیں لینی پڑی۔ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔

سالہا سال سے شہنشاہ ایران کے استقبال کے موقع پر کپڑے کے پرچم پر چند بندھے ٹکے فارسی کلمات اور مصرعے لکھ کر انہیں سڑک کے آر پار شاخوں یا کھمبوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ جنگ ستمبر کے بعد خوش آمدید، اے آمدنت باعثِ آبادئ ما اور ز تو قدمے زما چشمے والے پرچموں میں ایک نئے پرچم کا اضافہ ہو گیا جس پر لکھا تھا، دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست۔ در پریشاں حالی و درماندگی۔ گورنر ہاؤس کی ضیافت میں یہی شعر گورنر نے جذبہ احسانمندی سے مغلوب ہو کر پڑھ دیا۔ اس وقت لکھی ہوئی تقریر ان کے ہاتھ میں تھی اور نصف قطر کے شیشوں والی عینک ناک کے سرے پر رکھی ہوئی تھی۔ پلکیں تاحد امکان کھلی ہوئی تھیں اور پھٹی پھٹی آنکھیں اتنی اداس تھیں جتنا جنگ کے بعد وہ میدان جہاں لاشوں اور تباہ شدہ سامان جنگ کے ساتھ ادھورے خواب اور پوری نہ ہونے والی حسرتیں چاروں طرف بکھری ہوں۔ مغربی پاکستان کے یہ گورنر جنگ کے دوران بری فوج کے کمانڈار تھے۔ ایک بار میں ہوائی جہاز میں ان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ پاک بھارت سرحد پر اڑان کے دوران انہوں نے دریچہ سے نیچے جھانکتے ہوئے شہر قصور کے قریب لمبی آہ بھری اور کہنے لگے اگر اس جگہ فلاں حادثہ پیش نہ آتا تو جنگ کا نتیجہ بالکل مختلف ہوتا۔ میں نے سنا اور چپ ہو رہا۔ تاریخ میں اگر مگر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ واقعات کے حسب خواہش رونما نہ ہونے کی وجوہات کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ سوانح عمریاں، البتہ

ان وضاحتوں اور بہانوں سے بھری پڑی ہیں۔

بیرے میز پر پیالیاں رکھ کر جا چکے تھے۔ تقریروں کے بعد وہ یکایک چائے، کافی اور یاسمینی قہوہ لئے ہوئے آبدار خانہ سے نمودار ہوں گے۔ گورنر مغربی پاکستان نے اپنی تقریر ختم کی۔ اے ڈی سی ان کے ہاتھ سے کاغذات لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ شہنشاہ نے اپنی تقریر شروع کی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ نہ تھا۔ اس نے کہا، آپ نے دوستی اور دست گیری کی بات کی ہے۔ دوست کہلانے کا مستحق صرف وہ ملک ہوتا ہے جو آزمائش کی گھڑی میں دوسرے ملک کا ساتھ دے۔ ایران اور پاکستان دوست ہیں۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ دوستی کا تقاضا تھا۔ کوئی احسان نہ تھا۔ ہمارا فرض تھا۔ اس فرض کی ادائیگی میں ہماری طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوگی۔ البتہ ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ ایران اور پاکستان میں سے کوئی بھی ملک کسی وقت پریشاں حالی سے دوچار ہو جائے۔ لیکن آزمائش کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو، مشکلات کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، یہ دونوں ملک، ایران اور پاکستان انشاء اللہ کبھی درماندہ نہیں ہوں گے۔ ضیافت کے بعد گھر جا کر میں نے اردو اور فارسی لغات کو دیکھا۔ فارسی میں درماندہ کی بیچارگی اور عاجزی، ناتوانی اور تنگ دستی اردو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اردو میں ہر مصیبت کا مارا درماندہ ہے مگر فارسی میں مصیبت اتنی شدید ہونی چاہئے کہ مصیبت زدہ کا دیوالا نکل جائے۔ اس تقریر کے بعد اور اتنے واضح اشارہ کے باوجود شہنشاہ نے جس تقریب میں بھی شرکت کی اور پاکستان کے جس شہر میں بھی جا نکلے وہاں استقبال کرنے والوں نے دست گیری اور درماندگی والے شعر کو نگینہ سمجھ کر سپاس نامہ میں جڑا ہوتا۔

خیر سگالی کی جو فضا 1965ء کی جنگ کے بعد پیدا ہوئی تھی وہ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ قصور اتنا شہنشاہ کا نہیں جتنا ہمارا اپنا ہے۔ فیلڈ مارشل بیمار ہو گئے۔ طرزِ حکومت صدارتی تھا مگر نائب صدر کے بغیر۔ بلاشرکتِ غیرے حکومت کرنے کی خواہش وقت پڑنے پر ہمیں لے ڈوبی۔ حکومت غیر موثر اور ملک ناتندرست ہو گیا۔ بیمار اور ناتوان صدر نے اپنا بنایا ہوا آئین خود ہی توڑ دیا۔ مشرقی پاکستان کے سپیکر کو قائم مقام صدر بنانے کے بجائے چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ایک صدر نے آئین توڑا دوسرے نے ملک توڑ دیا۔ جب اہل مشرقی پاکستان یہ طعنہ سنتے سنتے زچ ہو گئے کہ ان

میں جنگ. جویانہ صلاحیتوں کا فقدان ہے تو انہوں نے جنگ. جویانہ صلاحیتوں والے نوے ہزار فوجیوں کو جنگی قیدی بنا کر بھارت بھیج دیا۔ اس عظیم حادثہ کے باوجود جنرل یحییٰ خاں بچے کھچے پاکستان کے صدر رہنے پر مصر تھے۔ ایک ریٹائرڈ جنرل کا کہنا ہے کہ جب یحییٰ خاں نے اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چند مشیروں سے مشورہ طلب کیا تو اس کی پرزور تائید کرنے والے دو سول افسروں کا تعلق محکمہ دفاع اور محکمہ اطلاعات سے تھا۔ ایک نے کہا عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ہم ٹی وی پر ایسے دلچسپ پروگرام دکھائیں گے کہ لوگ مشرقی پاکستان کو بھول جائیں گے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ اس فہم و فراست اور اپنی حالت پر رونا آتا ہے۔ خود فریبی اتنی کہ ہم نے مغربی پاکستان ہی کو پورا پاکستان سمجھ لیا ہے اور خود فراموشی ایسی کہ ہم نے مشرقی پاکستان کو یاد کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

شہنشاہ نے بھی پاکستان کو یاد کرنا چھوڑ دیا۔ وقت کے ساتھ اس کا مزاج بدلتا جا رہا تھا۔ اسے تخت نشین ہوئے پچّیس برس ہو چکے تھے۔ اس مدت میں اس نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اب تو اس کی تصویر ہفت روزہ ٹائم کے سرورق پر ایک باصلاحیت اور بااختیار بادشاہ کے طور پر چھپتی ہے۔ اس نے ڈاکٹر مصدق کا زمانہ بھی دیکھا ہوا ہے جب وہ بالکل بے اختیار اور بے بس تھا۔ اسے ملک سے فرار ہونے اور ایک بیرونی خفیہ ادارہ کی مدد سے دوبارہ سریر آرا ہونے کا تجربہ بھی تھا۔ اس پر سامنے کھڑے ہو کر گولی چلائی گئی اور وہ اس کے باوجود زندہ رہا۔ سیاہ کل کی بغاوت ناکام ہوئی۔ تودہ کی سیاست بھی ناکام رہی۔ روس نے ایرانی آذر بائیجان خالی کر دیا۔ امریکہ سارے ملک پر چھا گیا۔ تیل کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ بس قیمت میں اضافہ کا انتظار تھا۔ سات سالہ ترقیاتی منصوبے بن رہے تھے۔ شاہی خاندان کے ہر فرد کے نام پر کسی نہ کسی دریا پر بند باندھا جا رہا تھا۔ امیر کبیر، محمد رضا شاہ، شاہ بانو، فرح ناز اور شاہ ناز کے نام سے ڈیم مکمل ہو چکے تھے۔ رضا شاہ ڈیم دنیا کا چھٹا سب سے بلند ڈیم تھا۔ سفید انقلاب اور سپاہِ دانش کا چرچا تھا۔ آر سی ڈی وجود میں آچکی تھی۔ راولپنڈی سے اسلام آباد جانے والی مری روڈ کا نام خیابانِ محمد رضا شاہ رکھا جا چکا تھا۔ ایرانی یونیورسٹیوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسکول لاتعداد تھے، تکنیکی سے لے کر موسیقی تک ہر شعبۂ علم و فن کے لئے۔ ایک بیمہ اسکول بھی تھا جس میں پاکستان اور

ترکی سے آر سی ڈی سکالرشپ حاصل کرنے والے طلبا زیر تعلیم تھے۔ خفیہ کارروائی کا ادارہ نیا مگر موثر تھا۔ جب قُم میں ایک مُلّا نے ایسی ویسی بات کہی تو اس ادارہ نے طلباء کی سرکوبی کی اور ملا کو جلاوطن کر دیا۔ شہنشاہ تیسری شادی کر چکا تھا اور ولی عہد کی تلاش کامیاب ہو چکی تھی۔ شہنشاہ کامیابی کے نشہ سے چور تھا۔ اسے شالیمار کا عصرانہ یاد رہا نہ فوٹریس سٹیڈیم کا ٹیٹو شو۔ وہ اب کام پر امریکہ اور چھٹی پر سوئٹزرلینڈ جانے لگا۔

(4)

احمد شیرازی نام کا ایک گورا چٹا اور بھولا بھالا لڑکا ہمارے اسکول میں داخل ہوا۔ اس کا قیام انگلش ہاؤس میں تھا۔ اس بورڈنگ ہاؤس میں امیرزادے رہا کرتے تھے۔ میری اس سے کوئی خاص ملاقات نہ تھی اس لئے میں اس کو بھول چکا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد وہ مجھے اچانک کراچی میں ملا۔ خوش وضع، خوش اخلاق، دلچسپ مگر قدرے خاموش۔ پہلی ملاقات ہی کچھ اس انداز سے ہوئی جیسے ہم دونوں پرانے دوست ہیں۔ دو سال تک اس کے ساتھ خوب ملاقات رہی۔ اس عرصہ میں اس نے کبھی بھولے سے بھی کوئی سرکاری یا کاروباری بات نہیں کی۔ اس کی یہ ادا مجھے پسند آئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن جس طرح یکایک ملاقات کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اسی طرح یکدم ختم ہو گیا۔ میں کراچی سے اسلام آباد چلا گیا اور وہ ملک چھوڑ کر کہیں اور جا بسا۔ کراچی کے قیام کے دوران مجھے ایک واقف حال نے بتایا کہ کم آمیز اور شرمیلا ہونے کے باوجود احمد کے صدر پاکستان جنرل یحیٰی خاں اور شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ سے تعلقات بڑے خوشگوار اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔

ایک دن احمد کے یہاں مختصر اور گھریلو سی دعوت تھی۔ میں ذرا پہلے پہنچ گیا اور دیر تک علیٰحدہ بیٹھے ہوئے احمد سے گپ شپ کرتا رہا۔ میں نے پوچھا یہ شہنشاہ ایران سے دوستی والی بات کہاں تک سچ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ہر سال کہیں ادھر ادھر چلے جاتے ہو اور واپس آکر اعلان کرتے ہو کہ شہنشاہ کی دعوت پر ایران گئے ہوئے تھے۔ اس مرد

خوش جمال کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ وہی جو ہر کامیاب شخص کے ہونٹوں پر اس وقت خود بخود آجاتی ہے جب وہ اپنی کامیابی کا راز بتانے لگتا ہے۔ کہنے لگے، یہ اگست 1953ء کی بات ہے میں یورپ میں تھا۔ اخبار میں پڑھا کہ ڈاکٹر مصدق سے اختلافات کی وجہ سے شہنشاہ ایران کو تخت اور ملک چھوڑنا پڑا ہے۔ وہ رامسر سے اپنا دو انجن والا جہاز اڑا کر پہلے بغداد پہنچے اور پھر وہاں سے روم چلے گئے۔ میں نے اس ملک بدر شہنشاہ کو ایک تار دیا۔ مضمون یہ تھا کہ اے گھر سے بے سروسامانی کی حالت میں جلاوطن ہونے والے بادشاہ، تم تنہا نہیں ہو۔ میرے جیسے کتنے ہی بے نوا تمہارے ساتھ ہیں۔ زرمبادلہ میں میری کل پونجی پندرہ ہزار پونڈ سٹرلنگ ہے اور میں یہ حقیر رقم آپ کی نذر کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ کوئی تین چار دن گزرے ہوں گے کہ شہنشاہ واپس تہران پہنچ گئے اور پہلوی تخت پر دوبارہ جا بیٹھے۔ ہفتہ بھر کے بعد میرے تار کا جواب آیا۔ شہنشاہ نے مجھے دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست والے دوست کی حیثیت سے تہران بلایا تھا تاکہ وہ ذاتی طور پر میرا شکریہ ادا کر سکیں۔ بس اس دن سے لے کر آج تک میں اس تار کا شکریہ وصول کر رہا ہوں۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ صدر پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی موٹر پورچ میں آن پہنچی۔ احمد لپک کر ان کے استقبال کے لئے گئے اور پھر انہیں ساتھ لے کر اسی چھوٹے سے کمرے میں آگئے جہاں ہم دونوں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے صدر پاکستان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ یحیٰی خاں نے دو چار رسمی الفاظ ادا کئے پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بھاری آواز میں بھدے مذاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، احمد۔ وہ الو کے پٹھے کہاں ہیں۔ احمد ہنس کر بولے، ابھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد احمد کے بچے اپنے انکل سے ملنے کے لئے آگئے۔

میں نے احمد اور شہنشاہ کی اتفاقیہ دوستی کا قصہ دو چار جگہ بیان کیا۔ ایک دوست نے اسے پلے باندھ لیا۔ چند سال گزرنے کے بعد ملے تو گلہ کرنے لگے۔ کہنے لگے آپ نے مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے۔ احمد شیرازی والا قصہ سننے کے بعد میں ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہا۔ جونہی اخبار سے پتہ چلتا کہ کسی ملک میں انقلاب آیا ہے اور اس کا بادشاہ، صدر، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر یا وزیر اعظم پناہ لینے کے لئے ملک سے بھاگ گیا ہے میں بیرونی خبر رساں

اداروں سے رابطہ قائم کرتا اور اس کا کھوج نکالنے کے بعد احمد کی طرح ایک درد بھرا تار اس کے نام بھیج دیتا۔ دنیا میں اتنی اتھل پتھل ہے کہ میں نے ایک بڑی رقم مفرور حکمرانوں کے پتے تلاش کرنے اور انہیں خیر سگالی کے تار بھیجنے میں صرف کر دی ہے۔ جوا کھیلا مگر مسلسل ہارتا چلا آیا ہوں۔ آج تک میری فہرست میں شامل کوئی معزول بادشاہ یا صدر اقتدار میں واپس ہی نہیں آیا۔ سوائے ایک شخص کے کسی اور نے کبھی تار کا جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ جس کا جواب آیا تھا اس نے ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ذاتی طور پر مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہے مگر عوام کی خدمت اور بھلائی کی خاطر جو کام میں کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے رقم درکار ہے لہٰذا میں آپ کی مالی پیشکش قبول کرتا ہوں۔ آپ یہ رقم سوئٹزرلینڈ کے فلاں بنک میں جمع کرا دیں۔ اس واحد جواب کے علاوہ اگر کسی نے میری یک طرفہ خط و کتابت کی طرف توجہ دی ہے تو وہ ملکی اور غیر ملکی سراغ رسانی کے محکمے ہیں۔ یہاں والوں نے اٹھنا بیٹھنا اور باہر والوں نے آنا جانا مشکل کر دیا ہے۔

احمد سے پھر کبھی کھل کر شہنشاہ کے بارے میں بات نہ ہوئی مگر اس کے انداز سے یہ بات عیاں تھی کہ اب وہ پرانی والی بات نہیں رہی۔ شہنشاہ بیمار ہے۔ اسے کئی روگ لگ گئے ہیں۔ مغالطہ، نشہ اور غرور۔ اسے اپنی سوجھ بوجھ کی برتری کا مغالطہ ہے، تیل کی نئی قیمتوں کا نشہ ہے اور سائرس کی جانشینی کا غرور ہے۔ ایک مدت سے خوشامدیوں میں گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ بے حد تنہا اور بے حد خود پسند ہو گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ فرانس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے، بلند قامت اور بارعب منوچہر اقبال نے وزیراعظم کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد جب مجلس میں تقریر کی تو صاف الفاظ میں اقرار کیا کہ میں شہنشاہ کا نوکر نہیں بلکہ چاکر ہوں۔ مجھے چونکہ نوکر اور چاکر کا فرق معلوم نہ تھا اس لئے میں نے فصیح الدین سے پوچھا جو یہ واقعہ سنا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا یہ الفاظ اگرچہ اب ہم معنی سمجھے جاتے ہیں مگر اصل فرق یہ ہے کہ نوکر مالک کی خدمت کرتا ہے اور چاکر مالک کے اصطبل اور فیل خانہ کے جانوروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ چاکری گویا مالک کے جانوروں کی نوکری ہوتی ہے۔ میں شہنشاہ کی مردم شناسی اور منوچہر اقبال کی شاہ پرستی کا قائل ہو گیا۔ شہنشاہ ان دنوں واقعی ایران کو ایک پہلوی اصطبل اور عوام کو اس میں بندھے ہوئے گدھے گھوڑوں کی طرح سمجھتے تھے۔ البتہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی کا درجہ ایک فیل خانہ کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ

کے بعد منوچہر اقبال کو وزیر اعظم کے بجائے این آئی او سی کا چیئرمین بنا دیا۔ یہ کمپنی حکومت کے بجائے براہ راست شہنشاہ کے ماتحت تھی اور ریاست در ریاست کی مانند تھی۔ جب تیل کی قیمت چڑھی تو یہ اندر والی ریاست باہر والی ریاست سے کہیں زیادہ بارسوخ اور بااثر بن گئی۔

اکتوبر 1973ء میں تیل کا عالمی بحران آیا۔ قیمتوں میں جو مدت سے ایک ہی سطح پر ٹھہری ہوئی تھیں یکایک پانچ گنا اضافہ ہو گیا۔ تیل در آمد کرنے والے ملک زرمبادلہ کی کمی کا شکار ہو گئے اور تیل بر آمد کرنے والے ممالک دیکھتے ہی دیکھتے بے حد و حساب دولت کے مالک بن گئے۔ تیل در آمد کرنے والے تمام ممالک میں سوچ بچار کے لئے کمیٹیاں اور بھاگ دوڑ کے لئے وفود تشکیل دیئے گئے۔ میں بھی ایک پاکستانی وفد میں شامل ہو کر این آئی۔او۔سی کے صدر دفتر پہنچ گیا۔ ہمیں تھوڑی سی دیر کے لئے خواہ مخواہ انتظار کرایا گیا حالانکہ ملاقات کا وقت پہلے سے طے تھا اور ہمارے وفد کے رئیس پاکستان کے وزیر پیڑولیم تھے۔ ہم چیئرمین کے کمرے میں پہنچے۔ انہوں نے اس بیزاری کے ساتھ ہمیں وصول کیا جیسے وہ اہل سوال سے ملاقاتیں کر کے عاجز آ چکے ہوں۔

منوچہر اقبال کا نیلا سوٹ گھنے سفید لہریا بالوں کی شان دوبالا کر رہا تھا مگر چوڑے چکلے سپاٹ چہرے کی خاموشی، آنکھیں چرانے کی کوشش اور ہاتھ ملانے کے میکانکی انداز نے ہمیں مایوس کیا۔ صوفہ پر بیٹھنے کے بعد خاموشی کا ایک دور شروع ہوا۔ صبر آزما اور تکلیف دہ۔ یہ دور چند ثانیہ کا ہونے کے باوجود ہمیں بڑا طویل اور ناگوار لگا۔ ہم اس خیال میں رہے کہ حسب دستور منوچہر اقبال کچھ رسمی استقبالیہ کلمات فارسی یا فرانسیسی میں کہیں گے پھر سرکاری مترجم ان کا انگریزی میں ترجمہ کرے گا تب جا کر ہمارے وزیر کو جواب دینے کے لئے لب کشائی کا موقع ملے گا۔ مگر میزبان نے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا۔ اسے اس کی پرواہ ہی نہ تھی کہ کون آیا ہے، کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں مگن اور خیالات میں گم تھا۔ ہماری وہ حکمت عملی جو وفد نے رات گئے کراچی کے ہوائی اڈہ پر مڈوے ہوٹل کے وی آئی پی روم میں وضع کی تھی اس میں ایسی غیر متوقع بے مروّتی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اگر بات چیت دفتر میں غیر رسمی انداز میں ہوئی تو ہمارے وزیر گفتگو میں مناسب وقت پر مطلب کی بات چھیڑ کر وفد کے ایک رکن کی طرف دیکھیں گے جو بات کو آگے

بڑھائے گا۔ اور اگر ملاقات کانفرنس روم میں مائیکروفون کے وسیلہ اور ٹیلیویژن کی روشنیوں میں ہوتی ہے تو ہمارے وفد کے قائد اپنی باری آنے پر ایک ٹائپ شدہ صفحہ کی وہ تقریر پڑھ دیں گے جو ایک رکن نے لکھ کر دی تھی اور جس کا دوبار ریہرسل بھی انہیں کرایا تھا۔

جب مہر خاموشی توڑنے پر منوچہر اقبال کو آمادہ نہ پایا تو میں نے آہستہ سے حیات محمد خاں شیر پاؤ سے کہا، آپ ہی گفتگو کا آغاز کریں۔ انہوں نے بات شروع کرنے کی بجائے لکھی ہوئی تقریر جیب سے نکالی اور صوفہ پر بیٹھے بیٹھے اور دو لمبے آدمیوں کے درمیان بھنچے ہوئے اپنے منہ ہی منہ میں پڑھ دی۔ اس کے بعد منوچہر نے دو جملے ادا کیے اور مترجم نے ایک سالم تقریر جھاڑ دی۔ جملہ غالباً یہ تھا کہ میری وہ تقریر جو میں آج کل تیل کے گاہکوں کے سامنے کرتا ہوں اسے دہرا دو۔ لب لباب یہ تھا کہ یک انار و صد بیمار۔ تیل خریدنے کے لئے اتنے وفود آرہے ہیں کہ ہم ان سب سے مل بھی نہیں سکتے۔ (گویا یہ آپ پر کیا کم احسان ہے کہ ہم نے آپ کو شرفِ باریابی بخشا ہے) ۔ ہمیں تیل کا کوٹا مقرر کرنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ (یعنی آپ برادری اور ہم سائیگی اور پسماندگی اور تیسری دنیا کی باتیں کر کے ہماری الجھن اور اپنی مشکلات میں کیوں اضافہ کر رہے ہیں) ۔ مسئلہ قیمت کا نہیں مقدار کا ہے۔ گاہک ہر قیمت پر لینے کو تیار ہے۔ (زر مبادلہ کا مسئلہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے) ۔ بہرحال آپ اپنی ضروریات کے بارے میں یادداشت لکھ کر میرے عملہ کو دے دیں اور کوئی بات پوچھنا چاہیں تو وہ بھی ان سے پوچھ لیں۔ وہ کمیٹی روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم اشارہ سمجھ گئے اور اجازت چاہی۔ واپسی کے وقت میزبان نے وفد کے دو افراد سے ہاتھ ملایا۔ وفد کے دوسرے اراکین نے اس حجراسود کو دور ہی سے بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل آئے جہاں حبس تھا نہ گھٹن اور نہ ہی خاموشی۔ اچھی خاصی چہل پہل تھی۔

ہم کمیٹی روم میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ ہمارے سفارت خانہ کا ایک ترجمان کہنے لگا۔ آپ کا دورہ بے حد کامیاب رہا۔ یہاں لوگ ہفتوں کے انتظار کے باوجود چیئرمین این. آئی. او. سی تک نہیں پہنچ سکتے اور انہوں نے آپ کا بذات خود استقبال کیا اور جتنا وقت آپ کو دیا ہے اتنا پچھلے چھ ہفتہ میں کسی اور وفد کو نصیب نہیں ہوا۔ کسی نے طنزاً

اور کسی نے مروت کے مارے اس سفارت کار کی ہاں میں ہاں ملائی اور دوسرے ہی دن تہران سے رخصت ہو گئے۔

اس دورے میں ہمارے وفد نے مشرق وسطیٰ کے تیل بر آمد کرنے والے تین چار ملکوں کا سفر کیا۔ ایک ملک کے بادشاہ نے وفد سے ملاقات کی اور کہا، آپ تیل اور اس کی قیمت کی فکر نہ کریں بلکہ پاکستان کی فکر کریں جو بہت بیش قیمت ہے۔ آپ اپنی ضروریات میرے وزیر تیل کو بتا دیں وہ پوری کر دی جائیں گی۔ البتہ میرا یہ پیغام وزیر اعظم بھٹو تک پہنچا دیں کہ وہ پاکستان کی حفاظت کرنے کے فرض سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوں۔ یہ ملک اسلام دشمن قوتوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے اور وہ اسے کمزور کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے۔

(5)

ہز امپیریل میجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران نے پاکستان کا آخری سرکاری دورہ کیا۔ میں اسلام آباد کے ہوائی اڈا پر استقبالی صف میں کھڑا وقت کے سفر پر غور کر رہا تھا۔ کہاں وہ دن جب ایک اداس چہرہ لمبوترا نوجوان دس بارہ دن مشرقی اور مغربی پاکستان میں قریہ قریہ پھرتا رہا اور کہاں آج کا دن کہ ہز امپیریل میجسٹی کسی اور ملک کا دورہ مکمل کرنے کے بعد ازراہ عنایت خسروانہ اس بات پر رضامند ہوئے ہیں کہ واپسی کے سفر کے دوران ان کی پرواز چند گھنٹہ کے لئے اسلام آباد میں ٹھہرے گی۔ اس روز میں نے آریا مہری اور سرد مہری کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ دیکھا۔ صف میں ساتھ کھڑے ہوئے ایک ساتھی سے میں نے دردِ دل بیان کیا۔ وہ فرمانے لگے، یہ شخص اب ہماری اور تمہاری دنیا کا باشندہ نہیں رہا۔ یہ تیل کی دنیا کا باشندہ ہے بلکہ وہاں کا بادشاہ ہے۔ اس شخص کے تکبر کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس نے قرآن مجید کا ایک بہت خوبصورت نسخہ طبع کرایا ہے مگر اپنے پیش لفظ اور اپنے دستخط کے ساتھ۔ نہ جانے یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ کیبنٹ سیکرٹری پاس

ہی کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے، وہی سمجھتا ہے جو وہ ہے یعنی شاہوں کا شاہ۔ بادشاہوں کا بھی بادشاہ۔

اردشیر نے ایران کے چھوٹے بڑے بادشاہوں کو زیر کرنے اور ملک پر اپنا تسلط جمانے کے بعد کہا کہ یہ بات ہمیں ہرگز گوارا نہیں کہ ہمارے حلیف اور وفادار ساتھیوں کو شاہ کے علاوہ کسی کمتر خطاب سے مخاطب کیا جائے۔ تخت ہم نے لے لیا ہے، خطاب ان کے پاس رہنے دو۔ ہمارے نمک خوار ساتھی علاقہ اور اختیار کے اعتبار سے خواہ کسی بھی حیثیت کے حامل کیوں نہ ہوں انہیں بادشاہ کہہ کر پکارا جائے۔ اس حکم کی تعمیل بے چون و چرا ہوئی اور جب اتنے بہت سے شاہوں کے ہوتے ہوئے اردشیر کے اپنے سرکاری خطاب کا سوال پیدا ہوا تو اسے بآسانی شاہوں کا شاہ یعنی شہنشاہ بنا کر حل کر لیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردشیر نے جس فیاضی سے بادشاہت تقسیم کی تھی اس کا اصل مقصد شہنشاہی کا حاصل کرنا تھا۔ لیکن اردشیر کی نیت پر شبہ کرنا درست نہ ہو گا۔ اسے آخر اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ آسان طریقہ یہ تھا کہ اس کی نامزد کابینہ ایک متفقہ قرار داد منظور کرتی اور وہ گھر بیٹھے فیلڈ مارشل اردشیر بن جاتا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے اردشیر بابکان نے ایرانی کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے کر دیا۔ اختیارات کا انوکھا استعمال عام طور پر وہم اور خوف کے تحت کیا جاتا ہے اور یہی حال اس فیصلہ کا تھا۔ اردشیر کو ایک پیش گوئی ستا رہی تھی جس کی رو سے زرتشت مذہب کے زوال اور ایرانی سلطنت کے خاتمہ میں صرف ایک سو پچاس سال رہ گئے تھے۔ اس نے اس خطرہ کو ٹالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ گذرے ہوئے وقت میں سے تین صدیوں کو حذف کر دیا۔ وقت کو حکم دیا کہ وہ تین سو سال تک گنتی دوبارہ گنے۔ جنتری لکھنے والوں نے حکم کی تعمیل کی۔ سادہ دل فرشتے جو مسلمانوں کی طرح حساب میں کمزور معلوم ہوتے ہیں دھوکا کھا گئے۔ آتش پرستی اور آل ساسان کو اردشیر کی خواہش کے مطابق ایکسٹینشن مل گئی۔

محمد رضا شاہ کو ایرانی تاریخ کا یہ واقعہ یاد تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اردشیر سے بڑا اور سائرس کے برابر ہے تو اس نے بھی کیلنڈر میں مداخلت کرنی چاہی۔ اس نے ایک دن کیلنڈر میں ایک ہزار اور پینتیس سالوں کا اضافہ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اہل ایران کو بادشاہت دیرپا اور ضروری نظر آئے گی۔ یہ اس کا نظریۂ ضرورت تھا۔ حکمران اس

نظریے کی آڑ میں کیا کچھ نہیں کرتے۔

رضا شاہ کو کیلنڈر کی تبدیلی اور ہزار سال کا اضافہ راس نہ آیا۔ فرشتے عرصہ سے ناراض بیٹھے تھے کہ ایک ایرانی بادشاہ پہلے ہی تاریخیں آگے پیچھے کر انہیں جھانسا دے گیا ہے۔ انہیں بدلہ چکانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ نئے کیلنڈر کی رو سے چونکہ ایرانی بادشاہت ڈھائی ہزار سال سے قائم ہے لہٰذا اسے زائدالمیعاد قرار دے کر ختم کر دینا چاہئے۔ فرشتوں کے علاوہ لوگ بھی کیلنڈر میں صدیوں کے اضافہ سے ناراض تھے۔ اسلامی حلقوں کی ناراضی سمجھ میں آتی ہے مگر عوامی ناراضی کا سبب ایک بار محمد ہرندی نے ایک گھریلو مثال کی مدد سے سمجھایا۔ کہنے لگے، میرے پاس بڑے بچے کے دو سرٹیفکیٹ ہیں۔ ایک اسے پہلی جماعت میں داخل کرانے کا اور دوسرا اس کے امتحان میں کامیاب ہونے کا۔ ان کی رو سے میرے بچے نے صرف پہلی جماعت پاس کرنے میں ایک ہزار چھتیس برس لگا دیئے ہیں۔ بادشاہت بلاشبہ ایک بہت پرانا ادارہ ہے۔ شہنشاہِ ایران اس پر ناز کرنا چاہیں تو بےشک کریں۔ کس نے منع کیا ہے۔ مگر اس کی خاطر میرا کم سن بچہ پہلی جماعت میں ایک ہزار برس تک کیوں Detain کیا جائے۔

مصری صحافی محمد حسنین ہیکل نے ایک بار بڑی پتہ کی بات کہی تھی۔ اس نے کہا کہ مغرب عالمی ذرائع ابلاغ پر اتنی کامل دسترس رکھتا ہے کہ وہ جب چاہے تیسری دنیا کے کسی بھی لیڈر کو سارے جہان میں بدنام کرنے کی مہم چلا کر پنجرہ میں بند پرندہ کی طرح بےبس کر دے۔ اس قول کا دوسرا رخ بھی اسی قدر درست ہے۔ مغرب جب چاہئے تیسری دنیا کے کسی بھی لیڈر کو خواہ وہ کتنا نکما ہی کیوں نہ ہو اتنا عظیم و بےمثال اور ایسا نابغۂ عصر بنا کر پیش کر سکتا ہے کہ لوگ اس بات پر فخر کرنے لگیں کہ وہ اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مغرب کو شخصیت سازی کے علم میں بھی اتنا کمال حاصل ہے جتنا کردار کشی کے فن میں۔ شہنشاہ ایران کی زندگی کے آخری چند سالوں میں مغرب نے اس علم و فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

شہنشاہی عروج پر پہنچی۔ اسداللہ عالم وزیر جی حضوری نے اعلان فرمایا۔ Shahinshah is too great for the people ۔ یہ سنا تو دوسرے ملکوں سے بھی لوگ شہنشاہ اور اس کے ایران کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔ ایران ایک یلغار کی زد میں آگیا۔ ہر طرف سے طرح طرح کے موقع شناس اس ملک پر ٹوٹ

پڑے۔ وہی تلاش زر کا جنوں جو گولڈرش کہلاتا ہے۔ وہی نوکریوں کی کششِ ثقل جو لاکھوں بے روز گاروں کو گھر سے بے گھر کر دیتی ہے۔ وہی خوشحالی میں حصہ داری کی خواہش رکھنے والوں کی بھیڑ بھاڑ اور وہی پسماندہ ممالک کے حال اور مستقبل کا رخ متعین کرنے والے بدیسی جو بھیس بدل کر اس بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس یلغار میں سب شامل ہو گئے۔ بر عظیم سے ڈاکٹر اور انجینئر۔ سری لنکا سے خادمائیں۔ فلپائن سے بچوں اور بڑوں کا دل بہلانے کے لئے آیائیں۔ کوریا اور تائیوان سے تعمیراتی ٹھیکہ دار اور ان کے کارکن۔ جرمنی اور جاپان سے کارخانہ لگانے والے۔ فرانس سے شراب اور عطریات بیچنے والے تاجر اور ایک بلین ڈالر قرض مانگنے والے سرکاری افسر۔ امریکہ سے کوئی چوالیس ہزار افراد آ گئے۔ ملک کا کوئی دفتر اور کوئی کونا ایسا نہ تھا جو ان سے خالی ہو۔ ان بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں میں دو بھارتی بھی تھے۔ ایک وہ جو انتقال صوت کا ماہر تھا اور دوسرا وہ جو چراغ کے آگے انگلیاں رکھ کر پردے پر سائے سے عالمی لیڈروں کی تصویریں بناتا تھا۔ میں نے ان دونوں بازی گروں کو پہلی بار راجوں کی طرح ریشمی پگڑیاں باندھے اور نقلی زیورات پہنے ٹوکیو کے ایک تماشا گھر میں دیکھا تھا۔

ایران کے تماشا گھر میں ایک گروہ اہل قلم کا بھی تھا۔ ہر طرح کی قلم بندی کرنے والے ایران میں جمع ہو گئے۔ سفرنامہ اور ہدایت نامہ، تاریخ اور جائزے، تیل کی کہانی اور ترقی کے افسانے، قالین بافی کے کمال ہنر اور مختصر تصویروں کی نقاشی کا فن، آسان فارسی اور فارسی ادب۔ جن لوگوں کو عام موضوعات سے ہٹ کر لکھنے کی خواہش ہوتی ہے وہ بھی بڑی تعداد میں وہاں آ پہنچے اور عجیب و غریب عنوانات لے کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ ایرانی شوہروں کے بیویوں کو زدوکوب کرنے کے رویئے سے لے کر کوہ زاگروس کے آبی غاروں کی سفید اندھی مچھلی پر تحقیقی تحریریں شائع ہونے لگیں۔ ایران لکھنے والوں کی دلچسپی کا مرکز تھا اور اس مرکز کا مرکز شہنشاہِ ایران کی ذاتِ والا صفات تھی۔ بہت سے لکھنے والوں نے روایتی قصیدہ گوئی کا انداز اختیار کیا اور کھل کر نظم اور نثر میں شہنشاہ کی تعریف کی۔ جہاں کہیں ذرہ بھر خوبی دیکھی وہیں ذرے کو آفتاب بنا دیا۔ ممدوح نے ہمیشہ ایسی باتوں کو سچ سمجھا اور جوں جوں ایسی تحریروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا ان کا مغالطہ بھی اسی قدر بڑھتا چلا گیا۔ بہت سے لکھنے والوں نے قصیدہ گوئی کا لطیف، پراسرار اور پر پیچ طریقہ استعمال

کیا اور کامیاب رہے۔ آخر کار زور قلم، بیان دعویٰ اور بیان تائیدی کی بنا پر وہ دھاک بندھی کہ محمد رضا شاہ کو سائرس دوم، اس کی سوانح کو نیا شاہنامہ اور اس کی بے سروپا اور بے بنیاد تجاویز کو نئی دنیا کا ماسٹر پلان تسلیم کر لیا گیا۔

محمد رضا جلالی نائینی سالہا سال بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ کسی زمانہ میں نیشنل فرنٹ سے بھی وابستہ تھے۔ ایک دن سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے قصیدہ گوئی میں شاعروں کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ فرمانے لگے، ہزامپیریل میجسٹی نے تن تنہا ایرانی عوام کی اتنی خدمت کی ہے جتنی پچھلے ڈھائی ہزار سال میں ایران کے تمام بادشاہوں نے مل کر کی ہو گی۔ خدا انہیں ایک سو بیس سال کی عمر عطا فرمائے۔ وہ فرشتہ جو بادشاہوں کو تخت پر بٹھانے اور اتارنے پر مامور ہے یہ تقریر سن کر مسکرایا ہو گا۔ اور وہ فرشتہ جو شاہ و گدا کی جان نکالنے کا کام کرتا ہے وہ تو مسکرایا بھی نہ ہو گا۔

یہ بیسویں صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی ہے۔ ملکوں ملکوں شہنشاہ ایران کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے ہیں۔ ایک مصنف اٹھتا ہے اور ان پلوں کو ڈھانے لگتا ہے۔ یہ ایک ناول نگار ہے۔ اس کے نئے ناول کا عنوان ہے۔ Crash'79 ۔ یہ ایران کے بے چین مستقبل کے بارے میں ایک فرضی کہانی ہے۔ لکھنے والے نے بڑی تحقیق اور محنت کے بعد یہ ناول لکھا ہے۔ اس کہانی میں شہنشاہ محمد رضا شاہ کو اپنی عظمت کا مرض اور بڑے کام کرنے کا جنون لاحق ہو جاتا ہے۔ کہانی کے مطابق شہنشاہ کا عہد حکومت 1979ء میں ختم ہو جائے گا۔ اور یہ کوئی خاتمہ بالخیر نہیں ہو گا بلکہ شکست و ریخت کا ایک بہت بڑا دھماکہ ہو گا۔ کہتے ہیں کہ اس ناول کا فارسی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ بالائے زمین نہیں بلکہ زیر زمیں۔ معلوم نہیں مترجم نے عنوان کیا رکھا ہے۔ فارسی میں Crash کے معنی ہیں، ریز ریز شدن و صدای بلند و ناگہانی در اثر شکستن۔ اچانک اور بلند دھماکہ کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو جانا۔ یہ ناول بذات خود ایک دھماکہ ہے مگر چھوٹا سا۔ ناول نگار کے مطابق ایران میں بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے۔ یہ مستقبل میں بہت جلد ہونے والا ہے۔ ایسے مستقبل کو عنقریب کہتے ہیں۔ لوگ ناول نگار کی خیال بافی اور جرأت کی داد دیتے ہیں مگر دھماکہ والی بات کو محض کتاب فروشی کا ایک تاجرانہ حربہ قرار دیتے ہیں۔ وفادار فوج، جانباز شاہی گارڈ، بے انتہا دولت جس سے ہر ایک کو خریدا جا سکتا ہے، بے حد سفّاک ساواک جو ہر ایک کو سیدھا

کرنے پر مامور ہے، امریکہ کی تائید اور سرپرستی، ڈھائی ہزار سال پرانی شہنشاہیت۔ یہ شخص کتنا جم کر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے صرف ناول ہی میں تخت سے اتارا جا سکتا ہے۔

یہ نو جولائی 1978ء کا پہلا پہر ہے۔ پی آئی اے کا ہوائی جہاز بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں تہران کا ہوائی اڈا آ جائے گا۔ یکایک پہاڑی سلسلہ سے ایک خوش نما پہاڑ کٹ کر فضائی راستہ میں آ جاتا ہے اور اترتے ہوئے ہوائی جہاز کے بہت قریب آ کر مسافروں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ یہ کوہ دماوند ہے۔ کل تک صرف اس کا نام سنا تھا۔ آج دیکھ بھی لیا۔ آنکھوں میں اس خوش منظر پہاڑ کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہم مہر آباد کے ہوائی اڈا پر اتر گئے۔

ہیسلٹائن اپنے تخیل کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہم ایران کی زمین پر فسوں کو چھو لیتے ہیں۔ اور یہاں پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال و جلال کا طبل زریں، مسرت و سعادت کا نقارۂ سحر آفرین، رقاصان طرب کار اور اسی طرح کے رموز و اسرار سب ہماری پیشوائی کے لئے موجود ہیں"۔ میرا سفر ایک حقیقت ہے مگر آکسفورڈ کے استاد کے تخیل کے سفر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ میں ہوائی جہاز کے دروازے سے باہر نکلا اور سیڑھی کے چبوترہ پر لحظہ بھر کے لئے رکا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کون کون میری پیشوائی کے لئے وہاں موجود ہے۔ ایک عظیم تہذیب، ایک قدیم تاریخ، ایک زیر تعمیر جہان نو، ایک ثروت مند ملک کی نئی سحر، علاقائی تعاون کا ایک نیا خواب۔

میں اور عذرا جہاز کی سیڑھیوں سے سیدھے مسکراتی ہوئی استقبالی آنکھوں میں جا اترے۔ بسر و چشم کی وہ تکرار تھی کہ زمین پر پاؤں رکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایسے خوشگوار موقع پر یہ بات کسے یاد آ سکتی ہے کہ ایک گمنام ناول نگار کی پیش گوئی کے مطابق ہزامپیریل میجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران کا تختہ الٹنے میں صرف چھ مہینے باقی ہیں۔ اور اگر خیال آتا بھی تو یقین نہیں آتا۔

باب سوم

خانہ بدوش

سفارتی تکلّفات میں گھرے ہوئے آدھ گھنٹہ سے اوپر ہو چکا ہے۔ گلدستہ وصول پایا۔ تعارف مکمل ہوا۔ انٹرویو ختم شد۔ فلم اور تصویر بنانے والی تیز روشنی گل ہو چکی ہے۔ پاسپورٹ پر چار سالہ قیام کے لئے مہر لگ چکی ہے۔ سامان کسٹم کے سفید چاک کے نشانات کے ساتھ سٹاف کار میں رکھا جا چکا ہے۔ موٹر کے پچھلے شیشہ کے ساتھ ڈاک رکھی ہوئی ہے۔ اس میں پاکستان سے آنے اور مجھ سے پہلے تہران پہنچ جانے والے خطوط اور مقامی تقریبات کے دعوت نامے شامل ہیں۔ سارا بندوبست کرنے کے بعد محکمہ تشریفات کے ایک چست و چالاک افسر نے پلکیں جھپکا کے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کلائی گھما کر کف دست سے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پاکستانی، ترک اور ایرانی ہم کار جو استقبالی کمرے میں آر۔سی۔ڈی کے حوالہ سے جمع تھے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے جیسے سر پر سرکاری فرائض کا کوئی بوجھ تھا جو اس ایک اشارے کے ساتھ اتر گیا ہو۔ اس رسمی استقبال میں ان کا سارا وقت یہ تشخیص کرتے ہوئے گزرا کہ نیا آدمی کیسا ساتھی ثابت ہو گا۔ میں بھی چلنے کے لئے تیار ہوں۔ اس مختصر تقریب کے عوض کل سے مجھے استقبال کرنے اور الوداع کہنے والے سفار تکاروں کی صف میں چند سال کھڑا ہونا اور مسکرانا پڑے گا۔ میں غوطہ خور کی طرح ایک لمبی سانس لیتا ہوں اور سفارتی سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سطحِ آب اور ساحلِ مراد پر واپسی چار سال کے بعد ہو گی۔

میں نے چلتے چلتے ایک بار پھر اس تصویر پر نظر ڈالی جسے میں دزیدہ نظری سے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ہوائی اڈا کے استقبالی کمرے میں سب سے نمایاں تصویر شہنشاہ ایران کی ہے۔ اور یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ مگر وہ تصویر جو مجھے پریشان کر رہی ہے وہ صرف ایک درخت کے تنے کی تصویر ہے۔ مضبوط، قد آور اور پختہ عمر کے درخت کا تنا جس کا گھیر کسی قدر پہلو دار ہے۔ تصویر درخت کے اس حصہ سے شروع ہوتی ہے جو زمین سے کوئی ایک میٹر بلند ہوتا ہے۔ اور اس مقام سے ذرا پہلے ختم ہو جاتی جہاں سے بڑے گھیر والا تنا چھوٹے تنوں اور شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ الجھن ہوتی۔ تصویر نامکمل لگتی اور نظریں کبھی جڑیں تلاش کرتے ہوئے فریم سے باہر نکل کر دیوار سے فرش تک چلی جاتیں اور کبھی برگ و بار کو ڈھونڈتے ہوئے چھت سے ٹکرا جاتیں۔ اس کے مقابلہ میں شہنشاہ کی تصویر کتنی جانی پہچانی اور مکمل لگتی۔ دل نے کہا۔ ادھر کیا دیکھتے ہو۔ وہ تاج و کلاہ والی تصویر صرف ایک فرد کی ہے یا زیادہ سے زیادہ تاریخ کے ایک لمحہ کی تصویر۔ ادھر دیکھو۔ یہ تن آور تنا ایک ملک ہے۔ ایک طویل شاہنامہ ہے۔ اس درخت کی جڑیں صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے برگ و بار آئندہ بہار میں پھوٹنے والے ہیں۔

جشن کا سماں ہے۔ میلا لگا ہوا ہے۔ خوشیوں کی گنگا بہ رہی ہے۔ لوگ جشن منانے میں اتنے مصروف ہیں کہ انہیں کسی اور چیز کا ہوش نہیں۔ میلا تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ہر شخص گنگا میں اس امید کے ساتھ اشنان کر رہا ہے کہ اس کی غربت کا داغ اور غم کا میل دھل جائے گا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایران کو دولت خرچ کرنے اور ضائع کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ دولت کمانے کے لئے کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ ساری محنت دولت کے استعمال کے لئے وقف ہے۔ دولت زمین کے نیچے سے خود بخود نکل رہی ہے بلکہ ابل رہی ہے۔

سارا ایران ابل پڑا ہے۔ بڑے بڑے منصوبے بن رہے ہیں۔ بعض بالکل خیالی اور خام۔ جگہ جگہ عمارتیں بن رہی ہیں۔ ان میں ہوائی قلعے بھی شامل ہیں۔ بیشمار نئی چیزیں بہ یک وقت وجود میں آ رہی ہیں۔ شاہراہیں، بزرگ راہیں، ڈیپارٹمنٹل سٹور، بیرونی طعام گاہوں کی شاخیں، تھیٹر اور اوپیرا، سینما اور گھڑ دوڑ کے میدان، ناچ گھر اور شراب خانے۔ کارخانے بھی لگ رہے ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ توجہ درآمدات کا انبار لگانے پر دی جا

رہی ہے۔ دنیا کے ہر کونے سے ہر قسم کی چیز در آمد ہو رہی ہے۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ دولتمند ضرورت کو نہیں دیکھتا۔ صرف اپنی قوت خرید کی نمائش کرتا ہے۔ اور یہ اسی قسم کی نمائش کا نتیجہ ہے کہ لالہ زار ایران اب گل لالہ در آمد کرتا ہے۔ گرہ دار لالہ ہالینڈ سے چلتا ہے اور ایران میں آ کر کھلتا ہے۔ ایران کے قومی پھول کو لالہ نہیں ڈالر کہتے ہیں۔ ڈالر جس کی کھلے بندوں نمائش پاکستان کے زرمبادلہ کے قانون کے خلاف ہے وہ یہاں فٹ پاتھ پر اگتا ہے۔ خیابان فردوسی کے دونوں سروں پر چھابڑی والے اس کا لین دین کرتے ہیں۔ کیا عجیب منظر ہے۔ میں ایک زیادہ آبادی، کم وسائل، تیل در آمد کرنے والے، زرمبادلہ کی کمیابی کے مارے ہوئے اور در آمد کی قانونی بندشوں والے ملک کا باشندہ ہوں۔ میری حیرانی بجا اور برحق۔ لیکن ایران کی اس صورت حال کو دیکھ کر اس کا پورا پورا ناجائز فائدہ اٹھانے والے ترقی یافتہ ملکوں کے نمائندے بھی انگشت بدنداں ہیں۔ یہ ولولہ ہے یا ہنگامہ۔ حرکت ہے یا حماقت۔ ترقی ہے یا تباہی۔ جو کچھ بھی ہے اس کی رفتار بہت تیز ہے۔

میں نے گل و بلبل والے افسانوی ایران سے ڈالر اور دولت والے ایران کا سفر صرف ایک دن میں طے کر لیا۔ دفتر والوں نے پہلے ہی دن وہ فائل سامنے رکھ دی جو نئے سیکرٹری جنرل کے گھر کی تلاش کے بارے میں تھی۔ فائل میں درج تھا کہ سارے جتن کر لئے ہیں مگر دو ہزار ڈالر ماہانہ پر کوئی مناسب گھر ملا ہے نہ ملنے کی کوئی امید ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تینوں ممبر ملکوں کو یہ تجویز بھیجی جائے کہ گھر کے کرائے کی حد بڑھا کر تین ہزار ڈالر ماہانہ کر دی جائے۔ چار چھ ماہ میں منظوری آ جائے گی۔

تلاش خانہ کے علاوہ ایک دوسری فائل بھی پہلے دن ملاحظہ کے لئے پیش ہوئی۔ دفتر اور تفریح گاہوں کی خط و کتابت۔ دفتر والوں نے میری خاطر داری کے لئے خود ہی بحر خزر کے ساحل پر واقع چند تفریحی مقامات کے ہوٹلوں کو جون جولائی میں لکھا کہ ہمارے ادارہ کے سربراہ کو اگست میں کسی وقت ہفتہ دس دن کے لئے آپ کے یہاں کمرا درکار ہے۔ جواب میں رامسر کے ایک مشہور ہوٹل نے لکھا۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آر.سی.ڈی کے سربراہ نے اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے ہمارے ہوٹل کا انتخاب کیا ہے۔ ہم نے سال آئندہ کے ماہ اگست کے لئے ان کی ریزرویشن کر لی ہے۔ افسر تشریفات نے کہا. سر میں چاہتا تھا کہ آپ

ہمارے ملک کی عظیم فنکار گوگوش کا گانا سنیں۔ وہ اتنی خوش آواز ہے کہ جب پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے اسے سنا تو بے اختیار یہ کہا، میں خوش قسمت ہوں کہ مرنے سے پہلے مجھے اس آواز کو سننے کا موقع مل گیا۔ اگر میں یہ آواز نہ سنتا تو مجھے کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ سریلی آواز کتنی سریلی ہو سکتی ہے۔ گوگوش گرمیوں میں ساحل خزر پر قو (راج ہنس) ہوٹل میں گاتی ہے۔ سیزن کے ختم ہونے میں چھ ہفتہ رہ گئے ہیں سارے ٹکٹ مدت ہوئی فروخت ہو چکے ہیں۔ میں نے آپ سے پوچھے بغیر وزارت خارجہ کو خط لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس نمائش ہنر کے لئے آپ کو سال بھر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ میں نے کہا۔ بہتر ہو گا اگر آپ چار سال کے بعد ہونے والے تمام کھیل تماشوں کی ابھی سے بکنگ کرا لیں تاکہ وہ محرومی جو میرے حصہ میں آئی ہے، میرا ترک جانشین اس سے دوچار نہ ہو۔

کسی نے ایران کا منہ دولت سے اتنا بھر دیا ہے کہ دم گھٹنے لگا ہے۔ تہران میں موٹروں کی کثرت سے اکثر راہ بندی ہو جاتی ہے۔ جتنی موٹریں اس شہر میں ہیں اتنی سارے پاکستان میں نہیں ہیں۔ نئی سڑکیں بھی اس تعداد کے لئے ناکافی ہیں۔ مصروفیت کے اوقات میں ذرا سا فاصلہ بھی گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ صبر کے علاوہ اس کا کوئی علاج نہیں مگر صبر کم ہے اور موٹریں زیادہ۔ گھر نہیں ملتا۔ اور کیوں کر ملے۔ لاکھوں آدمیوں نے یکایک شہر پر یلغار کر دیا ہے۔ حملہ آوروں سے نبٹنے کے لئے ہر طرف نئی رہائشی عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ جابجا بلند عمارتیں تعمیر کرنے والی کرینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا رنگ پیلا ہے۔ جس جگہ نئی تعمیر شروع ہوتی ہے وہاں راتوں رات پیلے رنگ کے تاڑ کے درختوں کا جھنڈ اگ آتا ہے۔ جب تک یہ عمارتیں مکمل ہوں گی اس وقت تک مزید کئی لاکھ افراد اس شہر میں آدھمکیں گے۔ بے گھری کا وہی عالم ہو گا جو ہے۔

ریستوران بھرے ہوئے ہیں۔ میز رزرو کرائے بغیر جائیں تو انتظار گاہ میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ آسرا لگائے بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہوائی جہاز کی سیٹ کے لئے ہفتہ بھر اور ہوٹل کے کمرے کے لئے دو ہفتہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مرسڈیز خریدنے جائیں تو انتظار کی مدت کا تعلق اس کے ماڈل سے ہوتا ہے۔ ایک دوست جو موٹر خریدنا چاہتے تھے مجھے ہمراہ لے گئے۔ شوروم کا مالک تیس پینتیس برس کا ہو گا۔ لاابالی اور شوخ۔ نیلی جین اور جوگرز پہنے ہوئے۔ آدھی آستین کی سفید قمیص کے آدھے بٹن کھلے ہوئے۔ گاہے سینہ کے بالوں میں

انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ گلے میں سونے کی زنجیر۔ زنجیر کے ساتھ بندھا ہوا لاکٹ فریم جس میں ایک طرف بیوی کی اور دوسری طرف بچے کی تصویر تھی۔ کامیابی نے اس کم عمری میں اس کے قدم چومے ہیں۔ بے حساب دولت کمائی ہے۔ اس کا اپنا کوئی کمال نہیں۔ کمال گرم بازاری کا ہے۔ اس نے استقبال کچھ اس طرح کیا۔ آپ کو مرسڈیز درکار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ 190 ماڈل کے لئے تین ماہ، 200 کے لئے چار ماہ، 280 ایس. ای. ایل کے لئے چھ ماہ اور 540 کے لئے ایک سال انتظار کرنا ہو گا۔ اگر آپ کو موٹر کار فوری طور پر درکار ہے تو میں نئی گاڑی نائیجیریا میں رجسٹریشن کے بعد ہوائی جہاز سے منگوا سکتا ہوں۔ اس صورت میں کیا آپ فاضل اخراجات برداشت کر سکیں گے۔
ہم اس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

این اے قریشی چیئرمین ریلوے بورڈ تہران کے ایک بڑے صنعتی اور تجارتی ادارہ کے صدر سے اس کے دفتر میں گفتگو کر رہے تھے۔ طے پایا کہ کل کارخانہ دیکھا جائے گا اور پرسوں خرید و فروخت کی شرائط کے بارے میں گفت و شنید ہو گی۔ اس سے اگلے دن لکھا پڑھی اور دستخط۔ اتنے میں ایک فون آیا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد صاحب دفتر نے فون پر اپنے مخاطب سے کہا۔ جناب من، آپ نے جو فیصلہ بھی کرنا ہے وہ اگلے چوبیس گھنٹہ میں ہو جانا چاہئے کیونکہ میں کل رات ایک طویل بزنس ٹور پر جاپان اور امریکہ جا رہا ہوں۔ اگر کل معاہدہ پر دستخط نہ ہوئے تو ہماری طرف سے اس معاملہ کو داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ فون بند ہوتے ہی قریشی صاحب نے کہا، آپ نے مجھے پاکستان سے بلایا ہے اور ہماری اصل بات چیت پرسوں ہونی تھی مگر آپ نے یکایک ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ جواب ملا۔ بے فکر رہیں۔ میں کہیں بھی نہیں جا رہا۔ آپ سے پروگرام کے مطابق ملاقات ہو گی اور تمام معاملات طے کئے جائیں گے۔ دراصل میرا مخاطب ایک کمزور ارادہ شخص تھا۔ مہینہ بھر سے معاہدہ پر بات چیت کر رہا ہے۔ جب دستخط کا وقت آتا ہے تو کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں قوت ارادی کی کمی ہے۔ میں نے اپنے دورے کا بہانہ بنا کر اس کی قوت فیصلہ کو بیدار کیا ہے۔ اب جو بھی فیصلہ ہو وہ اسے اگلے چوبیس گھنٹہ میں کرنا ہو گا۔

ان دنوں ایران میں لوگوں کی قوت فیصلہ بیدار ہو چکی ہے۔ وہ دن گئے جب غربت فیصلہ کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اب وہ تیل والی دولت خرچ کرنے کا فیصلہ بغیر

ہچکچاہٹ کے فوراً کر سکتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ میں نے تہران میں سونی الیکٹرونک کے سیل سنٹر میں دیکھا۔ ایک پاکستانی نے موسیقی کا لطف لینے کے لئے سونی کا ڈیک خریدا۔ ایک مشین ٹیپ بجانے کی، دوسری لانگ پلے ریکارڈ والی، تیسری ساز و آواز کے جوڑ توڑ کے لئے، چوتھی ان تینوں کو چلانے کے لئے۔ ان کے علاوہ ایک خوبصورت چار خانہ شیلف اور دو بڑے بڑے سٹیریو سپیکر۔ قیمت ادا کی اور رسید حاصل کی۔ گودام سے بند ڈبے نکالے گئے۔ بس انہیں بار برداری کی وین پر رکھنے کی دیر تھی۔ ایک ایرانی جس نے کئی ماڈل دیکھے اور ناپسند کئے تھے کہنے لگا۔ مجھے وہ ماڈل دے دیجئے جو اس پاکستانی گاہک نے خریدا ہے۔ سونی والوں نے کہا۔ یہ اس ماڈل کا آخری ڈیک تھا۔ نئی کھیپ چھ آٹھ ہفتہ میں آنے والی ہے۔ اس ایرانی نے سونی کے سیلزمین کی طرف سے پیٹھ پھیری اور پاکستانی خریدار سے کہنے لگا، آپ یہ ڈیک مجھے فروخت کر دیں۔ جو قیمت آپ نے ادا کی ہے میں اس سے دس فیصد زیادہ رقم آپ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ بیس فیصد نفع پر سودا پکا ہو گیا۔ دونوں اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ ایک ڈیک لے کر دوسرا ڈالر لئے ہوئے۔ ایک نے وقت خرید لیا، دوسرے نے انتظار بیچ ڈالا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ حالانکہ خوشی تو ان ملکوں کو ہونی چاہئے جن کی مصنوعات کی مشرق وسطیٰ میں اتنی مانگ ہے کہ ان کے کارخانے دن رات اسے پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جاپان امریکہ اور یورپ سے مشرق وسطیٰ کے لئے بار بردار بحری جہازوں، مال بردار ہوائی جہازوں اور عظیم الجثہ ٹریلر ٹرک قطار اندر قطار چلے آرہے ہیں۔ مصنوعات لا رہے ہیں۔ تیل کی ادا کی ہوئی قیمت مع سود، منافع اور جرمانہ واپس لے رہے ہیں۔

میرے لئے ایک ہدایت نامہ سفارت خانہ نے تیار کیا ہے اور دوسرا آر. سی. ڈی کے دبیر خانہ نے۔ بیگم کی رہبری کے لئے دو گرل گائیڈز تیار ہیں۔ ایک ایرانی اور دوسری پاکستانی۔ ایک ماہرِ عطریات، ملبوسات، جواہرات. زیورات اور زیبائشِ زنانہ۔ ہر گراں فروش کا پتہ اسے ازبر ہے اور ہمراہ بازار جانے کے لئے تیار ہے۔ دوسری کا علم باورچی خانہ اور توشک خانہ کے لوازمات کی سستی دکانوں تک محدود ہے۔ دوسری خاتون مشیر نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ اللہ کی شان ہے۔ ایران ان چار پانچ سالوں میں کتنا بدل گیا ہے۔ وہ خواتین جو چند سال پہلے مغرب کی ورکنگ کلاس کے خلاف فیشن ڈھیلے ڈھالے

کپڑے پہنا کرتی تھیں اور کھٹے میٹھے رنگ برنگ ڈیزائن پر جان دیتی تھیں آج ہمیں پیرس کے فیشن ملبوسات کی شش ماہی نمائش اور رنگوں کے حسن ترتیب کے بارے میں لکچر دیتی ہیں۔ خدا جب دولت دیتا ہے نخرہ خود بخود آجاتا ہے۔ میں دلاسا دیتا ہوں کہ ایسی تبدیلی ایک فطری بات ہے۔ اس کا برا منانے کا کیا فائدہ۔ جواب ملا۔ سر، آپ ایک سفار تکار اور ادارہ کے سربراہ ہیں آپ کو کیا معلوم کہ ہم پر کیا گزرتی ہے۔ چند سال پہلے ہم ماہر اور کارشناس تھے۔ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے۔ مشورہ ہمارا حرف آخر ہوتا۔ آج ہم نوکر ہیں۔ اجنبی ہیں۔ ڈالر دیوانے ہیں۔ حیثیت ہماری صفر ہو گئی ہے۔ بات ہماری کوئی سنتا ہی نہیں۔ اب ہمیں کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔

(2)

مرزا رفیق عنایت نے تعلق داری کا لحاظ کیا اور حالات کو دیکھتے ہوئے رہائش کے لئے اے ایس پی کمپلیکس کا ایک فلیٹ عارضی طور پر حاصل کر لیا۔ ان کے اس فیصلہ نے ہمیں پہلے تین ہفتہ کے لئے در بدری اور خواری سے محفوظ رکھا۔ اس فلیٹ میں دو یورپی کرایہ دار رہتے ہیں جو چھٹیوں میں وطن واپس گئے تو اس فلیٹ کو تحتی کرایہ پر اٹھا گئے۔ چوکیداری کا انتظام مفت اور کرائے کی آمدنی اس کے علاوہ۔ رہی قانون کرایہ داری کی خلاف ورزی تو اس کی پروا کون کرتا ہے۔ اس طرح مہمانوں کے نام پر چند ہفتہ تحتی کرایہ دار رکھنے کی روایت قانون کرایہ داری سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے۔ یہ ایک جدید اور بے حد فیشن ایبل ہاؤسنگ کمپلیکس ہے۔ اس احاطہ میں تین پچّیس منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ایک عمارت میں دو کمرے والے، دوسری میں تین کمرے والے اور تیسری میں چار پانچ کمرے والے لگژری فلیٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس احاطہ میں چوکیداری، خریداری، بنکاری، اصلاح گیسو اور آرائش جمال کے علاوہ تیرنے، کھیلنے، ناچنے اور کھل کھیلنے کے جملہ انتظامات موجود ہیں۔ اس کے کار پارک میں رولز رائس، مرسیڈیز 640، کیڈیلیک اور تیز رفتاری کے لئے مشہور موٹروں کو مڑ کر دیکھنے کا تکلف میرے بچوں نے صرف

ہفتہ بھر کیا۔ باقی دو ہفتے ایسے گزارے جیسے وہ پہلے ہفتہ کی توجہ اور سنسنی کی نفی اور تلافی کر رہے ہوں۔

میں نے ایک ایرانی سے اس اقامت خانہ کی منصوبہ بندی کی تعریف کی۔ ایک متمول آدمی ساری زندگی ان تین عمارتوں والے احاطہ میں بسر کر سکتا ہے۔ نوجوان اور غیر شادی شدہ عمارت نمبر ایک میں آکر آباد ہو جائے۔ بیوی بچوں والا بنے تو اٹھ کر عمارت نمبر دو میں چلا جائے۔ بچے بڑے ہو جائیں تو خاندان عمارت نمبر تین میں منتقل ہو سکتا ہے۔ بچے نوکری کے لئے ملک سے باہر چلے جائیں یا بیویاں ان کو لے کر الگ ہو جائیں تو بوڑھے میاں بیوی یادوں اور بیماریوں کی پوٹ باندھ کر واپس عمارت نمبر ایک میں چلے جائیں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ دور اندیش ماہر تعمیرات نے دار وخانہ، بنک اور لاکرز کی جگہ بھی اسی عمارت نمبر ایک میں رکھی ہے۔ سننے والے نے بات غور اور دلچسپی سے سنی اور بولا۔ جناب من، اقامت خانہ کی ایک درجہ بندی آپ کے ذہن میں ہے اور دوسری وہ ہے جو وہاں پائی جاتی ہے۔ عمارت نمبر تین میں مالک مکان اپنی نئی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ نمبر دو میں اس کی پہلی بیوی اور بچے رہتے ہیں۔ عمارت نمبر ایک والا فلیٹ اس نے اپنی داشتہ کو دے رکھا ہے۔ یقین نہ آئے تو دفتر کی کسی غیر شادی شدہ سیکرٹری سے اس ترتیب کی تصدیق کر لیجئے گا۔

ہمارا فلیٹ سترھویں منزل پر واقع ہے۔ ایک دن میں کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا کہ شیشہ کے دوسری طرف ایک مچھر اڑتا ہوا نظر آیا۔ یہ فلیٹ دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کھڑکی سے نصف میل کے فاصلہ تک کوئی عمارت نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ہوا بہت تیز چلتی ہے۔ پھر یہ نحیف بدن اور مکڑی کے جالے کی طرح کمزور پروں اور چھ سینک سلائی ٹانگوں والا حقیر پشہ اتنی بلندی تک کیسے پہنچا۔ میں اس کی ہمت اور مردانگی کا قائل ہو گیا۔ کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھولا۔ مچھر فوراً گنگناتا ہوا اندر آگیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے ماہر کہتے ہیں کہ مچھر کو گانا نہیں آتا۔ وہ محض ایک سازندہ ہے جو اپنے پروں سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ ماہرین میں ایک نام سر ڈانلڈ راس کا بھی ہے جن کی تحقیق ہے کہ یہ معصوم نظر آنے والا ملیریا بردار کیڑا ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اذیت اور موت کا باعث بنتا ہے۔ ڈی. ڈی. ٹی کا چھڑکاؤ شروع ہونے کے بعد بھی ہر سال کوئی دو ملین افراد اس ذرا سے کیڑے کی نذر ہو

جاتے ہیں۔ جونہی مجھے یہ اعداد و شمار یاد آئے میں غسلخانہ سے کرم کش سپرے کا ڈبہ اٹھالایا اور اپنے ننھے اور مہلک مہمان کی طرف رخ کر کے اس کا بٹن دبا دیا۔

مچھر فوراً مر گیا۔ مگر مجھے ایک طویل عرصہ کے لئے احساس جرم کے وسوسوں نے گھیر لیا۔ مہاویر کے ماننے والے بھی کیا اچھے لوگ ہیں۔ ساری زندگی جیئو ہنتیا کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ پانی چھان کر پیتے ہیں۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو آب میں۔ نتھنوں پر کپڑا باندھتے ہیں۔ لے سانس بھی آہستہ کہ اس کارگہ ہستی میں تیرا سانس لینا بھی کسی کے لئے موت کا پیغام نہ بن جائے۔ چلتے ہیں تو راستہ چنور سے صاف کرتے جاتے ہیں۔ مبادا آواز آئے کہ چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تم کو کچل ڈالیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ جینی بھی کیا خوب لوگ ہیں۔ غیر عملی اور وسواسی۔ دوسروں کو جینے کا حق دینے کے لئے اپنے جینے کو ایک عذاب بنا لیتے ہیں۔

وسوسے نے کہا تمہیں اس قبائلی روایت کا پاس کرنا چاہئے تھا کہ دشمن اگر مہمان بن جائے تو بدلہ نہیں چکاتے بلکہ خاطر تواضع کرتے ہیں۔ تاریخ نے کہا، یہ کوئی اٹل اصول نہیں ہے۔ تاریخ میں مہمانوں کے ساتھ بے رخی اور بد سلوکی کی بہت سی مثالیں محفوظ ہیں۔ قاہرہ میں ایک روز محمد علی نے مملوک حکمرانوں کے لئے ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔ لذیذ کھانا کھلانے اور پر سرور مشروب پلانے کے بعد سارے مہمانوں کو دستر خوان پر ہی ڈھیر کر دیا۔ صرف ایک آدمی بچ نکلا مگر وہ بھی محمد علی سے لے کر شاہ فاروق تک اس خاندان کو مصر پر ایک سو اکتالیس برس تک حکومت کرنے سے نہ روک سکا۔ تاریخ نے کہا۔ تم نے ملیریا سے بچاؤ کی خاطر حق خود حفاظتی کے تحت مچھر مارا ہے۔ مگر ایک مدت سے احساس جرم نے تم کو ہلکان کر رکھا ہے۔ یہ پریشانی بے جا ہے۔ تم نے کُودِتا تو نہیں کیا۔ آئین کی خلاف ورزی تو نہیں کی۔ ملک تو نہیں توڑا۔ ہتھیار تو نہیں ڈالے۔ ملک ٹھیکہ پر تو نہیں دیا۔ کمیشن سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں تو جمع نہیں کرائی۔ دہشت گردی کی سرپرستی تو نہیں کی۔ بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر آنے جانے کی بات تو نہیں کی۔ ایٹمی پروگرام کی رفتار میں کمی تو نہیں کی۔ لوگ اتنے بڑے صدمے بے فکری سے برداشت کر گئے۔ نہ گزشتہ کا احتساب۔ نہ آئندہ را احتیاط۔ نہ کوئی مجرم نامزد ہوا۔ نہ کسی کو سزا ملی۔ تم ایک مچھر مار کر خواہ مخواہ واویلا کیوں کر رہے ہو۔

مچھر کی بد دعا لگی۔ فلیٹ کے اصل کرایہ دار چھٹی سے دو ایک دن پہلے ہی واپس آ گئے۔ اب ہم تھے اور ایک پرانے محلّہ کا دو چھوٹے کمرے اور واحد غسلخانہ والا فلیٹ جس کا انتظام آر سی ڈی کے ایک افسر نے ہم پر ترس کھا کر کیا تھا۔ یہ فلیٹ ان کی ہمشیرہ کا تھا۔ کرایہ کچھ ایسے طے ہوا کہ دفتر کو پچاس فی صد بچت، لینڈ لیڈی کو سو فی صد منافع، خسارہ سارے کا سارا ہمارے حصہ میں آیا۔ مستقل رہائش کے لئے گھر کی تلاش جاری رہی۔ جو کوئی بھی کرائے کے گھر کی نشاندہی کرتا میں اس کے ساتھ گھر دیکھنے کے لئے چل پڑتا۔ تہران میں بے گھر ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے چار ہفتہ میں اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے جتنے گھروں میں جھانک لیا اور جتنے آدمیوں سے اس سلسلہ میں میرا معاملہ پڑا اس کا موقع عام حالات میں مجھے پورے چار برس میں بھی میسر نہ آتا۔

تہران میں مکانوں کی درجہ بندی کچھ یوں ہے۔ محل بادشاہ کے لئے، اونچی چار دیواری میں چھپے ہوئے محل نما مکان امیرالامرا کے لئے، جدید طرز کے خوش نما ولا امرا کے واسطے، خوش نما ماڈرن فلیٹ خوشحال لوگوں کے لئے، چھوٹے فلیٹ متوسط طبقہ کے لئے، تنگ و تاریک گھر نچلے متوسط طبقہ کے لئے اور کچی آبادیاں غریبوں کے لئے۔ یہ کچی آبادیاں پاکستان میں کچی اور ایران میں پکی ہوتی ہیں۔ میں نے ایران کی پہلی کچی آبادی کرج شہر کے باہر دیکھی۔ اس بستی کا نام "زور آباد" ہے۔ لوگوں نے زبردستی پہاڑی اور اس کے دامن میں یہ بستی بسالی۔ حکومت کے کارندے گھر گرانے کے لئے آئے۔ لڑائی جھگڑا ہوا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے، کچھ مارے بھی گئے۔ فتح کچی آبادی والوں کی ہوئی۔ جن لوگوں نے زور بازو سے اس علاقہ پر قبضہ کیا تھا انھوں نے اس کا نام زور آباد رکھ دیا۔ سرکار نے بھی نام کی منظوری دے دی۔ ہر ملک میں سرکار یہی کرتی آئی ہے۔ ضرورتمند کی ضرورت کا خیال نہیں رکھتی۔ وہ قانون توڑ دیتا ہے۔ حکومت اس وقت جاگتی ہے جب پانی سر سے گزر جائے۔ ٹرک، بلدیہ کا عملہ اور پولیس موقع پر جاتی ہے۔ جہاں جہاں کمزور لوگ آباد ہیں وہاں بل ڈوزر چلا دیتی ہے۔ جہاں زور دار لوگ آباد ہیں وہاں سے پولیس اور عملہ فرار ہو جاتا ہے۔ چیف منسٹر خود موقع پر جاتا ہے اور کچی آبادی کو مستقل کرنے کے اعلان کرتا ہے۔ قانون کا محافظ اپنے ہاتھ سے قانون کی دھجیاں کرتا ہے اور ہر دھجی کو اپنے دست مبارک سے پروانۂ ملکیت کے طور پر تقسیم کرتا ہے۔ اس ساری محنت کا

صلہ بس ایک نعرہ۔ وزیرِ اعلیٰ شیر ہے۔ باقی ہیر پھیر ہے۔

پاکستان میں ہم جس عمارت کو بنگلہ یا کوٹھی کہتے ہیں اسے ایران میں ولا کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولا کی چار دیواری بہت اونچی ہوتی ہے اور اس میں تالاب اور تہ خانہ ہوتا ہے۔ تہ خانہ کے ایک حصہ میں انجن روم اور دوسرے میں ملازمین کی رہائش کا انتظام ہوتا ہے۔ ولا کو گرمیوں میں ٹھنڈا کرنے اور سردیوں میں گرم رکھنے کی مشین انجن روم میں لگی ہوتی ہے۔ ولا میں عام طور پر کوئی کھلا چبوترہ نہیں ہوتا۔ موسم اس کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ کون موسم بہار کے چند دنوں کی خاطر چھ سات ماہ اس چبوترہ کی گرد اور دو تین ماہ اس کی برف صاف کرتا رہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ الکٹرونک آلات سے صدر دروازہ کھلنے، حفاظتی الارم بجنے، کمروں میں موسیقی کی دھنیں بکھیرنے، اندر خانہ گفتگو کے لئے انٹرکام نصب ہونے اور باورچی خانہ میں جدید ترین آلات کی بھرمار کے باوجود ان کوٹھیوں اور بنگلوں میں نہ گیس کی پائپ لائن موجود ہے اور نہ ہی گندے پانی کے نکاس کے لئے کوئی بدرو ہے۔ گیس کے سلنڈر بازار سے منگانے پڑتے ہیں۔ گھر کا گندہ پانی گھر ہی میں بنے ہوئے ایک گہرے آب گیر میں جا گرتا ہے۔ سلنڈر خالی ہو جائے تو گیس کمپنی اور حوض بھر جائے تو تخلیہ چاہ کی فرم کو ٹیلیفون کرنا پڑتا ہے۔

ذہن کے کسی گوشہ میں یہ واقعہ محفوظ تھا کہ جب مولانا محمد حسین آزاد ایران سے واپس آئے تو ان کے توشہ دان میں روزمرہ کا ایک محاورہ بھی تھا جسے وہ ایک باورچی خانہ سے اٹھا کر لائے تھے۔ ہانڈی میں ابال آیا۔ مولانا سوچتے ہی رہ گئے کہ اس کیفیت کو فارسی میں کیسے بیان کریں۔ دس برس کی بچی نے مشکل حل کر دی۔ اماں کو آواز دی۔ دیگچہ سرکردہ۔ چولھے کی حرارت پا کر پانی یا دودھ کا جوش میں آنا اور اپنی سطح سے بلند ہو کر گرم ہوا کے بلبلوں کے سہارے دیگچی کے کناروں تک پہنچ کر جھاگ کی صورت نیچے گرنا۔ اس سارے عمل کے لئے سرکردہ کی ترکیب مولانا آزاد کو بہت پسند آئی۔ مختصر اور برمحل۔ ساری بات بیان میں آجاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو مولانا آزاد سے عقیدت اور اچھی نثر اور بندش سے دلچسپی رکھتا ہے اس نے یہ واقعہ پلے سے باندھا ہوا ہے۔ حالانکہ اس بات کا ذکر مولانا آزاد کی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ برجموہن دتاتریہ کیفی نے یہ واقعہ مولانا سے سنا اور اپنی کتاب منشورات میں درج کر دیا۔

ان دنوں میں مکان کی تلاش کے بہانہ بے دھڑک ایرانی گھروں میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ باورچی خانہ میں ضرور جاؤں۔ کیا عجب کہ اس وقت وہاں چاول پک رہے ہوں۔ ماں دالان میں ہو۔ پانی ابل رہا ہو۔ اور مولانا آزاد کو ملنے والی بچی کی چوتھی نسل سے کوئی ماڈرن لڑکی میرے لئے نیا محاورہ لئے کھڑی ہو۔ مجھے جو نوجوان بچیاں گھروں میں نظر آئیں وہ باورچی خانہ کے بجائے ٹی وی لاؤنج میں مغربی موسیقی میں گھری ہوئی ملیں۔ سب کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا مگر دو چار کے بارے میں یقین ہے کہ انہوں نے میری خاطر ناچ کی مشق میں وقفہ کرنا مناسب سمجھا۔ ایران میں چاول کا دیگچہ ابلتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا۔ چاول اب جاپان کی نیشنل کمپنی کے خود کار اور سربند کوکر میں پکائے جاتے ہیں۔ پرانے خوشبودار چاول اور پرانے مہک والے محاورے دونوں اس نئے جاپانی کوکر میں اندر ہی اندر گل جاتے ہیں۔ ایک دیگ جو میں نے ایران میں اپنے قیام کے آغاز میں ابلتے ہوئی دیکھی ہے وہ بے پناہ دولت، بے فکر جوانی اور بے چین الیکٹرونک موسیقی کی شب دیگ ہے۔ ایک دوسری اور بڑی سی دیگ بھی ہے۔ دولت سے محروم، ظلم سے عاجز، بے اختیار اور بے آواز لوگوں کے جذبات کی دیگ ہے۔ کھدبد اس میں بھی ہو رہی ہے۔ نہ جانے کب ابل پڑے یا پھٹ جائے۔ ابلی تو اصلاحات، پھٹی تو انقلاب۔

آج ایک خاتون نے مجھے اپنا باورچی خانہ بڑے فخر کے ساتھ دکھایا۔ پہلے خانہ سازی کی وہ کتابیں اور آرائش خانہ کے وہ رنگین رسالے دکھائے جن کے مطالعہ کا نتیجہ ان کے باورچی خانہ کی صورت میں نکلا تھا۔ اس کے بعد باورچی خانہ دکھایا بلکہ سمجھایا۔ حسب دستور ان کی الماریوں میں سب سے زیادہ بوتلیں آب لیمو اور ٹماٹو کیچ اپ کی ہیں۔ میرے لئے اس خوبصورت اور جدید کچن میں دلچسپی کی چیز مائیکرو ویو چولھا ہے۔ میں نے اس سے پہلے اس چولھے کو صرف دور سے شوکیس میں سجا ہوا دیکھا ہے۔ جب خاتون نے گنجینہ سرد سے نکلے ہوئے ایک برفانی ڈلے کو لمحوں میں اس چولھے کی مدد سے گرما گرم کھانے میں تبدیل کر دیا تو میں اس مشین کے کمال کا قائل ہو گیا۔ خاتون نے پوچھا۔ چھوٹی الیکٹرو مقناطیسی لہروں کا یہ چولھا کیسا لگا۔ میں نے کہا۔ حیران کن اور افسوس ناک۔ حیرت کی وجہ ظاہر ہے۔ اس مشین کی ایجاد سے پہلے ہمارا تجربہ تھا کہ منجمد کئے ہوئے کھانے کو گلانے اور گرم کرنے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔ اس مشین نے ہمیں یاد دلایا کہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کو

انجام دینے کے لئے وقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف "کن" کہنے کی دیر ہے کہ وہ کام مکمل ہو جاتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے اس چھوٹی لہروں کے تنور میں کھانے کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی رکھ دیا ہے۔ وہ سب دم پخت ہو گئی ہیں۔ آپ نے فارسی زبان اور اس کا لہجہ، فارسی ادب اور ایرانی آرٹ، روایت اور تہذیب بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بعض شخصیات اور اعتقادات کو بھی اس تیز رفتار چولھے میں جھونک دیا ہے۔

گھروں کے اندرونی حصہ میں اندھیرا کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے بجلی کا استعمال بے دردی سے کیا جاتا ہے۔ جو اندھیرا ایک بلب کی روشنی سے دور ہو سکتا ہے اس کی پسپائی کے لئے تین چار بلب روشن کر دیتے ہیں۔ جہاں تین چار کی ضرورت ہو وہاں پندرہ بیس قمقمے لگا دیتے ہیں۔ میں نے ایک گھر میں پینتالیس فانوس اور ان سے ملتی جلتی دیوار گیر روشنیاں شمار کی تھیں۔ تہران میں فانوس فروش کی ایک چار منزلہ دکان ایسی بھی ہے جس میں چوتھی چھت سے لٹکا ہوا فانوس زمین تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ ہر گھر میں مے نوشی کے لئے بار بنی ہوئی ہے۔ صراحی اور ساغر قطار اندر قطار سجے ہوئے ہیں۔ مشروبات کی لبالب اور سربمہر بوتلوں کے ساتھ ادھ بھری اور تقریباً خالی بوتلیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ گھریلو میخانہ کی دیوار پر خیام کی رباعی لکھی ہوئی ہے۔ ان گھروں میں پالتو جانور بہت کم ہیں۔ بچے ان سے بھی کم۔ اور کتابیں نہ ہونے کے برابر۔

گھروں کی جانچ پڑتال کے دوران موقع پاتے ہی میں مالک مکان سے یہ پوچھ لیتا ہوں کہ آپ اپنا گھر کرائے پر کیوں اٹھا رہے ہیں۔ بیشتر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے بچوں کو تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا ہے۔ اخراجات میں جو اضافہ ہو گیا ہے اسے پورا کرنے کا بس یہی ایک آسان طریقہ رہ گیا ہے۔ دو مرتبہ اس سوال کا جواب سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک بہت بڑے ولا کے والی نے کہا۔ میں اس گھر کو اب اپنے لئے غیر محفوظ پاتا ہوں۔ میری چھٹی حس یہ کہتی ہے کہ کسی سفارت کار کو کرائے پر دے کر سال دو سال کے لئے پیرس چلے جاؤ۔ اور جب میں نے یہی سوال فریدوں تولّلی سے کیا تو اس نے کہا۔ یہ ولا میرا نہیں۔ میں اتنا امیر نہیں کہ تنہا ایسا گھر بنوا سکوں۔ یہ میرے خاندان کے پانچ چھ افراد کی مشترکہ سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔ میں ان سب کا کار مختار ہوں۔ ہم آپ کو یہ گھر ساڑھے تین ہزار ڈالر ماہانہ کرائے پر دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ یہ گھر کرایہ پر لیں یا

نہ لیں میں آپ کو ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ آپ نیاوران پیلس جو شہنشاہ کی رہائش گاہ ہے اس سے ایک میل کے فاصلہ کے اندر گھر مت لیجئے گا۔ میں اس وقت اپنی بات کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ چار سال کے لئے تہران آئے ہیں۔ یہ لمبی مدت ہے۔ میری بات دو ڈھائی سال کے عرصہ میں خود بخود آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

ایک دن تنگ آکر ادارہ کی انتظامیہ کے ایک افسر نے کہا۔ سر، آپ مکان کے سلسلہ میں اتنے سنجیدہ نظر نہیں آتے جتنا آپ کو ہونا چاہئے۔ ایسی بے نیازی کس کام کی۔ خود تکلیف اٹھائیں اور بیوی بچوں کو بھی تکلیف اٹھانے پر خواہ مخواہ مجبور کریں۔ اس ادارہ کے ساتھ تین ممبر ملکوں کا وقار وابستہ ہے۔ آپ کے ایک پیشرو کا گھر اتنا کشادہ تھا کہ وہاں سو سو آدمیوں کے کھانے کی دعوت ہوتی تھی۔ ایک اور سیکرٹری جنرل جو غیر شادی شدہ تھے تنہا اتنے بڑے مکان میں رہتے تھے جس میں دو تین خاندان آرام سے سما جائیں اور پتہ بھی نہ چلے۔ جب تک گھر نہیں ملتا آپ کو فیملی سمیت کسی فائیو سٹار ہوٹل میں قیام کرنا چاہئے۔ مکان کی تلاش وقت اور توجہ طلب ہے اور ادھر آپ اپنا بیشتر وقت تعارفی ملاقاتوں میں صرف کر رہے ہیں۔ معلومات اور مواد جمع ہوتا ہے۔ سوال و جواب تیار کئے جاتے ہیں۔ ملاقات کے بعد گفتگو کے لمبے لمبے نوٹس عملہ کے مختصر نویسوں کو لکھائے جاتے ہیں۔ وہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی دانستہ ٹائپ میں اتنی غلطیاں کر دیتے ہیں کہ آپ کو خلاصہ دوبارہ ہاتھ سے لکھنا پڑتا ہے۔ جناب من، میرا مشورہ ہے کہ آپ دو تین ماہ کے لئے رہائش گاہ کی تلاش کو اپنا واحد ضروری سرکاری کام قرار دیں۔ دیگر سرکاری کام جو ایک مدت سے زیر غور ہیں اگر کچھ عرصہ اور ان پر غور و خوض ہوتا رہا تو کونسی قیامت آجائے گی۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ آر سی ڈی میں فیصلے بہت سوچ ساچ کر کئے جاتے ہیں۔

میں نے ان کی دلجوئی کی۔ خانہ گیری کے لئے بس اک تمہارا مشورہ صائب ہے۔ اس سے دوستی اور اپنائیت کی مہک آتی ہے۔ دوسرے مشورے صرف خانہ پری کے لئے ہیں۔ تم سے دل کی بات کی جا سکتی ہے۔ دراصل میرا تجاہل بالکل اوپری ہے۔ اندر سے میں بھی اپنی خانہ بدوشی سے پریشان ہوں۔ موجودہ رہائش گاہ کی صورت یہ ہے کہ جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہم چاروں ہر وقت ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہتے ہیں یا فلیٹ کے واحد غسلخانہ کے باہر قطار میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ صورت تابہ کے۔ لیکن مجھے اس

خیال سے بڑی تقویت ملتی ہے کہ ہر صبح تہران میں لاتعداد مشینیں، ہزاروں کارکن اور سینکڑوں انجینئر صرف اس لئے حرکت میں آتے ہیں تاکہ وہ جلد از جلد میرے لئے ایک نیا گھر بنا دیں۔ جہاں اتنے بہت سے لوگ ایک آدمی کی حاجت روائی کے لئے مصروف کار ہوں وہاں اس آدمی کا ضرورت سے زیادہ فکرمند ہونا محض ناشکری ہوگی۔ تہران میرے لئے جائے شکوہ نہیں مقام شکر ہے۔ اس شہر میں جگہ جگہ نئی بستیاں اور رہائشی عمارتیں بن رہی ہیں۔ شہر کے مرکز میں، شہر کے چاروں طرف، اور شہر سے ذرا فاصلہ پر۔ ان میں کہیں نہ کہیں اس چار دیواری پر بھی چھت پڑ ہی جائے گی جس کے دروازے پر شہری بحالیات کے فرشتہ نے ہمارے نام کی تختی لگائی ہوئی ہے۔ البتہ کبھی اس خیال سے وحشت ہونے لگتی ہے کہ جب گھر مل جائے گا تو ہم ان تمام احباب کے مشوروں سے محروم ہو جائیں گے جو ہماری بے گھری کو اپنی ہمدردی کے حصار میں لئے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو بے گھر سفارتی نمائندوں کی ایک انجمن بن گئی ہے اس کی رکنیت بھی چھوڑنی پڑے گی۔ گھر ملا تو تعارف اور گفتگو کا ایک موقع اور موضوع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اہل ایران کی بود و باش کا جائزہ لینے اور مشاہدہ کرنے کا جو بہانہ ملا ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ گھر ملنے کا ایک فائدہ ہو گا اور سو نقصان۔

سویڈن کے سفیر نے کہا کہ میں نے 1975ء میں جو گھر فرمانیہ میں ایک ہزار تین سو ڈالر ماہانہ پر لیا تھا اس کے کرائے میں پہلے سال بیس اور دوسرے سال ایک سو بیس فیصد اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود مالک مکان اس سال گھر خالی کرانے پر مصر ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے سفیر کو معتبر جانتے ہوئے حکومت بنگلہ دیش ان کے ہر سیاسی تجزیہ اور انتظامی سفارش کو بغیر پس و پیش کے مان لیتی ہے مگر جب وہ یہاں کے بڑھتے ہوئے کرایوں کے بارے کوئی تجویز بھیجتے ہیں تو انہیں سراسر ناقابل اعتبار ٹھہرایا جاتا ہے۔ نیوزی لینڈ کے سفیر کہنے لگے کہ میں کرائے میں اضافہ کی تجویز تہران سے ولنگٹن بھیجتا ہوں۔ وہاں اس پر وزارت خارجہ اور وزارت مالیات میں غور ہوتا ہے۔ مالی سال کا آغاز ہو تو وہ کہتے ہیں تجویز قبل از وقت ہے اور اگر آدھا سال گزر جائے تو کہتے ہیں اگلے سال کا انتظار کرو۔ جتنی مدت میں اضافہ کی منظوری ملتی ہے اتنے میں کرائے اور بڑھ جاتے ہیں۔ مکان حسب معمول پہنچ سے پرے رہتا ہے۔ اب کون بار بار اس مسئلہ کو اٹھائے۔ یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا

کریں۔ ناچار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صومالیہ کے سفیر کہنے لگے۔ میرا ملک تہران کے کرایوں کی تاب نہیں لاسکتا۔ میں مکان خالی کر رہا ہوں۔ متحدہ عرب امارات کے سربراہ شیخ زید النہیان نے ایک عمارت تحفہ میں دی ہے۔ رہائش اور دفتر دونوں اس عمارت میں منتقل کر رہا ہوں۔ رئیس السفراء کویت کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دس پندرہ دن کے بعد پردیس میں رہتے رہتے اداس ہو جاتے ہیں۔ ان کا ہوائی جہاز آجاتا ہے اور وہ آخر ہفتہ گزارنے کے لئے کویت چلے جاتے ہیں۔ سفارتی نمائندوں نے دوہائی دی اور وہ فوراً ایک یادداشت وزارت خارجہ میں جاکر دے آئے جس میں صاحب جائیداد لوگوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے پیدا ہونے والی سفارتی تشویش کا ذکر تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر گھ چلے گئے۔ گھر دور ہو تو اکثر اور قریب ہو تو بیشتر یاد آتا ہے۔

ابتلا کے اس دور میں دو سفیر بڑے مطمئن نظر آتے ہیں۔ ایک پاکستان کا اور دوسرا ترکیہ کا۔ شہنشاہ نے پاکستان کو ایک قطعہ اراضی فرح پارک میں سفارت خانہ کی تعمیر کے لئے ہدیہ کیا۔ زمین کی قیمتیں جب آسمان سے باتیں کرنے لگیں تو وہ قطعہ فروخت کر دیا گیا۔ نصف رقم سے دفتر کے لئے بنی بنائی عمارت خرید لی اور بقیہ ریال بنک میں جمع کرا دیئے۔ ترکی کو بھی تحفہ ملا تھا۔ یہ الٰہیہ کے علاقہ میں واقع ایک پورا جنگل ہے جس کے گرد فصیل بنی ہوئی ہے۔ یہ تحفہ رضا خاں نے اپنے پیرومرشد مصطفیٰ کمال پاشا کو دیا تھا۔ جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے ریگستان، نخلستان، پہاڑوں، وادیوں اور ساحلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ملک کی صورت جمع کیا تھا۔ بیرونی طاقتوں کی مداخلت کو حتی الامکان کم کیا اور ملک کو ماڈرن بنانے کے لئے تعلیم، تنظیم اور تعمیر سے کام لیا۔ اس نے نئی سڑکیں بنانی شروع کیں۔ ان میں سے بہت سی سڑکیں ایسے علاقوں سے گزرتی تھیں جن پر قدامت پسند مُلّا قابض تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سڑکوں کی تعمیر کو مداخلت فی الدین تصور کیا گیا۔ رضا خاں نے ضابطہ قانون بھی تبدیل کیا۔ شادیاں سرکار کے رجسٹر میں درج ہونے لگیں۔ عورتوں کو طلاق حاصل کرنے کا حق ملا۔ غیر مسلموں کو کئی ایسی مساجد اور کئی ایسے مقابر میں آنے جانے کی اجازت ملی جہاں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔ محرم کے دوران کھلے بندوں کوڑے مارتے ہوئے ماتم کرنے پر پابندی لگی۔ عورتوں کا نقاب الٹا۔ مردوں کو کوٹ پتلون اور ہیٹ پہنایا۔ روس کے پیٹر دی گریٹ کی طرح آخر کار رضا خاں کا ہاتھ روحانیان کی

ڈاڑھی تک جا پہنچا۔ وہ بے ریش چہرے پسند کرتا تھا۔ جب اس کی اصلاحات کی مخالفت ہوئی تو وہ بکتر بند گاڑیاں لے کر قم پہنچا اور فوجی فل بوٹ پہنے ہوئے معصومہ مسجد میں داخل ہو گیا۔ مشہد میں فوجی دستے رائفل اور مشین گن لے کر روضہ امام رضا میں گھس گئے۔ جب خانہ بدوشوں نے بستیوں میں آباد ہونے سے انکار کیا تو خان صاحب نے ان کے پھیری والے علاقہ کے کنوؤں میں زہر ڈلوا دیا۔ بہت سے لوگ رضا خان کے ان فیصلوں اور حرکتوں کی وجہ سے ناراض ہو گئے۔ ان ناراض ہونے والوں میں علامہ اقبال بھی شامل تھے جو ایک زمانہ تک کمال پاشا اور رضا خان کی فوجی صلاحیت اور انتظامی قابلیت کے بڑے معترف تھے۔ جب ان دونوں نے اپنی راہ گم کر دی تو وہ بھی اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی۔ کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی۔

میں نے روح شرق کو 1978 ء میں تہران کی سڑکوں پر مارا مارا اور در بدر پھرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شروع میں اس کا حلیہ کچھ ایسا تھا۔ خراب و خستہ۔ خاموش اور بے زبان۔ پریشان اور کھوئی کھوئی۔ ہر قدم سوچ اور احتیاط کے ساتھ اٹھاتی ہوئی۔ اس کی صورت ایک مختصر سی ٹولی کی ہوتی جو خیابان شاہ رضا کی طرف سر جھکائے جا رہی ہوتی یا وہاں سے سر اٹھائے واپس آ رہی ہوتی۔ وقت کے ساتھ اس کا حلیہ بدل گیا۔ ٹولیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ شمال کے سوا شہر کی ہر جانب سے نکلنی شروع ہو گئیں۔ دوسرے شہروں کے لوگ بھی تہران کی ریس میں سڑکوں پر نکل آئے۔ لوگ آتے چلے گئے اور کارواں بنتا چلا گیا۔ ایک دن میں نے اس کاروان میں ایک ملین افراد کو شامل دیکھا۔ متحد، منظّم، پرجوش اور پریقین۔ ہاتھوں میں ایک شخص کی تصویر اٹھائی ہوئی۔ اس کا نام لیتے اور درود پڑھتے۔ اس روز مجھے اعتبار آ گیا کہ روح ایران جس بدن کی تلاش میں تھی وہ اسے مل گیا ہے۔ اس بدن کا نام جمہور ہے۔ جمہور کے قائد کو یہاں امام کہتے ہیں۔

(3)

جب میں مکان کی تلاش میں موڑ پر نکلا اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کے پاس سے پہلی بار گزرا تو میرے دل میں ایک خیال آیا جسے میں نے فوراً پیچھے دھکیل دیا تاکہ وہ لبوں تک نہ آسکے۔ پھر جب ان ٹولیوں اور جلوسوں سے سر راہے ہر روز ملاقات ہونے لگی اور میرے ایرانی ہمراہی نے اس منظر کے بارے میں محتاط گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے اسے اپنے خیال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ ان دنوں ہم لوگ ہفتہ میں دو تین بار کسی اسٹیٹ ایجنسی کے نمائندہ کے ہمراہ مکان دیکھنے کے لئے جاتے تھے۔ مکان یا محلّہ ناپسند ہوتا یا اس کا کرایہ ہماری پہنچ سے باہر اور شرائط نامعقول ہوتیں۔ ایک مکان کے ساتھ شرط یہ تھی کہ ماسٹر بیڈ روم، اس کا ڈرسنگ روم اور غسلخانہ کرائے میں شامل نہیں ہیں۔ مالک اس میں تالا ڈالے گا مگر اسے حق حاصل ہو گا کہ سال میں پندرہ دن اس بیڈروم میں آکر بسر کرے۔ یہ ماسٹر بیڈروم گھر کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ ایک صاحب مصر تھے کہ ان کا پونی اصطبل میں اور بلیاں گھر کے اندر رہیں گی۔ وہ ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم چھوڑ جائیں گے۔ بلیوں کے کھانے پینے کے لئے دودھ گوشت اور خواب دیکھنے کے لئے چھچھڑوں کا انتظام کرایہ دار کو کرنا ہو گا۔

ایک دن مکان دیکھنے گئے تو مالک مکان سے دیر تک اس کا پورٹ فولیو بیگ ہی نہ کھلا جس میں مکان کی چابی رکھی ہوئی تھی۔ بیگ میں قفل ہندسہ لگا ہوا تھا اور مالک کو صحیح نمبر یاد نہ تھا۔ کہنے لگا میں ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو اس تالے کے اعداد بدل دیتا ہوں۔ جب کبھی تازہ نمبر بھول جاؤں تو اسی طرح سب کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ بے شرم غرض مند کی طرح ہم لوگ بھی پندرہ بیس منٹ تک تماشا دیکھتے رہے۔ اس دوران میں مجھے ابن حسن برنی کا ایک تبصرہ یاد آیا۔ ایک دن موج میں تھے اور معاشرہ کی ان کمزوریوں کا حال سنا رہے تھے جن پر عام طور سے کوئی توجہ نہیں کرتا۔ بولے، یہ پاکستانی بھی کیا سادہ لوح ہیں۔ ساری قوم کے سمسو نائٹ مارکہ سوٹ کیس اور دستی بیگ کے نمبروں والا 786 پر کھل جاتا ہے۔ ان لوگوں کو ترکیبی تالہ کے استعمال کی ترکیب بھی نہیں آتی اور ہندسوں کے ادل بدل سے جو سینکڑوں بلکہ ہزاروں نئے نمبر بنتے ہیں وہ ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

دراصل یہ لوگ برکت اور حفاظت کا فرق بھی نہیں جانتے۔ میں نے کہا۔ یہ سچ ہے کہ ہم راز کی حفاظت کے معاملہ میں قدرے لاپرواہیں۔ ایٹم بم کو لے لیجئے۔ ہرایرا غیرا اس سلسلے میں یوں بیان دیتا ہے گویا وہ ڈاکٹر اے کیو خاں ہے۔ پروا کرنے اور پردہ پوشی کا کام ہم نے پروردگار پر چھوڑ رکھا ہے۔ ایک دن جنرل موسیٰ نے اپنے دستی بیگ کے نمبروں والے تالے کو کچھ دیر گھمانے کے بعد تالے کو برا بھلا کہتے ہوئے فرمایا۔ نان سنس ۔ مجھے نمبر صحیح طور پر دکھائی نہیں دیتے اور وہ عینک جسے لگا کر میں ان نمبروں کو پڑھ سکتا ہوں وہ اس پورٹ فولیو بیگ کے اندر بند ہے۔ ایک سمارٹ نوجوان اٹھا اور سیلوٹ مارنے کے بعد کہنے لگا۔ سر میں کھول دیتا ہوں۔ پھر اس نے سرگوشی کرتے ہوئے نمبر پوچھا۔ جرنیلی جواب باآواز بلند ملا۔ اس تالے کا کوڈ نمبر ہے۔ تھری ناٹ تھری۔ تالا کھولو اور نمبر کو فوراً بھول جاؤ۔ آس پاس موجود ہر شخص کو یہ نمبر یاد ہو گیا۔

میں نے محمد ہرندی سے کہا۔ یہ خیال کئی دن پہلے آیا تھا مگر آج تم سے بیان کر رہا ہوں۔ یہ ہاؤسنگ ایجنسیوں کی فہرست جو تم لئے پھر رہے ہو اسے میں نے کئی بار پڑھا ہے۔ ارژنگ، کندو، وکٹری، البغل. شارپ، رابنسن ، مون ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔ اس فرد میں مجھے اس ایجنسی کا نام دکھائی نہیں دیا جس کی معرفت بالاخر مجھے مکان ملے گا۔ اس نے بڑے اشتیاق سے ایجنسی کا نام پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ جلوس لیکن یہ عربی اور فارسی والا جلوس نہیں بلکہ اردو والا جلوس ہے۔ آپ بیٹھنے کو جلوس کہتے ہیں اور ہم اٹھ کھڑے ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے جلوس جو روز ہمیں سڑک کے کنارے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جس دن سڑک کے بیچوں بیچ چلنا شروع کریں گے۔ اس دن مجھے مکان مل جائے گا۔

اسفر جانی نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ سر، اگر آپ دو چار ماہ اور انتظار کر سکیں تو ایک بہت اچھا ولا مل سکتا ہے۔ مجھے اپنے بھائی کی باتوں سے لگتا ہے کہ جمشید آموز گار کی حکومت اب زیادہ دیر تک نہیں چلے گی۔ میرا بھائی نئی کابینہ میں شرکت کے بجائے ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا اس کا گھر خالی ہو جائے گا۔ میں یہ سن کر بہت حیران ہوا کہ وزیر خزانہ ابھی سے ملک چھوڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ گویا اندرون خانہ حالات اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں جتنے تہران یونیورسٹی کے صدر دروازے کے آس پاس نظر آتے

ہیں۔

ایک دن یکایک مجھے مکان مل گیا۔ وہی جو صومالیہ کے سفیر نے کرائے کے اضافہ کی وجہ سے خالی کیا تھا۔ وہی جس کا جزوی مالک میرے ساتھ کرایہ کی حد کم ہونے پر اظہار ہمدردی کر کے واپس چلا گیا تھا۔ ادھر ژالہ چوک میں جلوس پر گولی چلی ادھر وہ کرایہ نامہ لے کر دفتر آ پہنچا۔ کرائے کی نئی حد تین ہزار ڈالر ماہانہ ہے اور یہ رقم اسے منظور ہے۔ وہ ایک دور اندیش نوجوان ہے جو حالات کا رخ دیکھ کر اندازہ لگا چکا ہے کہ کل کوئی اتنی رقم دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہو گا۔ خیابان اسفند یار والے مکان کے کرایہ نامہ پر میں نے دستخط کر دیئے۔ ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی کہ میرے دفتر میں اسٹیٹ ایجنسیوں کے نمائندوں اور مالکان مکان کا تانتا لگ گیا۔ الٰہیہ کے اس مالک مکان کا فون بھی آیا جس کا اخبار میں اشتہار پڑھ کر میں اور عذرا ولا دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ اشتہار میں لکھا تھا کہ یہ ولا اندلسی طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے اور اس کے لان سے سورج غروب ہونے کا منظر دیدنی ہے۔ ہم مغرب سے ذرا پہلے گئے اور خوش منظری کے اشتہاری دعوے کو بالکل درست پایا۔ عمارت مختصر سی تھی۔ ہماری ضروریات سے قدرے کم۔ مالک مکان نے جو ہمارا انٹرویو لیا وہ طویل اور صبر آزما تھا، تقریباً ہماری قوت برداشت کے برابر۔ اس کے باوجود شاید ہم اس مکان کے بارے میں شرائط پر گفتگو شروع کرتے مگر مالک مکان کی ایک حرکت نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی جب ہم مکان کے بارے میں مالک مکان کا توصیفی لکچر سن کر عمارت کے اندر داخل ہونے لگے تو میں سب سے آگے تھا۔ میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوا۔ لمحہ بھر کمرے میں کھڑے رہنے کے بعد میں نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ مالک مکان دروازے کے ہینڈل کو رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔ جب دس بارہ ہفتوں کے بعد اس مالک مکان کا فون آیا تو میرے دل میں اس رگڑ کی کسک ابھی باقی تھی۔ فون پر انہوں نے بتایا کہ جس دن آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی اس وقت میرے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ گھر آپ جیسے باذاق شخص کے لئے تعمیر ہوا ہے۔ آپ میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی مثالی کرایہ دار میں ہو سکتی ہیں۔ خارجی، سفارت کار، مختصر گھرانہ، گھر داری کا سلیقہ وغیرہ وغیرہ۔ آپ جو کرایہ بھی دیں گے میں قبول کر لوں گا۔ اپنوں سے بھلا کوئی تکرار کیا کرتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ گھر ہمیں پسند

ہے۔ بس ایک قباحت ہے۔ ہینڈل کو ہاتھ سے گھمائے بغیر گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ اور یہ آپ کے لئے ممکن نہ ہو گا کہ مستقل دروازہ سے لگے کھڑے رہیں تاکہ ہر بار ہمارے ہینڈل گھمانے کے بعد رومال نکال کر اسے صاف کر سکیں۔

ایک شخص نے جس سے سرراہ ملاقات ہوئی تھی مجھے چائے پر بلایا۔ میں اس کے گھر پہنچا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی اور مہمان نہ تھا۔ اس نے کہا میں نے آپ کو زحمت دی ہے کہ آپ میرا گھر دیکھیں۔ یہ ایک باغ کے اندر واقع ہے۔ اس باغ میں پھلدار درخت بھی ہیں اور بڑا سا لان بھی ہے۔ موٹروں کے چار گیراج ہیں اور اتنے ہی کمرے ملازموں کی رہائش کے لئے ہیں۔ سگ خانہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں چار چھ کتے آرام سے رہ سکتے ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا میں ملک سے کچھ عرصہ کے لئے فرار ہونا چاہتا ہوں۔ میرا گھر اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ اس میں کوئی سفارت کار ٹھہرا ہوا ہو۔ کیا آپ یہاں رہنا پسند کریں گے۔ میں دو موٹریں، ایک کتا، دو مالی اور ایک چوکیدار چھوڑ جاؤں گا۔ ان کا خرچہ بھی خود برداشت کروں گا۔ کرائے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ دیں تو وہ بھی منظور ہے۔ بس کاغذات میں آپ کا نام کرایہ دار کی حیثیت سے لکھا ہونا چاہیئے۔

ہم لوگ عباس آباد کے ایک غسلخانہ والے چھوٹے فلیٹ سے اٹھ کر خیابان اسفندر یار والے ولا میں آ گئے۔ نئے گھر میں داخل ہوتے ہی ہر ایک نے سیدھا اپنے اپنے غسلخانہ کا رخ کیا۔ نیم گرم پانی سے ٹب بھرا۔ پانی میں باتھ فوم حل کیا۔ ہاتھ میں رسالہ لیا اور ٹب میں اتر گیا۔ نہ اس کا خیال کہ غسلخانہ کے دروازہ پر کیو لگا ہوا ہے۔ نہ اس کا خوف کہ ٹنکی میں پانی ختم ہو جائے گا۔ نہ اس کا ڈر کہ نالی بند ہو جائے گی اور پانی غسلخانہ سے نکل کر گھر کے دوسرے حصوں کی طرف چل دے گا۔ بالفرض پانی دوسرے کمروں میں پھر جائے تو بھی آج یہاں کوئی نقصان نہیں ہو گا کیونکہ یہ ولا اس وقت بالکل خالی ہے۔ پلنگ، میز، کرسی اور پردے نام کی کوئی چیز اس گھر میں موجود نہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گھر انسانوں سے آباد ہوتا ہے نہ کہ فرنیچر اور قالینوں سے۔ ہم نے فوم کے گدے فرش پر بچھائے اور خالی گھر میں جان پڑ گئی۔ میں نے زندگی بسر کرنے کا یہ سلیقہ رندوں سے سیکھا ہے۔ جو ظرف اٹھا لیا وہی پیمانہ بنا اور جہاں بیٹھ کر پی لی وہی مے خانہ

ٹھہرا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سفارتی دنیا جو مفت شراب نوشی کا سب سے بڑا بین الاقوامی کلب ہے وہ رندی کی خوبیوں سے قطعی ناواقف ہے۔ رندی ایک خالی گھر کی طرح بے تکلف، بے ریا اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ سفارت کاری تکلّفات، تشریفات اور تقریبات کے عجائب گھر میں بسیرا کرتی ہے۔

(4)

زیبائشِ خانہ کی ماہر خاتون نے پوچھا، سر، آپ اپنی سرکاری رہائش گاہ کے لئے کس قسم کے پردے پسند فرمائیں گے۔ میں نے کہا اس پردے کے علاوہ جو عقل اور آنکھوں پر پڑ جاتا ہے، کوئی سا پردہ بھی لگا دو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے فرق کی وضاحت شروع کی۔ پہلے ہمیں گھر کو تین حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ذاتی، رسمی اور کھلا۔ پھر ہر کمرے کے دروازوں اور دریچوں کی طرز تعمیر اور شگاف کی شکل کے مطابق درجہ بندی کرنی ہو گی۔ اس کے بعد ہم پردے کے اقسام کی عمومی تقسیم کرتے ہیں اور پھر ایک ایک کمرے کے لئے خصوصی تقسیم ہوتی ہے۔ اس مرحلہ میں میٹریل، رنگ، وزن، ڈیزائن اور بافت پر غور ہوتا ہے۔ اس کے بعد پردہ ٹانگنے کے مختلف طریقوں پر بحث شروع ہو گی۔ اور آخر کار سلائی کے جو بے شمار انداز ہیں ان میں سے من پسند انداز کا انتخاب کرنا ہو گا۔ مثال کے طور پر میٹریل کو لے لیجئے۔ پردے آج کل کپڑے، لکڑی، بانس، دھات، پلاسٹک، سبھی چیزوں سے بنتے ہیں۔ رہا کپڑے کا معاملہ تو اس کی قسمیں لاتعداد ہیں۔ نباتاتی ریشہ والا اور مصنوعی ریشہ والا یا ملا جلا۔ مصنوعی ریشہ بھی قسم قسم کا ہوتا ہے۔ لوگ ان میں تمیز نہیں کرتے اور تمام مصنوعی ریشوں کو دو ایک مشہور ناموں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ نام اصطلاحی، عمومی، خصوصی یا تجارتی ہے۔ میں نے کہا۔ ٹھہریئے۔ ذرا دم تو لیجئے اور مجھے سچ سچ بتایئے کہ اس علم کا پھیلاؤ واقعی اتنا ہے یا آپ نے پردے کو کھینچ تان کر اتنا لمبا چوڑا مضمون بنا دیا ہے۔ سر، آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔ پردہ تو خیر بہت بڑی چیز ہے، پردے کے بالائی دو تین انچ جنہیں ہیڈنگ یا پیشانی کہتے ہیں اس پر چنٹ ڈالنا بھی ایک علیحدہ فن ہے۔

چنٹ کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ پتلی، چوڑی، تنگ، کھلی، سادہ، ڈیزائن والی، صندوقی یا کارتوسی نالی دار۔

بات یہاں تک پہنچی تو میں نے ماتھے پر شکنیں اور حافظہ پر زور ڈالا اور کہیں سے کہیں جانکلا۔ چند ایسے شہروں کو یاد کیا جنہیں میں نے آزادی سے پہلے بچپن اور لڑکپن میں دیکھا تھا۔ علی گڑھ، دلی، آگرہ، کلکتہ، حیدر آباد، اورنگ آباد، لاہور، امرتسر، گجرات اور جلال پور جٹاں۔ میں نے مسلمانوں کے گنجان آباد محلوں اور ان کے تنگ اور دن کے وقت بھی تاریک رہنے والے گلی کوچوں کو یاد کیا۔ ان کھنڈر حویلیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا جو مسلمانوں کی خوشحالی کے دور کی یادگار تھیں اور جن میں رہنے والوں نے جا بجا کچی پکی دیواریں کھڑی کر کے ان کا بٹوارا کر لیا تھا۔ علی گڑھ کے تالا بنانے والوں، آگرہ کے جوتے بنانے والوں، جلال پور میں دستی کھڈی پر لوئی بننے والوں اور حیدر آباد دکن میں اچکن کے بٹن بیچنے والوں کے گھروں کو یاد کیا۔ کھاتے پیتے مسلمانوں کے پردہ دار زنانہ صحن والے نقشہ پر بھی غور کیا۔ سوال یہ ہے کہ ان گھروں میں کونسی قسم کے پردے ٹنگے ہوتے تھے۔ فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی یا ولایتی۔ ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان سب گھروں میں صرف ایک پردہ ہوا کرتا تھا۔ ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا جس میں لکڑی کا ایک ڈنڈا اوپر اور ایک نیچے پرو کر صحن یا ڈیوڑھی کے دروازے پر لٹکا دیتے تھے۔ ٹاٹ نیا اور چمکدار ہو تو مکین خوش حال۔ میلا اور پیوند لگا ہو تو گھر والے سفید پوش۔ پھٹا پرانا ہو تو اندر فاقہ ہو گا اور فاقہ مستی۔ جن دنوں برطانوی ہند میں ہر اسلامیہ اسکول میں صبح سویرے اقبال کے ترانہ کا یہ مصرع لہک لہک کر گایا جاتا تھا، خنجر ہلال کا ہے قومی نشان ہمارا، ان دنوں پردہ نشین عورتوں اور بوریا نشین مردوں کی قوم کا سب سے نمایاں نشان ٹاٹ ہوا کرتا تھا۔ لٹکا لیا تو پردہ۔ بچھا لیا تو غالیچہ۔ مسجد میں جاء نماز۔ مدرسہ میں فرش۔ خانقاہ میں مسند۔ ہر طرف ٹاٹ ہی نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ مفلسی کے محاورے نے مرد کو ٹاٹ کا لنگوٹا پہنا دیا اور عورت کو ٹاٹ کی انگیا۔

برِّ عظیم کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب کے خطرے اور انگریز حکمرانوں کے رہن سہن اور طور طریق کی یلغار سے بچاؤ کے لئے ہر ممکن ذریعہ کو استعمال کیا۔ ٹاٹ کا پردہ، دیوبند کا مدرسہ، اکبرالہ آبادی کا شعر۔ گلی میں کھلنے والے دروازے پر لٹکا ہوا ٹاٹ کا پردہ

بڑے کام کی چیز تھا۔ گھر کے اندر جو اونچ نیچ ہوتی اسے غیروں کی نظروں سے چھپائے رکھتا۔ باہر سے جو ناموافق نظریہ اور ناگوار فیشن دروازے پر دستک دیتا اسے وہیں روک لیتا۔ ایک طرف رکھ رکھاؤ کا وظیفہ اور دوسری طرف روک رکاؤ کا فریضہ۔ اتنی خدمت اور اہمیت کے باوجود اس قسم کے پردے کے لئے گھر کے اندر کوئی جگہ نہ تھی۔ برآمدہ میں کھلنے والے دروازوں پر بانس کی پتلی پتلی تیلیوں سے بنی ہوئی چق لگائی جاتی تھی اور گھر کے باقی تمام دروازے منہ کھلے اور کھڑکیاں بے نقاب ہوتی تھیں۔ ان دنوں کھڑکیاں شیشہ کے بغیر ہوتی تھیں۔ باہر لوہے کی سلاخیں، اندر لکڑی کے پٹ۔

دوسری جنگِ عظیم کے ساتھ خوشحالی اور شیشہ دونوں مسلمانوں کے گھر میں داخل ہوئے۔ لکڑی کے رنگین فریم میں لگے ہوئے فٹ بھر کے شیشہ کو چارپائی پر رکھ کر بناؤ سنگھار کرنے والی خواتین نے پہلی بار سنگھار میز کا نام سنا اور پہلی بار قد آدم شیشہ میں اپنا عکس دیکھ کر شرما گئیں۔ اندھی کھڑکیوں میں پہلی بار شیشہ کی آنکھیں لگیں اور باہر کی دنیا نظر آئی۔ سفید لٹھے کا شٹل کاک برقع پہننے اور دنیا کو کروشیئے کی بنی ہوئی باریک جالیوں میں سے جھانکنے والیاں حیران ہو گئیں۔ انھوں نے وقت کا ساتھ دینے کے لئے برقع کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ کوٹ اور نقاب۔ دیکھنے والی جالی کا جال بڑا کر دیا۔ لٹھے کی جگہ لیڈی ہملٹن نے لے لی۔ اس کا نام بھی بدل دیا۔ اب یہ ترکی برقع کہلانے لگا۔ اتنی بڑی سوشل تبدیلیوں کے زمانہ میں دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر گوند سے اخبار یا بھورے رنگ کا کاغذ چپکانے کا رواج عام تھا۔ جو لوگ وضع دار ہوتے وہ سبز رنگ کا پتلا کاغذ استعمال کرتے۔ آسودہ ہوتے تو ایک آدھ کمرے میں رنگدار شیشے لگوا لیتے۔ گھروں کے اندر کپڑے کے پردے لگانے کا فیشن بہت دیر سے اور بڑی آہستہ آہستہ آیا۔ پہلے بیٹھک کے صدر دروازہ پر کپڑے کا ایک پردہ لٹکا اور دوسرا سونے والے کمرہ کی واحد کھڑکی پر لگا۔ اس سے پہلے کہ باقی ماندہ دروازوں اور کھڑکیوں کی باری آتی برّ عظیم میں فسادات شروع ہو گئے۔ پردے کھڑکیاں کس شمار میں ہیں۔ ان فسادات کی شدت کی وجہ سے یار لوگ جان بچانے کے علاوہ سب کچھ بھول گئے۔

علی گڑھ میں ہم لوگ ذکا اللہ روڈ پر چار نمبر والے مکان میں آباد ہونے سے پہلے سات نمبر والے مکان میں رہتے تھے۔ اس کے سونے والے بڑے کمرے کی کھڑکی مشرق

کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی کے سامنے دور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ کھیتوں کے دوسری جانب اکھڑی اور گھسی ہوئی اینٹوں کی ایک ویران سڑک کے کنارے آم کے اونچے اور گھنے درختوں کی ایک قطار تھی۔ کھیتوں کی دائیں جانب چھوٹی سی منڈیر والا نماز کا چبوترا اور سرسید ہاؤس کی عمارت تھی۔ اس کھڑکی کے بہت سے فائدے تھے۔ اجالا، تازہ ہوا، رونق، کشادگی اور گھر بیٹھے بٹھائے باہر کی دنیا سے رابطہ۔ موسم کی مناسبت سے مور اور کوئل کی کوک بھی اسی کھڑکی سے اندر آتی۔ باجرے کے چمکیلے دانوں والے پتلے اور لمبے سٹوں کے لہلہانے کا منظر بھی اسی کھڑکی سے نظر آتا۔ ایک دو بار ہمیں دور کھیتوں سے پرے ہرنوں کی ڈار بھی نظر آئی۔ پردہ دار برقع پوش ماں کے لئے یہ کھڑکی کسی طرح جام جہاں نما سے کم نہ تھی۔ وہ دیر تک اس سے لگی کھڑی رہتیں۔ اتنی اہمیت اور خوش منظری کے باوجود وہ ایک معمولی سی کھڑکی تھی۔ اس میں کچے لوہے کی گول سلاخیں لگی تھیں۔ لکڑی کے پٹ بھاری اور بھدے تھے۔ کنڈی کا نمونہ لوہے کے ابتدائی زمانہ کا معلوم ہوتا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے شیشے تھے جن پر سبز کاغذ کی دہری تہ اتنی دبیز تھی کہ پو پھٹنے پر سورج اپنے جوتے اتار کر دبے پاؤں اندر آتا اور کھڑکی کی دہلیز پر کھڑا ہو جاتا۔ ایک دن بڑھئی آیا اور کھڑکی کے دونوں جانب لکڑی کے سادہ سے بریکٹ لگا کر چلا گیا۔ تین چار دن تک وہ بریکٹ یونہی لگے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آستین اونچی کئے دو باوضو ہاتھ کہنیوں تک دیوار سے باہر نکلے ہوں اور کف دست کو خم کئے دعا مانگ رہے ہوں۔ یا اللہ غلامی، ذلت اور افلاس سے مسلمانوں کو نجات دے۔ عزت، آسودگی اور ملک عطا فرما۔ ہم سارا برِّ عظیم واپس نہیں مانگتے۔ صرف ہماری اکثریت والا علاقہ ہمیں دے دے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس خطہ میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کریں گے جہاں امن، انصاف اور دیانت کا بول بالا ہو گا۔ یا اللہ ہمارے گناہوں اور کمزوریوں کی پردہ پوشی فرما۔ چند دنوں کے بعد درزی آیا اور اس نے کھڑکی پر ایک پھولدار پردہ لگا دیا۔

ایک روز پردہ ہٹایا تو منظر بدلا ہوا تھا۔ کھیت کے شمالی کنارے پر جہاں ایک اندھا کنواں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹبے اور گڑھے واقع تھے۔ وہاں سر سید احمد خاں کی بہو، جسٹس سید محمود کی بیوہ اور سر راس مسعود کی والدہ نے کرائے کے لئے کوارٹر بنوانے شروع کر دیئے۔ مزدوروں میں جتنے مرد تھے اتنی عورتیں بھی تھیں مگر جنس اور لباس کی وجہ سے

مردوں سے کہیں زیادہ نمایاں تھیں۔ یہ مزدور کسی پنچ ذات کے خانہ بدوش تھے۔ اچھوت اور ملیچھ مزدور بنیادیں کھود رہے تھے۔ پھاوڑا چلاتے تو ہر ضرب کے ساتھ سانپوں کے جسم کے ٹکڑے بھی مٹی کے ساتھ باہر آجاتے۔ لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے مگر مزدور تماش بینوں سے لاتعلق اور سانپوں سے بے فکر ننگے پاؤں اپنے کام میں لگے رہے۔ وہ تو اس وقت بھی کام میں جتے رہے جب ایک مزدور چھوکری چھینٹ کے چھوٹے پرنٹ کا لہنگا، ہڈی کی پازیب اور گلٹ کی لٹو جیسی ناک کی کیل پہنے درخت کے نیچے پچھاڑیں مارتی رہی۔ اس کا کوئی اپنا سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تھا۔ وہ کچھ دیر مٹی ڈھوتی پھر واپس درخت کے نیچے بیٹھ کر رونے پیٹنے میں مصروف ہو جاتی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ گرا دیا۔ پہلی بار پتہ چلا کہ جو خود غرض اور خود پسند شخص اپنی دنیا علیحدہ بسانا چاہے اور دوسروں کے دکھ سکھ میں شامل نہ ہونا چاہے اسے صرف ایک پردہ گرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری دنیا پردہ کے دوسری طرف کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔

میرے کانوں میں چند آوازیں گونج رہی ہیں۔ ادھر دور بہت دور سرسید کی بہو بیگم کے زیر تعمیر کواٹروں سے کسی خانہ بدوش نوجوان مزدور بیوہ کی بے چین چیخ بلند ہو رہی ہے۔ ادھر دفتر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر تہران یونیورسٹی کے طلبا پر بے دریغ گولی چلانے کی آواز آرہی ہے۔ چیخ اور گولی کی گونج میں ایک تیسری بے موقع آواز بھی شامل ہو گئی۔ سر، آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ سر، آپ کو آر سی ڈی ہاؤس کے لئے کون سے پردے پسند ہیں۔ ہسپانوی یا فرانسیسی۔ میں نے کہا۔ فرانسیسی۔ اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ ہسپانیہ وقت سے بہت پیچھے ہے۔ وہاں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انقلاب آیا مگر ناکام رہا۔ فرانس وقت سے بہت آگے ہے۔ وہاں اٹھارویں صدی میں انقلاب آیا اور کامیاب ہوا۔ اس کی خوشبو ساری دنیا میں پھیل گئی۔ انقلاب فرانس کے کوئی دو سو برس کے بعد آج کل ایران کی فضا میں اس کی ہلکی سی مہک آرہی ہے۔ کیا پتہ خوشبو کا کارواں ادھر نکل آئے اور یہاں پڑاؤ ڈال دے۔

باب چہارم

جستجو اور گفتگو

تہران میں تازہ وارد ہوں۔ میرے پاؤں میں چکر ہے۔ ضرورت اور ضابطہ کے تحت مجھے آٹھ دس وزارت خانوں اور پندرہ بیس سفارت خانوں کے دروازوں پر تعارفی اور رسمی ملاقاتوں کے لئے دستک دینی ہے۔ موقع پاتے ہی کچھ ایسی ملاقاتوں کے لئے انقرہ اور اسلام آباد بھی جانا ہے۔ تہران اور انقرہ میں تاریخ اور جغرافیہ سے یک جہتی کی مثالیں پیش کرنی ہیں اور یہ کہنا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ میں نیا ہونے کے باوجود آپ کے لئے پرانا ہوں۔ اسلام آباد میں ان جان بن جانا ہے۔ وہاں یہ جتانا ہے کہ میں سول سروس کا وہ رکن نہیں ہوں جسے آپ تیس برس سے جانتے تھے۔ میں ایک علاقائی ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میں پرانا ہونے کے باوجود آپ کے لئے نیا ہوں۔

ملاقاتوں کا پروگرام بڑی مہارت اور محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ وزارتوں اور سفارتوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اہم سب سے پہلے۔ کم اہم اس کے بعد۔ آخر میں غیر اہم وہ بھی اگر وقت ملے اور رسمی ملاقاتوں کی کوئی حسرت باقی بچے۔ دفتر نے مجھے تہ کئے ہوئے چار لمبے کارڈ فراہم کئے جو میری مشغولیت کے بارے میں ہیں۔ ہفتہ کے دنوں کی رعایت سے اس کارڈ کی سات تہیں ہیں اور ہر حصہ میں ایک دن کی ملاقاتوں کی تفصیل اول پہر، دوپہر، سہ پہر اور شب کے حوالہ سے درج ہے۔ ہر کارڈ جاپانی دستی پنکھے کی طرح کھلتا اور تہ ہوتا ہے۔ چار عدد کارڈ اس بات کی علامت ہیں کہ مہینہ بھر کا پروگرام تیار ہے۔

خیال تھا کہ مہینہ بھر میں یہ فرض بخیر و خوبی ادا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مہینہ ختم ہوا تو چار کارڈ اور مل گئے۔ دوسرا مہینہ گزرا تو پھر نئے کارڈ مل گئے۔ تیسرے مہینے بھی یہی ہوا۔ ملاقاتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ وجہ یہ ہے کہ جونہی میں وزارتوں کا ایک چکر مکمل کرنے لگتا ہوں حکومت بدل جاتی ہے۔ ملاقاتیں از سرنو شروع کرنا پڑتی ہیں۔

جولائی میں جمشید آموز گار وزیر اعظم تھے۔ اگست میں شریف امامی نے ان کی جگہ لے لی۔ نومبر کے پہلے ہفتہ میں جنرل اظہری وزیر اعظم بن گئے۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں اس عہدہ کا چارج شاہپور بختیار کو مل گیا۔ سات آٹھ ہفتہ کے بعد فروری میں مہدی بازرگان آ گئے۔ سب کہتے تھے کہ یہ کئی سال تک اس عہدے پر کام کریں گے مگر دسمبر میں وہ بھی چلے۔ بنی صدر ایران کے نئے صدر بنے۔ اختلافات پیدا ہوئے اور وہ روپوش ہو گئے۔ باہنر صدر ہوئے اور رجائی وزیر اعظم۔ دونوں ایک حادثہ میں مارے گئے۔

میں حکومت کی ہر تبدیلی کے بعد ایک بار پھر کمر ہمت باندھتا اور از سرنو ملاقاتوں کے لئے چل پڑتا۔ میری حالت اس بڑھیا سے مختلف نہ تھی جو دن بھر کپڑا بنتی رہتی مگر راتوں رات سب کچھ ادھڑ جاتا اور اگلی صبح اسے پھر شروع سے بننا پڑتا۔ ایک شخص وہ بھی تھا جو دن بھر ایک دیوار کو چاٹ جاتا مگر راتوں رات وہ دیوار دوبارہ کھڑی ہو جاتی۔ کپڑا بنتے بنتے اور دیوار چاٹتے چاٹتے وہ کام جس کی تکمیل کے لئے میں نے ایک مصروف مہینہ کافی سمجھا تھا اس میں دو سال لگ گئے اور کام پھر بھی ادھورا رہا۔ میں نے کمر کھول دی اور رسمی ملاقاتوں کا سلسلہ بند کر دیا۔ اگلے دو برس حکومت میں پھر کوئی تبدیلی نہ آئی۔

(2)

امیر عباس ہویدا آج کل وزیر دربار ہیں۔ میں ان سے ملنے کے لئے ایک محل میں داخل ہوتا ہوں جہاں ان کا دفتر واقع ہے۔ کمرا خالی ہے لہذا مجھے بیٹھنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ میں جھک کر کرسی کی آغوش میں سمانا چاہتا ہوں کہ دوسرے دروازہ سے وہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ میں جتنا جھکا ہوا تھا اتنا ہی اٹھ جاتا ہوں بلکہ بلاارادہ کسی قدر تن کر

کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہویدا اس بات سے بالکل بے نیاز ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے کیا پہنا ہوا ہے۔ میرا قد کھلتا ہوا ہے یا دبتا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں پوری طرح مگن اور بے حد مطمئن اور مست ہے۔ اس کا ہر انگ اور ہر ادا یہ کہہ رہی ہے۔ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ وہ پچھلے برس تک ایران کا وزیر اعظم تھا اور اس عہدہ پر تیرہ سال سے بھی کچھ زائد عرصہ تک فائز رہا۔ اس مدت میں اس نے ایک دو بار نہیں بلکہ چوبیس مرتبہ اپنی کابینہ میں ردوبدل کیا۔ ہر وزارت آنی جانی تھی۔ ہر وزیر فانی تھا۔ دوام صرف وزیر اعظم کو حاصل تھا۔ اس کے ایک پیش رو جنرل علی رزم آرا کو سلطانی مسجد میں جہاں وہ ایک آیت اللہ کے جنازہ میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا قتل کر دیا تھا۔ کوئی اس کا جنازہ پڑھانے کے لئے بھی تیار نہ ہوا۔ اس کے ایک اور پیشرو احمد قوام السلطنۃ کو چار بار وزیر اعظم بنایا اور پھر ہر مرتبہ کارگزاری اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ہٹایا گیا۔ ڈاکٹر مصدق کے ساتھ جو گزری اس کا کسے علم نہیں ہے۔ اور اب اس شخص کے جانشین کا یہ حال ہے کہ اس کی حکومت سال بھر پورا کرتی نظر نہیں آتی۔ ایسے میں اگر کوئی شخص خود راضی نہ ہو تو اور کیا ہو گا۔

ہویدا نے ایک شوخ، ہنس مکھ، حاضر دماغ، حاضر جواب، خوش پوش اور قدرے چالاک آدمی کی شہرت پائی ہے۔ اس کی حاضر جوابی کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب امریکہ نے 1973ء میں سی. آئی. اے کے سربراہ رچرڈ ہلمز کو ایران میں بحیثیت سفیر تعینات کیا تو روس کے سفیر نے ہویدا سے کہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکہ نے اپنے سب سے بڑے جاسوس کو ایران میں سفارت کے لئے کیوں منتخب کیا ہے۔ ہویدا نے جھٹ جواب دیا۔ وہ ہمارے بہترین دوست ہیں اس لئے ہر شعبہ میں اپنا بہترین آدمی یہاں تعینات کرتے ہیں خواہ وہ شعبہ جاسوسی ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے دوسرے ملکوں کی طرح ناکارہ اور نکما جاسوس بھیج کر ہمیں ٹرخایا نہیں۔ اسی طرح ایک اسکول کے معائنہ کے دوران کسی بچی نے روتے ہوئے شکایت کی کہ وہ کلاس میں اول آنا چاہتی تھی مگر اسکول نے اسے یہ پوزیشن نہیں دی۔ ہویدا نے اسے دلاسا دیا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ میرے ساتھ بھی اسکول والوں نے یہی کیا تھا اور مجھے کبھی اول نہیں آنے دیا۔ مگر اس کے باوجود میں نخست (اول) وزیر بن گیا ہوں۔

ایک دوست نے مجھے ہویدا کی خوش مزاجی کا ایک اور قصہ سنایا۔ وہ قطار میں کھڑے ماتحت عملہ کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے ایک ایسے شخص کے پاس رک گئے جس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اپنی دستی چھڑی کی موٹھ جس پر نقشین چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا اس کے پیٹ پر رکھی اور نہایت سنجیدگی سے بولے۔ اچھا تو تم ہویدا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔

جتنی دیر مصافحہ کرنے میں لگتی ہے اس عرصہ کا تاثر صرف ہویدا کی خوش پوشاکی کا ہے۔ باقی سب باتیں اس کے آگے ماند ہیں۔ سوٹ اور بوٹ قمیص اور ٹائی نہ صرف اعلیٰ بلکہ اس خصوصی درجہ کے جہاں یہ چیزیں طرز و طرح کے اعتبار سے بلاشرکت غیرے صرف ایک ہی گاہک کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔ جیبی ریشمی رومال، پائپ اور چاندی کے دستہ والی چھڑی بھی موجود ہے۔ کوٹ کے کالر پر کارنیشن کا وہ پھول بھی سجا ہوا ہے جو ان کا امتیازی نشان بن چکا ہے۔ میری نظریں اس پھول پر ٹھہر جاتی ہیں۔ بظاہر پھول میں کوئی ایسی بات نہیں جو پاکستانی سفیر غیاث الدین احمد کے کارنیشن میں نہ ہو۔ دونوں خوش رنگ اور بڑے سائز کے ہوتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھیں تو ایک تازہ ہے اور دوسرا تازہ تر۔ تازگی کے فرق کا ایک انوکھا راز ہے۔ ہویدا کے جس کاج میں کارنیشن لگا ہوا ہے اس کالر کے نیچے سونے کا ایک چھوٹا سا گملہ کلپ سے لگا ہوا ہے اور پھول کا ڈنٹھل اس میں اڑسا ہوا ہے۔ اس سنہری گملے میں پانی کے چند قطرے ہیں جو کارنیشن کی تازگی کو برقرار رکھتے ہیں۔

میں نے ہویدا سے کہا کہ آپ کے دور حکومت میں ایران نے بہت ترقی کی مگر آر.سی.ڈی کے ادارے سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ آج تینوں ممبر ممالک میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کا تعلق اس ادارے سے اتنا گہرا اور طویل ہو جتنا آپ کا ہے۔ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے، میں پچھلی دہائی میں ہونے والے آر.سی.ڈی کے تینوں سربراہی اجلاس میں شریک ہوا تھا۔ ان میں جو باتیں اور جو تقریریں ہوئیں وہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں۔ خاص طور پر وہ جو فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانہ میں کراچی والا اجلاس تھا اس کا نقشہ ابھی تک میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ طول کلام، قرار دادوں کا طومار، الفاظ کے پہاڑ۔ عمل در آمد ندارد، تعمیل صفر، کارروائی تمام تر کاغذی۔ خوبصورت الفاظ کے استعمال پر کوئی خرچ نہیں اٹھتا اور بڑی واہ واہ ہوتی ہے۔ جب منصوبوں پر عمل کا وقت آتا ہے تو لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔ پسماندہ ممالک میں ترقی کے

لئے تعاون کی راہ میں تین چیزیں حائل ہیں۔ ایک نیشنلزم، دوسرا حکومتوں کا بار بار بننا اور ٹوٹنا، تیسرا ملک کے داخلی مسائل کی وہ کثرت کہ حکمرانوں کے پاس علاقائی مسائل کے لئے فرصت ہے نہ حوصلہ۔

میں نے انہیں روکا نہیں اور وہ از خود رکنے کے قائل نہیں۔ مزے لے کر اپنے تجربات سناتے ہیں اور سننے والا ان کے تجربہ کی وسعت اور خوش کلامی کی لذت میں کھو جاتا ہے۔ کہنے لگے، علاقائی تعاون کا ایک منصوبہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے سب کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ میرے سامنے سب ہاں میں ہاں ملاتے مگر جب عمل کا وقت آتا تو رائی کا پہاڑ بنا دیتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے طے کرنے میں سالہا سال گزار دیتے۔ ایران کو گوشت کی ضرورت ہے اور ترکی کے پاس بھیڑ بکریاں بہت ہیں۔ میں نے ایک منصوبہ تیار کیا کہ ایران اور ترکی کی سرحد پر ایک جدید ترین مذبح خانہ اور سرد خانہ تعمیر کیا جائے۔ ترکی جانور فراہم کرے اور ایران سرمایہ۔ میں نے لاکھ سر مارا مگر کوئی بات نہ بنی۔ میں نے یہ منصوبہ ترکی کے سامنے اتنی بار رکھا کہ وہ مجھے بھیڑ بکریوں والا وزیر اعظم کہنے لگے۔

پاکستان اور افغانستان کے لئے میں ہیضہ اور چیچک کے ٹیکوں والا وزیر اعظم ہوں۔ بار بار کہا کہ ایران کی سرحد سے سو میل کے اندر اندر پاکستان اور افغانستان کے جو علاقے واقع ہیں ایران ان میں ساری آبادی کو مفت ٹیکے لگانے پر تیار ہے مگر کوئی سنتا ہی نہیں۔ ایران یہ کام اپنے سرمائے سے اپنی نگرانی میں مقامی عملہ سے کرانا چاہتا ہے پھر بھی ہماری پیشکش کو کوئی منظور نہیں کرتا۔ ہاں یاد آیا۔ یہ جو آپ پاکستان سے ایران کو پھل بر آمد کرتے ہیں اس میں بحیرہ متوسط کی مکھی لگی ہوتی ہے۔ پہلے مجھے اعتبار نہیں آیا۔ کہاں پاکستان کہاں بحیرہ متوسط۔ جب ماہرین نے سمجھایا کہ اب انسانوں کی طرح کیڑے مکوڑے بھی دنیا بھر میں سیاحی کرتے ہوئے آزادی سے ہر جگہ جا پہنچتے ہیں تو بات سمجھ میں آئی۔ میں نے فوراً پاکستان سے کہا کہ اس مکھی کے خلاف علاقائی تعاون ہونا چاہئے۔ جواب کا اب تک انتظار ہو رہا ہے۔ ان باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ میں علاقائی تعاون کا کس قدر حامی ہوں۔ ان مثالوں سے آپ کو پتہ چلے گا کہ آر۔سی۔ڈی نے اب تک خاطر خواہ ترقی کیوں نہیں کی۔ دراصل علاقائی تعاون آج کل ایک فیشن بن چکا ہے۔ جیسے کوٹ کی اوپر والی جیب میں ٹائی کے جوڑ کا رومال رکھنا پہناوے کا ایک فیشن ہے۔ اسی طرح ہمسایوں کے ساتھ

تعاون کے لئے ادارہ سازی بھی ایک بین الاقوامی سیاسی فیشن ہے۔ ادارہ بنانے میں سب پھرتی دکھاتے ہیں۔ ادارہ سے کام لینے میں سستی کرتے ہیں۔

میں نے ملاقات کا رسماً شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ میں پاکستان ایران اور ترکی کے باہمی تعاون اور اشتراک کے ٹھوس منصوبے اور بہت سی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ ان امیدوں کی اساس خوش فہمی نہیں بلکہ وہ تاریخ، جغرافیہ، کلچر، روایت، مذہب اور کتاب ہے جو ان تینوں ممالک میں مشترک ہے۔ ہویدا نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور کہا۔ مسٹر سیکرٹری جنرل، میں آپ سے اسلام اور قرآن کے بارے میں ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرتا ہوں۔ اس کے بعد جو جملہ انہوں نے ادا کیا وہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔

امیر عباس ہویدا سے ملاقات کے دو فائدے ہوئے۔ ایک یہ کہ دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ بات کتنی ہی نفرت انگیز اور صدمہ پہنچانے والی کیوں نہ ہو اب میں اسے سن کر سناٹے میں آنے اور آپے سے باہر ہونے سے اجتناب کروں گا۔ اندر سے دل ہل جائے مگر باہر ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہے گی۔ قابل اعتراض بات کہنے والا حیران ہو گا کہ جس بات پر سننے والے کو زمین اڑا دینی اور آسمان سر پر اٹھا لینا چاہئے تھا وہ اس نے سنی ان سنی کر دی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے شہنشاہ کے صحیح مقام کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ بات وضاحت طلب ہے۔

ہویدا کا دفتر بادشاہ کے محل میں واقع ہے۔ اس کے باوجود اس نے چلتے وقت صرف ایک مرتبہ رواروی میں شاہ کا نام لیا تھا۔ ملاقات کے دوران شاہ کے قول و فعل کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس کے کمالات کا ذکر نہیں چھیڑا۔ کہاں وہ سارے ایرانی وزیر، سفیر اور عہدہ داران کبیر جو شاہ کی ذات والا صفات کی تعریف و تحسین کئے بغیر سانس بھی نہیں لیتے۔ موضوع کتنا ہی غیر متعلق کیوں نہ ہو وہ بات کو گھما پھرا کر ڈھٹائی اور بے تکے پن سے شاہ سے اپنی وفاداری کے اعلان کا موقع نکال لیتے ہیں۔ ہویدا ان سب سے مختلف ہے۔ حالات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ شاید اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ وقت آگے نکل گیا ہے۔ شہنشاہ پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کا ذکر کیا کرنا جو بحث سے خارج ہو چکا ہے۔ یہ وہ ہویدا نہیں ہے جس کی وفاداری کے قصے اور لطیفے مشہور ہیں۔

شہنشاہ نے ہویدا سے وقت پوچھا۔ جواب ملا، چھ بجے ہیں۔ بادشاہ نے یہی سوال

مہندس ریاضی، صدر مجلس شوریٰ سے کیا۔ جواب ملا، چھ بجے ہیں۔ شاہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ اس کی گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہے اور پانچ بجا رہی ہے۔ اس نے گھڑی اتار کر وقت درست کرنا چاہا۔ ہویدا نے شور مچایا اور اسے روکا۔ قربانت شوم۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور کو گھڑی درست کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے۔ آپ اپنی گھڑی کو یوں ہی رہنے دیں۔ ہم پینتیس ملین ایرانی اپنی اپنی گھڑیوں کو ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں۔ لطیفہ اچھا ہے مگر حالات خراب ہیں۔ اس وقت شاہ کی گھڑی کے مطابق مغرب کا وقت ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ عوام کی گھڑیوں میں فجر کا وقت ہے۔ سورج طلوع ہونے والا ہے۔ جہاں اوقات میں اتنا فرق ہو وہاں گھڑیاں ملائی نہیں جاتیں۔ جو وقت سے پیچھے رہ جائے اسے ناکارہ قرار دے کر پھینک دیتے ہیں۔

عباس علی خلعت باری سے طویل ملاقات ہوئی۔ یہ سات سال سے وزیر خارجہ ہیں۔ چھ سال سینٹو کے سیکرٹری جنرل رہ چکے ہیں۔ خوش پوش اور کم گو انسان ہیں۔ تجربہ کار اور سمجھ دار ہیں مگر آج کل کچھ بے اثر یا بے اختیار سے لگ رہے ہیں۔ ایک بات کا وعدہ کیا۔ وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر جنرل سپہبد جو گفتگو کے نوٹس لے رہے تھے انہیں واضح ہدایات جاری کیں۔ احکامات جاری کرتے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا مگر ان پر عمل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔

وزیر مالیات سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر یگانہ سے چند سال پہلے سری لنکا میں ملاقات ہو چکی ہے۔ یہ ECAFE کے کولمبو سیشن میں ایرانی وفد کے سربراہ تھے اور پاکستانی وفد کی سربراہی کا بوجھ پاکستان کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کے پروگرام کے اچانک تبدیل ہو جانے کی وجہ سے سیاسی کندھوں سے اتر کر نوکر شاہی کے پیشہ ورانہ کندھوں پر آن پڑا تھا۔ جب میں کولمبو کے ہوائی اڈہ پر اترا تو سری لنکا کے وزیر خزانہ ویلکم ڈاکٹر موباشور کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ دوسری طرف سفارت خانہ کا ایک افسر بھی مجھ سے لپٹ گیا اور کان میں کہنے لگا کہ ہم نے میزبان سے یہ خبر چھپا رکھی ہے کہ ہمارے وزیر خزانہ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے نہیں آ رہے۔ آپ انہیں علیحدہ لے جا کر کہہ دیں کہ وہ ایک اہم سرکاری کام کی وجہ سے اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے واپس چلے گئے تھے اور ایک دو دن تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم دو چار دن تک یہی اعلان کرتے رہیں گے کہ وہ کل آ رہے ہیں۔

اس کے بعد میزبان اتنے مصروف ہو جائیں گے کہ انہیں ایک ہزار مہمانوں کی بھیڑ میں یہ پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کون آیا، کون چلا گیا اور کون سرے سے آیا ہی نہیں۔ جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد آرام سے حاضری کا جائزہ لیا جائے گا تو ہم بھی آرام سے انہیں غیر حاضری کی وجہ سمجھا دیں گے۔

کولمبو سیشن میں پہلے ہفتہ ڈاکٹر یگانہ کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ کانفرنس میں شامل ہر وفد اور ادارہ بلکہ بیرون ملک سے آیا ہوا ہر موقع شناس جیب کترا ان سے خصوصی ملاقات کا خواہاں تھا۔ بہت سے لوگ ان کے اعزاز میں دعوت یا جلسہ کرنا چاہتے تھے۔ سب کی نظریں تیل کی قیمت میں اضافہ سے ایران کو حاصل ہونے والی دولت پر لگی ہوئی تھیں۔ جب پتہ چلا کہ ان تلوں میں تیل نہیں اور یہ پاکستانی سیاست کی روایت کے مطابق موقع بے موقع سرکاری خزانہ سے گرانٹ دینے کا اعلان نہیں کرتے تو ان کے گرد جمع ہونے والے اہل غرض کی بھیڑ چھٹ گئی۔ یہ شاید کچھ بے مزہ سے ہوئے اور کانفرنس کے ختم ہونے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔

ایران کے وزیر مالیات نے ایرانی انتظامیہ کے بارے میں کچھ انوکھی باتیں بتائیں مگر میں نے بھی طے کر رکھا ہے کہ اب حیران نہیں ہونا۔ کہنے لگے کہ مجلس میں بجٹ وزیر مالیات نہیں بلکہ وزیر اعظم پیش کرتا ہے اور بجٹ کی تیاری بھی محکمہ مالیات میں نہیں بلکہ پلان اینڈ بجٹ کے ادارے میں ہوتی ہے جو وزیر اعظم کے ماتحت ہے۔ ایوان میں جو بجٹ پیش ہوتا ہے اس کے تین حصے ہوتے ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور متفرق۔ سرکاری بجٹ منظوری کے لئے ہوتا ہے اور باقی دونوں بجٹ محض اطلاع کے لئے ہوتے ہیں۔ ان تینوں بجٹوں میں اعداد و شمار کی تکرار بہت ہوتی ہے۔ آمدنی اور خرچ کے کئی حصے دو دو بار شمار میں آجاتے ہیں۔ سال رواں میں جو نئے ایرانی کیلنڈر کے مطابق 2537 اور عیسوی کیلنڈر کے مطابق 79-1978ء ہے سرکاری بجٹ چالیس بلین ڈالر، نیم سرکاری اداروں کا بجٹ ترپن بلین ڈالر اور متفرق خرچ تقریباً ڈیڑھ بلین ڈالر ہے۔ کل رقم چورانوے بلین ڈالر بنی مگر اس میں چھتیس بلین ڈالر کی دہری گنتی شامل ہے۔ جاتے جاتے میں نے ان سے یہ پوچھا کہ اگر مالیات کا سارا کام دوسری وزارتوں میں ہوتا ہے تو وزارت مالیات کیا کام کرتی ہے۔ میں نے ان کا جواب سننے کے لئے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جس وزیر خزانہ کے پاس

خزانہ نہیں رکھا اس کے جواب میں کیا رکھا ہو گا۔

جعفر شریف امامی سینٹ کے پریزیڈنٹ ہیں۔ فرح فاؤنڈیشن کے سربراہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہیں۔ ہویدا سے پہلے ایک مختصر مدت کے لئے وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک پہلوی فاؤنڈیشن کے سربراہ رہے جس کے تحت ایران ایر، ہلٹن ہوٹل، بنک، انشورنس کمپنی اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ ابھی حال ہی میں مشترک منصوبوں کے بارے میں گفت و شنید کے لئے ترکی گئے ہوئے تھے۔ وزیر اعظم بلند ایجوت سے جو باتیں ہوئی تھیں ان کی رپورٹ وہ اس ہفتہ کسی وقت شہنشاہ کو دیں گے مگر اس سے پہلے وہ رپورٹ انہوں نے مجھے سنا دی۔ میں نے علاقائی تعاون کے سلسلہ میں UNCTAD کے ماہرین کی تازہ رپورٹ کے کچھ نتائج اور کچھ سفارشات بیان کیں تو کہنے لگے آپ سے ملاقات کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب میں ہز میجسٹی کے سامنے اپنی بات سند کے ساتھ پیش کر سکوں گا۔ میں نے شریف امامی کو ایک باہوش ٹیکنو کریٹ کی شکل میں دیکھا اور ان کی انتظامی سوچ اور صلاحیت کے بارے میں ایک اچھا تاثر لے کر اٹھا۔

دفتر پہنچا تو ایرانی ساتھیوں نے پوچھا۔ شریف امامی کیسا لگا۔ میں نے کہا علاقائی تعاون کے معاملہ میں بہت سمجھ دار ہے۔ وہ بولے، یہ شخص بڑا عیار ہے۔ شہنشاہ کا خوشامدی اور رازدار ہے۔ آخر اس نے آرسی ڈی کے بارے میں ایسی کونسی بات کہہ دی ہے کہ آپ اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، شریف امامی کہتا ہے کہ علاقائی تعاون علیٰحدہ علیٰحدہ پراجیکٹ کی بنیاد پر کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف منصوبوں کے پیکیج کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ کوئی پراجیکٹ تمام ملکوں کو یکساں نفع نہیں دے سکتا۔ بس جس ملک کا نفع دوسرے ملکوں سے کم ہوا وہ اسے لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ پیکیج میں کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر تعاون آسان ہوتا ہے۔ یہ سن کر ایرانی ساتھی خاموش ہو گئے۔ چند دن گزرے اور شریف امامی وزیر اعظم بن گئے۔

میں مجلس کی پرانی عمارت میں داخل ہوتا ہوں۔ یہ کبھی ایک محل ہوا کرتا تھا۔ غالباً یہ وہی عمارت ہے جس پر مشروطہ تحریک کے دوران بمباری ہوئی تھی۔ مجھے یہ عمارت بہت عزیز ہے کیونکہ ڈاکٹر مصدق کے زمانہ میں تیل کے کنوؤں کے قومیائے جانے کا قانون اسی عمارت میں منظور کیا گیا تھا۔ مجلس کے صدر عبداللہ ریاضی مجھے جس استقبالی

کمرے میں ملے وہ شیش محل لگتا ہے۔ آئینہ کاری کا جو فن ایران نے درجہ کمال تک پہنچایا ہے یہ ہال کمرا اس کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ مقصد شاید یہ ہے کہ اسمبلی کے خود پسند اور حقیقت سے آنکھیں چرانے والے ممبر ہر وقت آئینہ میں اپنی ہی تصویر دیکھتے رہیں اور تصویر کا دوسرا رخ ان کی آنکھوں سے اوجھل رہے۔ جس ہال میں اجلاس ہوتا ہے وہ قدرے سادہ ہے۔ نشستیں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ صدر کے سامنے والی قطاریں سیدھی ہیں اور ان کے دونوں جانب قوسی۔ ممبر اپنی نشستوں سے صرف برجستہ بات کر سکتے ہیں مگر تقریر کے لئے ان کو ڈائس پر آنا پڑتا ہے جس کے اوپر شوریٰ والی آیت خطِ نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ مجلس کے لئے ایک نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے مگر ہال ابھی پرانے محل کا استعمال ہو رہا ہے۔ عبداللہ ریاضی مجھے دونوں عمارتوں کی سیر کراتے ہیں۔ نوجوان مسلح سپاہی قدم قدم پر کھڑے ہیں۔

ریاضی پچھلے پندرہ سال سے مجلس کے صدر چلے آرہے ہیں۔ پیشہ کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ عمر کے لحاظ سے ضعیف اور جثہ کے اعتبار سے نحیف۔ بات کرتے ہیں تو آواز دھیمی مگر رفتار خاصی تیز ہوتی ہے۔ وہ چونکا دینے والے جملے جان بوجھ کر یوں ادا کرتے ہیں جیسے معذرت کر رہے ہوں۔ جملہ ختم کرنے کے بعد ان کی آنکھوں میں شرارت بھری چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ کہنے لگے۔ ایران میں بہت سے پاکستانی ڈاکٹر، انجینئر اور مزدور کام کر رہے ہیں۔ اس ملک کی ترقی میں ان کی لیاقت، محنت اور دیانت کا بڑا حصہ ہے۔ کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ جب یہ لوگ پاکستان واپس جائیں گے تو وہاں بھی اسی جذبہ کے ساتھ کام کریں گے۔ پھر ذرا وقفہ دیا۔ زیر لب مسکرائے اور طنز کا نشتر تیز کرتے ہوئے بولے۔ یہ مہمان کارکن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنی صحت اور صلاحیت غیر ممالک میں صرف کر دیتے ہیں۔ جب وطن واپس جاتے ہیں تو ان کے ہمراہ صرف دو چیزیں ہوتی ہیں۔ فارن ایکسچینج اور فرسٹریشن۔

ریاضی کہنے لگے۔ آپ علم سیاسیات سے واقف ہوں گے۔ آج میں آپ کو دو باتیں ایسی بتاتا ہوں جو آپ نے درسی کتابوں میں نہیں پڑھی ہوں گی۔ ہمارے قانون کی رو سے ووٹ ڈالنے کے لئے کم از کم عمر بیس سال، مجلس کی رکنیت کے لئے تیس سال اور سینٹ کی رکنیت کے لئے چالیس سال ہے۔ مجلس کی امیدواری کے لئے زیادہ سے زیادہ عمر ستر سال

مقرر ہے حالانکہ ایسی بندش دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ آپ اس قانون کو انوکھا قانون کہہ سکتے ہیں مگر اس سے بھی انوکھی بات یہ ہے کہ اس قانون کے باوجود میں 74 برس کی عمر میں مجلس کا رکن ہی نہیں بلکہ اس کا صدر بھی ہوں۔ دراصل عمر کی حد امیدوار کے لئے ہے رکن کے لئے نہیں ہے۔ پچھلے انتخابات کے وقت میں ستر سال سے دو چار ماہ کم تھا لہٰذا الیکشن میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سب سے زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہونے والا شخص ہوں۔ آیئے آپ کو ایک اور دلچسپ بات بتاؤں۔ 1975ء کے انتخابات میں مجموعی ووٹ سابقہ انتخابات کے مقابلہ میں خاصے کم پڑے۔ اس کی وجہ یہ ہے اب ووٹر کو ووٹ دینے کے لئے بذات خود زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ پہلے یہ آسانی تھی کہ امیدوار جتنے شناختی کارڈ جمع کر لیتے اور پیش کر دیتے انہیں اتنے ووٹ مل جاتے تھے۔

میری سمجھ میں یہ آیا کہ الیکشن کے دن تین چار امیدوار شناختی کارڈوں سے بھرے ہوئے تھیلے موٹروں میں لے کر دفتر الیکشن کمیشن میں پہنچ جاتے اور عملہ ان کے شناختی کارڈ گن کر ہار جیت کا فیصلہ کر دیتا تھا۔ الیکشن خاموشی اور آرام سے ہوتا۔ یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ الیکشن کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ نہ تقریر نہ پوسٹر۔ نہ جلسہ نہ جلوس۔ نہ چائے نہ دیگ۔ نہ مائکر وفون نہ لاؤڈ سپیکر۔ نہ دنگا نہ فساد۔ نہ پتھراؤ نہ فائرنگ۔ نہ چار دیواری کالی کرنے کی ضرورت نہ حریف کا منہ کالا کرنے کی حاجت۔ جمہوریت کا کیا صاف ستھرا نسخہ ہے۔ مجھے یاد آیا کہ بنیادی جمہوریت بھی اسی طرح کا ایک حکیمانہ نسخہ ہوا کرتا تھا۔ 1964ء میں جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے مس فاطمہ جناح کے خلاف صدارت کے بالواسطہ انتخاب میں حصہ لیا تو شکایت یہ تھی کہ تھانے داروں نے بنیادی جمہوریت کے بہت سے اراکین سے ان کے شناختی کارڈ زبردستی لے لئے ہیں تاکہ وہ ووٹ نہ ڈال سکیں۔ اس معاملہ میں پاکستان اور ایران میں کوئی فرق نہیں اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ ایک ملک میں تھانے دار بادشاہی کرتا ہے اور دوسرے میں بادشاہ تھانے داری کرتا ہے۔

منوچہر ظلی نائب وزراء خارجہ میں سب سے سینئر ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے پاکستان میں ایران کے سفیر ہوا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس تھوڑی سی جان پہچان کے طفیل جو ان سے اسلام آباد کی سفارتی دعوتوں اور دفتری کاموں کے سلسلہ میں ہو گئی تھی میں ان سے آر.سی.ڈی کے معاملات میں ذاتی دلچسپی اور امداد کی درخواست کروں گا۔ لیکن اس کی

نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ بھرے بیٹھے تھے۔ پاکستان کے صاحبان اختیار میں ایک آدھ شخص انہیں ناپسند تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کا غصہ تھا کہ جب بھٹو گورنمنٹ اور پاکستان نیشنل الائنس میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی تو کسی فریق نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مجھے ان کوتاہیوں اور محرومیوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے۔ میں نے انہیں ٹوکا۔ یاد دلایا کہ میرا دائرہ کار صرف علاقائی ترقی کے لئے تعاون تک محدود ہے۔ وہ مجھ سے جو باتیں کر رہے ہیں وہ انہیں تہران میں پاکستان کے سفیر سے کرنی چاہئیں۔ ان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ فرمانے لگے۔ میں اسلام آباد میں رہ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک سینئر سیکرٹری ہیں اور پاکستان کے صدر سے براہ راست بات کر سکتے ہیں لہٰذا آپ کو میری باتیں سننی اور اسلام آباد تک پہنچانی ہوں گی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ دس برس پہلے یہاں مسرت حسن زبیری آر سی ڈی کے سیکرٹری جنرل اور شاہنواز خاں پاکستان کے سفیر تھے۔ میں ان دونوں سے گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سیکرٹری جنرل کو سفارت خانہ کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے۔ البتہ جب وہ اپنی میعاد ملازمت ختم کر کے پاکستان چلا جائے تو اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تجربہ اور اپنی رائے سے کسی کو آگاہ کرنا مناسب سمجھتا ہے تو کر سکتا ہے۔ میں اس اصول سے انحراف کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اگر آپ نے مجھے کوئی قابل ذکر اور فوری اہمیت کی بات بتائی تو وہ انشاء اللہ چار سال کے بعد اسلام آباد پہنچ جائے گی۔ منوچہر نے تیوری چڑھائی اور سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ دو چار شکایتیں وہی جن میں حکایت زیادہ ہوتی ہے اور حقیقت کم۔ ایک دو اعتراضات وہی جو خود پسندوں کو اپنے آس پاس کے لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ ایک کلمہ تعریف جو بات کو گوارا بنانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ ایک کلمہ بدشگونی جسے وہ اپنی غیر اہم بات کو وزنی اور بااثر بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

میں نیشنل ایرانین آئل کمپنی کے صدر دفتر میں چیئرمین کے کمرے میں داخل ہوا۔ نقشہ وہی جما ہوا تھا جو میں پانچ سال پہلے دیکھ چکا ہوں مگر اس بار مرکزی کردار ہوشنگ انصاری ادا کر رہے تھے۔ منوچہر اقبال کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ لمبے قد کے خاموش آدمی تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سابقہ وزیر اعظم تھے۔ سر کے بال سفید تھے۔ انصاری کا قد میانہ، زبان شیریں اور تعلیم واجبی ہے۔ وزیر اعظم ہوتے ہوتے رہ گئے۔ سر کے بال سیاہ ہیں۔

اپنے پیشرو سے صرف ایک بات میں برابر بلکہ کچھ آگے ہیں۔ وہ ہے شہنشاہ کی خوشامد اور اس کی نظر عنایت۔ ایک ایرانی نے میرے کان میں کہا، یہ شخص لیاقت اور صلاحیت میں منوچہر کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔ جب یہ وزیر مالیات تھا تو اس وقت کے رئیس بنک مرکزی پر کام کا سارا بوجھ ڈال دیتا تھا۔ اب اس شخص کو این آئی او سی میں ڈپٹی چیئرمین بنا کر لے آیا ہے۔ وہ کام کرے گا اور یہ نام پیدا کرے گا۔ یہ شخص مینجمنٹ کے اس اسکول سے تعلق رکھتا ہے جو کام کا سارا بوجھ ایک اچھے کامی بندہ کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے جو شہرت طلب نہ ہو۔ ساکھ اور شہرت نمبر ایک کی پسینا اور پسائی نمبر دو کی۔

میں نے جب چیئرمین نیشنل ایرانین آئل کمپنی سے تیل کے حال اور مستقبل کے چند جائزوں کا حوالہ دے کر پوچھا کہ وہ کس جائزے کو درست سمجھتے ہیں اور کیوں، تو ان کا جواب عمومیت کی سطح سے بلند ہو کر ماہرانہ سطح تک نہ پہنچ سکا۔ میں نے تین چار سوچے سمجھے اور پہلے سے تیار کیئے ہوئے تکنیکی سوال داغ دیئے۔ میں ایک پر اعتماد ٹیکنو کریٹ کے جواب کا منتظر تھا۔ وہاں صورت ہی کچھ اور تھی۔ گول مول جواب ملا۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ مثال دے کر نو دریافت تیل کے کنوؤں کی استعداد کے بارے میں اور تین مشہور عالمی کمپنیوں کی اجارہ داری کے اثرات کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ ایران میں ساٹھ ہزار آدمی تیل کی صنعت میں کام کرتے ہیں اور ان میں صرف چھ سو باہر کے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی غیر ملکی ملازمت چھوڑنا چاہے تو میری طرف سے اسے اجازت ہے۔ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے کہ دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ایک تیل کا کاروبار کرنے والی کمپنی ہے جس کا نام رائل ڈچ ہے۔ میں نے کھانستے ہوئے لقمہ دیا۔ ایکس آن۔ کہنے لگے ہاں ہاں، میری مراد اسی کمپنی سے ہے۔

ہوشنگ انصاری موضوع بدلنے کے لئے پہلو بدل رہے تھے بولے، تیل کی باتیں چھوڑیئے۔ آیئے پاکستان کی بات کریں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک چھوٹا سا لیکچر اس بات پر دیا کہ پاکستانیوں کو اپنے موجودہ مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہیئے اور ملک کو کس ڈھب سے چلانا چاہیئے۔ ٹیپ کا مصرع یہ تھا کہ اگر آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ایران کی مثال کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ ہم چند سال میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں اور سوچیں کہ بیسویں صدی کے اختتام تک ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ دوسرا مصرع جس سے

شعر مکمل ہوتا ہے انہیں ادا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ایران کی ترقی کا جائزہ لیا جائے گا تو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ ایران نو کے معمار کا نام ہزمیجسٹی محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر شہنشاہ ایران ہے۔ اور اس اقتصادی معجزہ کو سرانجام دینے والوں میں ایک اہم نام خاکسار ہوشنگ انصاری کا بھی ہے۔

ملاقاتیں جاری ہیں۔ معتمدی، چیلاتی، خوانساری، ہدایاتی اور معینی۔ داریوش اور سادات۔ خوش کیش اور شرکاء۔ ان کے بعد جن لوگوں سے ملاقات کرنا ہے ان کے نام تقریباتی ڈائری میں لکھے کے لکھے رہ گئے اور ایک روز ان ناموں پر خط تنسیخ پھیرنا پڑا۔ ڈائری میں جگہ کم رہ گئی۔ اس بچی کھچی جگہ میں بڑی احتیاط سے کچھ نئے نام لکھے گئے۔ یکایک وہ بھی باطل ہو گئے۔ تیسری بار نام لکھنے کے لئے مسز امینی نے ڈائری میں سادہ کاغذ ٹائپ کر کے پن سے لگا دیا۔ پھر ایک دن خود ہی اس فہرست کو ڈائری سے نکالا اور پھاڑ دیا۔ زیر لب بس اتنا کہا، مردود شد۔ بات صرف اتنی ہے کہ جتنی دیر میں وزیروں سے وقت طے کرتے ہیں اتنی دیر میں ان کی حکومت ٹوٹ جاتی ہے۔ نکال بٹھال کے دن ہیں۔ جمشید آموز گار، شریف امامی، جنرل اظہری اور اب شاہپور بختیار۔

ایک ایرانی دوست نے بتایا کہ وہ شاہپوری کابینہ میں شمولیت پر غور کر رہے ہیں کیونکہ یہ حکومت کم از کم دس سال تک چلے گی۔ میں نے عرض کیا۔ آپ کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے اس حکومت کو آج سے دس سال پہلے حلف اٹھانا چاہئے تھا۔ اس وقت تو یہ دس دن بھی چلتی نظر نہیں آتی۔ وہ یہ بات سن کر اداس ہو گئے۔ مجھے تعجب ہوا کہ طبقہ خاص کے ایرانی اپنے ملک کی سیاسی فضا کے بارے میں کتنے لاعلم ہیں۔ میری پیش گوئی بھی غلط ثابت ہوئی۔ شاہپور کی حکومت دس دن کے بجائے دس ہفتے نکال گئی۔

(3)

ان دنوں سفراء سے بھی ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ سب سے پہلی ملاقات رئیس السفراء، شیخ ناصر محمد احمد الجابر الصباح سے ہوئی ہے۔ ان کی عمر تیس برس سے دو چار سال

زائد ہو گی مگر وہ پچھلے دس برس سے ایران میں کویت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ نام سے ظاہر ہے کہ وہ کویت کے امیر کے رشتہ دار ہوں گے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشتہ داری نہ بہت قریب کی ہے اور نہ بہت دور کی۔ ان کی ہر دلعزیزی کا راز یہ ہے کہ ہر سفیر کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ مجھے انہوں نے ایران میں گزر بسر کرنے کے دو چار قیمتی راز اور تہران کی سفارتی زندگی سے نبرد آزما ہونے کے چند گر بتائے۔ پھر ان کا سچا پن ثابت کرنے کے لئے اپنے تجربہ سے سند پیش کی۔ مجھے دیکھئے میں نے ان کے سہارے تہران میں مکھیوں اور مچھروں کی بہتات کے باوجود ہنسی خوشی دس برس گزار لئے ہیں۔ دراصل ہر ملک میں زندگی بسر کرنے کے چند خاص مقامی اصول ہوتے ہیں جن پر عمل کریں تو وقت گزرتے ہوئے پتہ نہیں چلتا۔ یہ شخص جو غیر ممالک میں زندگی بسر کرنے کے بارے میں ایک سائنسی رویہ رکھتا ہے نہ جانے اپنی بیاہتا زندگی میں کیوں ناکام رہا۔ بنت عم سے شادی کی۔ دو بچے ہیں، عمر چھ اور سات سال ہے۔ بیوی سے علیحدگی کو پانچ برس ہو چکے ہیں۔ تہران کے مچھروں سے نباہ ہو گیا۔ کویتی بیوی سے نہ ہو سکا۔ یہاں سائنس کا سہارا لیا اور وہاں روایت کا۔

میں نے نرم رو نوجوان سفیر کے دفتر کا جائزہ لیا۔ مال گودام لگ رہا ہے۔ ہر طرف گتے کے بڑے بڑے ڈبے نظر آرہے ہیں۔ نئے مال کے فبنتہ بند ڈبے نہیں بلکہ دست دوم والے برتے ہوئے ڈبے جو سامان باندھنے کے کام آتے ہیں۔ سفارتی اخلاق کا تقاضا ہے کہ میں سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ ظاہر کروں کہ میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ادھر صرف ایک بالجبر مسکراہٹ ہے اور خاموشی۔ میں یہ تاثر لے کر اٹھا کہ مکھیوں اور مچھروں کی یلغار کے باوجود تہران میں دس سال گزارنے والا شخص نئے تہران کی ساری آسائشیں چھوڑ کر واپس جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ اس وجہ کو جاننے کے لئے میں کئی اور سفارت خانوں میں جا نکلتا ہوں۔

میں ایک عمارت کے صدر دروازہ پر کھڑا ہوں۔ آج اس عمارت میں بنگلہ دیش کا سفارت خانہ واقع ہے۔ کل یہ ایران کے انقلابی قوم پرست وزیراعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ عجیب کیفیت ہے۔ ایک جی یہ چاہتا ہے کہ جھک کر اس چوکھٹ کو چوم لوں۔ دوسرا جی پوچھتا ہے کہ تمہاری غیرت کو کیا ہوا۔ یہ چوکھٹ وہ خط تقسیم ہے جس

کے ایک طرف مشرقی پاکستان ہے اور دوسری طرف نوے ہزار جنگی قیدی۔ چلو واپس چلیں۔ شرم کی جوار ہے اور فخر کا بھاٹا۔ میں جذبات کے سمندر کی ایک لہر کے ساتھ بہتا ہوا اس کمرے میں پہنچ جاتا ہوں جہاں مرزا رشید احمد میرا استقبال کرنے کے لئے اپنی بے لاگ مسکراہٹ اور متحدہ پاکستان کی یادوں کا تحفہ لئے ہوئے کھڑے ہیں۔

یہ کمرا جس میں آج مرزا صاحب اپنا دفترلگائے ہوئے ہیں۔ چوتھائی صدی پہلے ڈاکٹر مصدق کا بیڈروم ہوتا تھا۔ تیل کی صنعت کو قومیانے سے جو سیاسی بحران پیدا ہوا تھا اس پر گفت و شنید کے لئے مغربی ممالک سے جو اہم اشخاص آیا کرتے تھے ان سے ڈاکٹر مصدق اسی کمرے میں اپنا لکیریا لباس شب خوابی پہنے ہوئے ملاقات کرتے تھے۔ اور وہ دیوار بھی اسی کمرے کے باہر واقع ہے جسے پھاند کر ایک دن ڈاکٹر مصدق پاجامہ پہنے ہوئے مجلس کی عمارت میں جا پہنچے تھے۔

28ر فروری 1951 ء کو ڈاکٹر محمد مصدق ایران کے وزیراعظم بنے اور اسی روز مجلس نے تیل کی ساری کمپنیوں اور تنصیبات کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ان میں انگریزوں کی 560 ملین ڈالر کی اینگلو ایرانین آئل کمپنی اور دنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ بھی شامل تھا۔ جب ڈاکٹر مصدق نے سیکورٹی کونسل میں شکایت کی کہ تیل کی آمدنی کا صرف 15 فیصد حصہ ایران کو ملتا ہے اور 85 فیصد بیرونی سرمایہ کار لے جاتا ہے تو اسے جواب ملا کہ یہ ٹیکنالوجی اور سرمایہ کی قیمت ہے۔ مصدق نے جواب دیا۔

We are not prepared to finance other people's dreams of empire from our resources.

وہ لوگ جو امپیریلزم کے خواب دیکھتے ہیں ہم ہرگز اپنے وسائل سے ان کے خوابوں کی تعبیر کے لئے سرمایہ فراہم نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر مصدق نے سیاسی آزادی کو ناکافی قرار دیتے ہوئے پسماندہ اقوام کے قدرتی وسائل کو مغرب کے شکنجہ سے آزاد کرانے کے لئے جو پہل کی وہ اس کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر 1947 ء میں قائداعظم پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو 1951 ء میں کسی مصدق کے وزیراعظم ہونے اور آبادان ریفائنری پر قبضہ کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور اگر مصدق دنیا کی سب سے بڑی ریفائنری کو قومی ملکیت

میں نہ لیتے تو 1956 ء میں کسی ناصر کی طرف سے نہر سویز کو مصری ملکیت میں لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اسباب اور انجام کے سلسلہ میں تیسری دنیا کے کئی بڑے نام یوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں کہ جب تک رک کر اس سلسلہ پر غور نہ کریں ہمیں ان رہنماؤں کی باہمی قربت اور رفاقت کا پتہ نہیں چلتا۔

کرمٹ روز ویلٹ نے جو 1953 ء میں مشرق وسطیٰ میں سی آئی اے کا نگران تھا اپنی کتاب میں ڈاکٹر مصدق کے خلاف کامیاب ہنگامہ کرانے اور ایک ایسے وزیراعظم کا تختہ الٹنے کا حال بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جسے چند دن پہلے رفرندم میں 99.93 فیصد ووٹ ملے تھے۔ اسی تفصیل کے ساتھ اس نے شہنشاہ اور نئے وزیراعظم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جو ملک سے فرار ہو چکا تھا اور دوسرا جو شیمران کے ایک تہ خانہ میں چھپا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مصدق کے خلاف سب سے بڑے جلوس کی قیادت ایک پہلوان کے سپرد کی گئی جو تہران میں ایک اکھاڑا چلاتا تھا۔ اُسے شعبان بے مغز کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جلوس میں جو لوگ جاوید شاہ کا نعرہ لگاتے تھے انہیں دس ریال یومیہ کے حساب سے اجرت ملتی تھی۔ کرمٹ کی کتاب پڑھ کر مجھے صرف اس بات کا افسوس ہوا کہ سی آئی اے نے ایران میں معاشی اور سیاسی انقلاب کا رخ بدلنے اور وقت کو روکنے بلکہ پیچھے دھکیلنے کے لئے جو رقم منظور کی تھی وہ بھی پوری خرچ نہ ہو سکی۔ بچت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے اپنی خدمات اور وفاداریاں فروخت کیں انہوں نے معاوضہ ہی بہت کم مانگا۔ قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند۔ ضمیر فروش ہمیشہ اسی طرح خسارے کا سودا کرتے آئے ہیں۔ البتہ نفع کی ٹوہ میں رہنے والے لوگ بڑی دور کی سوچ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مصدق کا فسادات میں خستہ ہو جانے والا مکان ایک یہودی نے اس امید پر خرید لیا کہ ایک دن لوگ پھر سے بیدار ہوں گے اور اس عمارت کو زیارت گاہ اہل عزم و ہمت کا درجہ حاصل ہو گا۔ اس روز سرمایہ کار لوگوں سے ان کی تاریخ کا سودا کرے گا۔

مرزا رشید احمد نے باتوں باتوں میں جو اعداد و شمار بیان کئے ان سے پتہ چلا کہ سقوط مشرقی پاکستان کے ساڑھے چھ سال کے بعد بھی بنگلہ دیش کی معیشت ابھی اس مقام تک نہیں پہنچی جہاں متحدہ پاکستان سے جدائی کے وقت ہوا کرتی تھی۔ تاراپور نیوکلائی بجلی گھر کی اسکیم ترک کر دی گئی ہے۔ اس کے لئے جو سائنس دان تیار کئے گئے تھے وہ اب ایران میں کام

کر رہے ہیں۔ ان کی تنخواہیں اتنی زیادہ ہیں کہ یہ ماہرین خود بھی حیران ہیں۔ آج کل ایران میں دولت اتنی وافر ہے کہ غریب ممالک کے لوگ سوائے حیران ہونے اور یہاں نوکری کرنے کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

مرزا صاحب بے ساختہ باتیں کر رہے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ کہتے ہیں۔ وہ جو انگریزی اخبار میں تیزبین کے نام سے تہران کی سفارتی زندگی کے بارے میں گپ شپ کا کالم لکھنے والا فوٹو گرافر ہے وہ ایرانی نہیں بلکہ ہنگری کا باشندہ ہے۔ اس نے ایک ایرانی خاتون سے شادی کر لی اور بہائی ہو گیا۔ اب وہ شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اور وہ عورت جو کل رات عراقی سفارت کی دعوت میں خوشرنگ مشروب کا گلاس ہاتھ میں لئے اس کے پاس کھڑی تھی وہ بڑی خوش گفتار اور دلچسپ خاتون ہے۔ قابل، ذہین، باہنر۔ ہمہ صفت موصوف۔ ہفت زبان۔ اردو شستہ، انگریزی رواں۔ روسی زبان میں مہارت کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان کی وزارت خارجہ کے افسروں کو پڑھایا کرتی تھی۔ اسی بہانہ آہوجہ سے ملاقات اور شادی ہوئی۔ آہوجہ آج کل تہران میں ہندوستان کے سفیر ہیں۔ میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ڈھاکہ میں فرسٹ سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ اس خاتون کو ان دنوں بھی مصوری کا شوق تھا۔ تہران میں یہ اپنی مصورانہ خطاطی کی نمائش بھی کر چکی ہے۔ آرائش اور لباس کے معاملہ میں یہ خاتون بڑی جدت بلکہ انوکھے پن کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کپڑے رنگ برنگ کے ہوتے ہیں اور ان کی تراش خراش ایسی کہ خانہ بدوش عورتیں حسرت سے دیکھتی رہ جائیں۔ زیور کے نام سے ہر طرح کا ان گھڑ پتھر کانچ کوڑی مالا میں پرو کر گلے میں ڈال لیتی ہے۔ ایسا زیور عجائب گھر کی الماریوں میں پایا جاتا ہے یا فرعونوں کے زیر زمیں مقبروں سے نکلتا ہے یا بھیل اور گونڈ ناریوں نے پہنا ہوتا ہے۔ یہ خاتون جس سفارتی دعوت میں پہنچ جاتی ہیں ان کا حلیہ دیکھ کر سب دنگ رہ جاتے ہیں۔ جو نزدیک آنے کی ہمت کرتے ہیں انہیں اس خاتون کی زباندانی اور حاضر جوابی دیکھ کر چپ لگ جاتی ہے۔ ڈھاکہ میں عید کے دن یہ ہمارے یہاں آجاتی تھیں اور مہمان کمرے میں پڑی رہتی تھیں۔ اس روز ان کا چہکنا بھی ذرا کم ہو جاتا۔ ان کا نام ایلنہ ہے۔ دلی کے میسز نورالدین کی بیٹی ہیں۔ والدہ انگریز تھیں۔ شوہر ہندو ہے۔

میں بنگلہ دیش کے سفارت خانہ سے بہت اداس ہو کر باہر آیا۔ مجھے مشرقی پاکستان

کے وہ ساتھی یاد آ رہے تھے جو اکادمی میں ہمارے ساتھ زیر تربیت تھے۔ اعظم اور معظم۔ موسیٰ اور کرامت۔ احسن اور احسان۔ ثنا، فضل اور قدس۔ ان پڑھے لکھے ہوشمند ساتھیوں نے اپنی اپنی عمر کے پہلے بیس پچیس برس انگریز کی غلامی میں گزارے۔ اس کے بعد بیس پچیس برس پاکستانی کہلائے۔ اب وہ بنگلہ دیش کے باشندے ہیں جس نے بھارت کے ساتھ بیس پچیس سال کے لئے دوستی کا ایک ایسا معاہدہ کیا ہے جیسا ہارنے والے جنگ جیتنے والوں سے کیا کرتے ہیں۔ یہ کیسی جنگ تھی کہ مشرقی پاکستان بھی ہار گیا اور مغربی پاکستان بھی ہار گیا۔ جیتا وہ جو ان دونوں کو جینے کا حق دینے سے انکاری ہے۔ اب میں ان بنگالی ساتھیوں کو کہاں ڈھونڈوں جن کے ساتھ مل کر سول سروس آف پاکستان کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ مجھے حمود الرحمٰن رپورٹ کے صفحات میں بکھرے ہوئے ملیں گے۔ لیکن وہ رپورٹ تو ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئی اور کہتے ہیں کہ اس کی جلدیں گم ہو گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان بھی ان جلدوں کے ساتھ کہیں گم ہو گیا ہے۔

(4)

سفارت خانوں کا سفر جاری ہے۔ امریکہ اور روس۔ چین اور جاپان۔ فرانس اور جرمنی۔ مصر اور مراکش۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا۔ ملکوں کے نام آسان اور جانے پہچانے ہیں مگر سفیروں کے نام مشکل اور نامانوس ہیں۔ تکلف اور احتیاط کے بغیر زبان پر چڑھتے ہی نہیں۔ چیا و جویو، نصرن شیارون، کرک ہونے، سرل اوچونو، گمرک چوغلو، بینٹ اوڈنر، گیولیو تماگینینی۔

میں ہر سفیر سے یہ فرمائش کرتا ہوں کہ وہ نووارد کو اپنے تجربہ میں شریک کرے اور کھل کر یہ بتائے کہ ایران کے حال اور مستقبل کے بارے میں اس کی رائے کیا ہے۔ ماضی پر بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا ایک گہرا نقش پہلے ہی میرے ذہن اور دل میں کیمبرج ہسٹری آف پرشیا اور ای جی براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی وجہ سے موجود ہے۔ سفارت کاروں کے جواب سن کر جو نقشہ میرے ذہن میں جما وہ کچھ ایسا ہے۔ اہل ایران

شائستہ اور مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن، متواضع اور مہربان ہیں۔ خوش اخلاق ہیں۔ وہی پہلے آپ پہلے آپ والی خوش اخلاقی۔ خوش کلام ہیں۔ بفرمائید، خواہش می کنم ، چشم چشم اور آقای آقای کہتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔ فنون لطیفہ کے دلدادہ ہیں۔ آرٹ ان کے خون میں رچا ہوا ہے۔ پھول، شعر، شراب اور موسیقی پر جان دیتے ہیں۔ قبر اور کیبرے دونوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ زیارت عقیدہ اور ضرورت ہے۔ ناچنا خوشی کا اظہار اور تفریح کا ذریعہ ہے۔ دل کشادہ ہے۔ ہر شوق کے لئے اس میں جگہ موجود ہے۔ ملک وسیع ہے مگر بیشتر بے آب و گیاہ۔ کیسپین کا ساحل البتہ بہت ہرا بھرا اور خوبصورت ہے۔ پچھلے پانچ برس سے دولت کی ریل پیل ہے۔ بہتی گنگا ہے جس میں افراد اور تجارتی ادارے ہی نہیں بلکہ ساری قوم اور پورا ملک اشنان کر سکتا ہے۔ ایران ایک سونے کی چڑیا ہے۔ ایک سنہری موقع ہے۔ ایک فرصت عالی ہے۔ ان دنوں یہ ملک موقع کی تلاش اور سونے کی دریافت کرنے والوں کے نرغہ میں ہے۔ دولت بہت سے مسائل ہمراہ لائی ہے۔ کچھ مسائل طرز حکومت کے فرسودہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی موجود ہیں۔ ان میں تندی اور شدت آگئی ہے۔

سویڈن کے سفیر نے بتایا کہ ایران کی پچھلی حکومت بجلی کی کمی کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ ہر روز بجلی بار بار بند ہو جاتی اور لوگ ایک آدھ گھنٹہ لفٹ میں پھنسے رہتے۔ نئی حکومت نے مختلف ملکوں سے سو میگاواٹ کے تیرہ یونٹ منگا کر نصب کر دیئے ہیں۔ ہر بجلی گھر کی مشین دوسرے سے مختلف ہے۔ عملہ کا یہ عالم ہے کہ جہاں دس بارہ آدمیوں کی ضرورت ہے وہاں تین چار سو افراد ملازم ہیں۔ نیو کلائی بجلی پیدا کرنے کا پروگرام بھی اسی طرح کی بے موقع عجلت اور عیب دار منصوبہ بندی کا شاہکار ہے۔ چار پراجیکٹ تقریباً مکمل ہیں۔ چار کی تعمیر ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ بارہ کے سلسلہ میں گفت و شنید ہو رہی ہے۔ کوئی بیس پچیس نیو کلائی بجلی گھر بنانے کا پروگرام ہے۔ جب توقعات زیادہ اور تجربہ کم ہو اور یہی نسبت سرمایہ اور صلاحیت میں ہو تو وقت برباد، موقع ضائع اور دولت رائیگاں جاتی ہے۔ غلط منصوبہ بندی کے نتیجہ میں ہونے والا نقصان ایک سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ حکومت اپنی صفائی پیش کرتی ہے مگر کسی کو اعتبار نہیں آتا۔ حکومت کے لئے شکست کے سوا باقی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ ملک اور معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ

کیا اس ملک میں یہ قدرتی عمل شروع ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔

بلجیم کے سفیر نے کہا، یہ جو ایران کو تیل کی قیمتوں میں پانچ گنا اضافہ کی وجہ سے بے حساب دولت ملی ہے اس نے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کو بالکل بدل دیا ہے۔ عادات، اطوار، انداز، سوچ اور رویئے یا تو نئے ہیں یا ان کی کیفیت اور نوعیت میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے کہ بالکل نئے لگتے ہیں۔ اوپیک نے صرف تیل کی قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ تیل بر آمد کرنے والے ممالک میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسے اپنی اور اپنے معاشرہ کی قدروقیمت میں اضافہ سمجھ لیا ہے۔ خودپسندی کو یہ فضا بڑی راس آتی ہے۔ تیل بر آمد کرنے والے ممالک سے معاملہ کرتے وقت اس مزاج داری کا اب خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ خواہ وہ ایران ہو یا عراق، وینیز ولا ہو یا نائیجیریا۔ ان حالات میں آپ کو ہر وقت، چوکس اور چوکنا رہنا پڑے گا۔

میں بلجیم کے سفارت خانے کے باہر کھڑی ہوئی سٹاف کار میں بیٹھنے سے پہلے ٹائی کی گرہ کو جو پہلے ہی کافی کسی ہوئی ہے کچھ اور کس دیتا ہوں۔ چوکسی کا شاید یہ بھی ایک انداز ہے۔ یوں چوکنا ہونے کے بعد میں اس دعوت کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہوں جس کا ذکر بلجیم کے سفیر نے کیا تھا۔ پچھلے ہفتہ وہ شہنشاہ کے ساتھ ایک لنچ میں شریک ہوئے۔ کل آٹھ مہمان تھے جنہیں کھانے کی میز پر ایک سیدھی قطار میں بٹھایا گیا۔ چار شہنشاہ کی دائیں طرف اور چار بائیں طرف۔ سامنے کوئی بھی نہ تھا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا کیونکہ ایسی سپاٹ نشست میں باقاعدہ گفتگو کا کوئی امکان نہ تھا۔ ہوں ہاں کے درمیان پانچ منٹ کا وقفہ ایسا بھی آیا کہ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ شہنشاہ بہت تھکا ہوا لگا۔ نشست جان بوجھ کر ایسی یک رخی رکھی گئی تھی کہ کوئی مہمان سامنے بیٹھ کر شہنشاہ کے چہرے پر نظریں نہ گاڑ سکے۔ آج کل اعلیٰ حضرت نظروں کی تاب بھی نہیں لا سکتے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی ہے جسے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بلجیم کے سفیر کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ رضا شاہ محض ایک بادشاہ نہیں ہے۔ وہ جائے گا تو اس کے ساتھ اور بہت کچھ جائے گا۔

اٹلی کا سفارت خانہ تہران کے پرانے علاقہ میں واقع ہے۔ صدر دروازہ بھی قدرے تنگ ہے۔ غالباً اس وقت کا بنا ہوا ہے جب بیشتر مہمان گھوڑوں پر سوار ہو کر آتے

تھے۔ چار دیواری سے گھرے ہوئے احاطہ میں تین طرف عمارتیں ہیں اور بیچ میں کھلے میدان کی جگہ ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ مقام بڑا پر فضا ہے اور سفیر بڑا پر کشش ہے۔ بے تصنع باتیں، اچھا مطالعہ، اچھا مشاہدہ اور معقول تجزیہ۔ میں نے ایران کے حال و مستقبل والا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔ ایران میں بے چینی پائی جاتی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس بے چینی کی سات بڑی وجوہات میں چھوٹی بے شمار ہیں۔ اول، شہنشاہیت۔ دوم، تیل کی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم۔ سوم، یورپ اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے والے لبرل ایرانی طالب علم۔ چہارم، لبرل مقامی دانشور جن میں استاد، ادیب، شاعر اور صحافی شامل ہیں۔ پنجم، دیہات سے شہر پہنچ کر حیران اور مایوس ہونے والے افراد۔ ششم، روحانیان۔ ہفتم، بائیں بازو کی جماعتیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ متضاد مقاصد رکھنے والے لوگ حکومت کی مخالفت میں متحد ہوتے جارہے ہیں۔ کل تک کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ قم کی سیاہ پگڑیاں، ماسکو کی سمور کی ٹوپیاں اور امریکہ کی نیلی بدرنگ جھول دار جینز، تہران میں ایک تہرے تہ دار اتحاد کی علامت بن جائیں گی۔ ایسے اتحاد کے بارے میں صرف ایک بات یقینی ہے۔ ناکام ہوئے تو اتحاد ختم اور ایک دوسرے پر الزام تراشی۔ کامیاب ہوئے تو ایک دوسرے کی جگہ لینے کی کوشش اور خانہ جنگی۔ دونوں کا حاصل خانہ خرابی۔

سفارتی ملاقاتوں کے سلسلہ کو انجام تک پہنچانے کے لئے میں ایک ایسے سفیر کے گھر میں داخل ہوتا ہوں جن سے دو چار بار سرسری ملاقاتیں پہلے ہو چکی ہیں۔ مفصل گفتگو کی صورت چند ہفتوں کے بعد آج پیدا ہوئی ہے۔ سفیر محترم نے یورپ سے در آمد شدہ آئس کریم پر ایرانی پستہ کی ہوائیاں چھڑکتے ہوئے کہا۔ یہ اتنی بہت سی غلط سلط اطلاعات آپ نے کہاں سے جمع کر لی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایران میں ادھر ادھر اکا دکا مظاہرے ہو رہے ہیں مگر یہ سب دکھاوے کے لئے ہے۔ شہنشاہ کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ وہ ان مظاہروں کی معرفت امریکہ کو پیغام دے رہا ہے کہ دیکھو میں نے ذرا ڈھیل دی تو روس خلیج فارس تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ صرف زار روس کا گرم پانیوں تک پہنچنے والا خواب پورا ہو گا بلکہ ساتھ ہی ساتھ مشرق وسطیٰ کے تیل کے چشموں کی اجارہ داری کا وہ خواب جو روس نے کبھی دیکھا بھی نہیں وہ بھی پورا ہو جائے گا۔ اندریں حالات اے امریکہ کے اہل اقتدار، ہوش کرو، غور

سے میری بات سنو۔ اس علاقہ میں میرے علاوہ کسی اور کی بات سنو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔

سفیر محترم فرمانے لگے، شہنشاہ بڑا مدبر اور منتظم ہے۔ یہ سخنرانیاں، یہ راہ پیمائیاں، اس کا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ وہ جس دن چاہے گا یہ احتجاج یوں ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے چمچ آئس کریم کے پیالہ میں واپس رکھا اور چٹکی بجائی۔ پھر میری تسلی اور بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو کچھ کھولتے اور کچھ سمیٹتے ہوئے اس طرح حرکت دی جیسے پتلیوں کا ناچ دکھانے والا کرتا ہے۔ پتلی والے کی انگلیوں سے دھاگے بندھے ہوتے ہیں اور ان کا دوسرا سرا کسی کاٹھ کی پتلی کے سر پیر سے جڑا ہوتا ہے۔ پتلی والا قصہ سناتا اور انگلیاں ہلاتا ہے۔ ادھر پتلی اس قصہ کہانی کے مطابق تھرکتی ناچتی رہتی ہے۔ ادھر انگلیوں کی حرکت بند ہوئی ادھر پتلی دھڑام سے نیچے زمین پر آن گری۔ قصہ ختم پیسہ ہضم۔ میں میزبان کا منہ تکتا رہ گیا۔ میرے لئے جستجو اور گفتگو کے ان چند ہفتوں کے بعد یہ نظریہ قبول کرنا بڑا مشکل ہے کہ شہنشاہ محمد رضا تماشا گر ہے اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے اور میدان ژالہ میں گولیاں کھا کر زمین پر ڈھیر ہونے والے محض گڑیا گڈے اور پتلی پتلے ہیں۔

آئس کریم پگھل چکی ہے مگر پھر بھی حلق سے نیچے نہیں اترتی اور وہ دو چار چمچ جو گفتگو شروع ہونے سے پہلے کھائی تھی وہ اب کیسے ہضم ہو گی۔ ذرا دیر کے لئے میں اپنے گرد و پیش سے لاتعلق ہو گیا۔ مجھے آئس کریم کی ایک بہت پرانی دعوت یاد آئی اور میں بہت دور نکل گیا۔

مدت ہوئی نیویارک میں ایک مہمان نواز دوست نے مجھے آئس کریم کھلانے کے لئے اپنی موٹر میں بٹھا کر پچاس میل کا فاصلہ طے کیا۔ ہم کسی تفریح گاہ کے ریستوران میں جا پہنچے۔ اس نوعیت کے سفر کے بعد آئس کریم کا ذائقہ خواہ جیسا بھی ہو اس کی تعریف مہمان پر لازم ہو جاتی ہے۔ سو میں نے بھی تعریف کی مگر ذرا مختلف انداز میں۔ کچھ امریکہ کی تعریف، کچھ سفر کے مناظر کی تعریف، کچھ ہموار سڑکوں کی تعریف اور کچھ موٹر چلانے والے کی مہارت کی تعریف۔ آئس کریم کی باری آئی تو میں نے کہا۔ آپ کی جستجو اور شوق کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ہم نے محض پچاس میل کا سفر کیا ہے حالانکہ یہ وہ آئس کریم ہے جس کی

خاطر لوگ سات سمندر پار سے آتے ہیں اور پھر گھر واپس جانا بھول جاتے ہیں۔ جلاوطنی کا داغ اور غریب الوطنی کی ذلت قبول کر لیتے ہیں۔ اپنی ساری ذمہ واریاں اور اپنے سارے فرائض فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کے انتظار میں بوڑھی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ جوان محبتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ میرے خوش شکل میزبان پہلے خوب کھلکھلا کر ہنسے پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ جیسے انہیں کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے نیویارک میں اس آئس کریم نوشی کا ذکر میزبان کے ایک پرانے ساتھی سے کیا۔ وہ کہنے لگے۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ ایک کیمیائی تجزیہ رپورٹ کے مطابق اس مشہور آئس کریم میں دودھ کا ایک قطرہ اور شیر خانہ کی مصنوعات کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں۔ کچھ خاک چینی یعنی کھریا مٹی ہے۔ کچھ مصنوعی اجزا اور کچھ کیمیاوی مرکب۔ یہاں تک کہ مٹھاس بھی نقلی ہے۔ مجھے واقعی بڑا تعجب ہوا۔ امریکی صنعت گری کے کمال پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر جو اصل کو چھوڑ کر نقل کی خاطر میلوں کا سفر کرتے ہیں۔

پندرہ سال بعد اچانک یہ اطلاع ملی کہ نیویارک کے مہمان نواز پاکستان دوست نے پنشن پر جانے کے بعد برسوں ساتھ نبھانے والی پاکستانی بیوی سے علیٰحدگی اختیار کر لی ہے اور اس کی جگہ کالج کے دنوں کی جان پہچان والی امریکی لڑکی کو جو اب عمر رسیدہ اور از کار رفتہ خاتون ہے، اپنے حبالۂ نکاح میں لے لیا ہے۔ مجھے یہ خبر سن کر کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ یورپ اور امریکہ میں تیسری دنیا کے ایسے باشندوں کی اب کوئی کمی نہیں جو تمام عمر سفید چکنی مٹی اور جعلی مٹھاس کا پیچھا کرتے ہیں۔ خواہ وہ آئس کریم ہو یا گرل فرینڈ۔ کہاں وہ جنگ عظیم سے پہلے پڑھنے کے لئے ولایت جانے والی پرانی نسل اور کہاں یہ نوکری کے لئے دربدر ماری ماری پھرنے والی نئی نسل۔ ان دنوں سفر پر جانے سے پہلے دعا مانگی جاتی تھی۔ خواجہ من نگہدار آبروئے گدائے خویش۔ آنکہ زجوئے دیگراں پر نہ کند پیالہ را۔ اے آقا۔ اپنے در کے اس گدا کی آبرو کی حفاظت کرنا جو دوسروں کی ندی سے اپنا پانی کا پیالہ بھرنے کا روادار نہیں ہے۔ وہ نسل آرزو اور آبرو کے سہارے ندی کنارے پیاسی کھڑی رہی۔ موجودہ نسل میں ایک کھیپ کی کھیپ ایسے راہ گم کرنے والے لوگوں کی ہے جو اعلیٰ روایت، جدید تعلیم اور اچھے عہدے کے باوجود دوسروں کے گدلے گندے اور استعمال شدہ پانیوں میں اپنی خوشی سے اترے اور اپنی مرضی سے ڈوب گئے۔

(5)

تعارفی ملاقاتیں اب بھی جاری ہیں مگر نہ وہ اوپر تلے والی تیزی رہی نہ صبح و شام والا تسلسل۔ حالات بدل گئے ہیں بلکہ مسلسل بدتے چلے جا رہے ہیں۔ اب وزیروں سے ملاقات بالکل بے مزہ ہو گئی ہے۔ نہ میزبان پرتپاک نہ مہمان پرجوش۔ ایک پریشان دوسرا معذرت خواہ۔ میں ملاقاتوں کے لئے وزرا اور سفرا کو چھوڑ کر ایک نئے طبقہ کا انتخاب کرتا ہوں۔ دانشور، ہنرور، صحافی۔ تاس اور رائٹر کے نمائندے خود چل کر آئے۔ باقی لوگوں سے دوسروں کے گھروں پر ملاقات ہوئی۔ تاس والے نے جو سوالات پوچھے وہ اخباری سے زیادہ آزمائشی تھے۔ اس کے ذہن میں دو باتیں تھیں۔ کیا نیا سیکرٹری جنرل سفارتی دعوتوں اور نمائشی ہنگاموں کا آدمی ہے یا کچھ پیشہ ورانہ تجربہ اور عزائم رکھتا ہے۔ کیا آر سی ڈی مستقبل میں کسی وقت وسط ایشیا کی شوروی ریاستوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ رائٹر والے سے گفتگو غیر رسمی ماحول میں ہوئی۔ آر سی ڈی کی مشترکہ منڈی کے امکانات کے سوا باقی تمام گفتگو گپ شپ کے انداز میں ہوئی۔ چین کی خبر رساں ایجنسی کا نمائندہ کچھ کھویا کھویا سا لگا۔

ایجنسی فرانسوا کے نمائندے نے جس صراحت اور بے تکلفی سے حالات کا تجزیہ کیا اور مستقبل قریب کے بارے میں جس قطعیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ کہنے لگا، یہ شہنشاہ نہ تو 1953 ء میں لوٹ کر دوبارہ تخت نشین ہونے والا نوجوان مہم جو ہے اور نہ 1963 ء کے سفید انقلاب کے مخالفین کو بے دردی سے کچلنے والا حاکم۔ 1973 ء میں اوپیک کی طرف سے تیل کی قیمتوں میں اضافہ کا اعلان کرنے والے اہم عالمی لیڈر کا درجہ بھی اب اسے حاصل نہیں رہا۔ خیال ہے کہ دل کا شدید دورہ پڑنے یا ناقابل علاج ناسور کے سبب یا شاہی خاندان میں کسی کی گولی کا نشانہ بننے کے باعث وہ ایک بیمار جسم، ایک اداس جی، ایک پریشان ذہن اور ایک متردّد شخص ہے۔ وہ حکومت کرنے کے لائق نہیں رہا۔ آپ میری بات یاد رکھیں۔ ایران میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے

جس کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دھماکہ کب ہو گا۔ کل یا پرسوں مگر یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دھماکہ ضرور ہو گا اور بہت جلد ہو گا۔ میں چند ماہ سے اس متوقع مگر غیر معین دن کا انتظار کر رہا ہوں۔ انتظار کی الجھن دور کرنے کے لئے ایک کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا ہے۔ میں نے آپ کو ایک ذمہ دار نووارد سفار تکار کی حیثیت سے وہ بات صاف صاف بتا دی ہے جو دوسرے شاید اشاروں میں بھی بتانا پسند نہ کریں۔

خبر رسانی کی دنیا کے اس باہوش اور باخبر شخص کی بات ختم ہوئی۔ میں نے اس پر اعتبار کیا اور اس کے ساتھ دھماکہ کا انتظار کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ انتظار کی الجھن کا علاج یہ نکالا کہ ڈائری لکھنی شروع کر دی۔

(6)

میں نے زندگی میں کبھی روزنامچہ نہیں لکھا۔ یہ پہلا موقع ہے۔ ایک فرانسیسی اس کا محرک ہے۔ ایک ایرانی اس کا مرکزی کردار ہے۔ یہ شہنشاہ ہے اور وہ صحافی۔ روزنامچہ لکھنا میرے لئے ایک نیا اور دلچسپ تجربہ ہے۔ مجھے بے اختیار خواجہ حسن نظامی یاد آئے۔ ایک زمانہ میں خواجہ صاحب کے روزنامچہ کی بڑی دھوم تھی۔ وہ منادی اخبار میں چھپا کرتا تھا۔ دھوم اگرچہ دور دور تک تھی مگر اسے شوق سے پڑھنے والے صرف پرانی دلی میں بستے تھے۔ نئی دلی ساتھ لگتی تھی مگر اس کا مزاج اتنا مختلف تھا کہ وہاں خواجہ صاحب کے روزنامچہ کی کھپت کا کوئی امکان نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے یہاں خیال اور عبارت دونوں میں بڑی شوخی ہے۔ سو سے زیادہ تصانیف ہیں۔ طرح طرح کے عنوان اور ہر طرح کے مضامین۔ طمانچہ بر رخسار یزید، بیگمات کے آنسو، نظامی بنسری، تمباکو نامہ، پھکنی اور دست پناہ، کم ٹو موت، نئی تہذیب کی بوتل کا کاک، خدائی انکم ٹیکس۔ یہ ان کی چند تصانیف کے اچھوتے عنوانات ہیں۔ مضامین کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ تفسیر، تصوف، تاریخ، آخری مغل بادشاہ، غدر، عمر بڑھانے کے طریقے، مفلسی کا مجرب علاج۔ وہ کونسی بات ہو گی جو ان کے مشاہدہ

میں آئی اور ان کے قلم کی گرفت سے بچ گئی۔ وہ ایک جھینگر کی موت سے متاثر ہو کر پکار اٹھے۔ جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ اس جنازہ کا خیال انہیں ویسٹ منسٹر ایبے اور بہشتی مقبرے تک لے گیا۔ وہ بے اختیار مرحوم کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔ "اے پروفیسر! اے فلاسفر!! اے متوکل درویش!!! اے نغمہ ربانی گانے والے قوال!!!!"۔ وہ ساری صفات جو ہمیں کسی زندہ و تابندہ آدمی میں یکجا نظر نہیں آئیں وہ انہیں ایک جھینگر میں دریافت کر لیتے ہیں جس کا مردہ اور سوکھا ہوا جسم چیونٹیاں گھسیٹ کر اپنے بل میں لے جارہی تھیں۔ ایسے یگانہ روزگار شخص کی تقلید کیسے ممکن ہے جس کے لئے اردو ایک درگاہ تھی، محاورے مجاور اور انشائیہ متولّی۔

میں روزنامچہ کی مثالیں تلاش کرتا ہوا اردو نثر کے ایک ضخیم انتخاب کے ورق الٹتا ہوں۔ مقالے، افسانے، ڈرامے، جائزے، مطالعے اور خاکے۔ شخصیات، رپورتاژ، تراجم، طنز و مزاح اور سفر نامہ۔ بحث، سمپوزیم، ہماری دنیا، ہمارا سماج، ہماری تحریک اور ہمارے نام۔ سارے عنوانات موجود ہیں۔ اک نہیں تو روزنامچہ کا عنوان موجود نہیں۔ مایوسی ہوئی کہ مثال نہیں ملی۔ میں ذہن پر زور دیتا ہوں۔ کچھ روزنامچے یاد آئے۔ جو دوسرے یا تیسرے درجہ کے رسالوں میں کبھی پڑھے تھے۔ یاد دھندلی اور نامکمل۔ تاثر واضح اور مکمل۔ کوئی روزنامچہ بھی ایسا نہ تھا جس کی تحریر سے یہ پتہ چلے کہ دن بھر کا تھکا ہوا آدمی کمر سیدھی کرنے کی زبردست خواہش کے باوجود محض وضع داری نبھانے کے لئے قلم برداشتہ ڈائری لکھتا رہا۔ یہ سب تحریریں تازہ، توانا اور فرضی تھیں۔ آرام سے لکھی گئیں۔ اطمینان سے مختلف ٹکڑوں پر مختلف تاریخیں درج کی گئیں۔ مضمون کو روزنامچہ بنا دیا۔ ان روزنامچوں میں ہر دوسرے تیسرے صفحہ پر موسم کا حال محاوروں اور روایتوں کی رعایت سے بیان کیا جاتا۔ وہ چیل کا انڈہ چھوڑنے والی گرمی۔ وہ چوٹی سے ایڑی تک پسینا کا مہینہ۔ وہ حبس کہ جس میں لو کی دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ کڑاکے کے جاڑے میں لحاف، آتش دان کی آگ، کشمیری چائے، ابلے انڈے، خشک میوہ اور ان کے علاوہ اور بہت کچھ۔ گلابی جاڑا اور صرف ایک دلائی۔ برسات کے آم، جھولے، گیت، جھینگر اور جگنو۔ خزاں کا پت جھڑ اور زرد پتوں کی بہار۔ مجھے ان روزنامچوں سے کیا لینا۔ یادداشت کے جس خانے سے یہ برآمد ہوئے تھے اس سے بھی پچھلے خانہ میں انہیں واپس رکھ دیا۔

روزنامچہ نگاری کی کوئی اچھی مثال نہ ملی۔ مایوسی کی بجائے خوشی ہوئی۔ آخر یہ خوشی کا کون سا موقع ہے۔ میں نے غور کیا اور نیت کے تہ خانہ میں اتر کر دیکھا۔ وہاں شہرت اور کامیابی کی خواہش چھپی ہوئی تھی۔ تلبیس ابلیس۔ اردو ادب میں روزنامچہ نگاری کی صنف بڑی غریب ہے۔ میدان خالی نظر آیا۔ ناموری کے امکانات اسی قدر روشن نظر آئے۔ ہماری ڈائری چونکہ ادب میں ایک خلا کو پر کرے گی لہٰذا اس کی پذیرائی ہو گی۔ کتاب چھپے گی۔ تقریب رونمائی ہو گی۔ احباب تعریف کے پل باندھیں گے۔ ہم چہرے پر عجز و انکسار سجائے ہوئے اس پل پر سے گزر کر خودپسندی کے ایک ایسے باغ میں جا نکلیں گے جہاں صرف نرگس کے پھول کھلتے ہیں۔

فارسی میں ڈائری کو دفتر خاطرات روزانہ کہتے ہیں۔ دل کا غبار جس دن ورق پر منتقل کر دیا وہی اس دن کی ڈائری۔ چند اوراق جمع ہو جائیں تو وہی ان دنوں کا دفتر۔ پہلے دن میں نے ڈائری بڑے شوق سے لکھی۔ جو کچھ کیا تھا اس کی روئیداد بنا سنوار کر لکھی۔ جو کچھ دیکھا تھا اسے بڑھا چڑھا کر رقم کیا۔ جو دیکھنے کو نہ ملا اس کا ذکر جان بوجھ کر بیچ میں گھسیٹ لائے۔ دلچسپ بنانے کے لئے لطیفہ گھڑ لیا۔ دھاک بٹھانے کے لئے فارسی اشعار اور عربی مقولے کا سہارا لیا۔ انگریزی اقتباس کا استعمال کل پر اٹھا رکھا۔ پہلے دن کی طویل داستاں سرائی کی وجہ سے دوسرے دن کے لئے خیالات کا توڑا پڑ گیا۔ نہ کوئی واقعہ ہی واقع ہوا۔ ڈائری کا صفحہ خالی رہ گیا۔ تیسرے دن بہت مصروف رہا اور تھک گیا۔ آدھی رات کے وقت لکھنا چاہا مگر اس خیال سے اونگھ آگئی کہ نیا دن شروع ہو چکا ہے۔ اب جان مارنے کا کیا فائدہ۔ صبح ہو گی تو لکھ لیں گے۔ تاریخ پچھلی ڈال لیں گے۔ تیسرے دن جب دوسرے دن کی ڈائری لکھی تو وہ باسی اور بے معنی لگی۔ چوتھے دن پھر عہد کو تازہ کیا اور جی لگا کر کئی ورق سیاہ کئے۔ جوں توں کر کے چار ہفتے گزرے اور تمام تکلّفات دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اب ڈائری اس نہج پر لکھی جانے لگی جس کے ہم اہل تھے۔ ہر روز رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان لکھتے۔ دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت صرف نہ کرتے۔ پنسل سے لکھتے۔ صاف لکھنے کی کوشش نہ کرتے۔ اور اگر کرتے بھی تو اس نے کب بار آور ہونا تھا۔ خط شکستہ اور مختصر نویسی کو ملا کر کوئی نیا خط ایجاد کر لیا تھا۔ شعر یاد آیا تو صرف پہلا لفظ لکھ کر

لکیر کھینچ دیتے۔ بامحاورہ لکھنے کی کسے فرصت تھی۔ بس روزمرہ کافی سمجھا۔ مکمل بات بڑا وقت چاہتی ہے لہٰذا اختصار سے درج کرتے اور گاہے اختصار کی جگہ صرف اشارے سے کام لیتے۔ جہاں انشاء کی فکر نہ ہو وہاں املا کی پروا کون کرتا ہے۔ ربط بگڑا میری انشا کا غلط املا ہوا۔

چھ ماہ یونہی گزر گئے۔ دو سو صفحہ کی مجلد کاپی بھر گئی۔ سوچا کہ اب اس پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ بات بنی کہ نہیں بنی۔ آخر ہفتہ کی دو چھٹیاں اس کام کی نذر ہو گئیں۔ پڑھنے میں بڑی دقت ہوئی۔ اپنا لکھا ہوا تھا اس لئے کسی سے شکایت کیا کرتے، ذکر تک نہ کیا۔ گاہے یہ سمجھنے میں بھی دقت ہوئی کہ اس بات یا ایسی باتوں کو ڈائری کی صورت محفوظ کرنے کا کیا فائدہ۔ یہ دیکھ کر بھی رونا آیا کہ غیر ضروری معاملات پر بڑی خامہ فرسائی کی ہے اور ضروری باتوں کی صرف تاریخ اور وقت درج ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے تجربہ کی تائید۔ مولانا نے ایران کے سفر کے دوران جو ڈائری لکھی اس میں پہلے ہر بات لکھتے چلے گئے اور کچھ عرصہ بعد اس طرح کے مختصر اندراج کو کافی سمجھا۔ شیراز سے روانگی، 10 ر نومبر 1885ء اصفہان میں آمد، 25 ر نومبر۔ قیام صرف پانچ روز۔ طہران میں آمد، 10 ر دسمبر۔ قیام تقریباً تین مہینے۔ مولانا کی چار ماہ میں یہ حالت ہو گئی تھی۔ میرا قیام چار سال کا ہے۔ اور میں کوئی مولانا بھی نہیں ہوں۔ صرف ایک بات مشترک ہے۔ وہ بھی نوکری کے واسطہ ایران کے سفر پر نکلے تھے اور میں بھی نوکری کے سلسلہ میں یہاں آیا ہوں۔ ہم دونوں کی نوکری کی نوعیت میں البتہ تھوڑا بہت فرق ہے۔ سنا ہے ان کے فرائض میں کسی کے لئے خفیہ روزنامچہ لکھنا شامل تھا۔ میری حالت یہ ہے کہ صرف اپنے شوق کی خاطر لکھنا ہے۔ کوئی مجبوری ہے نہ کسی کا زور۔ اس کے باوجود یادداشت رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ بات چھ ماہ کی خفت اور خواری کے بعد سمجھ میں آئی کہ اردو ادب میں روزنامچہ کیوں کمیاب بلکہ بالکل نایاب ہے۔

باب پنجم

بزم آرائی اور ہنگامہ آرائی

رمضان کا مہینہ آیا۔ دبے پاؤں اور بڑی خاموشی کے ساتھ۔ اس مہمان کی طرح جو ناوقت آمد کی وجہ سے خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو۔ نہ دفتروں کے اوقات کار تبدیل ہوئے۔ نہ بازاروں میں کوئی اہتمام دیکھنے میں آیا۔ نہ احترام رمضان کی سرکاری اپیل۔ نہ فضائل رمضان پر اخبار کا ضمیمہ۔ نہ دن کو ٹھیلوں پر کھجوریں بیچنے والے۔ نہ سہ پہر کو جابجا اینٹیں جوڑ کر عارضی چولھے پر کڑاہی چڑھانے والے۔ نہ طعام گاہوں کی در بندی ہوئی نہ ان کے دروازوں پر پردے ڈالے گئے۔ ٹوپیوں کی فروخت بڑھی نہ تسبیح رولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ سحر و افطار کی خبر لانے والے سائرن نے بھی چپ سادھ لی۔ میں نے ماہ رمضان کو اتنی خاموشی سے آتے ہوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

شعبان کے آخری جمعہ کے روز نمازیوں میں سحر و افطار کا گوشوارہ تقسیم ہوا۔ پاکستانی مدرسہ میں ہفتہ واری نماز ادا کرنے والوں کی مختصر جماعت کے لئے چھپائی کا انتظام کون کرتا۔ بس ہاتھ سے لکھا اور مشین نے فوٹو کاپیاں بنا دیں۔ اس گوشوارہ میں نماز تراویح کا وقت بھی درج ہے۔ حسب دستور تراویح پڑھانے کے لئے حافظ صاحب پاکستان سے آئے ہیں۔ اس دفعہ ان کے آنے میں کچھ دقت پڑی اور دیر ہو گئی۔ کہنے لگے۔ میرے گھر والے پریشاں تھے۔ منع کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تہران میں حالات بڑے خراب ہیں۔ آج مجھے آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ دیکھنے میں یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آتا

ہے۔ اتنے میں دور سے ایک دھماکہ کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔ جناب من۔ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حافظ صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

پاکستان میں رمضان کی آمد کا اثر ملک کی سیاست پر براہ راست پڑتا ہے۔ سیاسی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ جلوس چلتے چلتے تھم جاتے ہیں۔ احتجاج ملتوی ہو جاتا ہے۔ رمضان اور سیاست کے اس باہمی تعلق کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ گورنر مغربی پاکستان مشورت کر رہے تھے۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ایک افسر نے کہا۔ یہ نئی پارٹی بنانے والے موقع ناشناس اور بے مہارت لوگ ہیں۔ رمضان سے چار پانچ ہفتہ پہلے جو سیاسی پارٹی بنائی جائے گی اس کا زور رمضان شروع ہوتے ہی ٹوٹ جائے گا۔ نہ تنظیمی دورے ہو سکیں گے۔ نہ جلسہ جلوس کے لئے لوگوں کو آمادہ کیا جا سکے گا۔ پھر عید آ جائے گی جس کا سرور ہفتہ دس دن تک باقی رہتا ہے۔ لوگ تعطیل اور تفریح کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ نئی پارٹی ملک گیر کنونشن اور کافی خرچہ کرنے کے بعد عید تک واپس اس مقام پر پہنچ جائے گی جہاں سے چلی تھی۔ جناب والا، یہ نئی پارٹی والے آغاز میں ہی ایک غلط چال چل رہے ہیں۔ یہ بازی ہار جائیں گے۔ ریٹائرڈ جنرل محمد موسیٰ یہ ماہرانہ رائے سن کر بڑے متاثر اور مطمئن ہوئے۔ میٹنگ برخاست ہو گئی۔ مسئلہ گویا خود بخود حل ہو گیا۔ دو چار دن کے بعد پتہ چلا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا یوم تاسیس چند ہفتوں کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اندر کی باتیں بھی کتنی آسانی سے باہر نکل جاتی ہیں۔ بعض اوقات جو شخص خبر لے کر اندر آتا ہے وہی باہر جا کر مخبری کر دیتا ہے۔ چت بھی میری پٹ بھی میری۔

خیال تھا کہ رمضان کی آمد آمد کی وجہ سے حالات سدھر جائیں گے۔ تہران میں زندگی معمول کے مطابق بسر ہو گی۔ لوگ نماز روزہ میں لگ جائیں گے۔ تراویح اور شبینہ کی وجہ سے کسی اور کام کے لئے فرصت ہو گی نہ ہمت۔ توجہ بٹ جائے گی۔ سیاست پس منظر میں چلی جائے گی۔ احتجاج موقوف ہو گا اور مظاہرے منسوخ۔ یہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جو اچانک گلیوں سے نکل کر کسی بڑی سڑک پر آ جاتی ہیں، یہ چوک میں کہیں سے یکایک نمودار ہونے والا سو دو سو آدمیوں کا گروہ، یہ چھوٹے چھوٹے سے جلوس جو گا ہے تہران یونیورسٹی کی طرف خاموشی سے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اب مہینہ بھر چھٹی منائیں گے۔ جو کچھ ہونا ہے وہ عیدالفطر کے بعد ہو گا۔ میں بھی ان لوگوں کا ہم خیال تھا اور میری رائے

محض اس لئے معتبر سمجھی جاتی تھی کہ صاحب ضلع کی حیثیت سے مجھے بلوا اور غوغا کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ یہ پاکستانی تجربہ ایرانی حالات کے تجزیہ کے لئے اتنا کار آمد ثابت نہ ہوا جتنا میرا خیال تھا۔ ہم سب اور ہمارے سارے اندازے غلط نکلے۔

شہنشاہ کے خلاف جو محدود اور کمزور سی تحریک چل رہی تھی وہ ماہ رمضان میں دن بدن زور پکڑتی چلی گئی۔ اثر کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ شامل ہونے والوں کی تعداد میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا گیا۔ خاموش مظاہروں کی زبان کھل گئی۔ وہ لوگ جو پہلے ان مظاہروں کو تہران یونیورسٹی اور قم کے ایک مدرسہ کا احتجاج سمجھ کر دور سے دیکھ رہے تھے انہیں احساس ہوا کہ یہ ساری قوم اور سارے ملک کا معاملہ ہے لہٰذا وہ گھروں میں دبک کر بیٹھے رہنے اور تماشا دیکھنے کے بجائے اس احتجاج میں شامل ہو گئے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ انتظامیہ حیران رہ گئی۔ مقامی اور بین الاقوامی دباؤ کے تحت تھوڑی بہت مخالفت برداشت کرنے کی جو قوت انتظامیہ نے پچھلے چند ماہ میں پیدا کی تھی وہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کم پڑ گئی۔ انتظامیہ کے رویہ میں سختی آگئی۔

مظاہرین کا رویہ بھی بدل گیا۔ بھاگنے کے بجائے گرفتاریاں دینے لگے۔ آنسو گیس چھوڑی گئی تو منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ اس گیس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے آنسوؤں کا تار ایک طویل مدت سے بندھا ہوا ہے۔ آگ لگی۔ سینما، بنک، ہوٹل اور دفاتر جلے۔ گولی چلی۔ لوگ بڑی تعداد میں مرنے لگے۔ زخمیوں کا تعاقب کرتے ہوئے انتظامیہ جوتوں سمیت تہران اور کرمان کی مساجد میں داخل ہو گئی۔ بے ادبی کے اس واقعہ کے بعد فوجی فل بوٹ کی دھمک صاف سنائی دینے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی شہروں میں مارشل لا لگ گیا۔ نجف آباد، شاہ رضا، ہمایوں شہر اور اصفہان۔ اصفہان کو نصف جہاں کہتے ہیں۔ وہاں مارشل لا لگا تو گویا دنیا بھر میں جگہ جگہ لگ گیا۔

ایک دوست مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اگلے ماہ آپ کے دورہ کے لئے اصفہان کے جس ہوٹل میں کمرا رزرو کرایا تھا اسے خرابکاروں نے آگ لگا دی ہے۔ شاہ عباس ہوٹل کی عمارت نادر اور تاریخی ہے۔ اس میں داخل ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے صفوی عہد کا سنہرا دور واپس آگیا ہے۔ شیشہ کاری، کاشی کاری، نقاشی،

شمعدان، قلیان، دستر خوان، فرش اور عملہ کا لباس سبھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مظاہرین کتنے ہنر دشمن، غارت گر، تہذیب سوز، اور وحشی ہیں۔ آرٹ کالحاظ نہ آرکیٹکچر کا خیال۔ کیسی کیسی نادر عمارات کو ویران کر رہے ہیں۔ ہجوم نے کبھی اور کسی ملک میں باشعور اور باذوق ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔

رضا شاہ بھی بحث میں شامل ہو گئے۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ لوگوں سے کہنے لگے کہ سیاہ و سرخ کے اتحاد سے خبردار رہنا۔ سیاہ سے ان کی مراد وہ روحانیون ہیں جو عام طور پر سیاہ چوغہ پہنتے ہیں اور سبک سیاہ پگڑی کو سر پر سیدھا رکھنے کے بجائے ماتھے پر ذرا پیچھے سرکا لیتے ہیں۔ سرخ سے مراد وہ نوجوان ہیں جو اشتراکی روس کو ارض مقدس کا درجہ دیتے ہیں اور خونی انقلاب کے بغیر انہیں کسی طرح راضی کرنا ناممکن ہے۔ شہنشاہ نے اپنی خدمات گنائیں۔ اے غافلو، اے ناشکرو۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں کون ہوں۔ کیا تم بالکل اندھے ہو گئے ہو۔ تمہیں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا کہ میں نے تمہارے لئے کیا کیا کچھ کیا ہے۔ میں ایران نو کا معمار ہوں۔ یہ لوگ خراب کار ہیں۔ میں ایران کو تمدن بزرگ کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ دو کوڑی کے لوگ تمہیں وحشت بزرگ کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے۔ اس خطاب کے اگلے ہی روز میں نے تمدن بزرگ کی ایک جھلک اور وحشت بزرگ کا ایک نمونہ دیکھا۔

مسز امینی نے یاد دہانی کرائی۔ شہنشاہ اور ملکہ فرح کا دعوت نامہ۔ برائے صرفِ شام۔ بوقت ساڑھے سات بجے۔ بمقام کاخ سعد آباد۔ میں نے مسز امینی سے کہا۔ ایک سٹاف کار میں تو میں اور عذرا جائیں گے مگر شہنشاہ جو تحائف دیں گے ان کی باربرداری کے لئے دوسری موٹر درکار ہو گی۔ مسز امینی نے کہا ایسے موقع پر کوئی تحفہ نہیں دیا جاتا۔ میں نے کہا، ابن خلدوں نے لکھا ہے کہ نوشیروان کے ایک امیر کے یہاں تقریب تھی۔ چاندی کے خوانوں اور سونے کے پیالوں میں کھانا آیا۔ خوان کو چار لونڈیاں اٹھا کر لاتی تھیں اور چار آدمی ایک خوان پر بیٹھ جاتے تھے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد وہی چار آدمی خوان، پیالوں اور لونڈیوں کو اپنے ہمراہ گھر لے جاتے تھے۔ وہ تو محض ایک درباری کی سخاوت تھی۔ ظاہر ہے کہ شہنشاہ کے یہاں سے تو اس سے کہیں زیادہ تحائف ملیں گے۔ میں ابن خلدون کی بات کا اعتبار کروں یا تمہاری بات مانوں۔

موٹر محل کے صدر دروازے کے پاس ذرا آہستہ ہوئی۔ حفاظتی عملہ کے ایک فرد نے سواریوں کی جھلک دیکھی اور اندر جانے کے لئے اشارہ کیا۔ یہ دہرے بدن کا آدمی جس کے سر پر فوجی ملاحوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بال ہیں بلکہ سامنے سے وہ بھی غائب ہیں، شکل شناسی کا ماہر شمار ہوتا ہے۔ اہم سرکاری تقریبات کے موقع پر دروازے کے قریب پانچ چھ آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور جہاں دوسرے فہرستوں، دعوتی رقعوں اور شناخت ناموں کی پڑتال میں الجھے رہتے ہیں یہ صرف اپنی نظر اور اپنے حافظہ سے کام لیتا ہے۔ موٹر ایک پہاڑی راستہ پر اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ سے ہوتی ہوئی ایک ڈھلان پر جاکر رک گئی۔ اس احاطہ میں محل کے علاوہ کئی ولا بنے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں موٹر سے اتر کر نشیب میں واقع مادر ملکہ یعنی بیوہ رضا خاں اور والدہ رضا شاہ کے سفید رنگ ولا کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی سو گز کا فاصلہ ہو گا جس میں سے آدھا راستہ ایک لمبی میز کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے طے کیا۔ میز کے اوپر فوج کے اعلیٰ افسروں کی طرحدار ٹوپیاں بڑے قرینہ سے قطار اندر قطار رکھی ہوئی ہیں۔ خاکستری رنگ کی چھجے والی ٹوپیاں جن پر نشان دولت زرتار سے کڑھا ہوا ہے پہلی دو قطاروں میں رکھی ہوئی ہیں اور تعداد میں بحریہ اور فضائیہ کی ٹوپیوں سے زیادہ ہیں۔ ان کلاہان افواج شاہی کی مجموعی تعداد ڈیڑھ دو سو ہو گی۔ ساری کی ساری بے جسم اور بے سر ہیں۔ جیسے کسی نے سروں کی فصل کاٹ لی ہو اور عبرت کے لئے ٹوپیوں کی نمائش لگا دی ہو۔ یوں لگا جیسے سلطانی جمہور کا زمانہ آواز دے رہا ہو۔ اے دیدۂ عبرت نگاہ، آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ۔ کل تم کھوپڑیوں کے مینار بناتے تھے آج ہم ٹوپیوں کی قطار لگاتے ہیں۔ جونہی خیال آیا کہ یہ شگون اچھا نہیں میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں سے جلدی گزر جانے کا حکم ہے۔

ولا کے بر آمدہ میں شاہی خاندان کے لئے صوفے رکھے ہوئے ہیں۔ سامنے سبزہ زار میں ایک کھلا اسٹیج بنا ہوا ہے۔ مہمان پائیں باغ میں ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں۔ روشنی کا انتظام ایسا ہے کہ وہ براہ راست صرف پیڑوں اور پودوں، کیاریوں اور جھاڑیوں، روشوں اور فواروں پر پڑ رہی ہے۔ روشن پیڑوں کا پتا پتا علیٰحدہ دکھائی دیتا ہے مگر ان سے سو گز پیچھے اسی جنگل کے گرانڈیل پیڑ افق پر سیاہ لکیروں اور دھبوں سے زیادہ کوئی اور شناخت نہیں رکھتے۔ باغ کا وہ حصہ جو مہمانوں اور بوفے کی میزوں کے لئے مختص ہے وہاں بیش از بیش

اتنا اجالا ہے جتنا چاندنی رات کو ہوتا ہے۔ خواتین کے چمکیلے اور بھڑکیلے لباس مدہم روشنی میں دیکھنے والوں کو صوفیانہ لگ رہے ہیں۔ سیاہ ڈنر جیکٹ والے مہمان آپ اپنا سایہ بن گئے ہیں۔ میری کالی اچکن نے اندھیرے کے ساتھ ساز باز کر لی ہے۔ دور سے دیکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے گھٹنوں سے ٹخنوں تک کے ٹی کی سفید براق شلوار کے پائنچے آپ سے آپ باغ میں ٹہل رہے ہوں۔

محل کے باغ میں بہت سے خوش لباس مہمان جمع ہیں۔ وقتی طور پر ان سب کا رابطہ اس دنیا سے ٹوٹ چکا ہے جو محل کی دیوار کے باہر واقع ہے۔ کیسا احتجاج، کہاں کی ہڑتال، کون سا جلوس، کیسی آنسو گیس، کس کی گولی اور کس کی لاش۔ جہاں کہیں مردوں کی ٹولی ہے وہاں جملہ بازی اور لطیفہ بازی ہو رہی ہے۔ بوجھل فضا کو وقتی طور پر بھلانے کی شعوری کوشش کا سفارتی انداز۔ جہاں عورتیں جمع ہیں وہاں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ دل کا غبار نکالا جا رہا ہے۔ گھریلو اطلاعات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ میں ایک ایرانی ایڈمرل کی بیوی نے بچوں کی تعداد، عمر، تعلیم اور خاوند کا عہدہ پوچھنے کے بعد عذرا سے سوال کیا۔ کیا پاکستانی شوہر بھی ایرانی شوہروں کی طرح ہتھ چھٹ ہوتے ہیں۔ جواب سن کر بڑی حسرت سے کہا۔ یہ پاکستانی عورتیں بھی کتنی خوش نصیب ہیں۔ یہاں بیوی کو مارنا پیٹنا مردانگی کی علامت اور خصلت سمجھی جاتی ہے اس لئے نیچے سے لے کر اوپر تک ہر طبقہ میں اس کا رواج ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ خانم، آپ سے کیا چھپانا۔ میرا ہمسر بڑا اچھا آدمی ہے مگر ہے تو آدمی۔ ایک زمانہ میں کبھی کبھار مار پیٹ پر اتر آتا تھا۔ اب چونکہ بڑی عمر کا ہو گیا ہے اس لئے مارتا نہیں صرف مارنے کی دھمکی دیتا ہے۔

افطاری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ افطار کا کسی کو تردد ہی نہیں۔ اب تو وہ آٹھ دس منٹ جو ایک فقیہہ اور دوسرے چار فقہا کے درمیان حائل ہیں انہیں گزرے ہوئے بھی دیر ہو چکی ہے۔ بالآخر کہیں سے دو چار بیرے طشتریاں لئے نمودار ہوئے اور پانچ سو مہمانوں کو جو باغ میں چہار سو پھیلے ہوئے ہیں دور ہی سے سلام کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان طشتریوں میں کیا ہے۔ کھجور یا مشروب۔ میں نے ابھی روزہ بھی نہیں کھولا کہ یہ اڑن طشتریاں نظروں میں غائب ہو گئیں۔ خدا خدا کر کے خود خدمتی ڈنر شروع ہوا۔ جن میزوں پر کھانا چنا ہوا ہے وہاں سے بھیڑ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ عذرا بہت دیر سے پلیٹ ہاتھ میں لئے

کھڑی ہیں مگر ان کی باری نہیں آئی۔ یہ لوگ جو میزوں کے گرد جمع ہیں بڑے مہذب ہیں۔ جس کسی کو شائستگی سیکھنی ہو وہ ان کی حرکات و سکنات اور نشست و برخاست پر نظر رکھے۔ ان میں سے بہت سوں نے تکلّفات اور تشریفات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ اس وقت وہ اپنے علم کا عملی مظاہرہ کر رہے ہیں اور روزہ داروں کے صبر کا امتحاں بھی لے رہے ہیں۔ سہج سے دو چمچ قریبی ڈش سے اپنی پلیٹ میں ڈالنے کے بعد سر اٹھاتے ہیں اور ہمراہی سے پہلے مسکراہٹ اور پھر دو ایک جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد دوبارہ میز پر جھک جاتے ہیں۔ چستی، چالاکی، جلدی، اور تیز دستی کے برعکس کام کرنے کے جتنے بھی دھیمے، ڈھیلے، نرم اور ست رویئے ہوتے ہیں وہ سب کھانے کی میز کے گرداگرد دیکھنے میں آرہے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں جو اس انہماک سے آئین معاشرت کی پابندی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہمسائے ہو کر بھی ہم سے سبق نہیں لیتے کہ آئین معاشرت ہو یا آئین دولت اسے بلاوجہ اور بار بار کس طرح نظریۂ ضرورت کے تحت توڑا جاتا ہے۔ نظریۂ ضرورت کی رعایت سے پاکستان واقعی ایک نظریاتی ریاست ہے۔

کھانا کھانے کے لئے آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ میزیں لگی ہوئی ہیں۔ جب تک ہم دونوں کھانا لے کر اپنی میز تک پہنچے ہمارا روزہ اٹھ پہرا ہو چکا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک دوست نے پلیٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ کیا آپ نے اس سرو کے پاس بار بے کیو کا انتظام دیکھا ہے۔ وہاں سالم ہرن آگ پر بھونا جارہا ہے۔ میری پلیٹ میں دہی اور زرشک پلاؤ ہے۔ میں نے جس میز سے کھانا لیا ہے اس کا بھی پوری طرح جائزہ نہیں لیا۔ چہ جائیکہ میں سرو و صنوبر کے جھنڈ میں ہرنوں کی ڈار تلاش کرتا پھرتا۔ شاہی دعوت ہے ظاہر ہے پر تکلف ہو گی۔ میں احترام رمضان کی خاطر اس تکلف کی تفصیلات میں جانے سے انکار کرتا ہوں۔

اسٹیج پر روشنی ہوئی اور تفریحی پروگرام شروع ہو گیا۔ خواتین کے ایک طائفہ نے جو یورپ سے آیا ہے گانا سنایا۔ اس کے بعد دو چار مغربی ساز بجانے والے آئے۔ پھر ایک جادوگر نے تماشا دکھایا۔ آخر میں ایک ہندوستانی بازیگر آیا۔ گلابی پگڑ باندھے۔ گلے میں ہار ڈالے۔ مہاراجوں کا سا بھروپ بنائے۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ دو چار سال پہلے اسے ٹوکیو کے ایک تماشا گھر میں دیکھا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ شخص بلب کے

سامنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور مٹھیوں کو یوں گڈ بڈ کرے گا کہ ان کے سائے سے سامنے پردے پر عالمی لیڈروں کی تصویریں بن جائیں گی۔ ڈیگال کی تصویر پر غور کرنا۔ وہ اس کا شاہکار ہے۔ تماشا گر نے اپنا کام دکھایا۔ سفید پردے پر مشہور آدمیوں کے سیاہی مائل خاکے بنتے بگڑتے رہے۔ داد دینے والے کبھی تماشاگر کو داد دیتے کبھی صاحب تصویر کو۔ چارلی چپلن، واہ، واہ۔ مارلن منرو، آہ آہ۔ خروشیف، خاموشی۔ کینڈی، تالی۔ ڈیگال، تالیاں۔ شہنشاہِ ایران، بہت ساری تالیاں اور بہت دیر تک تالیاں۔ لوگ جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں۔ کاخ سعد آباد میں روسٹ ہرن کھانے کے بعد اگر راگ درباری نہ گاتے تو اور کیا گاتے۔

صبح ہوئی۔ اخبار آیا۔ خبر پڑھی۔ یقین نہ آیا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ آبادان جیسے مشہور شہر میں جہاں تیل کے کارخانہ اور تیل کی برآمد کی وجہ سے دنیا بھر سے لوگ اور تیل بردار بحری جہاز آتے جاتے ہیں وہاں کے ایک سینما گھر کے سارے دروازوں کو فلم دکھانے کے دوران باہر سے اتنی مضبوطی سے بند کر دیا جائے اور پھر اتنی مہارت سے عمارت کو آگ لگائی جائے کہ ہال میں موجود سارے کے سارے مرد عورتیں اور بچے اندر جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ ایک شخص بھی نہ بچا جو یہ بتاتا کہ تفریح کی خاطر ریکس سینما میں بیٹھے ہوئے لوگ جب کہانی کے کسی دلچسپ موڑ پر پہنچے تو کس طرح آگے موت کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مرگِ ناگہانی اور مرگِ انبوہ۔ کس طرح یکایک آگ نے انہیں چاروں طرف بلکہ چھ اطراف سے گھیر لیا۔ آگے اور پیچھے۔ دائیں آگ اور بائیں آگ۔ چھت بھی جل رہی تھی۔ فرش میں جڑی ہوئی کرسیاں بھی جل اٹھیں۔ اب کون بتائے کہ بھگدڑ کیسے مچی۔ لوگ دروازوں کی طرف کیسے دیوانہ وار لپکے۔ شعلوں میں جلتے ہوئے بند دروازوں تک جو لوگ سب سے پہلے پہنچے انہیں بھیڑ نے وہاں سے لوٹنے کا موقع نہ دیا۔ چیخیں بلند ہوئیں۔ دہشت سے، بے بسی سے، کچلے جانے سے، ملبہ کے نیچے دب جانے سے، جل کر مرنے کی بے انداز اذیت سے۔ مگر یہ چیخیں کس کام کی۔ ان سے آگ تو نہیں بجھتی۔ ان سے بند دروازے تو نہیں کھلتے۔

دنیا کی سب سے بڑی ریفائنری والے شہر میں فائر بریگیڈ موقع پر بہت دیر سے پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے دریافت کیا کہ سارے نل خشک ہیں۔ کہیں پانی کا ایک قطرہ بھی

نہیں۔ آگ بجھانے والوں کی تیاری کتنی ناقص تھی۔ آگ لگانے والوں کی تیاری ہر طرح سے مکمل تھی۔ اخبار لکھتا ہے کہ ریکس سینما میں تقریباً 400 تماشائی جل کر خاک ہو گئے۔ ایک اندازہ کے مطابق ان کی تعداد 700 تھی۔ ایک تحریر میں کل تعداد 1006 بیان کی گئی ہے۔ "آپؐ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کا شمار خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے ان (کے شمار) کو بہت قلیل لوگ جانتے ہیں"۔

میں نے ایک تصویر دیکھی۔ جلے ہوئے ہال کا ڈھانچہ۔ جلی ہوئی کرسیوں کے فریم۔ گری ہوئی چھت کا ملبہ۔ میں نے ایک تصویر اور دیکھی۔ ریتلے میدان میں کوئلے کی ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں۔ کوئلہ کی ہر ڈھیری ایک جلا ہوا جسم ہے۔ فلم کا شو شروع ہونے سے پہلے وہ ایک زندہ جسم تھا۔ کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ بنا سنورا ہو گا۔ شاید اس نے خوشبو بھی لگائی ہو۔ تاہم اس وقت وہ بے جان بے لباس مسخ شدہ سیاہ لاشہ ہے۔ لوگ اس کے پاس ناک پر رومال رکھے کھڑے ہیں۔ جس وقت خوش پوشاک شاہی مہمان سعد آباد محل میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت یہ تماشائی خوش وقتی کی تلاش میں ریکس سینما میں داخل ہونے کے لئے ٹکٹ خرید رہے ہوں گے۔ جب تہران میں محل کے باغ میں بار بے کیو کے لئے آگ دہکائی گئی ہو گی اس وقت آبادان میں ریکس سینما کو آگ لگائی جا رہی ہو گی۔ ادھر سالم مگر ذبح کئے ہوئے ہرن تھے ادھر زندہ اور جیتے جاگتے انسان۔ جب محل میں بھارتی بازی گر پردہ پر بڑے آدمیوں کے سیاہ خاکے بنا رہا تھا اس وقت تک عام آدمی سینما میں جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے۔ اپنے معمولات میں مصروف لوگوں کو اگر ہر لمحہ یہ پتہ چلتا رہے کہ اس وقت دنیا میں کہاں کہاں ظلم توڑا جا رہا ہے، کیسا کیسا ستم ہو رہا ہے، کمزور کے ساتھ کتنی بے رحمی اور زبردستی ہو رہی ہے، تو جینا حرام ہو جائے۔

تین دن ہو گئے ہیں جہاں جاؤ لوگ اسی واقعہ پر گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے۔ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے۔ سرکار کا اشارہ انتہا پسند مذہبی حلقوں کی طرف ہے۔ لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کام سرکار کی سرپرستی اور نگرانی میں کیا گیا ہے۔ البتہ اس پر اتفاق نہیں کہ یہ کون سے سرکاری ادارے کی کارستانی ہے۔ فوج، ساواک یا سول انتظامیہ۔ دفتر میں بحث جاری ہے۔ عملہ کے ایک ایرانی رکن نے کہا۔ حادثہ ہے۔ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے ہوا ہو گا۔ سننے والا ترک کارکن جو ایسے حالات پر تبصرہ کرنے

میں بڑا محتاط ہے زچ ہو کر بولا۔ ہم اتنے سادہ اور بھولے بھالے بھی نہیں کہ حادثہ اور سازش میں تمیز نہ کر سکیں۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک پاکستانی نے اس پر گرہ لگائی۔ اور ہم اتنے ناسمجھ اور بیوقوف بھی نہیں کہ بے رحم سیاست اور شارٹ سرکٹ میں بھی فرق نہ کر سکیں۔

(2)

حالات ایسے بگڑے ہیں کہ آج کل دفتر میں ملاقاتی بہت کم آتے ہیں۔ پاکستان سے تو شاذو نادر ہی کوئی آتا ہے اس لئے جونہی میں نے مینو بھنڈارا کا تعارفی کارڈ دیکھا تو ایسا لگا جیسے تازہ ہوا کا جھونکا دفتر کی ساکن اور باسی ہوا کی جگہ لینے کے لئے آگیا ہے۔ میں انہیں لینے کے لئے دفتر کے دروازے تک گیا۔ مینو کے والدین سے میری تھوڑی بہت شناسائی تھی۔ سن پچاس کی دہائی میں ہر دوسرے تیسرے دن کاسمو پالیٹن کلب میں ان سے ہیلو ہیلو ہو جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے مہینہ المکّی برادران کے یہاں کسی پر تکلف تقریب میں شرکت کے بعد سڑک کے تنگ ہونے کی وجہ سے ان کے گھر کے بالمقابل بھنڈارا ہاؤس کے گیٹ میں اپنی موریس آکسفورڈ موٹر داخل کئے بغیر وارث روڈ سے لوٹ آنا مجھے یاد نہیں۔ ان دنوں کاسمو پالیٹن کلب کے صدر فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سر عبدالرشید اور سیکرٹری پنجاب ہائی کورٹ کے جسٹس شبیر احمد ہوا کرتے تھے اور سرگرم شغل پسند المکی برادران، مجید اور حمید، لاہور کی معاشرتی زندگی میں بڑے مقبول اور نمایاں تھے۔ رہے مینو بھنڈارا تو وہ بہت چھوٹے تھے۔ کنڈر گارٹن سے اگر نکلے ہوں گے تو پھر پرائمری میں پڑھتے ہوں گے۔ لیکن آج کل وہ ایک کامیاب تاجر اور مصروف کارخانہ دار ہیں اور بیوپاری سفر پر تہران آئے ہوئے ہیں۔

بھنڈارا نے کہا۔ میں پاکستان اور ایران کی باہمی تجارت کے فروغ اور پاکستان کی برآمد میں اضافہ کی ایک اہم تجویز لے کر آیا ہوں۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے آر.سی.ڈی کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کچھ عرصہ سے میں اپنے کارخانۂ شراب کی بنی

ہوئی بیئر ایران بر آمد کر رہا ہوں۔ سڑک کے راستہ بھیجتا ہوں اور مشہد میں فروخت کرتا ہوں۔ اس علاقہ کے لوگوں کو اس بیئر کا ذائقہ پسند آیا اس لئے کھپت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ ولایتی شراب جو بیچنے اور مقامی آب جو بنانے والوں کو تشویش ہوئی۔ دونوں نے مل کر وزارت بازر گانی سے کسٹم ڈیوٹی کے طریق کار میں تبدیلی کرا دی ہے تاکہ میرے کارخانہ کا مال آنا بند ہو جائے۔ پہلے کسٹم ڈیوٹی قیمت پر لگتی تھی اب وزن پر لگائی جاتی ہے۔ مری بریوری کی بیئر شیشہ کی بوتل میں بھری جاتی ہے جبکہ ولایتی اور ایرانی بیئر ٹین کے ہلکے پھلکے ڈبہ میں بند ہوتی ہے۔ شراب کا وزن ایک ہوتا ہے مگر ظرف کے وزن کے فرق کی وجہ سے ہماری شراب پر دوگنا چوگنا محصول پڑ جاتا ہے۔ جب سے یہ نیا قاعدہ رائج ہوا ہے پاکستان سے ایران کے لئے بیئر کی بر آمد بند ہو گئی ہے۔ وزارت بازر گان سے قاعدہ میں یہ تبدیلی کرانی ہے کہ کسٹم ڈیوٹی میں ظرف کے وزن کی کٹوتی دی جائے۔ محصول خالص مشروب پر لیا جائے۔ یہ بڑا اہم اور ضروری کام ہے۔ پاکستان کی بر آمدات اور زر مبادلہ میں اضافہ کا مسئلہ ہے۔ آپ تہران آنے سے پہلے پاکستان کی وزارت تجارت کے سیکرٹری تھے اس لئے ایران کی وزارت بازر گانی میں آپ کے تعلقات سے کام نکل سکتا ہے۔ شنید تو یہی ہے۔

میں نے سر اٹھا کر مینو بھنڈارا کی طرف دیکھا۔ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید۔

میں نے بھنڈارا سے کہا، کیا آپ نے دو باتوں پر غور کیا ہے۔ پہلی تو یہ کہ تبریز کے بلوہ میں سب سے زیادہ زور شراب خانے تباہ کرنے پر تھا۔ جب وہ سارے کے سارے جلا دیئے گئے تو ہجوم نے اپنا باقی غصہ جدید طرز کے ہیر کٹنگ سیلون جلا کر اتارا۔ جہاں حجام کی دکان تک محفوظ نہ رہے وہاں آپ کی بھیجی ہوئی شراب کے گودام کیسے سلامت رہیں گے۔ حالات اگر ایسے ہی رہے تو کسی دن تہران کی شمس بریوری کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ خود ہی سوچئے کہ جہاں سینما کے ساتھ سینما دیکھنے والے بھی جلا دیئے جائیں وہاں شرابِ جو کی در آمد کے قوانین میں ترمیم کی تجویز کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آج کل رمضان کا مہینہ ہے۔ آپ کو قاآنی کے ایک قصیدے کے چند اشعار سنانا چاہتا ہوں۔ تعجب ہے آپ کو فارسی نہیں آتی حالانکہ آپ کے بزرگ نسلاً ایرانی تھے اور آتش کدۂ فارس کے بجھ جانے کے بعد وہاں سے برعظیم چلے آئے تھے۔ چلئے میں آپ کو ان اشعار کا وہ ترجمہ سنا دیتا ہوں جو شبلی نعمانی نے کیا تھا۔ شاعر غلام کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ رمضان آگیا

ہے۔ میری تسبیح اور جانماز اٹھالا۔ مجلس میں عیش کے جو سامان ہیں ان کو اٹھا کر لے جا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مولوی آجائے ...... اس مہینہ میں شراب پینی ناجائز ہے۔

بھنڈارا نے جواب دیا۔ میں ان دونوں باتوں پر غور کر چکا۔ شراب بنانے، بیچنے، بر آمد کرنے اور زر مبادلہ کمانے کے بعد میری کوئی ذمہ واری باقی نہیں رہتی۔ در آمد کرنے والا جانے اور اس کا کام۔ رسد اور طلب کا اصول آپ جانتے ہوں گے۔ شراب کی جتنی دکانیں جلائی جائیں گی اور جتنے کارخانے اور گودام یہاں تباہ کئے جائیں گے اسی قدر شراب کی تجارت میں منافع بڑھتا جائے گا۔ تبریز میں بلوہ کے بعد یہی ہوا۔ تہران اور مشہد میں بھی یہی ہو گا۔ رہی آپ کی دوسری بات تو اس کا جواب یہ ہے کہ شعر گھڑنے اور تجارت کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اگر رمضان میں کچھ لوگ روزہ کھولنے کے لئے مری بریوری کی بیئر پسند کرتے ہیں تو کیا انہیں روکنے کے لئے قاآنی اپنی قبر سے اٹھ کر آئے گا۔ میں نے فارسی شاعری کے وکیل صفائی کا فرض ادا کرتے ہوئے کہا۔ شاعر خود تو نہیں آئے گا مگر اس نے شعر میں برملا اس اندیشہ کا ذکر کیا ہے کہ اچانک کہیں سے مولوی نہ آجائے۔

مینو بھنڈارا نے مجھے بتایا کہ سی آئی اے نے ماہ رواں میں حالات حاضرہ کا جو تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق ایران میں نہ کہیں انقلاب ہے اور نہ آغاز انقلاب کے کوئی آثار۔ امریکہ کے ایک اور باخبر محکمہ کی رائے میں شہنشاہ ایران کو اگلے دس برس تک کوئی مائی کا لال ہلا نہیں سکتا۔ اتنی پختہ بنیاد حکومت کے عہد میں اور اتنے روشن خیال زمانہ میں بے چارہ مولوی کہاں سے آجائے گا۔ میں لاجواب ان کا منہ تکنے لگا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔

(3)

شمالی تہران میں پچیّس تیس پاکستانی گھرانے ایسے ہیں جن کا باہم بڑا میل جول ہے۔ رمضان کے مہینہ میں کم و بیش ہر روز یہ لوگ کسی ایک گھر میں مع اہل و عیال جمع ہو جاتے ہیں۔ پہلے گھنٹہ دو گھنٹہ تلاوت کرتے ہیں۔ اتنے میں روزہ افطار کرنے کا وقت ہو جاتا

ہے۔ نماز مغرب با جماعت ادا ہوتی ہے اور ما بعد کھانے کی میز پر سب مل کر دھاوا بولتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے اور خوش گپیوں کا دور چلتا ہے۔ چند احباب اٹھ کر تراویح کے لئے پاکستانی مدرسہ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ بیچ بیچ میں چھوٹے بچوں والے نوجوان جوڑے گھر جانے کے لئے اٹھتے رہتے ہیں۔ باقی جم کر بیٹھتے ہیں۔ آدھی رات سے پہلے کوئی جانے کا نام نہیں لیتا۔ پندرہ بیس روزے گزرنے کے بعد اتفاقاً مجھے اس سلسلہ کا پتہ چلا۔ چن شاہ جو ایک عالمی ادارے میں مدت سے کام کر رہے ہیں ان کا فون آیا۔ اپنا تفصیلی تعارف۔ آر سی ڈی کی سربراہی کی مبارکباد۔ تہران پہنچنے پر خوش آمدید۔ شام کو اپنے گھر پر روزہ افطار کرنے کی دعوت۔ ان کی آواز میں اتنا خلوص اور انکسار ہے کہ میں نے شکریہ ادا کیا اور دعوت قبول کر لی۔

چن شاہ کا فلیٹ تیسری منزل پر واقع ہے۔ دوسری منزل پر پہنچا تو آگے سیڑھی پر پاؤں رکھنے کی جگہ نہ ملی۔ ہر طرف مرد، عورت اور بچوں کے جوتے، چپل اور سینڈل پھیلے ہوئے ہیں۔ میں ان کو پھلانگ کر میزبان کے فلیٹ تک پہنچا۔ گھر کا صدر دروازہ اور اندر سارے کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں۔ مہمان اتنے سارے ہیں کہ کوئی دروازہ بند کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ عورتوں نے پیشانی تک سر ڈھکنے کے بعد دوپٹے کانوں میں اڑسے ہوئے ہیں۔ مردوں نے کروشیا جالی کی چینی ٹوپیاں سروں پر جمائی ہوئی ہیں۔ ٹوپیاں ایک سائز کی ہیں اور سر مختلف سائز کے ہیں۔ مرد اور عورتیں دونوں تلاوت اور تسبیح میں مصروف ہیں۔ فضا میں سریلی بھنبھناہٹ کی گونج ہے جو فلیٹ سے نکلتی ہے اور سیڑھیاں چڑھ کر کہیں اوپر چلی جاتی ہیں۔ اتنی ساری آوازوں سے مل کر بنی ہوئی اس ایک آواز میں کوئی بات تو ہوگی جو یہ اوپر کی جانب سفر کر رہی ہے کیونکہ جہاں تک زینہ کا تعلق وہ نیچے بھی اترتا ہے۔ یہ ادب کا مقام ہے۔ میں چوکھٹ پر بیٹھ گیا اور جوتیاں سیدھی کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں اس وقت تک اس کام میں مشغول رہا جب تک مجھے ایک ایک کر کے رمضان کی باقی ماندہ افطاریوں کی دعوت نہ مل گئی۔

حالات بگڑتے چلے گئے۔ مصروفیت بڑھتی چلی گئی۔ افطاریوں میں غیر حاضری لگتی رہی۔ آج شام کے میزبان ایف زیڈ قریشی ہیں۔ میں نے ان سے دعوت میں دیر سے شامل ہونے کی اجازت لے لی ہے کیونکہ آج مجھے شہنشاہ سے ملاقات رسمی کے لئے جانا ہے۔ یہ

ملاقات آداب سفارت کا حصہ ہے۔ دیدار کا وقت ساڑھے پانچ بجے ہے۔ میں پانچ بجے سعد آباد پیلس پہنچ گیا۔ موٹر وہاں کھڑی کی جہاں وزیر دربار کا دفتر ہے اور عملہ کے ایک رکن کے ہمراہ اندرونی فصیل کے پھاٹک سے گزر کر محل میں جا پہنچا۔ کمرۂ انتظار میں اے ڈی سی نے کرسی پیش کی۔ میں نے کھڑا رہنا پسند کیا۔ سوٹ کی کریز کا معاملہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عباس آباد کے چھوٹے سے فلیٹ میں صوفہ پیچھے ہٹا کر فرش پر استری کے لئے جگہ بنائی تھی۔ کوٹ کے کاندھوں میں گھٹنا گھسا کر اس کی شکنیں درست کی تھیں۔ اتنے جتن کے ساتھ درست کئے جانے والے لباس کو میں اے ڈی سی کے کمرۂ انتظار میں کیوں خراب کروں۔ اے ڈی سی نے کہا اچھا ہوا آپ جلدی آ گئے۔ شہنشاہ فارغ بیٹھے ہیں۔ ملاقات وقت سے پہلے شروع ہو سکتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کل شہنشاہ نے جمشید آموز گار کی حکومت کو برطرف کیا۔ آج شریف امامی کی نئی کابینہ اور نئی سیاسی روش کا اعلان ہوا۔ کل چین کے وزیراعظم ہوا کوفینگ تہران آ رہے ہیں۔ قم، آبادان، تہران اور مشہد میں فسادات ہو رہے ہیں۔ اور اے ڈی سی کہتا ہے کہ شہنشاہ فارغ بیٹھے ہیں۔

شہنشاہ نے کہا یہ بڑی مصروفیت کے دن ہیں۔ بلکہ دنوں کا کیا ذکر یہ زمانہ بڑی مصروفیت کا زمانہ ہے۔ ہر چیز بڑی تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ وقت بدل رہا ہے۔ لوگ بدل رہے ہیں۔ تاریخ بدل رہی ہے۔ جغرافیہ بدل رہا ہے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ یہ تبدیلی صرف ایران میں نہیں ہو رہی۔ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ زمانہ پاکستان میں بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ کئی اور ملکوں میں بھی وقت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ وقت کبھی ٹھہرتا نہیں۔ وقت ہمیشہ حرکت کرتا ہے۔ لیکن جب کسی ملک میں اس کی رفتار یکایک بے حد تیز ہو جائے اور سمت غیر معین ہو تو وہاں کی حکومت کے لئے نئے نئے مسائل اور طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مورّخ کا کام حکمران کے مقابلہ میں بہت آسان ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ ہونے کے بعد آتا ہے۔ حالات کو جس رنگ میں چاہے رنگ دیتا ہے۔ زمانہ جس رخ اور جس رفتار سے آج کل بدل رہا ہے اس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایسے لوگ جنہیں ہر وہ شے میسر ہے جس کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا وہ اس طرح behave کریں جیسے کوئی بے حس، ناکام اور محروم شخص کرتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ لوگ انجام سے بے خبر ایسے راستہ پر چل نکلیں

جو بالآخر انہیں ہر اس چیز سے محروم کر دے گا جواب تک انہیں حاصل ہوئی ہے۔ ساری کمائی اپنے ہاتھوں گنوانے کا شوق کم از کم میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ بعض اوقات بڑی عجیب و غریب باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کوئی فرضی شکایت، کوئی جھوٹی حکایت، کوئی غیر اہم اور غیر معقول بات لوگوں پر یکایک جادو سا کر دیتی ہے۔ لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ان کی مت ماری جاتی ہے۔ برے بھلے کی پہچان نہیں رہتی۔ نفع نقصان کا پتہ نہیں ہوتا۔ بس خوشی خوشی بلکہ بڑے جوش و خروش سے نعرے لگاتے اپنی تباہی کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔

میرے ملک کی مثال لے لیجئے۔ چند سال پہلے عوام کے پاس کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ آج ان کے پاس کیا نہیں۔ سب کچھ ہے۔ اور اس سے بھی بڑی بات وہ حسن اتفاق، وہ مناسب وقت اور وہ عمدہ موقع ہے جو زمانہ نے اس نسل کو دیا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے کسی کو اس کا ذرہ بھر احساس بھی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو آسودہ ہیں، جن کا پیٹ بھرا ہوا ہے، جنہوں نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا، انہی کا رویہ سب سے زیادہ خراب اور مایوس کن ہے۔ کیا ایسے رویئے کی بھی کوئی بنیاد اور کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ شاید کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ مشرق میں نہ مغرب میں۔ ذرا مغربی جرمنی پر نظر ڈالئے۔ اس کی ترقی کی رفتار دیکھئے۔ گروس نیشنل پراڈکٹ کی مقدار پر غور کیجئے۔ اتنے دولتمند اور ایسے ترقی یافتہ ملک میں بھی آٹھ سو مستند تروریست اور تربیت یافتہ دہشت گرد موجود اور مصروف ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان بے مقصد دہشت پسندوں کو پناہ دینے اور پولیس سے چھپا کر رکھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ پچھتّر ہزار ہے۔ یہ لوگ کیسے ہیں کہ تعلیم، تجارت، صنعت، رہائش، کھیل تماشا سب کچھ ہونے کے باوجود جرمنی میں دہشت پھیلاتے ہیں۔

لوگ بدل گئے ہیں۔ انداز بدل گئے ہیں۔ سوچ بدل گئی ہے۔ مغرب میں سب کچھ ہونے کے باوجود سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ لوگوں کا جنس کے بارے میں بھی رویہ بدل رہا ہے۔ مغرب کا مرد جنس لطیف میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ عورتیں بھی مردوں سے بیزار ہوتی جا رہی ہیں۔ دونوں شادی کو جنجال سمجھتے ہیں۔ ہم جنس پرستی اور بے راہ روی زوروں پر ہے۔ اس وضع غیر عادی اس نابہ ہنجاری کا ان ملکوں میں کیا جواز ہے جہاں تعلیم عام، فرد آزاد اور معاشرہ روشن فکر ہے۔ آخر اس زوال کی وجہ کیا ہے۔ یہ کس کا مسئلہ

ہے۔ نفسیات، سوشیالوجی یا مرضیات کا۔

مغرب رو بہ زوال ہے۔ آج مغرب میں وہ جذبہ تسخیر اور وہ جذبہ تعمیر جس کی قوت اور شدت سے دنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دیئے جاتے ہیں کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کا چشمہ سوکھ گیا ہے۔ البتہ جذبہ تخریب بڑے شد و مد کے ساتھ موجود ہے اور اس میں لوگوں کے لئے غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے۔ تخریب کا چشمہ ابل پڑا ہے۔ سیلاب آرہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔

اس کے بعد گفتگو کا رخ بدل گیا۔ اشتراکی ملکوں میں سخت گیری کی وجہ سے نوجوانوں میں جو ڈسپلن پایا جاتا ہے اور مغرب کے برعکس منشیات اور ہیپی ازم پر جس طرح انہوں نے قابو پایا ہے اس کا ذکر ہوا۔ لازمی بات ہے کہ ان کی تعریف ہوئی اور مغرب کے بے لگام آزادی کے نظریہ کی مذمت ہوئی۔ اس کے بعد چیئرمین ہو آ کے حوالہ سے چین کے بارے میں بات شروع ہوئی۔ پچھلے تیرہ برس سے میں چین آتا جاتا ہوں۔ جن دنوں پنگ پانگ ڈپلومیسی کا بڑا چرچا تھا ان دنوں میں پاکستان ٹیبل ٹینس فیڈریشن کا صدر ہوا کرتا تھا۔ جب مجھے پہلی بار چین میں ان کے بیدار مغز اور پر اثر وزیر اعظم سے ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ چو این لائی کہلاتے تھے اب انہیں جو این لائی کہتے ہیں۔ اس وقت چیئرمین ماؤزے ڈونگ کا نام ماؤزے تنگ تھا اور بیجنگ کا نام پیکنگ ہوا کرتا تھا۔ یہ بات حروف تہجی کی اصلاح بلکہ کلچرل انقلاب سے بھی پہلے کی ہے۔ ٹیکسلا میں بھاری صنعتوں کے ایک کارخانہ کی تعمیر اور دوسرے کی منصوبہ بندی مجھے تین من سکوائر میں واقع پیپلز ہال میں لے گئی۔ پاکستان اور چین کے دو تجارتی معاہدوں پر بھی میرے دستخط موجود ہیں۔

ایک بار تجارتی معاہدہ کے لئے جب چین کے دورے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا تو وہ لوگ ایک ہفتہ کے قیام کو ناکافی قرار دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں آٹھ دن کے دورہ کے لئے راضی کیا۔ چھ دن گفت و شنید کے لئے۔ دو دن کا وقفہ سوچ بچار کے لئے۔ دو راتیں سفر کے لئے۔ ایک دن ہمارا وفد چین پہنچا اور دوسرے دن وزارت تجارت کے سینئر نائب وزیر سے باضابطہ گفتگو کے لئے بڑی تیاری کر کے کمیٹی روم میں پہنچا۔ نائب وزیر نے معاہدہ کا ایک مسودہ مجھے دیا اور شستہ انگریزی میں کہا۔ اس میں وہ سب شرائط درج ہیں جن پر دونوں ملکوں کے افسر ابتدائی بات چیت مکمل کر چکے ہیں۔ جہاں کہیں اختلاف تھا وہاں

میں نے پاکستان کے نقطۂ نظر کے مطابق عبارت کو متن میں شامل کر لیا ہے۔ مسودہ آپ کے لئے ہر طرح سے مکمل اور قابل قبول ہو گا۔ ضمیمہ میں صرف ایک کمی رہ گئی ہے۔ مال اور جنس کی فہرست میں وزن یا مقدار کا اندراج باقی ہے۔ آپ جو مال جس مقدار میں در آمد یا بر آمد کرنا چاہیں وہ خالی جگہ میں درج کر دیں۔ ہمیں آپ کی تجویز منظور ہو گی۔ میں نے فوراً مقدار کا خانہ پر کر دیا۔ اس نے مسودہ پر چھوٹے دستخط ثبت کر دیئے۔ دس منٹ میں دو سال کے لئے معاہدہ طے پا گیا۔ نائب وزیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں جو مشقت اور زحمت آپ نے اٹھائی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ تھکن دور کرنے کے لئے آپ دو چار دن چین کے مشہور اور خوش منظر شہر ہانگ چو میں بسر کریں۔

شہنشاہ ایران نے جب یہ داستان سنی توان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس اثنا میں دو ایک بار اے ڈی سی آیا اور دروازے میں لحہ بھر کے لئے ٹھہر کر واپس چلا گیا۔ شاہ نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر شہنشاہ نے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔

آر سی ڈی کی بات بھی ہوئی۔ سرسری اور ادھوری۔ بس محض خانہ پری کے لئے۔ شہنشاہ نے کہا میری خواہش تھی کہ آر سی ڈی کا حلقہ رکنیت اور وسیع ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ان کے لہجہ میں بے دلی اور اداسی ہے۔ یہ اس تجویز کی طرف اشارہ تھا کہ پہلوی قیادت کے تحت علاقائی تعاون کا دائرہ کار جنوبی افریقہ سے لے کر آسٹریلیا تک پھیلا ہو۔ محض خسروی خام خیالی۔ اور خسرو بھی وہ جس کے خلاف سعد آباد پیلس سے پانچ میل کے فاصلہ پر اس وقت مظاہرے ہو رہے ہیں۔

میں کمرۂ ملاقات سے باہر نکلا۔ بنک ملی کے سربراہ اندر جانے کے لئے دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ میں اے ڈی سی کے کمرا میں داخل ہوا۔ وہ نئے ملاقاتی کو شہنشاہ کے پاس چھوڑ کر آ گیا۔ میں نے خیر خبر پوچھی۔ موسم پر تبصرہ کیا۔ ہاتھ ملایا اور محل کی سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ موٹر میں بیٹھ کر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ میں نے مڑ کر محل کی طرف دیکھا۔ رئیس بنک ملی بر آمدہ میں کھڑے تھے۔ وہ شرف بازیابی حاصل کر کے واپس آ چکے تھے۔ وہ بنک کی سلور جوبلی یا کسی اور سالگرہ کے جشن کا پروگرام لے کر حاضر ہوئے تھے۔ سڑکوں پر جو جشن منایا جا رہا ہے

اور چوک شاہ یاد پر جو حشر بپا ہے اس کے پیش نظر یہ انٹرویو بہت طویل تھا۔ اسے مختصر ہونا چاہئے تھا۔

سعد آباد پیلس سے واپسی پر راستہ بھر میں یہ سوچتا اور غور کرتا رہا کہ میں نے کیا دیکھا اور کیا سنا۔ جو سنا تھا وہ مجھے حرف بحرف یاد تھا مگر جو دیکھا تھا اس کو سمجھنے کے لئے مجھے ذہن پر زور ڈالنا پڑا۔ شہنشاہ بیمار نظر آیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ اور اس روز میرے مشاہدہ میں آگئی تھی، جس دن میں کھانے کی دعوت میں شامل ہوا تھا۔ شہنشاہ حیران اور پریشان لگا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ جس حکمران کے خلاف احتجاج اور مظاہرے ہو رہے ہوں اور گولی چلانے سے بھی قابو میں نہ آئیں وہ حیران و پریشان نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ ذہن نے کہا تم نے آج ایک عجوبہ دیکھا ہے۔ ایک ایسا شخص دیکھا ہے جو ساری عمر ایک جنگ یہ سمجھ کر لڑتا رہا کہ وہ دشمنوں کے خلاف ہے مگر اب یہ دیکھ کر حیران ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے جنگ میں مصروف تھا۔ لوگ توقع رکھتے ہیں کہ جنگ میں شدت آنے والی ہے حالانکہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ بادشاہ نے بادشاہت کو مات کر دیا ہے۔ رضا شاہ اپنے آپ کو شکست دینے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ دل ہی دل میں وہ ہار مان چکا ہے۔ ہتھیار پھینک چکا ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا چکا ہے۔ مگر رسمی اعلان کرنے میں اسے تامل ہے۔ یہ تامل ہر ہارنے والے کو ہار ماننے سے پہلے ہوتا ہے۔ شکست کھانے والی بات دل سے زبان تک آنے میں کچھ وقت لے گی۔ اس وقت تک سڑکوں پر خون کی کتنی موٹی تہ جم چکی ہو گی۔ یہ ناحق بہنے والا خون ہو گا۔

(4)

ایف زیڈ قریشی کے گھر جاتے ہوئے دو تین چھوٹے چھوٹے جلوس نظر آئے۔ سورج ڈھلنے والا ہے۔ یہ جلوس نکالنے کا کون سا وقت ہے۔ کیا ان لوگوں کو روزہ نہیں لگتا۔ کیا انہیں افطار اور تراویح کا خیال نہیں آتا۔ لیکن یہ سرپھرے لوگ شاہراہ انقلاب کے مسافر ہیں اور روزہ مسافر کو معاف ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے روزہ کو کسی اچھے وقت کے لئے

اٹھار کھا ہے۔ جلوس اس اچھے وقت کو آواز دے رہا ہے۔ لوگ یک آواز ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ مرگ بر شاہ۔ یہ نعرہ میں نے آج پہلی بار سنا ہے۔

جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ تبریز، اہواز، ارک۔ میں نقشہ اٹھا کر شہروں کے نام تلاش کرتا اور ان پر سرخ پنسل سے نشان لگاتا ہوں۔ تہران شہر کا بھی ایک نقشہ ہے اس پر فساد زدہ علاقوں پر نشان لگے ہوئے ہیں۔ پچھلے دو دن میں شہر کے بہت سے حصے جو اب تک فسادات سے بچے ہوئے تھے ان کی زد میں آگئے ہیں۔ مظاہرے، تیراندازی اور کشتار میرے گھر سے ایک میل کے فاصلہ تک آپہنچے ہیں۔ ان کی آوازیں پہلے دور ہونے کی وجہ سے کبھی کبھار سنائی دیتی تھیں۔ اب قریب ہونے کی وجہ سے مسلسل سنائی دیتی ہیں۔

عیدالفطر سہمی ہوئی آئی اور سہمی ہوئی چلی گئی۔ نصیری اسٹیڈیم کے میدان میں کوئی سات ہزار افراد جمع ہوئے۔ ہر ایک کو گھر جانے کی جلدی ہے۔ پولیس کے جو سپاہی ان نمازیوں کی حفاظت پر مامور ہیں وہ بھی جلدی کے مارے ہوئے ہیں۔ ادھر منتظمین سے عیدی لی اور ادھر غائب ہو گئے۔

عید کی نماز کے لئے قیطریہ میں بہت سے لوگ جمع ہوئے اور ان سے کہیں زیادہ جلوس کی صورت میں سڑکوں پر نکل آئے۔ جلوس چلتے چلتے ایک ایسی سڑک پر پہنچ گیا جہاں فوج کھڑی تھی۔ دونوں طرف سے عید کا لحاظ کیا گیا۔ نہ ہجوم جوش میں آیا اور بے قابو ہوا۔ نہ فوج نے گولی اور گرمی سے جواب دیا۔ رمضان میں مہینہ بھر کی بے لحاظی اور بے مزگی کے بعد یہ منظر بڑا عجیب لگا کہ مظاہرین گولی چلانے والوں سے کہہ رہے تھے۔ برادر ارتشی (فوجی بھائیو) ۔ بھائی تو بھائی پر گولی نہیں چلاتا۔

شروع ستمبر میں بھائی نے بھائی پر اتنی گولیاں چلائیں کہ پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ انقلاب چونکہ روز روز نہیں آتے اس لئے یہ نیا ریکارڈ طویل عرصہ تک قائم رہے گا۔ حکومت کہتی ہے خرابکاروں کے ساتھ سختی سے نبٹا جائے گا۔ اس کے جواب میں مجاہدین بدھ کے روز تہران کے ایک پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیتے ہیں۔ حکومت کہتی ہے جلوس نکالنا غیر قانونی ہے۔ اس کے جواب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد جمعرات کے روز تہران کی سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ مظاہرین کہتے ہیں خمینی رہبر ماست۔ ارتش برادر ماست (خمینی

ہمارا رہبر ہے، فوجی ہمارے بھائی ہیں) ۔ حکومت اس نعرے کے جواب میں فائر کھول دیتی ہے۔ زخمی آوازیں آتی ہیں۔ کمک، کمک (مدد، مدد) ۔ برادر کشی، برادر کشی می کنند۔ (بھائیوں کا قتل ہو رہا ہے۔ بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں) ۔

(5)

جمعہ کا دن افواہوں سے شروع ہوا اور ان کی تصدیق پر ختم ہوا۔ صبح سویرے تہران میں مارشل لاء لگ گیا۔ کسی کو خبر ہوئی کسی کو نہ ہوئی۔ اور وہ جو میدان ژالہ والے لوگ چند دنوں سے آیت اللہ علامہ یحییٰ نوری کی قیادت میں انتظامیہ کی بات سننے سے انکار کرتے اور بڑے شوق سے باغیانہ تقریریں سنتے ہیں انہیں اگر پتہ بھی چل جاتا کہ تہران میں حکومت نظامی قائم کر دی گئی ہے تو بھی وہ چوک میں جمع ہونے سے باز نہ آتے۔ ایک لاکھ آدمی جمع ہو گئے۔ مارشل لاء والے سختی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پتہ چلا کہ فوج نے علاقہ کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ آس پاس کی سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ مسلح فوجی چھتوں پر پوزیشن لئے ہوئے ہیں۔ فضا میں ایک ہیلی کاپٹر اڑ رہا ہے۔ بہت اونچا ہے۔ لوگ ابھی گردوپیش کا جائزہ لے رہے تھے کہ فوج نے گولی چلا دی۔ ہیلی کاپٹر نیچے آیا۔ لوگ سمجھے وڈیو فلم بنائی جا رہی یا شہنشاہ اس میں بیٹھا ہوا خود صورت حال کا جائزہ لے رہا ہے۔ لیکن اس میں بیٹھے ہوئے قانون نظامی کے مسلح محافظوں نے بھی نہتے پر امن مگر بادشاہت بیزار جلوس پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ لوگ فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ بچوں کو نیچے چھپا لیا۔ عورتوں کے گرد حصار باندھ لیا۔

جب قتل عام ذرا تھما لوگ پناہ لینے کے لئے بھاگنے لگے۔ جو مر چکے تھے وہیں پڑے رہے۔ ان میں وہاں سے اٹھ کر بھاگنے کی خواہش بھی مر چکی تھی۔ جو شدید زخمی تھے وہ بھاگنے کی خواہش کے باوجود بے حرکت تھے۔ ٹرک آئے اور مردہ اور نیم مردہ جسموں کو بوریوں کی طرح لادنے لگے۔ کتنی بوریاں ہوں گی۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل غلام علی اویسی کی گنتی کے مطابق صرف اٹھاون تک ہیں۔ وزارت انصاف پچانوے عدد کہتی ہے۔

اخباری نمائندہ کہتا ہے صبح سولاشیں تو میں نے گنی تھیں۔ شام تک جو اضافہ ہوا اس کا علم نہیں۔ محتاط اندازہ ہے، پانچ سو۔ غیر محتاط اندازہ پر حد کی کوئی پابندی نہیں۔ ایک فرانسیسی اخبار نویس اپنے ڈسپیچ میں لکھتا ہے۔ (اس سخت اقدام سے) بادشاہ کا تخت بچ گیا۔ ایک ایسا ہی سخت قدم 25 مارچ 1971ء کو مارشل لا والوں نے ڈھاکہ میں اٹھایا تھا۔ اس روز ہمارے ایک ذہین سیاست دان نے بھی اس ڈسپیچ سے ملتا جلتا بیان دیا تھا۔ شکر ہے پاکستان بچ گیا۔

جمعۂ خونیں ختم ہوا۔ ہفتہ کا روز چڑھا۔ سناٹے، غصے اور پیچ و تاب کا روز۔ لوگ عزیزوں کو ڈھونڈنے ہسپتالوں، مردہ خانوں اور قبرستانوں کے چکر لگا رہے ہیں۔ ہم لوگ رسمی لباس پہنے ہوئے ہوائی اڈا کی طرف جا رہے ہیں۔ ساڑھے چار بجے سہ پہر پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاالحق کی آمد آمد ہے۔ استقبالی گروہ عجب گومگو کا شکار ہے۔ سب حیران ہو رہے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی ایران آنے کا وقت ہے۔ آخر کیوں آ رہے ہیں اور کیا کرنے آ رہے ہیں۔ صدارتی سطح کے اس ناوقت سرکاری دورے کا مشورہ کس عقلمند نے دیا ہے۔ دل میں سب کہہ رہے ہیں۔ آنکھوں سے بھی کہہ رہے ہیں۔ زبان سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ڈر اس بات کا ہے کہ جس کسی نے اس دورے کا مشورہ دیا تھا وہ بھی یہیں کہیں موجود ہو گا۔ مگرمچھ سے بیر کون رکھے۔ مچھلیاں مصلحتاً خاموش ہیں۔ ان کی خاموشی ہوائی اڈے کی ویرانی میں اضافہ کر رہی ہے۔ اڈا سنسان ہے۔ کام بند ہے۔ ہوا بہت تیز ہے۔ ذرا سی تیزی اور آ جائے تو آندھی کہلائے۔ بال ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ ٹوپی ہاتھ میں ہے اور مٹی آنکھوں میں۔ تیز ہوا قطار میں لگے ہوئے ہر پاکستانی کی ٹانگیں چیر کر ان سے آگے نکل جاتی ہے۔ جو تھوڑی سی پیچھے رہ جاتی ہے وہ اچکن اور قمیص کے دامن میں بھر جاتی ہے اور ان دونوں کو یوں اوپر کی طرف اٹھاتی ہے جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی چھتری کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ گرد و باد کے طوفان میں سنسان ہوائی اڈے پر اچکن کے پھڑپھڑاتے ہوئے دامن کا اس خوش منظر چھتری سے کیا مقابلہ جو بیلے ناچ میں فراک کے گھیر میں ہوا بھرنے سے کولہوں کے اوپر تن جاتی ہے۔

صدر ضیاالحق فوجی وردی پہنے ہوئے جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ انہیں لینے کے لئے شاہی محکمہ تشریفات کا ایک کم سن نمائندہ کھڑا ہے۔ رئیس تشریفات تبدیل ہو گئے

ہیں یا علیل ہوگئے ہیں۔ وزیر دربار نے آج استعفادے دیا ہے۔ استقبالی صف میں نئی کابینہ کا کوئی وزیر نظر نہیں آتا۔ ادھر صدر پاکستان کے ہمراہ چار وزراء تشریف لائے ہیں۔ خارجہ امور، دفاع اور مالیات کے وزراء کو میں پہچانتا ہوں۔ چوتھے وزیر کے محکمہ کا مجھے علم نہیں۔ صورت حال دیکھ کر صدر زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے غلام اسحاق خاں وزیر مالیات سے علیٰحدگی میں کہا۔ آپ لوگ کیا کرنے اور کیا لینے آئے ہیں۔ کہنے لگے، مذاکرات کے لئے آئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ لوگ کس سے مذاکرات کریں گے۔ یہاں نہ کسی کو اس کی فرصت ہے نہ اختیار۔ غلام اسحاق خاں نے یہ بات وزیر خارجہ آغا شاہی کو بتائی۔ وہ مضطرب ہوئے اور میرے پاس آئے۔ شکایت بھرے لہجہ میں بولے۔ یہ آپ نے غلام اسحاق سے کیا کہہ دیا ہے۔ میں نے کہا، کوئی خاص بات تو نہیں کی۔ ہاں اگر آپ وزارتی سطح پر باضابطہ مذاکرات کے لئے آئے ہیں تو وہ شاید ممکن نہ ہو۔ آر۔ سی۔ ڈی میں میرا واسطہ چھ سات وزارتوں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہاں روزمرہ کے کام بند ہیں۔ ایسے میں بین الاقوامی مذاکرات کون کرے گا۔ اتنے میں شاہی تشریفات کے نئے نوجوان نائب نے میری بلکہ سب کی مشکل حل کر دی۔ اس نے اعلان کیا کہ سارا پروگرام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ نئے پروگرام میں ملاقاتیں ہیں نہ مذاکرات۔ تہران میں قیام بھی صرف رات بھر کا ہو گا۔ صدر اور ان کے چند ساتھی مہمان خانہ میں ٹھہریں گے۔ باقی سب لوگ ہلٹن ہوٹل میں ٹھہرائے جائیں گے۔ مہمان ہوٹل سے باہر نہ جائیں کیونکہ رات نو بجے سے کرفیو لگ جائے گا۔ صدر پاکستان اور وزراء رات کا کھانا شہنشاہ کے ساتھ کھائیں گے۔ محل میں بھی صرف کھانا ہے۔ گفت و شنید کا کوئی باضابطہ اجلاس نہیں ہے۔ کل صبح نو بجے ایک خصوصی پرواز آپ لوگوں کو مشہد لے جائے گی۔ زیارت کے بعد آپ وہاں سے براہ راست اسلام آباد کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد بہت سے چہرے لٹک گئے اور ان پر جمی ہوئی گرد کی تہ اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔

میں رائل ہلٹن کے کمرا نمبر 515 میں جا بیٹھا۔ یہ کرنل صدیق سالک کا کمرا ہے۔ اس کی دوستی کو وسیلہ بناتے ہوئے اور اس کی مزاح نگاری کی آڑ لیتے ہوتے میں نے اس کے ورود نامسعود کو بدمذاقی بلکہ سراسر نالائقی سے تعبیر کیا۔ اس نے آنے کی اصل وجہ کا ذکر کیا۔ وہ اتنی بودی نکلی کہ میں نے اس تجویز کو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے

دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ صدیق سالک نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کی ہنسی معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں قائل ہو گیا ہوں۔ واقعی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ تمہاری بات اوپر پہنچا دی جائے گی اور بقدر ضرورت کسی نہ کسی کی گوشمالی بھی کر دیں گے۔ صدیق سالک نے ہنستے ہوئے کہا۔ اچھا، بابا معاف کر دو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ اگر ہو تو جو سزا چور کی وہ میری۔ میں نے کہا۔ یہ بات تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہو مگر ہر بار وہی کرتے ہو جو کرنا چاہتے ہو۔ جان من و جان شما۔ یاد کرو، ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب تم دلی کے صاحبان اختیار کی ناانصافیوں کے خلاف ڈٹ جانے کی باتیں کرتے تھے۔ پھر 1953ء میں میجر جنرل اعظم خاں کی قیادت میں لاہور چھاؤنی سے اندرون شہر مسجد وزیر خاں واقع دلی گیٹ تک فاصلہ طے کرنے کے بعد تم نے دلی کو بھلا دیا اور صرف دلی گیٹ کا راستہ یاد رکھا۔ گاہے تم اس جانی پہچانی راہ پر چل نکلتے ہو۔ بے شک تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لوگ اپنا سمجھتے ہیں اور تعاون کرتے ہیں۔ لیکن ناراحت ہونے والوں کی تعداد میں ہر بار اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے شکوہ کو تم جواب شکوہ کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔ ملال اس بات کا ہے کہ تمہیں کوئی مت دینے والا کیوں نہیں ملتا۔ اگر ملتا تو کیا تم اس وقت تہران کے ہوٹل رائل ہلٹن میں بیٹھے ہوتے۔ کل صبح کے قتل عام میں مارے جانے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں ابھی تک کفن دفن نصیب نہیں ہوا۔ اس غم زدہ ماحول میں یہ تمہاری استری شدہ بے شکن سیاہ اچکن، یہ کلف لگی کڑ کڑ کرتی سفید شلوار، یہ چمکتی دمکتی نوک پاپوش تمہاری بے حسی، سنگدلی اور بے بصری کا کھلا ثبوت ہے۔ ہنسی یکایک تھم گئی۔ مسکراہٹ جہاں تھی وہیں پپڑی کی طرح جم گئی۔

صدیق سالک کے بارے میں میری رائے ہے کہ بھارت میں جنگی قیدی کی حیثیت سے اس نے آواگون کے عقیدہ کے مطابق ایک نیا جنم لیا تھا۔ کڑک بانکا فوجی ایک سادھو سنت بن کر دوبارہ پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سقوط ڈھاکہ کے بارے میں اس انداز سے اپنی ذات کو علیحدہ رکھ کر لکھا جیسے وہ اس کے پہلے جنم کی باتیں ہوں۔ دوسرے جنم میں وہ کسی بات یا واقعہ کا زیادہ اثر قبول نہیں کرتا۔ حکومت کی حماقتیں، محلاتی سازشیں، بین الاقوامی خطرات، وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کوئی صورت حال بھی ایسی نہیں جو اسے قلبی یا دماغی صدمہ پہنچا سکے۔ وہ صدمہ کی آخری حد کو چھو کر واپس آیا ہے۔ میں نے اس

کے نئے جنم کا لحاظ کرتے ہوئے کہا۔ وقت آ گیا ہے کہ ایسے قومی مسائل پر کڑھنے کی بجائے جنہیں ہم دونوں حل نہیں کر سکتے کیوں نہ کوئی بہتر مشغلہ اختیار کریں۔ آؤ حسن یار کی باتیں کریں۔ حسن نگاریں اور حسن نگارش کی باتیں کریں۔ مگر اس سے پہلے ذرا روم سروس کو فون کر دو، میں کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ پیش غذا میں خاویار اور سوپ شہنشاہی اس کے بعد خلیج کا جمبو جھینگا۔ آخر میں زرشک پلاؤ اور کبابِ برگ۔

باب ششم

بات بس سے نکل چلی ہے

ہڑتال اور تالا بندی، رخصت اور فرار، جلوس اور نعرہ بازی، گولی اور خون، جنازہ اور چہلم، ترحیم اور تسلیت ۔ یہ وہ چند عنوانات ہیں جن کے تحت آج کل کام ہو رہا ہے۔ باقی تمام کام بند ہیں۔ نائٹ کلب مہینوں سے، شراب خانے ہفتوں سے اور سینما چند دنوں سے بند ہیں۔ پہلے ہڑتال کا باقاعدہ اعلان ہوتا تھا۔ بازار بند ہو جاتے تھے۔ اب اس تکلف کی بھی ضرورت نہیں رہی ساری دکانیں بغیر کسی اعلان کے بند ہیں۔ اسکول اور کالج بھی تا اطلاع ثانی بند ہیں۔ نیم سرکاری ادارے بھی اکثر و بیشتر بند رہتے ہیں۔ سرکاری دفاتر میں حاضری کم ہے۔ چھوٹا عملہ قلم چھوڑ، کام چھوڑ، قسم کی ہڑتالوں میں مصروف ہے۔ بڑے افسر خود بخود بیکار ہو گئے ہیں۔ حکم دینے والا موجود ہے۔ حکم براری والا غیر حاضر ہے۔

جس دن اخبار چھپ جائیں اس دن خبر ملتی ہے کہ کون کون ہڑتال پر ہے اور کتنے عرصہ کے لئے ہے۔ وگرنہ جہاں کام ہو وہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ یہ ادارہ ایک ہفتہ ہڑتال منانے کے بعد آج دو گھنٹہ کے لئے کھلا تھا اور اب پھر غیر معینہ مدت کے لئے بند ہو گیا ہے۔ بنک اکثر اوقات بند رہتے ہیں۔ ادارہ برق عارضی طور پر بند ہے۔ یہی حال ریڈیو اور ٹی وی کا ہے۔ ادارۂ فرہنگ و ہنر بند۔ ادارۂ آموزش و پرورش بند۔ ٹیکسی ڈرائیور ہڑتال پر ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں کا عملہ ہڑتال پر ہے۔ تیل پیدا کرنے والا عملہ کبھی عوام کا ساتھ

دینے کے لئے ہڑتال پر ہوتا ہے کبھی عوام کی خاطر کام پر واپس آجاتا ہے۔ معلوم نہیں آج کل ساتھ دے رہا ہے یا خاطر کر رہا ہے کیونکہ پٹرول کچھ راشن میں ملتا ہے اور کچھ بلیک مارکیٹ میں۔ ایران ائیر میں کبھی جزوی ہڑتال ہوتی ہے اور کبھی مکمل۔ جزوی ہڑتال کا مطلب یہ ہے کہ جہاز اڑ گیا تو اترنا مشکل اور اتر گیا تو اڑنا ناممکن۔ شریف امامی کی حکومت کا حال بھی وہی ہے جو ایران ائیر کا ہے۔ حکومت کچھ ہوا میں معلق ہے۔ کچھ زمین پر ہے مگر بے بس اور بے تعلق۔

تہران میں ایک ادارہ ایسا ہے جو بہ یک وقت بند بھی ہے اور کھلا بھی۔ یہ تہران یونیورسٹی ہے۔ پڑھائی لکھائی کے لئے بند۔ شورش اور ہنگامہ کے لئے کھلی۔ سارے جلوس یونیورسٹی کی طرف جاتے ہیں۔ جب اس کا میدان بھر جائے تو خیابان شاہ رضا پر پھیل جاتے ہیں۔ اس علاقہ پر دن بھر مظاہرین کا قبضہ رہتا ہے۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں دن رات طالب علموں کا راج ہوتا ہے۔ میں ایک چکر اس علاقہ کا لگاتا ہوں۔ احاطہ میں بھی داخل ہوتا ہوں۔ مستقبل کی جتنی صاف تصویر وہاں نظر آئی وہ نہ حکومت کے اعلانات میں نظر آتی ہے نہ اخباری بیانات میں۔ تہران یونیورسٹی کو دیکھے بغیر ہر تبصرہ محض قیاسی ہے اور ہر جائزہ ایک جسارت۔

جس دن سے شریف امامی وزیر اعظم ہوئے ہیں اس روز سے بیانات، اصلاحات اور اموات کی شرح میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ زلزلہ کی کمی باقی تھی۔ وہ بھی آگیا۔ بس چند جھٹکے لگے۔ وقت کچھ بھی نہ لگا۔ طبس کا جیتا جاگتا شہر ایک کھنڈر بن گیا۔ اس شہر کے ملبہ کے نیچے پندرہ بیس ہزار افراد دب کر مر گئے۔ اصلاحات کا اعلان ہو رہا ہے۔ کوئی کان نہیں دھرتا۔ جو سنتا ہے وہ یقین نہیں کرتا۔ سب کہتے ہیں دکھاوے کی باتیں ہیں۔ نیا شاہی کیلنڈر جو بادشاہت کو ڈھائی ہزار سالہ پختہ اور آزمودہ ادارہ ثابت کرنے کے لئے 1971ء میں رائج کیا تھا وہ بمشکل سات سال تک چل سکا اور منسوخ ہو گیا۔ سارے کیسینو بند کر دیئے گئے۔ چار لیفٹننٹ جنرل بہائی ہونے کی وجہ سے پنشن پر بھیج دیئے گئے۔ ان میں شاہی معالج بھی شامل ہے۔

حکومت وقت کچھ کہتی ہے اور وقت کچھ اور کہتا ہے۔ اصلاحات کام آتی ہیں نہ رعایت۔ چند بد عنوان وزیر پکڑے گئے۔ لوگوں کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں سب کو

پکڑو اور چوراہے میں لٹکا دو۔ تنخواہوں میں اضافہ ہوا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ بس اتنا سا اضافہ اور وہ بھی اتنی دیر کے بعد۔ حکومت نے سیاسی قیدی چھوڑ دیئے۔ سیاست ٹھنڈی پڑنے کے بجائے اور زیادہ گرم ہو گئی۔ اس نے مطبوعات پر سے سنسر کی پابندی اٹھانے کا اعلان کیا۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ چند اخباروں نے اس اعلان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سکینڈل چھاپنے شروع کر دیئے۔ کچھ دولت کی لوٹ کھسوٹ کے اور کچھ ساواک کی شکنجہ گری اور اذیت دہی کے۔ فوج ان اخباروں کے دفاتر میں جا کر بیٹھ گئی۔ وزیر اعظم کہتا ہے۔ سنسر ختم ہو گیا۔ فوج کہتی ہے ہماری اجازت کے بغیر کچھ نہیں چھپے گا۔ اخبارات ایک بار پھر ہڑتال کر دیتے ہیں۔ ہنگاموں میں مرنے والوں کی تصویریں اور اموات کے جو اعلانات ترحیم اور تسلیت کے عنوان سے اخباروں میں روز چھپا کرتے تھے ان کا سلسلہ بھی اشاعت بند ہونے کے ساتھ منقطع ہو گیا ہے۔

مرنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ روز روز اور جگہ جگہ مظاہرین پر گولیاں چلتی ہیں۔ پولیس کی اندھا دھند اور سہمی ہوئی گولیاں نہیں بلکہ فوج کی نڈر اور نشانہ پر بیٹھنے والی گولیاں۔ ہفتہ میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی شہر میں لوگ ذرا زیادہ ہی تعداد میں مر جاتے ہیں۔ ان اموات کو اہل اقتدار نے کبھی قابل توجہ نہیں سمجھا۔ اب تہران میں بھی فٹ پاتھ دھونے میں کوئی مستعدی نہیں دکھاتا خون جہاں بہتا ہے وہیں جم جاتا ہے۔ دھبہ پہلے دن سرخ ہوتا ہے، دوسرے دن مٹیالا، تیسرے دن سیاہ اور پامال۔ چوتھے دن اس کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ یہ خون خاکِ نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا۔

جو سیاسی اور معاشرتی اصلاحات وقت پر نہ ہوں وہ بے اثر ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت سیاسی شعبدہ بازی اور سودا بازی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ لوگوں کے حوصلے ہر رعایت کے ساتھ بلند ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ شریف امامی کا کمال نہیں۔ یہ تو مرنے والوں کا خوں بہا ہے۔ شریف امامی کہتا ہے۔ میری بات سنو۔ نہ لوگ اس کی بات سنتے ہیں، نہ علما اور نہ فوج۔ سب کہتے ہیں۔ مکار، عیار، ناقابل اعتبار۔ تین ہفتہ بعد وہ بڑی عاجزی سے کہتا ہے۔ میں وہ بیس دن پہلے والا شریف امامی نہیں رہا۔ اس اعلان سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر لوگ بھی تو بیس دن پہلے والے نہیں رہے۔ وہ بھی بدل چکے ہیں۔ انقلابی ہو گئے ہیں۔ اس بات کا خیال شریف اماں کو اس روز بھی نہ رہا جب اس نے بڑے جوش سے

پریس کانفرنس میں کہا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ایران کا وزیراعظم ہوں۔ میں (اس عہدہ پر) ڈٹا رہوں گا۔ اگر وزارت عظمیٰ پر قائم رہنا قصور ہے تو میں یقیناً قصور وار ہوں۔ ابھی اس اعلان کی گونج باقی تھی کہ شریف امامی لاپتہ ہو گئے۔

شریف امامی کے اس آخری بیان سے کوئی سال بھر پہلے ہمارے وزیراعظم نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی تھی۔ انہوں نے ٹی وی پر تقریر کرتے ہوئے کرسی کے بازو پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ یہ کرسی بڑی مضبوط ہے۔ مگر وہ کرسی بڑی کمزور نکلی۔ اگر کوئی شے مضبوط نکلی تو وہ لکڑی کا کندہ تھا جسے چیر کر کبھی کرسی بناتے ہیں، کبھی منبر اور کبھی تختہ دار۔

ایک دن وزیر دربار شہنشاہی علی قلی اردلان کے دستخطوں سے سوگ کا ایک اعلان شائع ہوا مگر اس کا تعلق حضرت پاپ پل اول (پوپ پال اول) رہبر کتھولک ہای جہاں کے انتقال سے ہے۔ تین دن تک جھنڈے سرنگوں رہے۔ ان تین دنوں کے دوران بھی گولیاں چلتی رہیں اور لوگ سڑکوں پر مرتے رہے۔ ان کے سوگ کا کوئی اعلان علی قلی اردلان کے دستخطوں سے شائع نہیں ہوا۔

علی قلی اردلان کی جانب سے ایک دعوت نامہ مجھے موصول ہوا ہے۔ اعلیٰ حضرت ہمایوں شہنشاہ آریامہر کی سالگرہ کا جشن کاخ گلستاں میں منایا جائے گا۔ جمعرات کے دن صبح سوا دس برائے پونے گیارہ بجے محل میں تشریف لے آئیں۔ یہ محل تہران کے جنوب میں واقع ہے جو اب علاقہ غیر کی مانند ہے۔ ہم تو خیر پہنچ جائیں گے مگر شہنشاہ وہاں تک کیسے پہنچیں گے۔ انہیں کون راستہ دے گا۔ ایک ایک کر کے سارے راستے بند ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی خفیہ راستہ یا چور دروازہ باقی ہے تو اس کے بند ہونے میں اب کونسی دیر رہ گئی ہے۔

کاخ گلستان کی پہلی منزل پر آرائشی تقریباتی ہال میں تمام سفرا جمع ہیں۔ مقامی باشندے صرف وہی ہیں جو انتظامات سے وابستہ ہیں۔ تقریب تمام آداب رسمی کے ساتھ ادا ہو رہی ہے اس لئے جانے پہچانے چہرے ان جانے سے لگ رہے ہیں۔ جس شخص کو آپ نے ہمیشہ ہلکے سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں دیکھا ہو وہ اگر کبھی کبھار اپنے قومی اور رسمی لباس میں سامنے آجائے تو اسے پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ کھیس جیسے رنگ برنگ

افریقی چوغے، بند گلے کا کوٹ، کڑھائی والی بش شرٹ، شیروانی۔ پتلون، لنگی، شلوار، تنگ موری کے افریقی پاجامے۔ عقال، کلاہ، سرپیچ، نیپالی سیاہ ٹوپی، صدر گرجا کی چھوٹی سرخ ٹوپی، انڈونیشی ساخت کی رامپوری مخملی ٹوپی، سمور کی لمبوتری ٹوپی، قراقلی جناح کیپ۔ اور اس پر مستزاد سنہری کمربند، گلے میں لٹکے ہوئے سنہری تمغے، ریشمی پٹکے جو بائیں کاندھے کے دونوں طرف سے ہوتے ہوئے دائیں ہاتھ کی کلائی تک آتے ہیں جہاں خوش نما گرہ اور تھوڑی سی جھالر لگی ہوئی ہے۔ یہ سفیر لوگ ہیں یا کسی بہروپ بدل پارٹی کے شرکاء۔ ان کی لغات کا خزانہ اور لطیفوں کا ذخیرہ بتا رہا ہے کہ بلاشبہ یہ سفراء ہیں۔ ایک صاحب دوسرے کے کان میں کہہ رہے ہیں۔ سوال ہے کہ نیپالی ٹوپی اور نیپال بھارت تعلقات میں کیا چیز مشترک ہے۔ جواب ہے، دونوں سامنے سے کھڑی اور اکڑی ہوئی اور پیچھے سے بیٹھی اور پچکی ہوئی ہیں۔

رونق کے سارے اسباب موجود ہیں مگر دربار میں بڑی بے رونقی ہے۔ چہل پہل اور خوشی خُرّمی کا موقع ہے مگر لوگ مؤدب کھڑے ہیں یا زیر لب گفتگو کر رہے ہیں۔ محل کے باہر سڑکوں پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اثر محل کے اندر اس تقریب پر کیوں نہ پڑتا۔ عجب ماتمی سالگرہ ہے۔ سب کہہ رہے ہیں کہ یہ آخری سالگرہ ہے۔ اگلے سال آمد کی نہیں رخصت کی سالگرہ منائی جائے گی۔ سفراء نے ہال میں قطار بنائی جو تین اطراف تک چلی گئی۔ چوتھی جانب سے یکایک شہنشاہ نمودار ہوئے۔ جلو میں تین چار آدمی ہیں۔ رئیس السفراء نے دو چار جملوں میں تبریک پیش کی۔ شہنشاہ نے ایک جملہ میں شکریہ ادا کیا، ہاتھ ملایا اور قطار میں کھڑے ہوئے اگلے سفیر کی طرف بڑھ گئے۔ اب ایک گردان شروع ہو گئی ہے۔ میں اپنے ملک کی حکومت اور اس کے عوام کی طرف سے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شہنشاہ ہاتھ ملاتا اور ایک لفظ میں شکریہ ادا کرتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ چالیس پچاس بار یہ رسم ادا کرنے کے بعد شہنشاہ نے وہ ایک حرف تشکر زبان سے ادا کرنا بند کر دیا۔ بس سر کی جنبش سے مبارکباد قبول کرنے کی اطلاع دینی شروع کر دی۔

میں اور اقوام متحدہ کا نمائندہ ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ میں آر سی ڈی کے ادارہ اور عملہ کی جانب سے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سر ہلا، ہاتھ ملا، ایک قدم پہلو کی جانب لیا گیا اور مسٹر وائٹ کی باری آ گئی۔ جتنی دیر وہاں مبارکباد کے لین دین میں لگی اتنی دیر

میری نظر شہنشاہ کے بالائی دھڑ پر جمی رہی۔ وردی کے کالر سے جو گردن نکلی ہوئی ہے وہ پتلی سی ہے۔ اس گردن پر جو سر اور چہرہ سجا ہوا ہے وہ سوکھا اور مرجھایا ہوا ہے۔ البتہ گردن کے نیچے سینہ صندوق ہے۔ اتنا بھرا ہوا کہ تن سازی کا مقابلہ جیتنے والوں کے سینے اس کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ فوجی وردی جو شہنشاہ نے پہنی ہوئی ہے ایسی بے شکن ہے جیسے انسانی جسم کے بجائے کسی قالب پر مڑھی ہو اور وہ قالب بھی فولادی ہو۔ اگر کوئی انگشت شہادت دہری کر کے شہنشاہ کے اس پھولے ہوئے سینہ پر مارے تو وہ بجنے لگے گا۔ ٹن ٹن ٹن۔ شہنشاہ خطرہ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے کیونکہ اس نے وردی کے نیچے گولی روک فولادی صدری پہنی ہوئی ہے۔ یہ صدری گولی اور بم کی کرچوں کو تو روک سکتی ہے مگر افواہوں کو روکنے میں ناکام ہے۔ افواہ ہے کہ ان دنوں شہنشاہ کے ہر ملاقاتی کی تلاشی لی جاتی ہے خواہ وہ شاہی خاندان کے افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پہلے ملکہ فرح دیبا اس تلاشی سے مستثنیٰ تھیں مگر اب انہیں بھی تلاشی دینی پڑتی ہے۔ خوف کی دیوار کھڑی ہو جائے تو سارے رشتے اس کی دوسری طرف رہ جاتے ہیں۔

عرصہ ہوا ناول نگار رشید اختر ندوی نے مجھے خوف کی ایک دیوار اٹھانے کا حال سنایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سوانح لکھنے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی۔ کہنے لگے۔ میں سوانح کے پراجیکٹ پر گفتگو کے لئے لاڑکانہ گیا۔ مجھے ملاقات کے لئے بڑا انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جونہی ذوالفقار علی بھٹو سامنے آئے ساری کلفت دور ہو گئی۔ دھلا دھلایا روشن چہرہ، بالوں پر پانی کے چند قطرے جیسے پھول پر شبنم۔ نئے اجلے کپڑے اور بھینی بھینی خوشبو۔ کہنے لگے جب میں نے سنا کہ آپ ملنے کے لئے آئے ہیں تو میں نے شیو بنایا اور غسل کیا تاکہ میرے سوانح نگار کا پہلا تاثر خوشبو اور خوبصورتی کا تاثر ہو۔ رشید اختر کہنے لگے، اس کے بعد بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں اس شخص کی ذہانت اور دور اندیشی سے بڑا متاثر ہوا۔ یہ نابغۂ روزگار شخص ہے۔ ایک بیش قیمت تحفہ جو قدرت نے ہمیں عطا کیا ہے۔ اس تحفہ کی ہمیں پوری طرح حفاظت کرنی چاہئے۔ جب میں بے تکلف ہو گیا تو میں نے ایک دن بھٹو صاحب سے کہا۔ آپ اپنی قدر و قیمت سے بے خبر ہیں مگر دشمن اس سے بخوبی واقف ہے۔ مجھے اس خیال سے خوف آتا ہے کہ وہ آپ کی ذات کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے اور یہاں کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ کوئی شخص ضابطہ کی

کارروائی سے ہٹ کر اس مسئلہ پر سوچتا ہی نہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ ملک اور قوم کی خاطر اپنے حفاظتی انتظامات کو بہتر بنائیں۔ اور ہاں ایک مشورہ فقیر کا بھی مان لیں۔ کبھی کسی ایسے شخص سے تنہائی میں نہ ملیں جو آپ سے زیادہ صحت مند اور طاقتور ہو۔ آپ کی کابینہ میں ایک وزیر آپ سے عمر میں کم ہے۔ جسم اس کا کسرتی ہے۔ وفاداری اس کی مشکوک ہے۔ کردار سب کے سامنے ہے۔ اسے ہرگز ہرگز تنہائی میں ملنے کا موقع نہ دیں۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر رشید اختر ندوی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بولے۔ آپ ذمہ وار شخص ہیں آپ سے کیا چھپانا۔ میں آپ کو اس وزیر کا نام بتا دیتا ہوں۔

شہنشاہ نے قطار میں کھڑے ہوئے آخری آدمی سے ہاتھ ملایا۔ سر اٹھا کر ہال میں کھڑے سفیروں پر ایک نگاہ ڈالی اور جس طرح خاموشی سے آئے تھے اسی طرح خاموشی سے چلے گئے۔ تقریب ختم۔ شراب اور کباب تو بہت دور کی باتیں ہیں کسی نے چائے پانی تک نہ پوچھا۔ سب مہمان افسر تشریفات کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کار پارک میں جا پہنچے۔ موٹریں باری باری آئیں گی۔ انتظار کا وقفہ گپ شپ میں گزر رہا ہے اور یہ گفتگو دربار ہال کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کھلی فضا میں ہو رہی ہے۔ مسٹر وائٹ نے مجھے بتایا کہ امریکی باشندوں کا انخلا زوروں پر ہے۔ چار ہزار امریکی خاندان ایران چھوڑ کر واپس جا چکے ہیں۔ ان کے دفتر میں ایک بھارتی خاتون کام کرتی تھی۔ ایک روز گھر جاتے ہوئے اس کی موٹر مخالف سمت سے آنے والے ایک جلوس میں گھر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے موٹر ہجوم کے زور اور بوجھ سے پچک جائے گی اور وہ اندر بیٹھی ہوئی پس جائے گی۔ اس پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ دوسرے دن پہلی پرواز سے گھر واپس چلی گئی۔

مسٹر وائٹ نے تہران میں اقوام متحدہ کے دفتر پر مظاہرین کے حملے کا حال سنایا۔ کہنے لگے، پچھلے ماہ جب مظاہروں نے ابھی اتنی شدت اختیار نہ کی تھی جتنی آج کل ہے کچھ مظاہرین میرے دفتر میں آئے اور آگ لگانے کی اجازت طلب کی۔ ہم لوگوں نے سمجھا بجھا کر انہیں رخصت کر دیا۔ سہ پہر جب دفتر بند کرنے لگے تو وہ لوگ جنہیں ہم اپنی دانست میں فارغ کر چکے تھے دوبارہ آدھمکے اور بند دفتر کو آگ لگانے کی پیشکش کرنے لگے۔ ہم نے پھر سمجھایا اور وہ پھر مان گئے مگر ایک چھوٹی سی شرط کے ساتھ۔ کہنے لگے اب خالی ہاتھ کیسے

واپس جائیں کم از کم ایک سٹاف کار کو تو آگ لگا دیں۔ پھر انتہائی مہارت کے ساتھ انہوں نے اقوام متحدہ کے مونو گرام والی ایک موٹر کار کو الٹا کیا اور ماچس دکھا دی۔

مسٹر وائٹ کہنے لگے، بعض اوقات حکومت خود اپنے خلاف جھگڑا کھڑا کرتی ہے۔ مطالبہ بھی اپنا، منصوبہ بھی اپنا، بندوق بھی اپنی۔ بس ذرا دیر کے لئے دوسروں کا کاندھا استعمال ہوتا ہے۔ پھر بندوق اس مطالبہ کے حق میں داغ دی جاتی ہے اور ملک میں مارشل لا لگ جاتا ہے۔ اتنے میں مسٹر وائٹ کی موٹر آ گئی۔ وہ ہاتھ ہلا کر رخصت ہوئے۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر Mr. White کے والدین نے جو حبشی تھے اپنے بیٹے کا نام رکھنے میں کیا مصلحت دیکھی تھی کہ اس باوقار سیاہ فام شخص کو نام لے کر مخاطب کرنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی سفید جھوٹ بول رہا ہو۔

مسٹر وائٹ سے کاخ گلستان میں ملاقات کو آج دس دن گزر چکے ہیں۔ سارے ایران میں عمومی مارشل لا نافذ ہو گیا ہے۔ شریف امامی رخصت ہوئے۔ سول حکومت ختم ہوئی۔ جن کے لئے راہ ہموار کی جا رہی تھی اور وہ جو آنے کے لئے بے تاب نظر آتے تھے بالآخر آ ہی گئے۔ لیکن اس وقت آنے کا فائدہ کیا۔ تیر بارانی تو پہلے ہی ہو رہی ہے اور بے اثر ہے۔ ان حالات میں یہ کون سا تیر مار لیں گے۔

مجھے 69-1968ء کی سردیاں یاد آنے لگیں۔ بیماری کے حملہ کے بعد مہینوں سے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اپنے منصب کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھے۔ عدم صلاحیت کی وہ کیفیت تھی جسے ناقابلیت از روئے قانون کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر ایسے قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوم میں جس صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی کمی اپاہج گورنر جنرل غلام محمد کے زمانہ میں بھی دیکھنے میں آئی اور معذور صدر ایوب خاں کے زمانہ میں بھی۔ جن لوگوں کی اہمیت اور اختیارات میں کسی کی بے چارگی سے اضافہ ہو جاتا ہے وہ کٹھ پتلی کے اس تماشا کو طول دینا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی زور آور اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے قوم کا خادم اور ملک کا نجات دہندہ بن کر آ جاتا ہے۔ یحیٰی خاں کو ایوب خاں کی جانشینی کا کوئی آئینی حق نہیں پہنچتا تھا مگر وہ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کی گہری خواہش رکھتے تھے اور ان کے دور اندیش ساتھی ان سے بھی زیادہ پرجوش تھے۔ جب لاہور میں احتجاجی جلسے اور جلوس شروع ہوئے تو ان کے بارے میں جو اطلاعات خفیہ نویسی کے ایک

ادارے کی طرف آتی تھیں وہ بڑی سنگین ہوتی تھیں۔ ان میں اور دوسرے ذرائع سے ملنے والی اطلاعات میں بڑا تفاوت تھا۔ ایک اعلیٰ افسر نے خلیفہ ہارون الرشید کے انداز میں بھیس بدل کر واردات اور موقع دیکھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ وہ جو پچاس ہزار کا بپھرا ہوا ہجوم روزنامچہ میں بے قابو نظر آتا ہے دراصل پانچ سات سو بے فکرے شرارتی نوجوانوں اور ایک ہزار تفریح پسند تماشائیوں پر مشتمل تھا۔ اور وہ آگ جو روزنامچہ کے صفحات میں شہر کا ایک حصہ جلا کر خاک کر چکی ہے صرف سڑک پر پڑے ہوئے ٹائروں تک محدود تھی۔ البتہ دھوئیں کے بادلوں کا جو ذکر روزنامچہ میں ہے وہ بالکل درست ہے۔ کاربن کی وجہ سے ٹائروں کا دھواں کچھ زیادہ ہی کالا ہوتا ہے۔ میں نے مبالغہ آرائی کی وجہ دریافت کی۔ جواب ملا۔ اگر بڑا بھائی جو خفیہ نویسی کے ادارے کا سربراہ ہے چھوٹے بھائی کو چیف مارشل ایڈ منسٹریٹر اور صدر پاکستان بنانے کے لئے ذراسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے سکتا تو وہ کیسا بھائی ہوا۔ بھائی ہونا تو بڑی بات ہے جن سے محض ملازمت کی بھائی بندی تھی وہ بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔

ایک بار جنرل حمید کیانی جو اپنی مخصوص شگفتہ بیانی کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے فوکر میں میرے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہم نے 1958 ء کی اکتوبر کی اس صبح کو یاد کیا جب ملتان میں سردار عطا محمد خاں لغاری نے مجھے فون پر کہا کہ فوراً کمشنر ہاؤس پہنچ جاؤ۔ دیر نہ کرنا۔ جس حال اور حلیہ میں ہو اسی میں آجاؤ۔ میں پہنچا۔ وہاں لیفٹننٹ کرنل (بعد میں میجر جنرل) حمید کیانی اور میجر (بعد میں میجر جنرل) احسان اس سنجیدگی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھے جو ان دونوں خوش دل اور خوش گپ احباب کی طبیعت اور عادت کے خلاف تھی۔ دونوں غل غپاڑے کے شوقین تھے۔ ایک بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کرتا جو احتیاط اور رعب داب کی فضا میں ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح ہوتی۔ دوسرا جملہ بازی کرتا کرتا بیچ میں ایسے لطیفے سنا جاتا کہ سننے والے کے کان کی لو سرخ ہو جائے۔ بات اٹھا رکھنے کے وہ دونوں قائل نہ تھے۔ خاموش رہنا انہیں آتا ہی نہ تھا۔ ان دونوں کو چھ اکتوبر 1958 ء کی صبح کو ہونے والی ملاقات میں خاموش اور سنجیدہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ دستور، مزاج اور توقعات کے خلاف ہے۔

اس ملاقات میں ان دونوں کو ایک سوال کا جواب دینے میں بڑی ہچکچاہٹ تھی۔

سوال یہ تھا کہ مارشل لا کس نے لگایا ہے۔ حکومت نے لگایا ہے یا بالا بالا لگا دیا گیا ہے۔ جواب تھا۔ ہمیں تفصیل معلوم نہیں۔ صرف یہ حکم نامہ ملا ہے کہ مارشل لا لگا دیا گیا۔ نئے انتظامات کی بات کرتے ہوئے یکایک ان میں سے ایک نے کہا۔ مسٹر ڈپٹی کمشنر، آپ Key of the city (کلیدِ شہر) ہمارے حوالے کر دیں۔

ہوائی جہاز میں گفتگو کرتے ہوئے بات پہلے مارشل لا کے گیارہ سال بعد لگنے والے دوسرے مارشل لا تک آپہنچی۔ میں نے کہا، اس بار وہ اچنبھہ نہیں ہوا جو آپ سے ملتان کے کمشنر ہاؤس میں مل کر ہوا تھا۔ وہ مارشل لا رازداری اور بڑے بڑوں کی بے خبری میں لگا۔ اس مرتبہ بہت سے لوگ ہفتوں سے اس کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ہاں، یہ فیصلہ متوقع تھا۔ ایک بار میں نے یحییٰ خاں سے کہہ بھی دیا کہ دیر ہو رہی ہے۔ میں ان دنوں بریگیڈیئر تھا۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ یحییٰ خاں نے پوچھا۔ حالات کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔ میں نے کہا۔ تمثیلاً صرف اتنا عرض کروں گا کہ مریض کی حالت نازک ہے۔ سول ہسپتال میں کوئی لائق ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہیں۔ سول ہسپتال کا نظام بگڑ چکا ہے۔ آکسیجن بڑی چیز ہے ان کے پاس کوئی دوائی ہے نہ گولی۔ مریض کو گولی دینی ہو تو فوج کی طرف دیکھتے ہیں۔ سر، ان حالات کا تقاضا ہے کہ مریض کو فوراً سی.ایم.ایچ (کمبائنڈ ملٹری ہسپتال) میں داخل کیا جائے۔ یہ تمثیل یحییٰ خاں کو بہت پسند آئی۔ دیر تک ہنستے رہے۔ جب ان کی ہنسی تھمی تو لوگوں کے رونے کی باری آگئی۔

(2)

جولائی کے تیسرے ہفتہ میں آر سی ڈی کی سالگرہ منائی تھی۔ اگرچہ میں اس کا میزبان تھا مگر سارے انتظامات میرے آنے سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ میرا کام تین چار سو بار مصافحہ کرنا اور تشریف آوری کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ عذرا کا کام خواتین کو خوش آمدید کہنا اور کھڑے مسکراتے رہنا تھا۔ میں چند مہمانوں کے سوا کسی کو پہچانتا تک نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اس رسمی استقبالیہ کے بعد اب تک میں نے کوئی دعوت نہیں کی۔ چند دنوں کے بعد باہر کے

سفر شروع ہو جائیں گے۔ ان سے فارغ ہونے تک دو تین مہینے اور گزر جائیں گے۔ آر۔سی۔ڈی نے اصل اور ضروری کام کی کمی کو مہمان نوازی کی مصروفیت سے پورا کرنے کی جو روایت قائم کی ہے اس پر حرف آئے گا۔ لہٰذا میں نے پچیس تیس سفارت کاروں کو انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں شام کے کھانے کی دعوت دی۔ میرا خیال تھا کہ ہوٹل سنسان پڑا ہو گا۔ کرفیو اگرچہ رات گئے لگتا ہے مگر لوگ عافیت کی خاطر رات کے پہلے حصہ میں خانہ نشین ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی مظاہروں اور گولیوں میں گزرنے والے دنوں کی شام ہوٹل میں بسر کرنا کون پسند کرے گا۔

جب میں ہوٹل میں پہنچا تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ بڑے ہال میں چار پانچ سو مہمان موجود تھے۔ بیشتر نئے شادی شدہ نوجوان جوڑے تھے۔ کچھ عمر رسیدہ مہمان بھی تھے۔ نانا دادا ہوں گے۔ بیس پچیس مہمان بچہ گاڑی میں اونگھ رہے تھے۔ پوتے نواسے ہوں گے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک کھلائی تھی۔ انگریزی بولنے والی۔ ساڑھی پہننے والی۔ دمکتے سیاہ رنگ والی۔ ناریل کے تیل سے چپکے ہوئے اور چمکتے ہوئے بالوں والی۔ سری لنکا سے پٹرو ڈالر کی تلاش میں ایران آنے والی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہال میں آرکسٹرا بجنا شروع ہوا۔ پہلے آہستہ پھر تیز اور اس کے بعد بہت تیز۔ نوجوانوں نے اس کی دھن پر ناچنا شروع کر دیا۔ بوڑھے گاہے گاہے تال دیتے رہے۔ ساز بجانے والے ایسے مست ہوئے کہ جو چیخ چنگھاڑ ساز کے بس کی نہ ہو وہ خود اپنے گلے سے نکالنے لگے۔ اتنا چیخم چہاڑا مچا کہ جس کمرے میں ہمارا کھانا ہو رہا تھا وہاں گفتگو ناممکن ہو گئی۔ میرے مہمان خاموشی سے آئے۔ دم سادھ کر کھانا کھایا۔ اور چپکے سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ کسی نومولود کے ختنہ اور عقیقہ کا سلسلہ تھا۔ ختنہ کو مارشل لا سے کیا خطرہ، عقیقہ کو کرفیو کی کیا پروا۔ نوجوان جوڑے خطرہ کی باہوں میں باہیں ڈال کر بے اختیار ناچا کرتے ہیں۔

اس ہفتہ کی سب سے اہم دعوت چین کے سفارت خانہ میں ہو رہی ہے۔ سفارت خانہ اہم ترین سفیروں سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ نہ صرف اس عام سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ ایران کدھر جا رہا ہے بلکہ یہ ٹوہ لگا رہے ہیں کہ سپر پاور ممالک ایران کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ بہت کھسر پھسر ہو چکی۔ بے چین سفیروں کی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ اب وہ دل بہلاوے کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تین چار

سفیروں کے ساتھ ایران کے زود رنج سینئر نائب وزیر خارجہ منوچہر ظلّی کے پاس کھڑا ہوں۔ ایک سفیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جناب وزیر، میں آپ کی وزارت کے عملہ کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے میں جہاں دوسری وزارتوں نے کام کرنا چھوڑ رکھا ہے، وزارت خارجہ حسب دستور کام میں جتی ہوئی ہے۔ ظلّی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپ تعریف کر رہے یا طنز کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وزارت خارجہ اس طوفان بدتمیزی میں ایک جزیرے کی مانند ہے تو میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ یاد رہے کہ وزارت خارجہ عام حالات میں بھی دوسری وزارتوں سے مختلف ہے اور موجودہ صورت حال میں بھی ان سے الگ نظر آئے گی۔ مجھے وزارت خارجہ کی کارکردگی اور عملہ کی شاہ سے وفاداری پر ناز ہے۔ آپ ایران کے مزاج سے واقف نہیں وگرنہ یوں آیت اللہ آیت اللہ کی رٹ نہ لگاتے۔ یاد رکھئے ہمارے یہاں صدیوں سے کام کی تقسیم اور مہارت کے لحاظ سے ایک جانی پہچانی طبقہ بندی ہے۔ مذہبی رہنما کا دائرہ کار سیاست اور حکومت نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو گا۔ ایران میں ڈھائی ہزار سال سے حکومت کا کام بادشاہ چلا رہے ہیں۔ یہ ڈھائی دن کے ہنگامے اعلیٰ حضرت ہمایوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ منوچہر ظلّی کا مقدمہ کمزور ہے اس لئے اس کا چہرہ سرخ اور آواز بلند ہے۔ کچھ لوگ اونچی آواز سن کر ادھر چلے آ رہے ہیں کہ دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ میں چپکے سے وہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں۔ مجھے سفر کی تیاری کرنی ہے۔

دورے کی تیاری کے سلسلہ میں آج دفتر میں مشاورتی اجلاس ہو رہا ہے۔ عالمی اقتصاد کی صورت حال، علاقائی تعاون کے اداروں کی کارکردگی، آر سی ڈی کی سالانہ رپورٹ، منصوبوں کی فہرست، منصوبوں پر عملدر آمد کی رفتار، مالی مسائل، تجارتی معاہدہ کا مسودہ، کمپنی برائے بیمہ مکرر کا منافع، جہازراں کمپنی کے معاملات۔ اجلاس کا ایجنڈا میری رائے کے مطابق کچھ اس طرح کا ہونا چاہئے۔ مشیر ایسے ملے ہیں جو مجھے ایجنڈا کی طرف آنے ہی نہیں دیتے۔ ایک ساتھی کہنے لگے۔ سر، وہاں تو یہ سب باتیں فروعی معلوم ہوں گی۔ ہر شخص آپ سے مسئلہ ایران پر بات کرنا چاہئے گا۔ دوسرے مشیر نے کہا۔ سرکاری دورہ برحق مگر آپ جانے سے پہلے گھر والوں کے لئے سامان خورد و نوش کا وہ انتظام کر جائیں جو پرانے زمانہ میں محاصرہ سے پہلے قلعہ بند ہونے والے بادشاہ کیا کرتے تھے۔ چلئے اس قدر نہ سہی۔ کم از کم اتنا اہتمام کر لیجئے جتنا سردیوں سے پہلے گلہریاں کیا کرتی ہیں۔

میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ پتہ چلا کہ ہر گھر گلہری کا گھونسلہ بنا ہوا ہے۔ پانی کے ڈرم، پٹرول کے ڈبے، گیس کے سلنڈر، آٹے کی بوری، چاول کا تھیلہ، پنیر آلو پیاز، مٹی کے تیل کا چولھا اور بخاری۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے چالیس بربری نان بھی اپنے گنجینۂ سرد میں محفوظ کر لئے ہیں۔ بہت کچھ جمع کرنے کے باوجود ہر کسی کو اپنے سٹاک کے غیر کافی ہونے کا خدشہ لاحق ہے۔ بعض ایسے ہیں جو صرف ان چیزوں کا غم کھا رہے ہیں جو بآسانی دستیاب نہیں ہیں۔ ہائے مرغ و ماہی، ہائے دودھ اور دہی، ہائے انڈہ اور ڈبل روٹی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اس آڑے وقت کے لئے جب گھر میں بند ہو کر بیٹھنا پڑ جائے چند اچھی کتابیں بھی ذخیرہ میں شامل کر لینی چاہئیں۔ اس جملہ کو بے وقت کا مذاق سمجھتے ہوئے تیسرے مشیر نے ناراض ہو کر کہا۔ یہ آپ کتابوں کو کہاں سے بیچ میں لے آئے۔ مت بھولئے کہ طوائف الملوکی میں صرف دو چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک اسلحہ دوسری روٹی۔ اگر آپ کو کسی تیسری شے کی خواہش ہے تو اپنے بھرے ہوئے فرج کا تبادلہ میری کتابوں کی بھری ہوئی الماری سے کر لیجئے۔

(3)

تہران سے پیرس تک بوئنگ سات چار سات میں سفر کر رہا ہوں، پیرس سے واشنگٹن تک کنکارڈ میں۔ ایک جہاز مسافر برداری میں سب سے بڑا اور دوسرا تیز رفتاری میں سب سے آگے۔ بوئنگ بھرا ہوا ہے۔ ایک بھی سیٹ خالی نہیں۔ جتنے مسافر جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں ان سے کئی گنا امیدواری کی کیفیت میں مہر آباد ایئر پورٹ پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس بھیڑ میں مسافر کم ہیں۔ مہاجر اور فراری زیادہ ہیں۔ کہنے کو ان کے پاس پیرس یا واشنگٹن کا ٹکٹ ہے مگر ان کا اصل سفر دوسرا ہے۔ یہ سفر بادشاہت سے جمہوریت کا سفر ہے۔ مشرق سے مغرب کا سفر، وطن سے بے وطنی کا سفر، مخدوش حال سے ان جانے مستقبل کا سفر۔

جو حال بوئنگ کا ہے وہی حال کنکارڈ کا ہے۔ وہ بھی بھرا ہوا ہے۔ بیشتر مسافر ایرانی

ہیں جنہیں یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں مگر اس کی کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور منزل پر پہنچ کر ان پر کیا گزرے گی۔ کیبن کو تقسیم کرنے والے دیواری تختہ پر سبز شیشہ کے پیچھے بجلی کے ہندسے جگمگا رہے ہیں۔ یہ رفتار کا میٹر ہے۔ اس وقت کنکارڈ ہوائی جہاز 2.5 میک کی رفتار سے پرواز کر رہا ہے۔ آواز کی رفتار سے ڈھائی گنا زیادہ تیز۔ ایرانی مسافر۔ ایک آواز کے خوف سے گھر سے بھاگے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تیز رفتار ہوائی جہاز "مرگ بر شاہ" کی اس صدا کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے جو ایران کے گلی کوچوں میں گونج رہی ہے۔ واشنگٹن پہنچے۔ یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی وائٹ ہاؤس کے قریب ایک دیوار پر نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، مرگ بر شاہ۔ مرگ بر شاہ۔ نئی زمین دوز ریل کے اسٹیشن کی دیوار پر لکھا ہے۔ مرگ بر شاہ۔ یہ کیسا نعرہ ہے کہ نقب لگا کر زیر زمین بھی آ پہنچا ہے۔ نعرہ گلے سے نکلے تو آواز کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ دل سے نکلے تو خیال کی رفتار سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

سال بھر پہلے آر سی ڈی کے نمائندہ کا سفر اس سفر سے کتنا مختلف تھا۔ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوں۔ وہ سفر پا پیادہ تھا۔ تہران سے استنبول۔ استنبول میں قیام۔ استنبول سے پیرس۔ پیرس میں قیام۔ پھر لندن میں قیام۔ لندن سے سڑک کے راستہ ساؤتھ ہمپٹن۔ وہاں سے ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر بحر اوقیانوس کے پار۔ سہج سہج سے سفر کرنا۔ ہر قدم سفارتی انداز میں اٹھانا اور صاحبی اور افسری شان کے ساتھ اسے زمین پر رکھنا۔ اس طرح ڈیڑھ ماہ سفر اور کام میں صرف ہو جاتا تھا۔ ایک میں ہوں جو یہ جانتے بوجھتے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے بھاگڑ میں پڑا ہوا ہوں۔ اس ایک برس میں ایران اتنا بدل گیا ہے کہ میں آرام اور بے فکری سے سفر کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہر روز تہران فون کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اہل خانہ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ ہر وقت اس تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں جو ایران میں آ رہی ہے۔ میں اکیلا نہیں۔ ایک دنیا کو یہ سوچ لگی ہوئی ہے۔ اخبار، بینک، بازار، ادارے، حکومتیں اور ملک۔ سب فکرمند ہیں۔

عالمی بنک اور فنڈ کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے۔ اس میلے میں شرکت کے لئے ہزاروں مہمان دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے ہیں۔ ان سب کا تعلق مالیات اور معیشت سے

ہے۔ یہ لوگ سنجیدگی کے مارے ہوئے اور اپنے وقار اور اہمیت کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ خشک مزاج ہیں۔ پیشہ ہی ایسا ہے۔ کوئی رنگین مزاج اس راہ پر زیادہ دیر چل نہیں سکتا۔ ملازم ہو تو نکالا جاتا ہے۔ مالک ہو تو دوالا پٹ جاتا ہے۔ یہ کم گو لوگ ہیں۔ ان کی جگہ اصطلاحات باتیں کرتی ہیں۔ انفلے شن، سٹیگ فلے شن، ری سیشن اور کریش۔ یہ لوگ سیاہ پوش ہیں۔ جن لوگوں کو ہر وقت روپیہ کا رونا پڑا رہے ان کے لئے سیاہ ماتمی رنگ کے کوٹ پتلون سے بہتر اور کون سا لباس ہو گا۔ افتتاحی اجلاس اپنی رسمی رونق کے باوجود ایک ماتمی اجتماع ہے۔ تیل کی قیمت میں اضافہ کا ماتم جاری ہے۔ اس کے علاوہ عالمی معیشت کو جو کوئی خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے اس کے ذکر سے سامعین کو ڈرایا جا رہا ہے۔ سامعین صرف وہ ڈیڑھ دو ہزار افراد نہیں ہیں جو مختلف حیثیتوں سے ہال کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامعین کی گنتی ان ڈیڑھ دو ہزار بن بلائے مہمانوں کو شامل کرنے سے بھی پوری نہیں ہوتی جو دوسرے ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر اس ہال میں ہونے والی کارروائی پر کان لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے اصل سامعین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مغربی دنیا اور اس کے زیر اثر تمام پسماندہ ممالک اس کانفرنس کے سامعین ہیں۔

افتتاحی اجلاس کے بعد لوگ ملنے بلانے میں مصروف ہو گئے۔ میری نشست ہال کے اس حصہ میں ہے جو آبزرور کا درجہ رکھنے والے اداروں کے لئے رزرو ہے۔ تقریباً چالیس اداروں کے نمائندے اس حصہ میں موجود ہیں۔ مجھے صرف اس بنا پر کہ میں ایران سے آیا ہوں تقریباً ہر ایک سے ہاتھ ملانا پڑا۔ دو چار نے رسمی تعارفی کلمات دہرائے۔ ہاؤ دو یو دو۔ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ باقی سب نے یہی پوچھا کہ ایران کا حال کیسا ہے۔ ہفتہ بھر کے بعد صورت حال یہ ہے کہ بعض ڈیلیگیٹ یا مہمان وقفہ یا استقبالیہ دعوتوں میں میرے پاس آتے اور تعارف کے فوراً بعد دو تین سوال پوچھتے ہیں۔ کیا شہنشاہ اس ہنگامہ پر قابو پا لے گا۔ اگر شہنشاہ ناکام ہوتا ہے تو اس کی جگہ کون لے گا۔ کیا ایران میں نظام حکومت کی تبدیلی کے ساتھ نظام معیشت بھی تبدیل ہو جائے گا۔ سوال پوچھنے والوں میں جرمنی جاپان فرانس کے علاوہ اور کئی ملکوں کے رہنے والے شامل ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے یہ صرف بنک کار ہی نہیں بلکہ صنعت کار، تاجر اور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ یہ سب اہل غرض ہیں۔ سوال سے غرض معلومات میں اضافہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔

بنک فنڈ مشترکہ اجلاس میں لنچ کا وقفہ ہوا۔ بنک کے ایک پاکستانی افسر غلام اسحاق خاں، آفتاب احمد خاں اور مجھے ہمراہ لے کر ایک ریستوران کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔
میں نے راستہ میں آفتاب احمد خاں سے پوچھا۔ کیا بھارتی اخبار نے جو بیان ہمارے میزبان سے منسوب کیا ہے وہ درست ہے۔ بیان میں یہ کہا گیا تھا کہ برعظیم کے سیاسی مسائل کا بہترین حل وہ منصوبہ تھا جسے کیبنٹ مشن پلان کہتے ہیں۔ اس پلان کے تحت پاکستان کا مطالبہ نامنظور کرتے ہوئے برطانوی ہند کو ایک مرکزی حکومت اور تین نیم خود مختار حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ آفتاب کہنے لگے۔ شنید یہ ہے کہ ہمارے میزبان کسی عالمی ادارے میں ایک اعلیٰ عہدہ کے امیدوار ہیں۔ بھارت کی تائید حاصل کرنے گئے تھے۔ وہاں کے اخباروں نے موقع کا پورا فائدہ اٹھایا۔ تم لنچ کے دوران کسی وقت ان سے پوچھ لینا۔ میں پوچھوں گا تو وہ طنز یا مذاق قرار دیں گے۔ تم پوچھو گے تو وہ سنجیدگی سے وضاحت پیش کریں گے۔ میں نے موقع دیکھا اور سوال پوچھ لیا۔ جواب ملا، اخبار والوں کو میری بات سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ پوچھا، آپ نے تردید کیوں نہیں کی۔ بولے، مجھے حال ہی میں بنک والوں نے سیاسی بیانات سے اجتناب کا مشورہ دیا ہے۔ جرح کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ بیان واضح ہے۔ وضاحت گول مول۔ میں اداس ہو جاتا ہوں۔
واشنگٹن میں بنک اور فنڈ کے کارکن پاکستانیوں نے مجھ سے پاکستان کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ ان سوالات کا تعلق بھی معلومات عامہ سے نہیں ہے۔ یہ سوال ان دوستوں کے ہیں جو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائے۔ صلہ وہ کچھ نہیں چاہتے۔ بس دو تین سال کے لئے اسلام آباد میں موٹر اور کوٹھی پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کا موقع۔ ان لوگوں نے شاذ ہی کوئی سوال ایران کے بارے میں کیا ہو۔ میں لندن میں ایک دن کے لئے رکا۔ جس سے بھی ملا اس نے ایران کے بارے میں پوچھا۔ پکاڈلی گیا۔ وہاں ایک جہازی دیواری اشتہار کی نیم عریاں خاتون کے جسم کے عریاں حصہ پر سپرے پینٹ سے لکھا ہوا تھا۔ مرگ بر شاہ۔
میں جینوا پہنچتا ہوں۔ یہاں بھی لوگ ایران کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ملے۔ ان میں اس کمیٹی کے وہ دس ممبر بھی شامل ہیں جس کی رکنیت مجھے جینوا لے کر آئی ہے۔ ابرٹو فیوانٹس موہر (جو گوئٹے مالا کا صدارتی الیکشن لڑنا چاہتے ہیں)، مینوئل پیرز

گوریرو (سابق سیکرٹری جنرل انکٹاڈ حال وزیر بین الاقوامی اقتصادیات وینیز ولا)، علی محمد جیدا (سیکرٹری جنرل اوپیک)، ایڈن کو جو (سیکرٹری جنرل او اے یو)، ونسنٹے پاترنو (وزیر صنعت فلپائن)، این ایم پریرا (وزیر خزانہ سری لنکا)، لایا چی یاکر (نائب صدر، پاپولر اینڈ نیشنل اسمبلی، الجزائر) وغیرہ وغیرہ۔ ہر ایک جاننا چاہتا ہے کہ ایران میں کیا ہونے والا ہے اور اس کا اثر عالمی معیشت پر کیا ہو گا۔ جب اس پچ رنگی مجموعہ افراد نے جس میں ہر شخص کا ملک، مزاج، زبان، دلچسپیاں مختلف ہیں ایران کے بارے میں یکساں دلچسپی کا اظہار کیا تو میں اس صاف اور ظاہر نتیجہ پر پہنچا کہ ایران کا داخلی معاملہ اب بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔

انکٹاڈ کے سیکرٹری جنرل گاماٹی کوریا ملے۔ کہنے لگے۔ دو ہفتہ پہلے تہران کے دورے پر گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ سارا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ کسی وزیر سے ملاقات تو درکنار ٹیلیفون پر بات تک نہ ہو سکی۔ ہوٹل انٹر کانٹیننٹل سے باہر نکلنا بھی دشوار ہو گیا۔ دو دن کمرے میں بند رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے آر. سی. ڈی کے دفتر تک گیا کیونکہ وہ ہوٹل سے دو سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہاں میں نے ایک جلوس دیکھا جو ایلزبتھ بلوار سے گزر رہا تھا۔ یہ جلوس اتنا بڑا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

میں جنیوا میں ایک فلیٹ میں کھانا کھانے کے بعد چھوٹے سے خوش گپ گروہ میں گھرا ہوا ہوں۔ لوگ بڑے سرور میں ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر کسی نہ کسی کی طبیعت رواں نہ ہو۔ لیکن بات گھوم پھر کر ایران پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔ یہ میری موجودگی کے سبب نہیں بلکہ بلجیم کے اس فری لانس صحافی کی وجہ سے ہے جس کے شہنشاہ ایران سے گہرے ذاتی مراسم ہیں اور جو اس کے کئی خصوصی انٹرویو شائع کر چکا ہے۔ دوسرے مہمان اس شخص سے بڑے مرعوب ہیں۔ اس کا لکھا نیوز ویک میں چھپتا ہے۔ شاہی خاندان کا فرد ہے۔ میزبان کہتے ہیں کہ اگر بلجیم کا بادشاہ انتقال کر جائے اور اس کے بعد تخت کے اٹھارہ وارث یکایک اور اکٹھے کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو اس روز یہ شخص اپنے ملک کا بادشاہ بن جائے گا۔ سننے والے نے کہا، وہ دن بڑا نحس ہو گا جب بلجیم کی بے اختیار بے چہرہ بادشاہت کے لئے اٹھارہ لاشوں سے گزر کر کوئی شخص برسلز کے شاہی

محل میں داخل ہو گا۔

غذای شب کی دعوت میں شامل سوئس باشندہ نے مجھ سے کہا۔ ایران میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے اثرات ایک نہ ایک دن بین الاقوامی سطح پر ضرور نمودار ہوں گے۔ میں دیر سے موقع کی تلاش میں بیٹھا ہوا تھا۔ فوراً جواب دیا۔ جناب والا، دوسرے ممالک پر جو اثر ہو گا وہ بعد میں دیکھا جائے گا، پہلے آپ کے خوبصورت وطن سوئٹزرلینڈ کی بات کیوں نہ کریں جس کے بنکوں کے مالی مفادات تیسری دنیا کے عوام کی سیاسی بدنصیبیوں سے وابستہ ہیں۔ ایران میں جو بے یقینی اور ابتری ہے اس کا فائدہ کچھ ملکوں نے ابھی سے اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ بنک مرکزی کے عملہ نے تہران میں ایک فہرست شائع کی ہے جس کی رو سے پچھلے آٹھ ہفتہ میں دو ہزار ملین ڈالر کی رقم ایران سے دوسرے ممالک کو منتقل کی جا چکی ہے۔ سرمایہ کے اس فرار کا سب سے زیادہ فائدہ دو ملکوں کو ہوا ہے ان میں سے ایک آپ کا ملک ہے۔ یہ آپ کا ملک بڑا خوبصورت ہے۔ خیانت اور خورد برد کرنے والوں کے لئے جنت ہے۔ آپ کی معیشت بڑی مضبوط ہے۔ غریب ملکوں کا خون اس کی رگ و پے میں دوڑ رہا ہے۔ آپ لوگ بڑے امانت دار ہیں۔ ناجائز اور نامناسب ذرائع آمدنی سے حاصل ہونے والی حرام کمائی کے امین آپ ہیں۔ کہتے ہیں مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ جائے حرام سے مراد شاید سوئٹزرلینڈ ہے۔

(4)

جامعہ کارکنان بانک مرکزی ایران نے ایک اطلاعیہ شائع کیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے نام درج ہیں جنھوں نے شہریور اور مہر 1357ء کے دو مہینوں میں (اگست 1978ء کے تیسرے ہفتہ سے اکتوبر کے تیسرے ہفتہ تک) دس ملین تومان فی کس سے زیادہ کی رقم ملک سے باہر بھیجی ہے۔ یہ فہرست طویل اور دلچسپ ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ ہژبر یزدانی، 540 ملین تومان۔ کہتے ہیں کسی زمانہ میں یہ صاحب مال بکریاں چراتے تھے۔ ہوشنگ انصاری، 480 ملین تومان۔ شہنشاہ کے وزیر، سفیر اور صاحب

نسبت۔ ارتشبد (جنرل) محمد نصیری، 380 ملین تومان۔ جفا پیشہ سابق رئیس ساواک۔ موجود پیشہ سفارت۔ سفیر ایران در پاکستان۔ انہیں ایران میں سب سے زیادہ قابل نفرت شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ارتشبد حسن طوفانیایان، 280 ملین تومان۔ چند ہفتہ پہلے یہ صاحب قوت ایک سفارت خانہ کی خصوصی دعوت میں شامل ہوئے تو سفیر اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگا۔ ارتشبد غلام علی اویسی، 121 ملین تومان۔ تہران کے مارشل لا ایڈ منسٹریٹر۔ غلام رضانک پئ، 52 ملین تومان۔ شہردار تہران جن کے بارے میں مشہور ہے کہ عمارتوں کے نقشے منظور کرنے کے لئے رشوت لیتے ہیں۔ ایسی رشوت ہمارے یہاں بھی عام ہے۔ بس ریٹ کا فرق ہے۔ جیسی معیشت ویسی رشوت۔ شجاع الدین شفا، 70 ملین تومان۔ ادیب اور مترجم۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کا ترجمہ کیا۔ بہشت و دوزخ عنوان رکھا۔ ترجمہ کی دنیا سے باہر نکلے تو بہشت و دوزخ موجود کا پتہ چلا۔ پہلوی ایران اس کی بہشت، انقلابی ایران اس کا دوزخ۔ ڈاکٹر شیخ الاسلامی زادہ، 48 ملین تومان۔ یہ غالباً وہی ایرانی وزیر صحت ہیں جو ایک بار بنکاک میں ایک کانفرنس کے سلسلہ میں مجھے ملے تھے۔ میں ان دنوں پاکستان میں وزارت صحت کا سیکرٹری تھا۔ شیخ صاحب صدر منتخب ہوئے اور میں نائب صدر۔ جشن افتتاح کے بعد وہ بغیر اطلاع غائب ہو گئے اور ہفتہ بھر کے بعد آخری روز اختتامی اجلاس میں دوبارہ گھنٹہ بھر کے لئے ان کی صورت دیکھنے کو ملی۔ سنا ہے کہ اس مدت میں وہ کسی صحت افزا مقام پر مضر صحت تفریحات میں بے حد مصروف رہے۔

ایک پاکستانی اس اطلاعیہ کی نقل اور جیبی حسابی مشین لئے بیٹھے تھے۔ سات تومان برابر ایک امریکی ڈالر کے حساب سے پہلے ریال کو ڈالر میں تبدیل کرتے ہیں پھر ڈالر کو تازہ شرح کے مطابق پاکستانی روپے میں تبدیل کرتے ہیں۔ ہر جواب کروڑوں میں نکلتا ہے جسے دیکھ کر وہ دو بار غضب ہو گیا، غضب ہو گیا کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس کے بعد خاموشی سے اگلے آدمی کے فراری سرمایہ کا حساب لگانے میں جت جاتے ہیں۔ فہرست طویل ہے۔ پہلی قسط ہے۔ مدت صرف دو ماہ کی ہے۔ یہ کب تک اس دولت کا حساب جوڑتے رہیں گے جو حساب سے باہر ہے۔ میں انہیں اس مشغلہ میں مصروف چھوڑ کر ترکی چلا جاتا ہوں۔

بالآخر ترکی کے سفر کا وقت آ ہی گیا۔ دو تین بار تاریخیں بدلنی پڑیں۔ کبھی ہنگاموں نے راستہ روکا کبھی ہڑتالوں نے۔ جب کبھی عارضی طور پر ان کا زور ٹوٹتا تو پتہ چلتا کہ

پروازیں منسوخ ہو گئی ہیں۔ پروازیں شروع ہوتیں تو نشستیں کم پڑ جاتیں۔ بھاگ دوڑ کر سیٹ حاصل کرتے تو بنک ہڑتال پر چلے جاتے۔ نہ زر نہ زرمبادلہ اور نہ زادراہ۔ میرے اس ایک سفر کو ملتوی کروانے کے لئے کتنے ہی ادارے طرح طرح کے حربے استعمال کر رہے تھے۔ میں خندہ پیشانی سے ان تمام حربوں کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر کار انقرہ پہنچ گیا۔

ترکی کے صدر فہری کورو ترک سے گفتگو ترجمان کی معرفت ہو رہی ہے۔ عام طور پر ایسی گفتگو بڑی دقت طلب اور بے مزہ ہوتی ہے۔ لفظ لفظ گفتگو، نقش نقش یادداشت، سہج سہج ترجمہ، بار بار وقفہ۔ جہاں گفتگو میں ٹیکنیکل اصطلاحات استعمال ہو رہی ہوں اور مترجم کا درسی علم ان کے بارے میں صفر کے برابر ہو وہاں گفتگو کی رفتار برفانی چوٹی سر کرنے والوں کی چال کے مطابق ہوتی ہے۔ قدم قدم۔ رسیوں کا سہارا لے کر۔ نیچے کھائیاں اوپر طوفان، پھسلے اور گئے۔ مترجم کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ کبھی دس منٹ کی بات کا ترجمہ ایک جملہ میں کر کے آپ کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے گا۔ کبھی ایک جملہ کا ترجمہ دس منٹ تک کرتا رہے گا اور آپ سے آنکھیں بھی نہیں ملائے گا۔ میں ایسے تکلیف دہ عمل سے کئی بار گزرا ہوں۔

آج البتہ بات ہی کچھ اور ہے۔ مترجم کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے گفتگو براہ راست ہو رہی ہے۔ بات آر سی ڈی کی کارکردگی سے شروع ہوئی اور تاریخ کے تجزیئے تک جا پہنچی۔ شہری ریاست سے امپیریلیسم تک، امپیریلیسم سے قومی ریاست تک، قومی ریاست سے علاقائی تعاون کے اداروں تک۔ علاقائی تعاون میں ترقی یافتہ قوموں کی پیش رفت اور پسماندہ ممالک کی پس رفت کی وجوہات پر غور ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا۔ اول، تاریخ کے ہر دور میں ہمسایہ ملک کی مادی ترقی خطرہ اور جنگ کی علامت سمجھی گئی ہے۔ دوم، غیر ترقی یافتہ ممالک میں علاقائی تعاون کو محض سیاسی اور نمائشی حیثیت حاصل ہے۔ سوم، غیر ترقی یافتہ ممالک میں اقتصاد پر حاوی نوکر شاہی میں بصیرت، جرأت اور اہلیت کی کمی ہے۔ ساری بحث کہ پسماندہ ممالک میں علاقائی تعاون اب تک کیوں کامیاب نہیں ہوا آخر دو لفظوں میں سمٹ گئی۔ خوف اور نااہلیت۔

ہاتھ ملا کر میں کمرۂ ملاقات سے باہر نکلا اور ایک دو کمروں سے ہوتا ہوا گیلری میں

داخل ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گیلری کے دوسرے سرے پر دروازہ تک جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ ترکی کے ایوان صدر کی گیلری میں جو سرخ مشینی قالین بچھا ہوا ہے وہ پرانا اور گھسا ہوا ہے۔ ایران سے مقابلہ درست نہ ہو گا۔ وہاں شہنشاہیت ہے اور تیل کی دولت ہے۔ ترکی کی قومی آمدنی پاکستان سے دگنی اور آبادی آدھی ہے۔ مگر ان کے ہاں بے حد سادگی ہے۔ قومی دولت نمائشی کاموں میں لٹانے کا رواج نہیں ہے۔ ان کا وزیر زراعت جس فلیٹ میں رہتا ہے اس کے سامنے والے فلیٹ میں پاکستان کا پریس اتاشی رہتا ہے۔ چھٹی کے وقت انقرہ میں سرکاری دفاتر کے باہر کھڑے ہوں تو بڑا بڑا سول اور باوردی فوجی افسر بس پکڑتا نظر آئے گا۔ صدر پاکستان استنبول پہنچے تو انہیں اور ان کے چالیس پچاس ساتھیوں کو فائیوسٹار ہوٹل کے بجائے ایک فوجی میس میں ٹھہرایا گیا۔

میں ایک ایسے سرکاری مہمان سے بھی واقف ہوں جو ترکی کے دورے پر جاتا تھا تو اسے تین دن کے لئے ایک جونیئر افسر اور ایک پرانی موٹر دی جاتی تھی۔ اگر وہ چار دن ٹھہرنا چاہتا تو آخری دن اسے ٹیکسی منگانی پڑتی تھی۔ اس کے اعزاز میں ایک سادہ لنچ دیا جاتا جس میں دس بارہ مہمان ہوتے تھے۔ وہی مہمان جب پاکستان آتا تو اس کی موٹر کار کے آگے ایک موٹر سائیکل سوار ہوتا۔ سیٹی بجا کر خیبر سے کراچی تک ہر جگہ اس کے لئے ٹریفک روکی جاتی۔ مرکزی اور صوبائی صدر مقامات پر پر تکلف دعوتیں ہوتیں۔ ہر دعوت میں چالیس پچاس افراد شامل ہوتے۔ قابل دید مقامات کی سیر ہوتی۔ گھنٹہ بھر کی دو رسمی ملاقاتوں کے لئے وہ مہمان پاکستان کا دو تین ہفتہ کا دورہ کرتا تھا۔ جہاں اتنی پذیرائی ہو وہاں سے واپس جانے کو کس کا جی چاہتا ہے۔ اس ایک مہمان کے ہر دورے کے سلسلہ میں ترکی کا کل خرچ سینکڑوں میں ہوتا اور پاکستان کا لاکھوں میں۔

ایشیائی ترقیاتی بنک کے بھارتی نائب صدر نے ایک بار منیلا میں اپنے دفتر میں بچھے ہوئے دو تین قالینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں اسلام آباد میں جس کسی سے ملنے گیا اس نے مجھے ایک قالین تحفہ میں دے دیا۔ معلوم نہیں آپ کے یہاں سرکاری دورہ کے موقع پر آخر اتنے قیمتی تحائف بار بار کیوں دیئے جاتے ہیں۔ کسی اور ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے جملہ میں بڑی کاٹ تھی۔

مشرق بعید کے اسی سفر میں مجھے کسی نے بتایا کہ چند دن پہلے سول فضائیہ کا اجلاس

ہوا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ تحفے پاکستانی وفد کے سربراہ نے تقسیم کیے۔ اکثر بڑے قیمتی تھے۔ تقسیم سراسر بے موقع تھی۔ ورکنگ ٹیکنیکل اجلاس میں لوگ تحائف نہیں بلکہ تجاویز لے کر آتے ہیں۔ میں یہ سن کر شرمندہ ہوا۔ واپس اسلام آباد پہنچا۔ کسی سے اس بات کی شکایت کی۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ یہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ایک امریکی ٹھیکہ دار آیا ہوا تھا۔ پرانے ٹھیکہ کی مدت میں توسیع چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں لوگوں کو خوش کرنے کے لئے تحفے لایا ہوا تھا۔ سب سے بڑے دفتر میں بلایا گیا۔ ملاقات ہوئی، ٹی وی فلم بنی اور چلتے ہوئے اسے ایک قالین تحفہ میں دیا گیا۔ ہم کیسی کیسی نادانی کو اپنی دانست میں عقلمندی سمجھتے ہیں۔ بیوقوفی اور اسراف کے کس کس انداز کو روایتی مہمان نوازی کے نام پر جائز قرار دیتے ہیں۔ اس ٹھیکہ دار نے ایک بے تکلف دوست سے کہا۔ یہ کیسے لوگ ہیں جنہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ تحفہ اور رشوت کس کو دیتے ہیں اور کس سے لیتے ہیں۔ دوست نے کہا، تحفہ کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر جہاں تک رشوت کا تعلق ہے یہ لوگ اس فن کے علم اور عمل میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

پاکستان دولت میں ایران سے کم تر اور ترقی کی دوڑ میں ترکی سے پیچھے ہے مگر سرکاری رہائش گاہوں اور موٹروں کے شاہانہ استعمال، نیم سرکاری اداروں کے ٹھاٹھ باٹھ اور بیرونی مہمانوں پر ناحق اور ناجائز اخراجات کے سلسلہ میں سب سے آگے ہے۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ پاکستان کے وزیر خزانہ کے دفتر میں ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑی اچھی حالت میں تھا۔ ترکی کے ایوان صدر کی راہرو میں بچھے ہوئے قالین سے کہیں زیادہ صاف اور خوشرنگ تھا۔ لیکن وزیر موصوف کے معیار پر پورا نہ اترا۔ حکم ہوا کہ اسے بے داغ سفید رنگ کے قالین سے تبدیل کر دو۔ تعمیل ہوئی۔ اسلام آباد میں بارش بہت ہوتی ہے۔ سیکرٹریٹ کی ساری عمارتیں پورچ کے بغیر ہیں۔ لوگ گیلے کپڑوں اور گندے جوتوں سمیت اندر داخل ہوتے ہیں۔ وزیر خزانہ جو خزانہ کی حفاظت پر مامور تھے وہ اپنے دفتر میں نہ صرف سفید قالین بچھواتے ہیں بلکہ اپنی میز کرسی کے پیچھے جو دیوار ہے اسے تہ دار سرخ کمخواب سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ ایک دوست کو جس نے 1946ء میں اپنی ملازمت کا آغاز نئی دلی میں برطانوی ہند کی وزارت خزانہ سے کیا تھا، کئی دہائیوں کے بعد بھارت کے وزیر خزانہ کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کہتے ہیں کہ وہی ساگوان کی میز جو انگریز استعمال

کرتے تھے اسی طرح کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔ فرش لکڑی کا ہے۔ چلتے ہوئے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے مگر کسی نازک مزاج نے اسے دیوار سے دیوار تک قالین سے ڈھکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ اس ذرا سے حصہ میں جہاں صوفہ رکھا ہوا ہے ایک چھوٹا اور سادہ قالین بچھا ہوا ہے۔

ہمارے یہاں ملک کی دولت کو حکومت کے سیاسی اور انتظامی کارندے جس بے دردی سے علانیہ ضائع کرتے ہیں، اگر اس کی مثالوں کا دفتر جمع کیا جائے تو ترقی یافتہ ملکوں میں اسے الف لیلہ کے قصوں کی طرح شوق اور حیرت سے پڑھا جائے گا۔ سوئٹزرلینڈ دنیا کا ایک امیر ترین ملک ہے۔ اس کے معتمد تجارت سے میں نے اسلام آباد سے رخصت ہوتے ہوئے یونہی پوچھ لیا کہ وہ جنیوا کے راستہ جا رہا ہے یا زیورچ کے۔ اس نے کہا میں ہمیشہ زیورچ کے راستہ واپس وطن پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ وہاں ریلوے اسٹیشن ہوائی اڈا سے نزدیک ہے۔ اگر جنیوا جاؤں تو سامان اٹھا کر دور تک چلنا پڑتا ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیا ہوائی اڈا پر تمہاری سٹاف کار اور تمہارا عملہ تمہیں لینے کے لئے نہیں آتا۔ آخر باسل ہے ہی کتنی دور۔ اس نے کہا اگر سٹاف کار صدر مقام سے باہر کسی دوسرے شہر محض استقبال کے لئے پہنچ جائے تو اخبارات اس واقعہ کو سکنڈل کے طور پر شائع کریں گے اور جو افسر یا وزیر اس حرکت کا مرتکب ہو گا اسے استعفا دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہو گا۔ مجھے موٹروں کے وہ کاروان یاد آئے جو وزیروں کے استقبال کے لئے دوسرے شہروں میں بھیجے جاتے ہیں۔ مجھے بے شمار افسر اور وزراء یاد آئے جو اپنے سرکاری استحقاق سے کہیں زیادہ تعداد میں موٹریں استعمال کرتے ہیں۔ اخراجات ذیلی اداروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں تاکہ وہ کھاتا در کھاتا درج ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ ایک صاحب اقتدار سیاست دان کابینہ ڈویژن کی موٹروں کو اس طرح تصرف بے جا میں لائے کہ جب کسی موٹر کے لئے کوئی محکمہ مطالبہ کی پرچی بھیجتا تو وہ اس اندراج کے ساتھ واپس آ جاتی۔ تمام موٹریں ڈیوٹی پر ہیں۔ آپ کو ٹرانسپورٹ کرایہ پر لینے کی اجازت ہے۔ ان دنوں کابینہ کے پول میں ساٹھ باسٹھ موٹریں ہوا کرتی تھیں۔

ہماری پسماندگی میں سب سے بڑا حصہ اس خوف اور ماحول کا ہے جس کی وجہ سے ہم حکمرانوں سے حکمرانی کے دوران کوئی سوال نہیں پوچھتے۔ جہاں یہ سوال پوچھنے کی روایت

ترک کر دی جائے کہ سربراہ ریاست کے پاس دوسری چادر کہاں سے آئی ہے تو پھر حکمرانوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ دوسری چادر کے بجائے کپڑا بنانے کے کارخانے اور انہیں سرمایہ فراہم کرنے والے بنکوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔

میں انقرہ میں ایوان صدر کی گیلری کے دوسرے سرے پر دروازہ کے پاس کھڑا قالینی پٹی پر نظریں گاڑے گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ صدر ترکیہ کے عملہ کا ایک فرد میرے پاس آیا اور کہنے لگا سر، رسمی ملاقاتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک رسمی اور برف کی طرح سرد ملاقاتیں، ٹھنڈی گرمیوں والی منافقتی ملاقاتیں، کلینکی سفارتی ملاقاتیں جیسے ہر شخص نے دستانے پہن رکھے ہوں، ماسک میں چہرہ چھپایا ہوا ہو اور پرفیوم کی جگہ کپڑوں پر ڈیٹول لگائی ہو۔ دوسری وہ ملاقاتیں جن کا آغاز ضابطہ کے مطابق رسمی ہوتا ہے مگر مدت ملاقات کے ختم ہونے تک وہ غیر رسمی بن جاتی ہیں۔ تکلّفات کا حجاب اٹھ جاتا ہے اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی ہے۔ آج کی ملاقات اس دوسری قسم کی ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ آپ تہران سے آرہے ہیں مگر ایران کے بارے میں بات کرنے کی نوبت تک نہ آئی۔ افسر تشریفات کی بات ختم ہوئی تو اس گھسے ہوئے قالین نے مجھ سے کہا۔ کیا آپ میرا ایک پیغام اہل پاکستان کو پہنچا دیں گے۔ زندہ قومیں عمل اور جرأت سے پہچانی جاتی ہیں نہ کہ فرش اور فرنیچر سے۔ اسراف جرم ہے۔ غربت میں اسراف دہرا جرم ہے۔

میں نے وزیر اعظم بلند ایجوت سے کہا۔ ایران میں ایک بنیادی ساختیاتی تبدیلی ناگزیر ہے۔ وجوہات چار ہیں۔ تیل کی دولت، تعلیم کا فروغ، فرسودہ شخصی نظام حکومت، معاشی ناہمواری۔ لوگ ایک نئے عہد اور امید کی خونریز تلاش میں گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ نئے دور کی شکل کا تعین اس وقت مشکل ہے مگر پرانا دور بہر صورت ختم ہو چکا ہے۔ بلند ایجوت نے کوئی جرح نہ کی۔ کہنے لگے آیئے اب غیر سرکاری گفتگو کریں۔ کوائف میں لکھا ہے کہ آپ ادیب اور نثر نگار ہیں۔ میں بھی ادب سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ شعر کہتا ہوں۔ میری چند نظموں کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے وہ آپ کو پڑھنے کے لئے دوں گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل قونیہ جا رہا ہوں۔ مولوی معنوی کے مزار پر فاتحہ پڑھنا ہے۔ مولانا سے مجھے ایک نسبت ہے۔ میں نے اپنی کتاب آواز دوست کا عنوان مولانا کے ایک شعر سے مستعار لیا ہے۔ وہی مولانا جو ایک طرف یہ پوچھتے ہیں کہ آلۂ موسیقی بے جان اور بے مغز

اور خشک سوکھے اجزا سے بنا ہوا ہے پھر آخر دوست کی یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ اور دوسری طرف اس خطرہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ایک آواز ایسی بھی ہے جسے لوگ آواز دوست اور بانگ آشنا سمجھ کر اس کی جانب چل نکلتے ہیں مگر جب منزل پر پہنچتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ عمر برباد ہوئی، راستہ دور رہ گیا اور دن بے وقت ہو گیا۔ یہ نفس کی گہرائیوں سے اٹھنے والی آواز ہوتی ہے جو تمام عمر کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ مجھے دولت چاہیئے، شوکت چاہیئے، شہرت چاہیئے۔ یہ چاہیئے اور وہ چاہیئے۔

میں نے انقرہ کے قیام کے دوران بلند ایجوت کی نصف درجن نظموں کو دو چار بار غور سے پڑھا مگر ان کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ ایک ترجمہ اور وہ بھی صرف چند نظموں کا۔ کم از کم ایک پوری کتاب تو ہوتی۔ ان نظموں میں سب سے شوخ نظم کا عنوان غار نشیں (Caveman) ہے۔ مطلب کچھ یوں ہے کہ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ صرف تنہائی ہی تنہائی ہو۔ میں ایک غار مرد ہوں۔ یہ دنیا مجھے راس نہیں آئی۔ اور آئے بھی کیسے۔ یہ ہنگاموں سے پر ہے۔ ادھر میری سرشت میں تنہائی، خاموشی اور غار نشینی شامل ہے۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے میں نے نو ماہ ایک گھپ اندھیرے غار میں بسر کئے تھے۔

شام کا وقت ہے۔ میں ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں۔ استنبول سے تہران کا سفر ہے۔ یورپی اور امریکی اخبارات کی ایک ایک سطر پڑھ رہا ہوں۔ ایران میں مقامی اخبار بند ہیں اور تازہ بیرونی اخبار نایاب۔ اخبار میں لکھا ہے کہ تہران میں پانی، تیل، گیس، بجلی اور امن و امان کا سلسلہ تباہ ہو چکا ہے۔ اس حساب سے شہر میں گھپ اندھیرا ہونا چاہیئے۔ ہوائی جہاز نے تہران کا ایک چکر لگایا۔ سارا شہر جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ لاتعداد بتیاں روشن ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بادشاہت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ میں نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا۔ دیکھئے اخبارات کیا لکھتے ہیں اور یہاں تہران میں کیسا چراغاں اور کیسی رونق ہے۔ جواب ملا۔ آپ روشنیوں کو رونق کہہ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان روشنیوں کو بند کرنے والے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں یا ہڑتال پر ہیں۔ یہ دن میں بھی اسی طرح جلتی رہتی ہیں۔ ایران پر حکومت کرنا اب شہنشاہ رضا شاہ کے بس کی بات نہیں رہی۔ آخر وہ کون کون سا سوئچ آف کرے گا!

باب ہفتم

نئے نام، پرانی تصویریں

اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر۔ کل چار ماہ ہوئے۔ یہ کوئی ایسی بڑی مدت بھی نہیں۔ سو سوا سو دن ہی تو بنتے ہیں لیکن تبدیلی بہت بڑی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سترہ ہفتوں میں وہ ایک دنیا جو مدت سے یہاں آباد تھی اور بڑی پائدار لگتی تھی، ادھر سے اُدھر ہو گئی ہے۔ لوگ نئی دنیا کی باتیں کرتے ہیں مگر کسی کو خبر نہیں کہ وہ کب وجود میں آئے گی اور اس کی صورت اور ساخت کیسی ہو گی۔

سب سے نمایاں تبدیلی خواص کے قدم اور عوام کے ہاتھ میں آئی ہے۔ وہ ڈگمگا گئے ہیں، یہ لمبے ہو گئے ہیں۔ ایک مدت سے یہاں خاص اور عام کا فرق اس فاصلہ سے ماپا جاتا تھا جو کسی ایرانی باشندہ اور ایران کے شہنشاہ کے درمیان ہوتا تھا۔ فاصلہ کم ہوا تو خاص الخاص، زیادہ ہوا تو یکے از عوام الناس۔ کل تک خواص کا طبقہ عوام سے بہت دور دوسری انتہا پر اپنی ارضی جنت میں آباد تھا۔ ہر شخص اپنی ذات میں مگن تھا۔ خدا اور اس کے بندوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس چار ماہ میں اس جنت کی فصلیں ڈھے گئی ہیں۔ دودھ اور شہد کی نہریں سوکھ گئی ہیں۔ سبزہ پہلے جیسا سبز اور تازہ نہیں رہا۔ دل جو بڑے خود پسند اور مطمئن ہوا کرتے تھے اب ڈاکٹر کی دواؤں کے باوجود نڈھال اور بے آرام ہیں۔ غرور جو ہر ہر قدم پر ایک گہرا نقش بناتا تھا آج کل بالکل بے نشان ہے۔ خواص کے قدم اکھڑ گئے ہیں۔ نقش قدم بنے تو کیسے بنے۔

ایک بہت بڑی تبدیلی عوام میں بھی آگئی ہے۔ شہنشاہیت کی تیز روشنی میں ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ خوف کے مارے ان کی زبان بند تھی۔ حاجتمندی نے انہیں بے دست و پا کر دیا تھا۔ اب وہ دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں صاف نظر آ رہا ہے کہ بادشاہت ختم ہونے والی ہے۔ اب وہ بول سکتے ہیں۔ مرگ بر شاہ کا نعرہ لگا سکتے ہیں۔ اب وہ چل سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں تو لاکھوں افراد کا جلوس بن جاتا ہے۔ ان کے ہاتھ اب بندھے ہوئے نہیں کھلے ہوئے ہیں۔ ہاتھ بدستور خالی ہیں مگر اب وہ حکومت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر کوئی یہی پوچھتا ہے کہ کیا یہ ہاتھ بالاخر تاج و تخت تک جا پہنچیں گے۔

اس نئے ماحول میں نئے نئے نام سننے میں آرہے ہیں۔ ایسے نام جنہیں چند ماہ پہلے کوئی جانتا نہ تھا۔ ایسے ایسے نام جنہیں چند دن پہلے زبان پر لانا جرم تھا۔ یہ نئے نام اب زبان پر آگئے ہیں۔ اخبار میں چھپ گئے ہیں۔ دیوار پر لکھے گئے ہیں۔ اور وہ نام جنہیں کل تک ہر جملہ میں شامل کئے بغیر جملہ مکمل نہ ہوتا تھا آج متروک ہو گئے ہیں۔ صرف طنز اور عبرت کے کام آتے ہیں۔ میری مشکل میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے لئے اہم افراد کے وہ نام ابھی تک نئے ہیں جو اسلام آباد سے تہران پہنچ کر میں نے سرکاری کاغذات میں لکھے ہوئے دیکھے تھے بلکہ انہیں ضروری جان کر زبانی یاد کر لیا تھا۔ وقت کہتا ہے، وہ سب پرانے ہو چکے ہیں۔ انہیں بھول جاؤ۔ حافظہ کہتا ہے، میں صرف ایک حکم مانتا ہوں۔ کہو یاد کرو۔ میں مقدور بھر تعمیل کی کوشش کرتا ہوں۔ کہو بھول جاؤ۔ میں انکار کر دیتا ہوں۔ بھلانا میری اپنی مرضی اور مجبوری پر منحصر ہے۔ یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔

فوزیہ مصری اور ثریا اسفند یاری پہلے ہی پرانے نام تھے لیکن اب شاہ بانو فرح پہلوی کا نام بھی پرایا لگتا ہے۔ تخت ان دونوں نے چھوڑا تھا۔ تخت اس ملکہ کا بھی سلامت نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے ان کو چھوڑا تھا۔ بادشاہت اس کو چھوڑ جائے گی۔ رضا شاہ، شاہ رضا، مادر ملکہ، اشرف پہلوی، یہ نام کتنے پرانے لگتے ہیں۔ ہویدا، آموزگار، امامی، ازہری، شاہپور، حسن عارفہ، طوفانیاں، پاکرواں، قرہ باغی، اویسی، رحیمی۔ زاہدی، خلعت باری، انصاری، نہاوندی۔ یہ سب باسی پھولوں کے نام ہیں جنہیں صفائی کے وقت جھاڑو پھیر کر جمع کرتے ہیں اور کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آتے ہیں۔ نئے پھولوں کے لئے خود بخود جگہ

بن گئی ہے۔ جگہ جگہ ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ خمینی، طالقانی، مطہری، منتظری، بہشتی، خامنہ ای، رفسنجانی۔ ان سب کا تعلق قم کے دینی مدرسوں سے ہے۔ ایک نام شریعتی کا بھی ہے۔ لوگ اس کو بہت یاد کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں میں اپنے جمہوری سیاسی حقوق حاصل کرنے کی خواہش عمرانیات کے اس استاد اور دانشور نے بیدار کی تھی۔ احمد شاملو، فروغ فرخزاد، صادق ہدایت، جلال آل احمد ادیب اور شاعروں کے نام ہیں۔ زنجانی، شاہی، لاہیجی ، جوادی، میناچی، مراغی، حسن نزیہ۔ یہ سب بنیادی انسانی حقوق کے پرچم بردار ہیں۔ بازرگان اور سنجابی بہت پرانے لیڈر ہیں۔ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ حکومت نامہربان نے اتنا عرصہ پہلے ان کے ناموں کی تختی پر سیاہی لگا کر اپنی دانست میں انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا کہ اب دوبارہ سامنے آنے پر یہ دونوں اشخاص تازہ دم، نئے اور نوجوان لگ رہے۔

میں ان ناموں پر غور کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ بے شمار نئے اور پرانے ناموں پر غور کرتا ہوں۔ بالآخر دو ناموں پر آکر ٹھہر جاتا ہوں۔ آج کل ایران میں سب سے پرانا اور فرسودہ نام شہنشاہ رضا شاہ کا ہے اور سب سے تازہ اور تابندہ نام آیت اللہ روح اللہ خمینی کا ہے۔ اسماء الرجال بھی کیا علم ہے۔ دریاؤ اور دلچسپ۔ عبرت ناک اور سبق آموز۔

جب کبھی سبق پڑھنے کو جی چاہتا ہے میں خیابان شاہ رضا پر تہران یونیورسٹی کے سامنے کتابوں کی دکانوں کا چکر کاٹنے لگتا ہوں۔ آج پھر وہاں جانے کا ارادہ تھا مگر اسے ترک کر دیا ہے۔ یاد آیا کہ سنسر کی پابندی اٹھنے کے بعد شہر کے کئی حصوں میں پیادہ روپر کتابوں کی عارضی دکانیں کھل گئی ہیں۔ جہاں سایہ اور گاہک نظر آیا وہاں فٹ پاتھ پر کتابوں کا ڈھیر لگا دیا اور اسٹول رکھ کر پاس بیٹھ گئے۔ نئ نئ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ شعر، ناول، ترجمہ، حالات حاضرہ، سوانح، سفر نامہ۔ ہر ہفتہ نئ کتابوں کی ایک کھیپ کی کھیپ بازار میں آجاتی ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ مانا کہ طباعت کا طریقہ ست اور دقیانوسی تھا مگر نئے عنوانات کی کمیابی کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ ابھی چند دنوں پہلے تک ایک بہت ست رفتار محکمہ سنسر کا ہوا کرتا تھا۔ بس کان نمک کے مصداق۔ مسودے وہاں تک جاتے ہوئے تو سب نے دیکھے مگر وہاں سے منظور ہو کر واپس آنے والا مسودہ کسی نے کا ہے کو

دیکھا ہو گا۔ سنا ہے کہ جب رنج و آزار کے اس محکمہ کو بند کیا گیا تو کوئی بیس پچیس ہزار مسودے توجہ اور فیصلے کے منتظر تھے۔ اور بعض 1966 ء سے زیر غور تھے جب یہ محکمہ پہلی بار باضابطہ طور پر وجود میں آیا تھا۔ سنسر کا بند ٹوٹا ہے اور چھاپے کے طریقے بدلے ہیں لہٰذا یہ شہر نئی کتابوں کے سیلاب کی زد میں ہے۔ کہاں وہ دن کہ پڑھنے والے پیاسے تھے، کہاں یہ دن کہ وہ پانی میں غوطے کھا رہے ہیں۔

چھپائی کا کام آف سیٹ نے بہت آسان کر دیا ہے۔ روٹری نے اس کی رفتار بہت تیز کر دی ہے۔ جلدی کے مارے لوگ رات کو مسودہ ٹائپ کراتے ہیں اور صبح کتاب چھاپ دیتے ہیں۔ بڑی سے بڑی ضخیم کتاب ہفتہ بھر میں چھپ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہینہ بھر سے سڑک کے کنارے مضامین نو کا انبار لگا ہوا ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

میں نئی کتابوں کی تلاش میں پارک شہنشاہی کے فٹ پاتھ پر چل رہا ہوں۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ البرز برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ ہوا سرد ہے۔ سڑک کے دونوں جانب نالے میں پہاڑی چشمہ کا یخ پانی گول سڈول کا ہی رنگ پتھروں سے ٹکراتا اور اعصاب کو سکون بخشنے والے دھیمے سروں میں گنگناتا شیمران سے جنوب شہر کی طرف رواں دواں ہے۔ لوگ باغ کی سیر کے لئے جمع ہیں۔ جو بچے پارک میں ہیں وہ سکیٹ بورڈ پر پھسلنا سیکھ رہے ہیں۔ جن نوجوانوں کو یہ فن آتا ہے وہ کرتب دکھلا رہے ہیں۔ جو بچے سڑک کے اس پار دکانوں کی جانب ہیں وہ کون آئس کریم کی مشینوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے تاک جھانک میں مصروف ہیں۔ سڑک کی دونوں جانب فٹ پاتھ پر رسالوں اور کتابوں کے بیس پچیس ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ جو بھی ان کے پاس سے گزرتا ہے وہ رکتا ضرور ہے۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر کتابیں چھاپنے کی آزادی نے اسے کیا کچھ دیا ہے۔ عنوانات دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

لوگ نئی کتابوں کے ندیدے ہیں۔ نئے عنوانات کے بھوکے ہیں۔ نئی کتاب کل تک شجر ممنوعہ تھی۔ آج ہر شخص اس کا پھل چکھنے میں لگا ہوا ہے۔ راز پہ راز افشا ہو رہے ہیں۔ ستر پہ ستر کھلتا جا رہا ہے۔ کیسے کیسے لوگوں کی رسوائی ہو رہی۔ کیسا کیسا شخص تہمت کی زد

میں آگیا ہے۔ دو خریدار اس وقت ایک ایسی ہی کتاب میں دلچسپی رہے ہیں جس میں سکینڈل چھپے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کتاب کا شاید ایک ہی نسخہ ہے۔ وہ لکھنوی انداز میں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پہلے آپ، پہلے آپ۔ سیلزمین نے اپنی وین میں رکھے ہوئے گتہ کے ڈبے سے اس کتاب کے دس نسخے نکال کر فٹ پاتھ پر رکھ دیئے۔ دونوں خریدار خوش ہو گئے۔ مارے خوشی کے انہوں نے دو دو نسخے خرید لئے۔ کسی بھی کتاب کے نسخوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک دن اگر سارے نسخے فروخت ہو جائیں تو راتوں رات نیا ایڈیشن چھپ جاتا ہے۔ وہ دن گئے جب لوگ کسی مخطوطہ کی نقل کا انتظار کرتے کرتے یا کسی کتاب کے اگلے ایڈیشن کے چھپنے سے پہلے اگلے جہان پہنچ جایا کرتے تھے۔ وہ دن بھی گئے۔ جب کتاب خریدنے پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔

مجھے رینے لی ساج (Rene Lesage) کی یاد آئی۔ 1707ء میں اس کا ایک ناول پیرس میں شائع ہوا جس میں اس دور کے سکینڈل صاف صاف مگر کہانی کی صورت میں اس طرح بیان کئے گئے تھے کہ اصل کردار کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ایک بھتنے کا کردار تخلیق کیا جس کے پاس جادو کی چھڑی تھی۔ وہ پیرس میں ایک بلندی پر بیٹھ کر جس محل یا حویلی کی خوابگاہ کی طرف چھڑی سے اشارہ کرتا اس کی چھت سرپوش کی طرح علیحدہ ہو جاتی۔ شاہزادے، جاگیردار، امیرزادے، بگڑے رئیس، وزیر اور سفیر خلوت میں جن سیاہ کاریوں میں مصروف ہوتے یہ شیطان کا بچہ اور اس کے دوست مزے سے اس کیفیت کا نظارہ کرتے۔ پیرس کے عشرت کدوں میں اس کتاب نے ہلچل مچا دی۔ وہ جن کی ساری عیاشی دوسروں کی رومانی داستانیں پڑھنے پر موقوف ہے دھڑا دھڑ یہ کتاب خریدنے لگے۔ خریداروں میں وہ اعلیٰ طبقہ بھی ان سے پیچھے نہ تھا جس طبقہ سے مصنف نے اپنے کردار ادھار لئے تھے۔ کتاب کے یہ خریدار دیکھنا چاہتے تھے کہ خیر سے ان کے علاوہ اور کس کس کا ذکر آیا ہے۔ کون کون ملوث ہے اور کس قدر۔ مشہور آدمیوں میں سے کوئی بچا ہے یا نہیں۔ ملکہ زیادہ شوقین ہے یا بادشاہ۔ کس کس نے کس کس کو رکھا ہوا ہے۔ کون رکھنی ہے اور کون اس کار کھنہار۔ اس دلچسپ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا آخری نسخہ خریدنے کے لئے دربار شاہی کے دو معزز جاگیردار بار بن کتب فروش کی دکان پر پہنچے۔ آخری جلد کا حصول عزت کا معاملہ بن گیا۔ ذرا سی دیر میں

دونوں نے تلوار کھینچ لی۔

فٹ پاتھ پر زیادہ تر کتابیں سرخ سویرے کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد ایران کی سیاست غالباً سب سے مقبول موضوع ہے۔ بہت سی کتابیں ہلکے پھلکے موضوعات پر ہیں۔ طنز و مزاح اور کارٹون کی کتابیں کم اور رسالے زیادہ ہیں۔ مذہب کے موضوع پر پرانی کتابیں موجود ہیں۔ کوئی نئی کتاب ابھی بازار نہیں آئی۔ مذہب پر نئی کتاب لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ میں ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہوں۔ یہ کتاب فراموش خانہ کے بارے میں ہے۔ وہی فری میسن لاج جسے ہم جادو گھر کہتے ہیں۔ لکھنے والے نے فراماسیون کو ایران کی بہت سی خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

مجھے مصروف اور تنہا دیکھ کر نوجوان جزوقتی کتب فروش میرے پاس آیا۔ پوچھا، غیر ملکی ہو۔ سفارت [illegible] رہو۔ پھر آہستہ سے کہا۔ کیا تم آیت اللہ خمینی کے سیاسی بیانات کا مجموعہ خریدنا چاہتے ہو۔ بس ایک کاپی بچی ہے۔ لیکن کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم نے کہاں سے خریدی ہے۔ میں یہ پمفلٹ نما کتاب خرید لیتا ہوں۔ قیمت زیادہ ہے مگر مجھے کم لگ رہی ہے۔ میری یافت امریکی ڈالر میں ہے۔ مہنگائی جس قدر ایرانی ریال میں بڑھتی ہے اسی قدر ڈالر کی شرح مبادلہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ میرے لئے مہنگائی صرف ایک حسابی احساس ہے۔ میں آشوب کے عالم اور اقتصاد کے بحران کے باوجود مہنگائی کے دائرہ اثر سے باہر ہوں۔ کتب فروش کو بھی اس کا کچھ احساس ضرور ہے۔ وہ میرے کان کے پاس آکر کہتا ہے۔ اگر آپ آیت اللہ خمینی کے صوتی کیسٹ میں دلچسپی رکھتے ہوں تو کل اسی وقت یہاں آجائیں۔ میں آپ کو یہ کیسٹ بڑی مناسب قیمت پر دوں گا۔ یاد رہے کہ کل میری دکان اسی جگہ مگر سڑک کے دوسرے کنارے پر ملے گی۔

نئی کتاب پڑھنے کا شوق اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ میں باغ کی سیر کو مختصر کرتا ہوں۔ وقت سے پہلے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ اہل خانہ وی سی آر کے گرد جمع ہیں۔ کوئی میری طرف دھیان نہیں دیتا۔ سسپنس والی فلم ہے۔ Papillion ہے یا Great Escape - قیدی بھاگنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ دھر پکڑ ہو رہی ہے۔ مار پیٹ ہو رہی۔ تماشا دیکھنے والوں کے سامنے میز پر دو تھال رکھے ہوئے ہیں۔ ایک میں پستہ ہے دوسرے میں چھلکے۔ میں اس صورت حال کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ مطالعہ کے کمرے میں اطمینان

سے بیٹھ کر اس چھوٹی سے کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جس کی اشاعت غیر قانونی اور تقسیم خفیہ ہے۔ حسن عمید کی فرہنگ فارسی کی دونوں جلدیں سامنے میز پر دھری ہیں۔ کوئی لفظ یا ترکیب مشکل ہو تو لغت سے رجوع کرتا ہوں۔

یہ پہلا بیان جمعہ سیاہ کے بارے میں جاری ہوا تھا۔ وہی جمعہ خونیں جس دن صبح سویرے ژالہ چوک میں قتل عام ہوا تھا۔ اس کے ایک دو جملے کچھ اس طرح ہیں۔ "ایران کا چہرہ آج گلاب کی طرح سرخ ہے۔ جو کوئی چاہے وہ ملک کے طول و عرض میں ولولہ اور شجاعت کا نظارہ کر سکتا ہے۔ ہاں یہی امیرالمومنین علی (ع) اور امام شہداامام حسن (ع) کا راستہ ہے۔ اے کاش، اس وقت خمینی آپ لوگوں کے ہمراہ ہوتا اور آپ لوگوں کے ساتھ (میدان ژالہ کے قتل عام میں) مارا جاتا۔ اے اہل، ایران فتح آپ کا مقدر بن چکی ہے۔ زور یا بدیر"۔ دوسرا بیان ایک ہفتہ بعد کا ہے۔ آغاز کچھ اس طرح ہے۔ "شہادت میں سبقت لے جانے والوں کے قتل عام کو آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہے۔ یہ بھی کیا اندوہناک ہفتہ تھا۔ جلاد نے ملت ایران کو فل بوٹ کے نیچے کچل ڈالا۔ ٹینک اور توپ کے گولوں سے بھون ڈالا۔ مشین گن کی باڑ پر رکھا ــــــ شاہ نے نیک اور بہادر نوجوانوں کے سروں کی فصل کاٹ لی ہے۔ ــــــ ملک کے گورستان فرزندان اسلام اور قرآن کی قبروں سے پر ہو گئے ہیں"۔ یہ نہ لفظی ترجمہ ہے اور نہ آزاد۔ بس اس بیان کے لب و لہجہ کو اردو میں منتقل کرنے کی ایک کوشش۔ ان بیانات میں ایک آدھ مقام ایسا بھی آیا کہ میں ٹھٹکا، جھجکا اور پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔

میں مختلف بیانات کے چیدہ چیدہ جملوں پر سرخ پنسل سے نشان لگاتا ہوں۔ اور ان پر غور کرتا ہوں۔ مطلب کیا ہے۔ مفہوم کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ بین السطور کیا کچھ ہے۔ موت کا ماتم نہ کرو، ابھی تو ہمارے مرنے والوں کی تعداد جنگ صفّین میں مرنے والوں سے بھی کم ہے ...... خدا نے نصرت کی نوید دی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے ...... اسلام ہماری راہ دیکھ رہا ہے ...... میں دور افتادہ سہی مگر میری آنکھیں (تمہارے کارناموں سے) روشن اور دل امت اسلامی کے لئے تڑپ رہا ہے ...... ایران ایک وسیع قبرستان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہڑتال ہی ہڑتال ہے۔ اور شاہ جس کا یہ آخری وقت ہے وہ جاتے جاتے بے کس اور کمزور لوگوں سے بدلہ چکانا چاہتا ہے ......

بادشاہ اس وقت ایک زخمی سانپ کی طرح ہے...... شاہ کو رخصت کرنے اور رژیم کو بچانے کی باتیں ایسی ہیں جیسے سانپ کو مارنا اور اس کے بچے کی پرورش کرنا...... ہم نے جس دلیری سے مقابلہ کیا ہے اور جس طرح جانوں کے نذرانے دیئے ہیں اس نے ہمارا نام تاریخ میں اور مجاہدین اسلام کی صف اول میں رقم کر دیا ہے...... ہمارا خون شہداء کربلا سے زیادہ رنگدار تو نہیں ہے...... ملت موت و حیات کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ ہمیشہ کے لئے آزادی یا ہمیشہ کے لئے غلامی...... آپ کا یہ احتجاج خدا کے واسطے اور امت اسلامی کی آزادی کے لئے ہے۔ اس مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانا بہت بڑی عبادت ہے...... میں اللہ تعالیٰ سے اسلام کی نصرت اور مسلمانوں کی رہائی کی دعا کرتا ہوں۔

میں نے کتاب میز پر رکھ دی۔ بوجھل قدموں سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔ فلم کا آخری منظر دکھایا جارہا ہے۔ ساری سختیاں برداشت کرنے کے بعد قیدی بالاخر آزاد ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان بے قید چہروں کو تو دیکھے۔ خود مختاری کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔

(2)

جن ایرانی باشندوں سے ہمارا روزمرہ کا واسطہ ہے وہ بھی اس چار ماہ کے عرصہ میں ایک حالت پر قائم نہیں رہے۔ ان کے طور طریق میں کم از کم تین بار تبدیلی آئی ہے۔ ایران کے داخلی حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو یہ لوگ ان جان بن گئے۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ اگر دوسروں کے سامنے اخبار اٹھائیں گے تو پہلا صفحہ فوراً الٹ دیں گے۔ شہنشاہ کی بات ہو رہی ہو تو یکدم سنجیدہ صورت بن جائیں گے۔ صورت حال کی بات شروع کریں تو انہیں اچانک کوئی ضروری کام یاد آجائے گا اور یہ وہاں سے کھسک جائیں گے۔ لیکن حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اب یہ جائیں بھی تو کہاں جائیں۔ کوئی جائے فرار باقی نہ رہی۔

دوسرا دور شروع ہو گیا۔ بھری محفل سے اٹھ کر جانے کا تکلف جاتا رہا۔ وہ سارے ضروری کام جن کا بہانہ بنا کر یہ اٹھ جاتے تھے انہیں بھول گئے۔ یاد رہا تو صرف ملک کا اور

اپنا مستقبل۔ اب وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے مگر خاموش۔ اس دیوار کی طرح جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم گوش دارد۔ دوسروں کا تبصرہ سنتے مگر چہرہ سپاٹ ہوتا۔ پتہ ہی نہ چلتا کہ کونسی بات کی تائید کرتے ہیں کونسی غلط سمجھتے ہیں اور کونسی انہیں ناگوار گزری ہے۔ اگر کوئی براہ راست سوال داغ دیا جائے یہ ہوں ہاں سے آگے نہیں بڑھتے۔ اصرار کرو۔ جواب ملے گا کہ ان حالات کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔

آج کل یہ احباب تیسرے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ کھل کر بات کرتے ہیں۔ دفتر کے جس کمرے میں بات ہو رہی ہو یہ از خود وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ بحث میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ شہنشاہ کی خامیوں اور کوتاہیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اس کے حواریوں کی چاپلوسی اور مکاری کے قصے سناتے ہیں۔ فدائین اور مجاہدین کے فرق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اہل جبہ و دستار کے بارے میں ان کی حتمی رائے یہ ہے کہ شورش میں تجربہ کار اور کامیاب، سیاست میں خام اور ناکام۔

ایک تیس پینتیس سالہ ایرانی بڑی حیرت کے ساتھ اپنا تجربہ بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی کوئی جلوس نہیں دیکھا تھا۔ اندازہ ہی نہ تھا کہ جلوس کیا ہوتا ہے اور کیسے نکالا جاتا ہے۔ اب پتہ چلا کہ اگر کسی مقصد کے لئے اوروں کو ساتھ لے کر سڑک پر نکل آئیں تو اسے جلوس کہتے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کا یوں اکٹھے ہونا بڑا اچھا لگتا ہے۔ آج کل میری یہ حالت ہے کہ جہاں کسی جلوس کو دیکھتا ہوں یہ پوچھے بغیر کہ کیوں نکلا ہے جھٹ اس میں شامل ہو جاتا ہوں۔ اگر شمولیت کی فرصت نہ ہو تو سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہجوم کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہو لیتا ہوں۔ جب تک لوگ نظروں کے سامنے رہتے ہیں میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔ فرد کو بات بات پر ڈر لگتا ہے مگر جلوس اور ہجوم ہمیشہ نڈر ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ یک ارادہ اور یک جا ہو جائیں تو خوف ان کے نزدیک نہیں آتا۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس، گولی۔ جوش اور ولولہ کے سامنے سب بے اثر اور بے معنی۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آئی ہے کہ ایران میں جلوس نکالنے پر سالہا سال سے کیوں پابندی لگی ہوئی تھی اور شہنشاہ کو ہجوم سے کیوں خوف آتا ہے۔

میں اس ایرانی دوست کی بات پر غور کرتا ہوں۔ وہ ابھی تک اپنی صرف ایک

صورت اور حیثیت سے واقف تھا۔ شخصی اور ذاتی، کمزور اور تنہا۔ شاہ کے خلاف احتجاج کی وجہ سے اس نے اپنی نئی صورت اور دوسری شخصیت دریافت کی ہے۔ وہ جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے، کندھے سے کندھا ملانے اور مل کر نعرہ لگانے سے بنتی ہے۔ اس دریافت کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ آج کل ایران میں یہ نشہ عام ہے۔ ہر نشہ کی طرح اس میں بھی ایک بڑی خرابی ہے۔ اگر کسی کو ایک بار جلسہ جلوس کی لت پڑ جائے تو پھر ساری عمر نہیں چھٹتی۔ مجھے لاہور کے بہت سے جلوس اور کئی ہنگامہ پسند کارکن یاد آرہے ہیں۔

ایک جانی پہچانی صورت نظروں میں پھرنے لگی۔ رنگ روپ کشمیری۔ ہٹ وہی جو ایک بٹ میں ہونی چاہیئے۔ خاکسار مگر وہ انکساری والا نہیں بلکہ بیلچہ بردار، غصیلا اور جانباز۔ ایک زمانہ میں مال روڈ پر جو احتجاجی جلوس بھی نکلے یہ من چلا سرکش اس کی پہلی صف میں پایا جاتا۔ گرجتا برستا۔ گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ مارنے مرنے کے لئے تیار۔ سرخ و سپید چہرہ غصہ سے لال بھبوکا ہو جاتا۔ انتظامیہ سے الجھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ جب بات بڑھ جاتی تو وہ سینہ پر ہاتھ مارتا۔ قمیص کے بٹن کھولتا۔ دامن چاک کر دیتا۔ اور کہتا، لو گولی مارو۔ ہمت ہے تو چلاؤ بندوق۔ سالہا سال تک یہ بے ٹکٹ ناٹک مال روڈ کے بیچوں بیچ ہر احتجاجی جلوس میں کھیلا گیا مگر قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے ___ پولیس، رینجرز، بارڈر پولیس، کانسٹبلری، فیڈرل سیکورٹی فورس ___ نے ان کی فرمائش پر کان نہ دھرا۔ یہاں تک کہ خم ٹھونکنے والا بوڑھا ہو گیا۔ مٹھی بھر سیاہ بال جو اس کے سینہ پر تھے وہ آدھے جھڑ گئے اور باقی سفید ہو گئے۔ اب وہ کس بل بوتے پر قمیص کے بٹن کھولے اور گریبان چاک کرے۔

تہران میں قانون نافذ کرنے اور امن بحال کرنے والے ادارے ___ ژندار مری، کلانتری، ساواک، فوج، جادواں ___ لوگوں کی خواہشات کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ اگر جلوس میں لوگوں نے شہادت کے بارے میں کتبے اٹھائے ہوئے ہوں تو یہ ان کو مقام شہادت پر فائز کرنے کے لئے ہر امکانی کوشش کریں گے۔ نوجوانوں کا کوئی دستہ اگر کفن پوش نظر آئے تو یہ ادارے ضرور گولی چلائیں گے۔ ادھر بہشت زہرا کا قبرستان وسیع تر اور آباد تر ہوتا جا رہا ہے۔ ادھر جلوس طویل تر اور انبوہ گنجان تر ہوتا جا رہا ہے۔ تاریخ لہولہان ہو گئی ہے۔

تہران کا بادشاہ ہٹاؤ جلوس مال روڈ لاہور والے حکومت گراؤ جلوس سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نظم و ضبط بہت زیادہ ہے۔ جمگھٹا ہے مگر ایک نظر آنے والی ترتیب کے ساتھ۔ ہجوم ہے مگر ایک نظر نہ آنے والی قطار بندی کے ساتھ۔ گاہے جلوس ٹکریوں میں بٹا ہوتا ہے اور گاہے ایک سرے سے دو چار میل کے فاصلہ پر دوسرے سرے تک یک جان و یک قالب۔ سڑک ہو، چوک ہو کہ کھلا میدان، یہ جلوس ہمیشہ حصار باندھ کر اس کے اندر رہتا ہے۔ سڑک دو رویہ ہو تو یہ ایک سڑک ٹریفک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ لوگ کسی چوک پر ٹریفک کی بتی نہیں توڑتے۔ کہیں اومنی بس نہیں جلاتے۔ کہیں ہلڑ بازی نہیں کرتے۔ ہمارا جلوس سیلاب کی طرح ہوتا ہے۔ کناروں سے باہر نکل جاتا ہے۔ تباہی مچاتا ہے۔ کوئی عورت ایسے جلوس میں شامل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور یہاں ہر روز ہزاروں عورتیں جلوس میں شامل ہوتی ہیں۔ عورتوں والے حصہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ سیاہ چادروں میں لپٹے ہوئے دوہرے بدن کچھ اور زیادہ بھاری بھرکم اور باوقار نظر آتے ہیں۔ غنڈہ گردی کرنے اور آوازے کسنے والے نہ جانے کہاں گم ہو جاتے ہیں۔ انہیں ایرانی عورتوں کے دستہ کے نزدیک کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ادھر ہمارے گھر کی حالت یہ ہے کہ چودہ اگست کو جو گھرانے برقی آرائش دیکھنے کے لئے باہر نکلتے ہیں انہیں معاشرے کے تاریک ترین پہلو کا نظارہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

جہاں قانون شکنی کو اہم شخصیت ہونے کی دلیل سمجھا جائے، ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کو آزادی قرار دیا جائے، آوارہ گردی تفریح اور غنڈہ گردی پیشہ بن جائے وہاں لوگوں کو اس بات کا یقین کیسے آئے گا کہ تہران میں انقلاب کی افراتفری اور نفسانفسی کے دنوں میں ایک بار چار پانچ لاکھ افراد کے جلوس کو نکلے ہوئے جب بہت دیر ہو گئی تو راستہ میں جہاں کہیں پبلک ٹیلیفون بوتھ بنے ہوئے تھے وہاں کچھ رضا کار ریز گاری لے کر کھڑے ہو گئے تاکہ لوگ اپنے گھر والوں کو فون پر خیریت کی اطلاع اور دیر سے واپس آنے کی خبر دے سکیں۔

تہران میں جلوس اب ہر روز نکلتے ہیں۔ ہر محلّہ سے نکلتے ہیں۔ صبح سے شام تک نکلتے ہیں۔ جلوس میں ہر شے کی بہتات ہوتی ہے۔ شامل ہونے والوں کی، جان دینے والوں کی، بہنے والے لہو کی۔ البتہ نعروں کے سلسلہ میں یہ جلوس بڑی کفایت اور کنجوسی سے کام

لیتے ہیں۔ پہلے دو ماہ تک صرف ایک نعرہ سے کام چلایا۔ اگلے دو ماہ کے لئے اس میں دوسرے نعرے کا اضافہ کر لیا۔ اب احتجاج مسلسل کو پانچواں مہینہ چڑھا ہے تو کہیں جا کر تیسرے نعرے کا اضافہ کیا ہے۔ مرگ بر شاہ سے چلے اور درود بر خمینی سے ہوتے ہوئے مرگ بر امریکہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان تین عدد نعروں کے ساتھ انقلاب نعروں کے سلسلہ میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ یہ کسی اور نعرے اور سہارے کے بغیر منزل تک پہنچنے کی قوت رفتار حاصل کر چکا ہے۔ اس قوت کا اندازہ مجھے اس دن ہوا جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی کہ آیت اللہ خمینی کی تصویر چاند میں نظر آتی ہے۔ رات کو لوگ چھتوں پر چڑھ کر چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ دو چار لوگ ہمارے گھر کی چھت پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اس کام میں شریک کرنا چاہا۔ میں نے کہا۔ اس طرح کا ایک تجربہ مجھے دس بارہ سال کی عمر میں ہو چکا ہے۔ میں اب ایسے کسی اور تجربے کی تاب نہیں لا سکتا۔ آپ اپنا شوق پورا کریں اور خوش رہیں مجھے یونہی یادوں میں گم رہنے دیں۔

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں علی گڑھ سے امرتسر آیا ہوا تھا۔ دو تین ہم عمر کزن ہمراہ تھے۔ رام باغ گیٹ کے باہر ایک انگوٹھیاں اور نگینہ بیچنے والا پتھروں کے خواص بیان کر رہا تھا۔ غربت، بیماری، ناچاقی، بے روزگاری، معطلی، تنزلی، چوری، گرفتاری، گمشدگی، بے اولادی، سایہ، دورہ، بواسیر۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا حل کسی نہ کسی پتھر میں پوشیدہ نہ ہو۔ ایک پتھر ایسا بھی تھا جس کی انگوٹھی پہننے والے کے تکیہ کے نیچے سے ہر روز نئے نوٹ نکلتے ہیں۔ اس شخص کے پاس خزانہ کی ساری کنجیاں تھیں، کامیاب ہونے کے لئے ہر طرح کا پتھر تھا مگر پھر بھی وہ سڑک کے کنارے ٹاٹ بچھائے خاک پھانک رہا تھا۔ اس نے ایک بھورے داغدار پتھر کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ اس میں حضرت سلیمانؑ کی تصویر نظر آتی ہے۔ وہ دربار سجاتے ہیں۔ جن کو حکم دیتے ہیں۔ وہ ملکہ سبا کا تخت اٹھا کر لے آتا ہے۔ اس انگوٹھی کے پہننے والے کے سارے کام خود بخود ہو جاتے ہیں۔ طالب علم ہو تو علم کی ملکہ اس کے تابع ہو جاتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ پڑھائی کی مشقت کو آسان بنانے کی خاطر سارے کزن مٹھی کی دوربین بنا کر ایک سرے پر انگوٹھی رکھ کر اور دوسرے سے آنکھ لگا کر معجزہ دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

پتھر والا کہتا۔ وہ جو سایہ سا نظر آ رہا ہے وہ حضرت سلیمانؑ ہیں۔ دیکھو اب وہ سایہ چل رہا ہے۔ سامنے سے جن آ رہا ہے۔ وہ سجدہ میں گر گیا۔ کیوں جی، ٹھیک ہے نا۔ مریل سی آواز میں سب نے کہا ٹھیک ہے اور آنکھیں ملتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ میری باری آئی۔ انگوٹھی والا کہتا رہا کہ اب یہ ہو رہا ہے اور اب وہ ہو رہا ہے مگر میں نے بڑی صاف آواز میں اور پنجابی کے بجائے اردو میں جواب دیا۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ خاک بھی نہیں۔ بس پتھر ہے اور وہی اس کا داغ۔ اس نے سختی سے کہا۔ پھر دیکھو۔ اب کی بار غور سے دیکھو۔ میں نے دوسری بار ہی نہیں بلکہ تیسری اور آخری بار بھی ہمت کر کے وہی کہہ دیا جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ شخص ناراض ہو گیا۔ اس موقع کے لئے اس نے جو بقراطی دلائل اور بھاری بھر کم الفاظ چھانٹ کر علیحدہ رکھے ہوئے تھے انہیں ان پانچ چھ افراد میں خزانے کی طرح لٹا دیا جو اس وقت تک وہاں جمع ہو چکے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ بعض اشخاص کی آنکھوں کے آگے پردہ ہوتا ہے اور بعض اشخاص سے حضرت سلیمانؑ خود پردہ کر لیتے ہیں۔ وہ بے ہدایت اور بد عقیدہ لوگوں کے سامنے نہیں آتے۔

اس واقعہ کو ایک مدت گزر گئی مگر اس کی کسک دل میں باقی رہی۔ میں نے مشاہدہ کیا، پڑھا، پوچھا، غور کیا۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو لوگ مذہب کو مصلحت کی انگشتری میں نگینہ کی طرح سجا لیتے ہیں وہ ہدایت اور عقیدہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے بے علم اور سادہ دل لوگ بھی راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ایسی نظر بندی ہوتی ہے کہ جو نہیں ہے وہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اس مقام پر مذہب اور تجارت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ عبادت اور تماشا ایک ہو جاتے ہیں۔ توہمات، بدعات اور خرافات کی ہو حق ہوتی ہے۔ ایک دن یہ دونوں گروہ آپس میں جھگڑیں گے۔ ایک دوسرے پر الزام رکھیں گے۔ اس دن انہیں یاد دلایا جائے گا کہ ایک ہادیؐ آیا تھا۔ ایک کتاب لایا تھا۔ ہدایت کی راہ اور عقیدہ کی درستی اسے نصیب ہوئی جس نے صرف ان کی پیروی کی تھی۔ اے گرفتارِ افسانہ و افسوں، اے پرستارِ ہیچ و زبوں، کیا تم نے کتاب اور صاحبِ کتاب کا حق ادا کیا تھا۔ اس خیال سے دل کو قرار آ گیا۔ کسک کی جگہ سکون نے لے لی۔ میرے اور پتھر والوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔

دوسرے دن مسز امینی نے بتایا کہ اس کی خالہ نے چاند میں بڑی شفاف تصویر دیکھی

تھی۔ دیکھی تو خود اس نے بھی تھی مگر وہ کوئی ایسی صاف نہ تھی۔ مسز اسفرجانی نے کہا۔ سر، آج کل قرآن کے اوراق میں سے بال نکل رہے ہیں۔ کئی گھرانوں سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے۔ میرے یہاں بھی یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ آپ بھی گھر جا کر اپنے نسخہ کو دیکھیں۔ سر، آج کل کتنے عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مس جہانگیری نے کہا۔ کوہ البرز کی کسی نہ کسی چوٹی پر ہر روز صبح سویرے تھوڑی سی دیر کے لئے برف سے بنی ہوئی آیت اللہ کی تصویر نظر آتی ہے۔

آج کل واقعی عجیب و غریب باتیں ہو رہی ہیں۔ تصویروں کا زمانہ ہے۔ کچھ بنائی اور لگائی جا رہی ہے، کچھ بگاڑی اور اتاری جا رہی ہیں۔ آر سی ڈی کے صدر دفتر کی چوتھی منزل پر واقع میرے کمرے کی تین دیواروں پر تین ممبر ممالک کے سربراہان کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ چوتھی دیوار پوری کی پوری شیشہ کی ہے۔ اس کے دوسری جانب ایران کی وزارت زراعت کی فلک بلند عمارت واقع ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوا ہے کہ انہماک سے کام کرتے ہوئے جب میں نے بے ارادہ لمحہ بھر کے لئے سر اٹھایا تو یوں لگا جیسے سامنے والی دیوار پر نئے تہران کا ایک میورل بنا ہوا ہے۔ ان دنوں بجلی بند ہونے کی وجہ سے میں آفس ٹیبل والا تاریک حصہ چھوڑ کر شیشہ کی دیوار کے پاس کانفرنس ٹیبل پہ بیٹھ کر کام کرتا ہوں۔ چونکہ سردیوں میں سورج بھی لوڈ شیڈنگ کے پروگرام پر عمل کرتا ہے اس لئے یہ جگہ بھی کوئی بہت روشن نہیں ہے۔

اس بڑی میز پر بیٹھنے سے اتنا فرق ہوا ہے کہ میورل میں جان پڑ گئی ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جلوس ایلزبتھ بلوار سے وزارت زراعت کے صدر دروازہ کی طرف جا رہا ہے۔ لوگ مشتعل نظر آئے۔ میں نے ایک کارکن کو بلایا اور موقع پر بھیجا۔ وہ خبر لایا کہ مظاہرین وزارت خانہ میں گھس کر شہنشاہ کی تصویریں اتار رہے ہیں اور اتری ہوئی تصویروں پر غصہ نکال رہے ہیں۔ میں نے کہا، یہ کھیتی باڑی کی وزارت اتنی بڑی ہے اور اس عمارت میں شاہ کی تصویریں اتنی زیادہ ہیں کہ آج ان بلوائیوں کو کہیں اور جانے کی فرصت نہیں ملے گی۔ لیکن کل آر سی ڈی سیکرٹریٹ کی باری آ سکتی ہے۔ جنیوا کنونشن، سفارتی استحقاق، بین الاقوامی قانون، یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ عملی دنیا کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ سب کا خیال ہے کہ خطرہ کے پیش نظر آر سی ڈی کے دفتر میں لگی ہوئی شہنشاہ، شاہ بانو

اور ولی عہد کی تصویریں فوراً اتار دینی چاہئیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ کیسے کیا جائے۔ بین الاقوامی روایت کے لحاظ سے حکومت وقت کی خواہ وہ کتنی ہی غیر مقبول اور کمزور کیوں نہ ہو، کوئی حق تلفی نہیں ہونی چاہئے۔ سفارتی آداب اور حیلہ کا خیال رکھتے ہوئے احکام جاری کئے گئے کہ دفتر میں لگی ہوئی وہ ساری تصویریں جن کے فریم بدرنگ ہو چکے ہیں فوراً اتار لی جائیں اور نئے روغن یا نئے فریم کے ساتھ انہیں دوبارہ آویزاں کیا جائے۔ تھوڑی سی دیر میں حکم کی تعمیل ہو گئی۔ ہر طرح کا خطرہ ٹل گیا۔ سر پر جو بوجھ تھا وہ بھی اتر گیا۔

شہنشاہ اور اس کے اہل خانہ کی ساری تصویریں تہ خانہ میں واقع گودام میں پہنچ گئیں۔ ان میں سے بیشتر تصویروں کے سنہری فریم تہ خانہ کے اندھیرے میں جگمگا رہے ہیں۔ شہنشاہ کی تصاویر کو دفتر کی دیواروں سے اتارنے کے بعد یوں لگا جیسے رضا شاہ معزول ہو چکا ہے اور کسی نے اسے تخت سے اتار کر اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔

باب ہشتم

شاہ رفت، اللہ اکبر

یکم دسمبر 1978ء

کوہ البرز کی سب سے اونچی چوٹی ساری گرمیوں ننگے سر دھوپ میں کھڑی رہی اور جونہی اکتوبر میں گلابی جاڑا شروع ہوا اس نے ایک رات خاموشی سے برف کی سفید ٹوپی اوڑھ لی۔ برف کم کم تھی۔ سستی ململ کی جھلمل کرتی ٹوپی اتنی شفاف تھی کہ آر پار سب کچھ نظر آتا۔ سردی بڑھتی چلی گئی۔ پھر راتوں کو چپکے چپکے ہوا کی نمی جم جاتی اور برف میں اضافہ ہو جاتا۔ چند ہی دنوں میں سلسلۂ کوہ کی ساری چوٹیوں کی دستار بندی ہو گئی۔ ہر جگہ برف کے تہ بہ تہ اور پیچ در پیچ عمامے نظر آنے لگے۔ آج یکم دسمبر ہے۔ پہاڑ نے برف کا ہاف کوٹ پہن رکھا ہے۔ ہر روز اس کی لمبائی میں خود بخود اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور دو تین ہفتہ کے بعد برف کا سفید چوغہ پہاڑ کے دامن تک آجائے گا۔ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں برف ہمارے گھر کے صحن تک آجائے گی۔ لان میں سفید دانہ دار برفانی چادر بچھ جائے گی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہو گا۔ لکڑی کے دو تین تختے گھر کے سوئمنگ پول میں تیرائے جائیں گے۔ سطح آب پر جمنے والی برف کا آئینہ ان سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے گا۔

جمعہ کی نماز حسب معمول پاکستانی مدرسہ کے ان کمروں میں ہوئی جن میں بچے پڑھتے ہیں۔ کمرے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بے ترتیب ہیں۔ مختلف منزلوں پر واقع ہیں۔

ڈیسک اور کرسیاں اوپر تلے کونوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ جوتے سیڑھیوں اور گیلری میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس بھول بھلیاں میں جب امام سجدہ میں جاتا ہے تو دوسرے کمروں میں لوگ رکوع میں ہوتے ہیں اور دوسری منزل والے حالت قیام میں پائے جاتے ہیں۔ تیسری منزل والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ نماز کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ مولانا روم نے کسی ایسی ہی نماز کے بارے میں کہا تھا۔ بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم۔ کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے۔ خدا کی قسم مجھے نماز میں اس بات کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ رکوع کب ختم ہوا اور امامت کس نے کی تھی۔ اللہ اللہ۔ وہ حضوری کا عالم تھا۔ یہ مجبوری کی صورت ہے۔

نماز کے بعد لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں۔ نیچے کی منزل کے کمروں اور مدرسہ کے باہر اغل بغل کی گلیوں میں ہفتہ واری کلب کھل جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی خیر خبر پوچھنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی گھریلو خبروں، پرانے رسالوں اور وی سی آر کی نئی فلموں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ بیماروں کا حال پوچھتے ہیں۔ اگلے ہفتہ کے لئے کھانوں کے دعوت نامے تقسیم کرتے ہیں۔ پاکستان سے اگر کوئی خراب سیاسی خبر آئی ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تو اس میں خیر و خوبی کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ فضل کی تلاش میں اس غیر رسمی گپ شپ میں شامل ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات دس پندرہ منٹ کے بجائے آدھ گھنٹہ تک کھنچ جاتی ہے۔ اب تک اس بے عنوان مذاکرے کے سارے موضوع خالص نجی اور پاکستانی ہوا کرتے تھے۔ میزبان ملک کا ذکر شاذ و نادر ہوتا تھا۔ لیکن حالات بدل گئے ہیں۔ آج ساری گفتگو ایران کے بارے میں ہو رہی ہے۔ کوئی اور موضوع جچتا ہی نہیں۔ ہر شخص فکرمند ہے۔ سب متفق ہیں کہ دل کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ دل سے مراد شہنشاہ ہے۔ صبح گیا یا شام گیا۔ صبح سے مراد دسمبر اور شام سے مراد جنوری ہے۔ بس سات آٹھ ہفتہ کی بات ہے۔ ممکن ہے سات آٹھ دن میں ہی فیصلہ ہو جائے۔

کل سے ماہ محرم شروع ہو رہا ہے۔ سب کی نظریں نویں اور دسویں محرم پر لگی ہوئی ہیں۔ روز تاسوعا اور روز عاشورا۔ لوگ جو مہینوں سے احتجاج کر رہے ہیں شاید ان دو دنوں میں اپنا آخری فیصلہ خود ہی صادر کر دیں۔ رہنما بھی موقع اور جذبہ کی مناسبت سے کوئی بڑا

قدم اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ وگرنہ وہ پیچھے رہ جائیں گے اور لوگ جو پہلے ہی بہت آگے نکل گئے ہیں انہیں پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔

ایک ٹولی ایران سے انخلا کے معاملہ پر بحث میں الجھی ہوئی ہے۔ دوسری ٹولیوں سے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ امکانات کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ معلومات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ افواہ کے ہر نہلے پر قیاس کا دہلا لگ رہا ہے۔ گفتگو زیادہ سنجیدہ ہو جائے تو کوئی نہ کوئی فقرہ باز اسے واپس عوامی سطح پر لے آتا ہے۔ ان لوگوں کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی مہمان کارکن خوف و خطر کے کسی اشارے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وطن میں غریبی پر غریب الوطنی کو ہر حال میں ترجیح دیتا ہے۔ ادھر پچھلے چند ہفتوں میں مغربی ممالک کے ہزاروں باشندے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے ہیں اور ادھر یہ عالم ہے کہ پچھلے ہفتے ایک دوست کو تہران ایئرپورٹ سے فون آیا۔ چاچا جی، میں انوار بول رہا ہوں۔ میں واپڈا سے لمبی چھٹی لے کر کام کرنے کے لئے ایران آگیا ہوں۔ چچا نے حیرت سے پوچھا۔ یہ آنے کا کون سا وقت ہے۔ جہاں سے لوگ فرار ہو رہے ہیں وہاں منہ اٹھائے چلے آنے کا کیا مطلب۔ جواب ملا۔ ایران آنے کے لئے اس سے بہتر موقع کب ملے گا۔ جانے والے جو نوکریاں خالی کر رہے ہیں انہیں کون پر کرے گا۔ پہلے کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اب ہماری مانگ ہے۔ اب میں نوکری کے پیچھے نہیں پھرتا بلکہ نوکری کی پیشکش کرنے والے میرے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں۔ انوار ایک گریجویٹ انجینئر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابتری اور افراتفری نے ان کے لئے رزق کا بلند دروازہ کھول دیا ہے۔ دو دن میں انہوں نے کنٹریکٹ پر دستخط کئے اور زابل چلے گئے۔ یہ گاؤں پاک افغان سرحد کے پاس واقع ہے۔ وہاں ایک ڈیم کی تعمیر عملہ کے بھاگ جانے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔

ایران میں رہنے والے پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی ایک ڈاکٹر نے بڑی ہوشمندی کے ساتھ کی۔ اس نے حالات حاضرہ پر ہونے والی بحثا بحثی کی بساط یہ کہہ کر لپیٹ دی۔ انخلا، فرار، سبکدوشی۔ یہ مسائل ہمارے نہیں دوسروں کے ہیں۔ انخلا امریکہ اور یورپ کے ان باشندوں کا مسئلہ ہے جن کے لئے ایران ایک ملک نہیں بلکہ ایک سنہری موقع ہے۔ فرار ان ایرانی باشندوں کا مسئلہ ہے جنہوں نے اپنے ہم وطنوں کو کبھی انسان نہیں سمجھا۔ رہی سبکدوشی تو یہ قبلہ رضا شاہ کی ذات شریف کا مسئلہ ہے۔ ہم نہ سفید فام ہیں، نہ

خر دماغ اور نہ صاحب تخت و تاج۔ ہمارا مسئلہ بیوی بچے ہیں۔ اگر ان کا مستقبل بیرون ملک رہ کر سنور سکتا ہے تو پھر ہمیں ہر چیز منظور ہے۔ جلوس منظور، تنور پر لگی ہوئی قطار منظور، پٹرول پمپ پر گھنٹوں کھڑے رہنا منظور، بجلی کے بغیر سرد تاریک راتوں میں ٹھٹھرنا بھی منظور۔

جتنی دیر میں نماز جمعہ اور سر راہے کھڑے پاؤں والا ہفتہ وار اجلاس ختم ہوا اتنی دیر میں سبزکوہی موٹر پر ایک مہم سر کر کے واپس آ گئے۔ وہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک نئی لالٹین خرید لائے۔ یہ چین کی بنی ہوئی ہے۔ اصل قیمت سے چار پانچ گنا زیادہ رقم ادا کرنے کے باوجود چار سو پچاس ریال میں اندھیرے کو اجالے میں بدلنے کا سودا ہمیں بڑا سستا لگا۔ بجلی ہر روز شام کو سات ساڑھے سات بجے چلی جاتی ہے۔ جانے کا وقت مقرر ہے۔ آنا اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ عام طور پر کوئی دو گھنٹہ بعد واپس آتی ہے۔ اس کے بعد اگلے چھ سات گھنٹہ میں کئی بار جاتی ہے اور کئی بار آتی ہے۔

کئی دن سے روشنی کے لئے چاند اور موم بتی کا استعمال کر رہا ہوں۔ چاندنی ہر شے پر سونے کا ورق لگا دیتی ہے۔ ہر چیز اس نیم تاریک ماحول میں پر اسرار، خوبصورت اور سنہری نظر آتی ہے۔ موم بتی سونے کے ورق کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر لہراتی ہے اور میز کے آس پاس سنہرا اجالا پھیل جاتا ہے۔ آج لالٹین جلے گی۔ کمرے میں دور دور تک اجالا ہی اجالا ہو گا لیکن اتنی دور تک بھی نہیں جہاں خواجہ حسن نظامی کی لالٹین کی روشنی پہنچ جاتی تھی۔ میری لالٹین صرف مسکرائے گی۔ خواجہ صاحب کی لالٹین گفتگو کرتی تھی۔ مسائل تصوف پر روشنی ڈالتی تھی۔ ایک رات خواجہ صاحب نے لالٹین سے پوچھا۔ "کیوں بی! تم کو رات بھر کے جلنے سے کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی"۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد لالٹین نے کہا۔ "اے نورِ خدا کے چراغ، آدم زاد۔ سن...... تیرے اندر بھی ایک روشنی ہے۔ اگر تو اس کی قدر جانے اور اس کو پہچانے تو سب لوگ تجھ کو روشنی کہنے لگیں گے۔ خاک کا پتلا کوئی نہ کہے گا"۔

حکومتِ وقت نے موقع اور وقت کی نزاکت کا احساس کئے بغیر آج سے تمام مذہبی جلوسوں پر مکمل پابندی لگا دی ہے۔ لوگ اس حکم کے باوجود جمع ہوئے۔ پابندی کا لحاظ نہ کرفیو کی پروا۔ فوج نے گولی چلائی۔ کچھ لوگ مارے گئے۔ کچھ زخمی ہوئے۔ تاریکی میں

اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اتنے گھپ اندھیرے میں میری لالٹین کہاں تک ساتھ دے گی۔

2ر دسمبر

وہ برہمن نہ جانے کہاں رہتا ہے جو ہر چڑھتے سال کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر ایک پرانی پیش گوئی دہرا دیتا کہ یہ سال اچھا ہے۔ سن ہجری کے سال نو کا آغاز گولیوں کی گونج میں ہو رہا ہے۔ چند گھنٹے ہوئے پچھلے سال کی رخصت کے موقع پر بھی گولیاں چل رہی تھیں۔ اس رفتار سے چند ہفتہ بعد آنے والے نئے عیسوی سال کا استقبال بھی گولیوں سے کیا جائے گا۔

ایزن، ترک ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہیں۔ وہ رات ڈھائی بجے انقرہ سے تہران پہنچے۔ سفارتی پاسپورٹ کے باوجود انہیں ضابطہ کی کارروائی کے لئے گھنٹہ بھر ایرپورٹ پر مارا مارا پھرنا پڑا۔ باہر نکلے تو سفارت خانہ کی سٹاف کار ندارد۔ اتنی رات گئے کوئی ڈرائیور سی ڈی نمبر پلیٹ والی گاڑی چلانے کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ناچار ٹیکسی پر سوار ہوئے۔ اس نے تین کرائے لئے۔ فاصلہ کا کرایہ، رات کا کرایہ اور خطرے کا کرایہ۔

مسز امینی کا گلا خشک ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف ہے جسے وہ مشورہ کے بہانہ مجھے منتقل کرنا چاہتی ہیں۔ سر، میں بڑی دیر سے مسٹر رضوانی اور مسٹر ایزن کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سر، حالات تشویش ناک ہو گئے ہیں۔ اس وقت شہر میں کشتار ہو رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر سے گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارا دفتر بھی گولیوں کی زد میں آجائے ہم سب کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ میں نے پوچھا، کیا آج ہنگامہ کل سے زیادہ ہے۔ جواب ملا، بہت زیادہ حالانکہ کل ظالموں نے کوئی بیس ہزار افراد مار ڈالے تھے۔ یہ مبالغہ کی وہ حد ہے جو میری برداشت سے باہر ہے۔ میں بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ حقیقت پسندی سے کام لینے کا مشورہ دیتا ہوں۔ ادھر سے اس قدر اصرار ہے جیسے ہلاک ہونے والوں کی گنتی کا کام خود مسز امینی نے کیا تھا۔ تنگ آکر میں نے کہا۔ محترمہ، اگر بیس ہزار جنازے ایک قطار میں رکھے جائیں، تو وہ قطار تہران سے کرج ہوتی ہوئی کئی کیلومیٹر آگے نکل جائے گی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی ہو گئی۔ اتنے میں پاکستانی مدرسہ سے اطلاع آئی کہ والدین فوراً آکر بچوں کو لے جائیں۔ مرزا رفیق عنایت اور ارشاد احمد اسکول کی جانب روانہ

ہوئے۔ مسز امینی نے فتحمندانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ سر، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ حالات اتنے خراب ہیں کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو دو تین ماہ کی چھٹی لے لیتی وگرنہ چار چھ ہفتہ کے لئے ترکی اور پاکستان کے دورہ پر نکل جاتی۔ خواہ مخواہ خطرہ مول لینے کا کیا فائدہ۔

میں نے دفتر میں حاضری کا جائزہ لیا۔ تین دن سے ترک خواتین نہیں آئیں۔ عاشورا سے پہلے ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایرانی خواتین کی حاضری بھی ہنگاموں کی وجہ سے بے قاعدہ ہے۔ جب وہ آتی ہیں تو پیچھے سے شوہروں یا ہونے والے شوہروں کا ٹیلیفون آجاتا ہے۔ ایک کہتا ہے دفتر چھوڑو اور فوراً گھر واپس جاؤ۔ دوسرا کہتا تمہارے گھر کے راستہ میں خطرہ زیادہ ہے۔ میرے گھر آجاؤ۔ ایک عرصہ سے وہ ثابت قدم شیدائی بھی آر سی ڈی سیکرٹریٹ میں نظر نہیں آیا جو ہفتہ دس دن میں ایک بار اس خاتون دوست سے ملنے آتا تھا جس سے وہ کسی زمانہ میں شادی کا خواہشمند تھا۔ اس بات کا احترام کرتے ہوئے کہ وہ دونوں مدتوں سے اپنے اپنے گھر آباد کر چکے ہیں وہ دفتر کے دو ایک ساتھیوں کی موجودگی میں صرف چائے کی ایک پیالی پی کر واپس چلا جاتا۔ یہ ہنگامہ بھی کتنا شدید ہے کہ اس کی وجہ سے کیسے کیسے وضعدار لوگ اپنی پرانی روش بدلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

عملہ کے دو چار افراد ملنے کے لئے آئے۔ کہتے ہیں۔ شہر کی حالت بہت خراب ہے۔ سر، ہمارے لئے کیا حکم ہے۔ ہنگامہ کی شدت کا احساس کچھ اور بڑھا۔ میں نے اپنا دو ماہ پرانا زبانی حکم ایک بار پھر دہرا دیا۔ جو شخص جب اور جس وقت اپنی یا اہل خانہ کی حفاظت کی خاطر دفتر سے جانا چاہے، وہ جا سکتا ہے۔ دفتر جو پہلے ہی نصف خالی تھا پانچ منٹ میں بالکل خالی ہو گیا۔

بجلی بند، ٹیلیفون خاموش، دفتر خالی۔ میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ میں گھر کی طرف روانہ ہوا۔ فرح آباد کے زیر تعمیر ویرانہ کے موڑ پر خوزستانی کھجور اور گور گانی سنترہ بیچنے والے کو معمول کے مطابق اپنی جگہ پر کھڑا ہوا پایا۔ بائیں طرف گھوم کر میں بچوں کے اسکول پہنچا۔ یہ ایران زمین انٹرنیشنل اسکول کسی اور ہی دنیا میں آباد ہے۔ یہاں سوئٹزرلینڈ کا بیکالاریٹ کورس پڑھایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج اسکول کو وقت سے پہلے بند کرنے کی کوئی معقول وجہ ہمیں نظر نہیں آتی۔ اسکول والوں کی نظر کمزور ہے۔ مشاغل

بے سیاق اور بے سباق۔ شیکسپیئر کے ایک ڈرامہ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ شیکسپیئر نے چھتیس طویل ڈرامے لکھے تھے اور ان میں سے کئی ایک بادشاہوں اور سلطنتوں کے زوال کے بارے میں ہیں۔ اس بات پر غور کیئے بغیر کہ آج کل تہران کی سڑکوں پر ایک بادشاہ کی معزولی کا خونی کھیل کھیلا جارہا ہے، اسکول والے رومیو جیولیٹ کی ریہرسل میں مصروف ہیں۔

گھر کے راستہ میں ایک دھماکہ سنائی دیا۔ یہ دھماکہ میدان ونک کے قریب ہوا۔ میں نے چوک کے گرد گھومتے ہوئے ساتھ والی موٹر کے ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ وہ اوپری ہنسی ہنستے ہوئے بولا، کسی موٹر کا ٹائر پھٹا ہے۔ پھر ٹریفک کا قانون توڑتے ہوئے اس نے اپنی موٹر دھماکہ کے مخالف رخ موڑی، رفتار تیز کی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

رات کا کھانا لالٹین کی روشنی، اللہ اکبر کے نعروں اور گولیوں کی گونج میں کھایا۔ لوگ چھت پر چڑھ کر اذان دیتے ہیں۔ نعرے لگاتے۔ فوج ہوا میں گولیاں چلاتی ہے۔ وزیراعظم کہتے ہیں کہ یہ سب ٹیپ ریکارڈر اور لاؤڈ سپیکر کی آوازیں ہیں۔ گولیوں کی آواز بندوق اور مشین گن کی نال سے نہیں بلکہ آلۂ صوت بند کے فیتہ سے آرہی ہے۔ اس آواز سے کیا ڈرنا۔ وزیراعظم جس آواز سے ڈرتے ہیں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ آواز پیرس کے مضافات سے آتی ہے۔ یہ ایک آیت اللہ کی آواز ہے۔

3/ دسمبر

صبح سویرے ریڈیو لگایا۔ مقامی خبروں کے مطابق کل کہیں بھی بڑے پیانہ پر گڑبڑ نہیں ہوئی۔ حالات قابو میں ہیں۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔ دوسرے ملکوں کے فارسی پروگرام کے مطابق تہران میں چھٹی اور ہڑتال رہی۔ سرکاری دفتر، نجی ادارے، مدارس اور بازار بند رہے۔ تہران خاموش و مردہ است۔ ٹیلیفون کی اطلاع ہے کہ کل رات محرم کی مجالس کرفیو کے اوقات کے بعد ختم ہوئیں اور ساری رات مظاہرین اور ان پر چلائی جانے والی گولیوں میں آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ ایک اور اطلاع کے مطابق مشہد میں دو چار روز سے خانہ جنگی کی کیفیت ہے۔ لوگوں نے کئی پولیس اسٹیشن فتح کر لئے ہیں۔ فوجی ٹھکانوں کو آگ لگا دی ہے۔ کرنل کمالی کو گھیر کر مار ڈالا ہے۔ ساواک کے تین کارکنوں کو برسرعام پھانسی دے دی ہے۔ جواب آں غزل کے طور پر فوج نے مظاہرین کو گولیوں سے بھون دیا اور

ٹینکوں سے روند ڈالا۔ سینکڑوں مر گئے اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ ملٹری گورنر کہتا ہے صرف ایک سو سولہ افراد بلکہ خراب کار مارے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کا صحیح تخمینہ لگانے کے لئے گورنر کے اقرار اور شمار کو دس سے ضرب دیں یا بیس سے۔

ڈرائیور بچوں کو اسکول لے کر گیا اور واپس لے آیا۔ نوٹس لگا ہوا ہے کہ ہم اسکول کھولنے کے حق میں ہیں مگر وزارت آموزش کے حکم کے تحت ہمیں ناچار تالا بندی کرنا پڑ رہی ہے۔ بچے ہر نصابی کتاب کے اگلے دو سبق ہوم ورک کے طور پر تیار کریں۔ نوٹس میں یہ نہیں لکھا کہ رومیو جیولیٹ ڈرامہ کا اگلا ریہرسل کب ہو گا۔

دفتر میں حاضری ایک تہائی ہے۔ میں نے مرزا رفیق عنایت، ایزن اور رضوانی سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ محرم کے مہینہ میں دفتر کے اوقات کار نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک ہوں گے۔ یہ اعلان عملہ کے لئے سرکاری اور رسمی ہے حالانکہ کام کو آٹھ گھنٹہ روزانہ سے گھٹا کر صرف ساڑھے تین گھنٹہ کر دینے کے اختیارات آر.سی.ڈی سیکرٹریٹ کے پاس نہیں بلکہ سہ ملکی وزارتی کونسل کے پاس ہیں۔ تاہم میں تجربہ سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ تجربہ کے مطابق ایمرجنسی میں اختیارات کا تعلق قواعد سے نہیں بلکہ حوصلہ سے ہوتا ہے۔ جتنا حوصلہ اتنے اختیارات۔

مجھے 6 ستمبر 1965ء کی دوپہر کو لاہور میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمہ مالیات میں ہونے والا ایک اجلاس یاد آیا۔ ہندوستان کو کسی اعلان جنگ کے بغیر پاکستان پر حملہ کئے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ صوبائی حکومت کے پاس مقامی فوج، بارڈر پولیس، سول ڈیفنس، ریڈ کراس اور کئی دوسرے اداروں سے کچھ ایسے مطالبات زر آئے جو صوبائی دائرہ کار سے باہر تھے یا ان کے لئے کابینہ اور گورنر کی منظوری درکار تھی۔ گورنر سوا دو سو میل کے فاصلہ پر نتھیا گلی میں تھے۔ وزیر خزانہ ایک سو اسی میل کے فاصلہ پر راولپنڈی میں تھے۔ دشمن واہگہ پر کوئی بارہ تیرہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس کی افواج کا سربراہ شراب سرشام لاہور کے جمخانہ کلب میں پینا چاہتا تھا۔ اندریں حالات ہمیں ضابطہ کار کے بارے میں فیصلہ کرنے میں صرف پانچ منٹ لگے۔ اصولی طور پر یہ طے ہو گیا کہ فیصلہ کن لمحہ کے وقت جو کوئی جہاں کہیں بھی ہے وہی وہاں کے لئے سب کچھ ہے۔ سپاہی اگر محاذ پر تنہا ہے تو

وہ اس لمحہ کے لئے سپہ سالار بھی ہے۔ سیکشن افسر اکیلا ہے تو وہی گورنر ہے۔ اس سے بڑا افسر ہے تو وہ بذات خود حکومت پاکستان ہے۔ اس اصول کے تحت ہم نے گورنر مغربی پاکستان کے لاہور واپس آنے تک چند گھنٹوں میں ساٹھ ملین روپیہ جنگ سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نبٹنے کے لئے خرچ کر دیا۔ رولز آف بزنس اور آئین کو بھلا دیا۔ صرف آئین جنگ پر نظر رکھی۔ طریق کار یہ تھا کہ محکمانہ تجویز کے تحریری ڈرافٹ بنانے، درست کرنے، ٹائپ کرنے، دستخط کرانے، ڈائری پر چڑھانے اور محکمہ مالیات میں بھیجنے کی بجائے متعلقہ محکمہ کے دو ذمہ دار افسر محکمہ مالیات میں آکر زبانی مدعا بیان کرتے۔ تجویز پر باہم غور ہوتا۔ دو سطری فیصلہ پر سب دستخط کرتے اور وہیں بیٹھے ہوئے جناب سبزواری اکاؤنٹنٹ جنرل مغربی پاکستان ایک چیک بنا کر محکمہ سے آنے والے افسروں کے حوالہ کر دیتے۔ پختہ مورچوں کے لئے سیمنٹ اور سریا اور عارضی مورچوں کے لئے ریت کی بوریاں اور کدال خریدنے کی زبانی تجویز موصول ہونے اور چیک جاری کرنے میں کل پندرہ منٹ لگے تھے۔ وہ جنگ بھی کیا جنگ تھی۔ ہر فرد ایک فوج تھا۔ ہر ذرۂ خاک ایک مورچہ تھا۔ بی آر بی نہر کے پانی کا ہر قطرہ ایک سمندر تھا۔

آر سی ڈی بیمہ انسٹیٹیوٹ کے غیر ملکی طلبا کا ایک وفد ملنے کے لئے آیا ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ پڑھائی بند ہے۔ جامعہ کے جلد کھلنے کا امکان بہت کم ہے۔ کھل کر بار بار بند ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ ترکی اور پاکستان واپس جانے آنے میں خاصا خرچ اٹھتا ہے۔ یہاں رہتے ہیں تو روز بروز دشواریوں اور خطرہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ گھر والے الگ پریشان ہوتے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آپ سے مشورہ لینے آئے ہیں۔ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ حالات کب تک معمول پر آئیں گے۔ ہم والدین کو کیا جواب دیں۔ میں نے کہا کہ ان سوالات کا جواب خود آپ کو دینا چاہئے۔ آپ مستقبل فروشی کا پیشہ اختیار کرنے والے ہیں۔ لوگ گھبرا کر آپ کے پاس آیا کریں گے اور آپ انہیں پریمیم کی رقم کے عوض ایک محفوظ مستقبل کی دستاویزی ضمانت فراہم کریں گے۔ موکل کے خون کا دباؤ اس خیال سے کم ہو جائے گا کہ اس کی سلامتی کا ذمہ کسی بیمہ کمپنی نے لے لیا ہے۔ خود آپ کی بیمہ کمپنی نقصان کے احتمال اور برداشت کا بیمہ کرائے گی تاکہ اس پر مالی دباؤ کم ہو۔ وہ جو لندن میں لائڈز ایسوسی ایشن والے ہیں انہوں نے بیمہ در بیمہ اور بیمہ میں جدت کے

لئے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ نت نئے امکانی حادثات کا بیمہ کرتے رہتے ہیں۔ ناچنے والے کی ٹانگ کا بیمہ، گانے والے کے گلے کا بیمہ، بجانے والے کی انگلیوں کا بیمہ۔ اولمپک کھیلوں کے وقت پر منعقد ہونے کا بیمہ، بادشاہوں کے جشن تاج پوشی کا بیمہ، نئی ایجاد کا بیمہ کہ مقررہ مدت تک کوئی اور ایجاد اس پر سبقت نہیں لے جائے گی۔ گھڑ دوڑ کے اصیل گھوڑوں کی صحت اور زندگی کا بیمہ سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ لوگ گھڑ دوڑ سے فارغ ہونے والے گھوڑوں کی نسل کشی کی صلاحیت اور سالانہ کارکردگی کا بیمہ بھی کرتے ہیں۔ ایسے مردانہ اور باکمال پیشہ کے زیر تربیت نوجوانوں کو ایران میں ہونے والے ہنگاموں سے پریشان ہونے کی بجائے ان کا پیشہ ورانہ جائزہ لینا چاہئے۔

آپ کا تعلق تیسری دنیا سے ہے۔ غور کیجئے اس پسماندہ دنیا کو جسے عربی میں عالم فقیر کہتے ہیں کیسے کیسے بیمہ کی ضرورت ہے۔ غربت میں مزید اضافہ نہ ہونے کا بیمہ، جمہوریت کے آنے اور مارشل لا کے جانے کا بیمہ، منتخب نمائندوں کی سیاسی وفاداریوں کی ادل بدل کا بیمہ، پاکستان کے وزیراعظم کی برطرفی اور جملہ سیاسی خطرات کے خلاف جامع بیمہ۔ بیرونی امداد کے جاری رہنے اور سپر پاور کے راضی رہنے کا بیمہ۔ یہ سب آپ کے لئے پیشہ ورانہ چیلنج ہے۔ عزیزان گرامی میں آپ کو بھاگنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ آپ کیوں ایک ایسے تاریخ ساز لمحہ سے محروم ہونا چاہتے ہیں جو آپ کی زندگی میں شاید دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ گھر والوں کو دلاسا دے دیجئے۔ تفصیل مت لکھئے۔ وہی گھسا پٹا مضمون کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے کافی ہوگا۔ یوں بھی پردیس میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان گھر والوں کو کب اپنے بارے میں پوری اور سچی باتیں لکھتے ہیں۔ بس ان سے خرچ کے لئے مزید رقم کا مطالبہ نہ کیجئے، وہ آپ کے بارے میں بے فکر ہو جائیں گے۔

4ر دسمبر

ہوا تیز، موسم سرد۔ ٹریفک کم، افواہیں زیادہ۔ گرم جرابوں کے باوجود پیر ٹھنڈے ہیں۔ بدن کی حرارت فکرمندی سے کم ہو گئی ہے۔ زیادہ سوچیں تو کپکپی لگ جاتی ہے۔

5ر دسمبر

ہر شخص منہ اٹھائے بنک کی طرف چلا جا رہا ہے۔ چند گھنٹہ کے بعد دیکھا کہ ہر شخص

بنک سے منہ لٹکائے واپس آرہا ہے۔ بنک کہتے ہیں کہ لین دین کے علاوہ وہ ہر طرح سے گاہک کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔ معلوم نہیں ہر طرح کی خدمت سے ان کی مراد کیا ہے۔ برادرم مشتاق یوسفی سے پوچھنا پڑے گا۔ ایسی خدمات کا تجربہ نہ سہی انہیں علم تو ضرور ہو گا۔ وہ یو بی ایل اور بی سی سی آئی دونوں نامور اداروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

6 ر دسمبر

صبح سویرے میں مہر آباد ایئرپورٹ پہنچا۔ عمارت کے باہر بے شمار موٹریں جابجا کھڑی ہیں۔ راستہ بند ہے۔ موٹر بہت دور کھڑی کرنی پڑی۔ سڑک پر سامان کا انبار لگا ہوا ہے۔ پیدل چلنے والوں کو راستہ نہیں ملتا۔ سامان پر پاؤں رکھ کر پھلانگنا چاہیں تو بچے شور مچاتے ہیں اور عورتیں کوسنے کاٹنے لگتی ہیں۔ ہجوم سے بچنے کے لئے ہوائی اڈا کی عمارت کے دروازے بند ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک دروازہ ذرا سا کھولتے ہیں۔ ریلا اندر چلا جاتا ہے، پھر بند کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ میاں اندر ہے اور بیوی باہر۔ بچے آدھے ادھر ہیں آدھے ادھر۔ پاسپورٹ اندر ہیں اور ٹکٹ باہر۔ ریال اندر ہیں اور ڈالر باہر۔ حوصلہ اور حواس، صبر اور ڈسپلن اندر پائے جاتے ہیں نہ باہر۔ سامان کے ایک دو نگ کی طرح وہ بھی گم ہو گئے ہیں۔

بیرونی دنیا سے ایران کا فضائی رابطہ منقطع ہونے والا ہے۔ خبر گرم ہے کہ کل شام کے بعد اگلے تین دن تک کوئی پرواز تہران آئے گی نہ یہاں سے جائے گی۔ اس وقت آیت اللہ کی واپسی حکومت کو منظور نہیں۔ ہزاروں افراد کل شام سے پہلے ایران چھوڑ کر کہیں باہر جانا چاہتے ہیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہوائی جہاز والے، کسٹم والے، ورود و خروج والے، عام پولیس والے، خفیہ اور خاص پولیس والے، ان دو دنوں میں لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے جتنا لوٹنا چاہتے ہیں لوٹ سکتے ہیں۔ اجازت عام ہے۔ موقع اچھا ہے۔ رکاوٹ کوئی بھی نہیں۔

میں وی آئی پی روم میں داخل ہوتا ہوں۔ ڈاکٹر احمد مینائی اور تین چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مینائی، آر سی ڈی میں میرے پیشرو، پاکستان میں ایران کے سفیر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا چارج لینے جا رہے ہیں۔ تیسری بار پرواز میں تاخیر کا اعلان ہوا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایرانی وزارت خارجہ کے ایک ڈائریکٹر جنرل کو وی آئی پی روم کی

مصنوعی گرم فضا سے نکال کر بر آمدہ کی ٹھنڈی ہوا میں لے آیا۔ کھلی فضا میں کھل کر بات ہوئی۔ ڈائریکٹر جنرل کہنے لگے۔ حالات جتنے خراب نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ فوجی حکومت بالکل ناکارہ ثابت ہوئی۔ اس کی ناکامی نے حالات کا رخ بدل دیا ہے۔ اب جو راستے کھلے رہ گئے ہیں وہ سارے انار کی طرف جاتے ہیں۔ جنرل اظہری کی فوجی حکومت کی حماقت ملاحظہ کیجئے۔ ایسے بیان دے رہی ہے جیسے ناکام سول انتظامیہ دیا کرتی ہے۔ کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس حکم کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں۔ حکومت ایک نیا بیان جاری کر دیتی ہے۔ کرفیو کے اوقات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کسی صورت برداشت نہیں کی جائے گی۔ لاکھوں افراد مل کر خلاف ورزی کرتے ہیں۔ حکومت چپ چاپ اس صورت حال کو قبول کر لیتی ہے۔ حکومت جلوس پر پابندی لگاتی ہے۔ جلوس بغیر اجازت نکلتے رہتے ہیں۔ حکومت کہتی ہے کسی کو خراب کاری کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ لوگ سینما جلا دیتے ہیں۔ حکومت آگ بجھانے کی تکلیف بھی نہیں کرتی۔ حکومت بیان دیتی ہے کہ کسی کو امن میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کے باوجود پچھلے کئی ماہ سے بدامنی کا دور دورہ ہے۔ حکومت کا سب سے مضحکہ خیز بیان یہ ہے کہ آیت اللہ خمینی واپس آنا چاہیں تو حکومت انہیں اس کی اجازت دے دی گی۔ نہ جانے ان لوگوں کو کب عقل آئے گی۔

آپ نے ٹی وی پر وزیر اعظم کی پریس کانفرنس دیکھی ہو گی۔ فرماتے ہیں کہ ایران کے عوام اپنے شہنشاہ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ تین چار ماہ سے ہزاروں لاکھوں لوگ سڑکوں پر اس محبت کا جو برملا اظہار کر رہے ہیں وہ جنرل اظہری کو نظر نہیں آتا۔ یہ اندھاپن ہے۔ اور وہ جو مرگ بر شاہ کے محبت بھرے نعرے ہیں وہ بھی وزیر اعظم اظہری کو سنائی نہیں دیتے۔ یہ بہرہ پن ہے۔ سفید جھوٹ پر اصرار کرنا، خواہ مخواہ لوگوں کو اشتعال دلانا، یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ بات وہ کرنی چاہئے جس سے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔ دلوں کے فاصلے کم ہوں۔ لوگ ملک کے مفاد میں باہم کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ ویسے یہ بات آپ سے کیا چھپانی کہ تاسوعا اور عاشورا کے سلسلہ میں پس پردہ بات چیت ہو رہی ہے۔ کشت و خون انہیں راس آئے گا نہ اُنہیں۔

7 ر دسمبر

آج پھر صبح سویرے بلکہ اندھیرے اندھیرے ایئرپورٹ کا رخ ہے۔ ایک اور سفیر کو رخصت کرنا ہے۔ یہ چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔ پچھلے دو ماہ میں بہت سے سفارتکار ایران چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ سفارت خانے عملہ کی تعداد روز بروز کم کرتے جا رہے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ یہاں سے تبدیل کیا جانے والا سفارتکار الوداعی دعوتوں اور ملاقاتوں کے بہانہ اپنے قیام کو توسیع دیا کرتا تھا۔ آج یہ صورت حال ہے کہ جو سفارتکار صبح اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ رات کے کھانے میں شامل ہو گا وہ دوپہر کو ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم سے ٹیلیفون کرتا ہے کہ تبادلہ کے احکامات ٹیلیکس پر موصول ہوئے اور محکمہ تشریفات نے فوراً ایک نشست کا انتظام کر دیا اس لئے کھانے پر حاضر نہیں ہو سکتا۔ ان سفارتکاروں کی خاطر گاہے دوسرے مسافر جہاز سے اتار دیئے جاتے ہیں۔ وہ شور مچاتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے ہیں۔ بےبس ہو کر اپنے کپڑے پھاڑنے اور بال نوچنے لگتے ہیں۔

آج ہوائی اڈے پر کل سے بھی زیادہ برا حال ہے۔ اس وقت پین ایم کا ایک جہاز کھڑا ہے۔ ساڑھے تین سو نشستیں ہیں۔ مسافروں کی تعداد چار پانچ ہزار ہے۔ دن چڑھے گا اور اس سے بھی زیادہ مسافر قسمت آزمائی کے لئے آ جائیں گے۔ دن بھر میں زیادہ سے زیادہ آٹھ دس چھوٹے بڑے جہاز یہاں سے پرواز کریں گے۔ بیشتر امیدوار مسافر یہیں ایئرپورٹ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔ سنا ہے بلیک میں سیٹ کا نذرانہ جو کل تین ہزار ڈالر تھا آج پانچ ہزار تک جا پہنچا ہے۔ فریب دہی عام ہے۔ رقم بھی ڈوب جاتی ہے اور سیٹ بھی نہیں ملتی۔

وزیر اعظم نے کابینہ کے اجلاس میں جو تقریر کی تھی اسے ٹی وی پر بار بار دکھایا جا رہا ہے۔ دلائل وہی پرانے جو مشکل میں گھری ہوئی انتظامیہ اپنے حق میں دور دور سے ڈھو کر لاتی ہے۔ کچھ سچے، کچھ سچے جھوٹے، کچھ بالکل جھوٹے۔ جنرل اظہری بڑی سادگی سے کہتے ہیں یہ سپاہی مردم کش نہیں محافظ مردماں ہیں۔ یہ نہیں بتاتے کہ مردمان آخر کون ہیں۔ وہ لاکھ لاکھ جو سڑک پر جمع ہوتے ہیں، اور اپنا حق مانگتے ہیں یا وہ ہزاروں ہزار جو ایئرپورٹ پر جمع ہیں اور اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو کر جلد از جلد اس ملک سے چلا جانا چاہتے

ہیں۔

مجھے مغربی پاکستان کے ایک گورنر یاد آئے۔ صدر ایوب کے خلاف مظاہرے زوروں پر تھے۔ انہوں نے صوبہ کے سارے کمشنز اور ڈی آئی جی پولیس جمع کیے۔ اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے، وہ سہ نکاتی فارمولہ جو میری چالیس سالہ ملازمت کا حاصل ہے اس شورش کو دبانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ میں نے یہ سیکھا تھا کہ اول، دشمن کو Locate کرو۔ دوم، اپنی قوت کو جمع کرو۔ سوم، پوری قوت سے دشمن کا صفایا کر دو۔ میں یہ ترکیب استعمال کرنا چاہتا ہوں مگر پہلا مرحلہ ہی طے نہیں ہوتا۔ یہ حریف بڑا چالاک ہے۔ ہاتھ ڈالنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ کبھی یاں جلسہ کرتا ہے کبھی واں جلوس نکالتا ہے۔ کبھی مال روڈ پر ٹائر جلاتا ہے، کبھی شاہدرہ میں اومنی بس کو آگ لگا دیتا ہے۔ ادھر لائل پور میں ہڑتال کرتا ہے، ادھر ملتان میں ریل گاڑی روک لیتا ہے۔ سکھر میں پٹڑی اکھاڑ دیتا ہے، حیدر آباد میں آگ لگا دیتا ہے۔ کراچی میں وہ روز کوئی نہ کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کرتا ہے۔ میں آج تک اس کا ٹھکانہ معلوم نہیں کر سکا۔ یہ ساری بات گورنر موسیٰ نے ایک ہی سانس میں کہہ دی۔ وہ تیز بولنے کے عادی تھے۔ جس لفظ پر زور دینا چاہتے پہلے اس کے دو ٹکڑے کر دیتے پھر تشدید کا گوند لگا کر اسے جوڑ دیتے۔ اس معاملہ میں وہ انگریزی اور اردو دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ جب وہ سانس لینے کے لئے دم بھر کو رکے تو آواز آئی۔ سر، نہ آپ نے اسے اب تک کہیں Locate کیا ہے اور نہ کر سکیں گے۔ وہ کوئی دشمن نہیں، جو کہیں چھپا ہوا ہو بلکہ اس ملک کے عوام ہیں جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ آواز قاسم رضوی کی تھی۔ تحریک پاکستان کے طالب علم لیڈر جو ان دنوں ملتان کے کمشنر ہوا کرتے تھے۔ چند سال کے بعد ان لوگوں کو حکومت ملی جو صدر ایوب کے خلاف احتجاجی تحریک چلا رہے تھے۔ اس عوامی حکومت نے آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد کو کہے سنے بغیر برطرف کر دیا۔ اس فہرست کے پہلے چار پانچ ناموں میں اس کمشنر کا نام بھی شامل تھا جس نے ان لوگوں کے لئے گورنر ہاؤس میں کلمہ حق بلند کیا تھا۔

8، دسمبر

ہفتہ بھر سے لوگ اوندھی گنتی میں لگے ہوئے ہیں۔ سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو،

ایک، ساعت صفر۔ ان گھڑیاں گننے والوں کے حساب سے فیصلہ کن معرکہ میں صرف چوبیس گھنٹہ رہ گئے ہیں۔ بس کل کا دن۔

پسپا ہونے والی حکومتیں چھٹیوں کے معاملہ میں بڑی فراخ دل اور مناہی پر عمل کرانے میں بڑی بے بس ہوتی ہیں۔ ایران کی فوجی حکومت نے بہت سی چھٹیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ تاسوعا اور عاشورا کے روز جلوس نکالنے پر جو پابندی تھی وہ بھی واپس لے لی ہے۔ کرفیو کی سختیوں میں بھی چھوٹ دے دی ہے۔

امریکہ کے صدر کارٹر نے اپنے بیان میں ایک تازہ مضمون باندھا ہے۔ اگرچہ ہماری خواہش ہوگی کہ کار منصبی کی تقسیم میں شہنشاہ کی اہمیت برقرار رہے لیکن اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ ایران کے عوام کریں گے۔ اس اعلان کا سیدھا سادا مطلب یہ کہ شہنشاہ کے دوست اور مربی اس کا ساتھ چھوڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ یہ مصرع پامال سہی مگر جب تک کوئی اس سے بہتر مصرع نہیں کہتا اس کے باموقع استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ استعمال کا یہ موقع صدر کارٹر نے فراہم کیا ہے۔ یہ وہی صدر کارٹر ہیں جو گیارہ مہینہ پہلے تہران میں ہونے والے جشن سال نو میں شریک ہوئے تھے۔ ملکہ فرح اور شاہزادی اشرف کو اپنی سپرپاور بانہوں میں لے کر ناچ فرمایا تھا۔ اور اس موقع پر شہنشاہ کا نثری قصیدہ کچھ اس انداز سے پڑھا تھا۔ ''شہنشاہ ایران کی عظیم قیادت کا کمال یہ ہے کہ دنیا کے انتہائی غیر مستحکم اور پرفتنہ وفساد علاقہ میں واقع ہونے کے باوجود ایران کا ملک سلامتی اور عافیت کے ایک جزیرے کی مانند ہے۔ اس کامیابی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ اور جناب والا بتار یہ اعتراف اور عقیدت کا خراج ہے، آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کے واسطہ اور اس عزت، تحسین اور محبت کے لئے جو آپ کی رعایا نے آپ کو دی ہے۔'' جس رعایا کی بے پایاں محبت کا ذکر سال کے آغاز میں کارٹر نے کیا تھا وہ سال کے ختم ہونے سے پہلے یک زبان ہو کر مرگ بر شاہ کے نعرے لگانے میں مصروف ہے۔ اگر حتمی فیصلہ رعایا کی عدالت نے کرنا ہے تو وہ کبھی کا ہو چکا ہے۔ اس عوامی عدالت نے شہنشاہ کے لئے معزولی اور سزائے موت تجویز کی ہے۔ شریکِ جرم ہونے کی وجہ سے کارٹر کے لئے یہ سزا ہے کہ اسے دوبارہ امریکہ کا صدر منتخب نہ کیا جائے اور واپس اس زراعتی فارم پر چلا جائے جہاں وہ مونگ پھلی کاشت کیا کرتا تھا۔

نماز جمعہ کے موقع پر سفارت پاکستان کی طرف سے فارم تقسیم ہوئے تاکہ ایمرجنسی کے وقت بندوبست میں آسانی رہے۔ کوئی شخص بھی فارم بھرنے کے لئے تیار نہیں۔ نماز کے بعد لوگ یونہی خاموش کھڑے ہیں۔ معلوم نہیں اگلے جمعہ یہاں نماز کے لئے جمع ہونا ممکن ہو گا یا نہیں۔

9ر دسمبر

سناٹا ہی سناٹا۔ وہ سناٹا جو سڑکوں کو سنسان کر دیتا ہے۔ گھروں کے دروازوں اور دریچوں پر پہرہ لگا دیتا ہے۔ دلوں میں ایسے بیٹھ جاتا ہے جیسے کوئی ان جانا خوف۔ ذہنوں پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ بے حس اور بے سوچ ہو جاتے ہیں۔

(2)

10ر دسمبر

سورج نکلا۔ حسب معمول مشرق سے اور حسب موسم ذرا دیر سے۔ اگر وہ کسی اور سمت سے نکل آتا یا مقررہ وقت سے پہلے طلوع ہو جاتا تو کسی کو تعجب نہ ہوتا۔ ایران کا ہر باشندہ آج ایک معجزہ کے رونما ہونے کا منتظر ہے۔ سورج نے معجزہ دکھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نے شہنشاہ کا لحاظ کیا ہے۔ ہم نام اور ہم مرتبہ جو ٹھہرے۔ وہ مہر فلک، یہ آریا مہر۔ بہرحال وہ کام جو سورج سے نہ ہو سکا وہ لوگوں نے کر دکھایا۔ سوائے شمال کے وہ تہران شہر کی ہر جانب سے نکل آئے۔ پرے کے پرے، غول کے غول، دل کے دل۔ نو ساڑھے نو بجے صبح کے بعد جو شخص بھی گھر سے باہر قدم رکھتا ہے وہ اس ہجوم کا حصہ بن جاتا جو پہلے ہی گلی میں جمع ہو چکا ہے۔ گلی کوچے ابل پڑے ہیں۔ جہاں گلی سڑک سے ملتی ہے وہاں ٹکڑیاں مل کر چھوٹا سا جلوس بنا لیتی ہیں۔ جہاں چھوٹی سڑک کسی بڑی سڑک میں جا ملتی ہے وہاں خود بخود ایک بڑا سا جلوس بن جاتا ہے۔ یہ چھوٹے بڑے جلوس خیابان شاہ رضا اور خیابانِ آئزن ہاور پہنچ کر سب سے بڑے جلوس میں گم ہو جاتے ہیں جو شاہ یاد کی طرف رواں ہے۔ اس وقت جلوس نکلے ہوئے کوئی تین گھنٹہ ہو گئے ہیں۔ ہجوم دیکھنے سے تعلق

رکھتا ہے۔ میلوں تک آدمی ہی آدمی ہیں۔ اردو محاورے کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر شاہ یاد پر تھالی پھینکو تو سروں پر ہوتی ہوئی آٹھ دس کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بازار بزرگ میں اس دکان پر پہنچ جائے گی جہاں سے اسے خریدا تھا۔ مقامی محاورے کے مطابق بھیڑ اتنی زیادہ ہے کہ جائے برائے سوزن انداختن نگذاشت۔ سوئی پھینکنے کی جگہ بھی باقی نہیں بچی۔

ایک دو ہیلی کاپٹر نظر آرہے ہیں۔ ان کو اوپر سے کیا نظر آرہا ہوگا۔ یہی کہ ایک ہزار پانے تہران میں اپنے پاؤں جما لئے ہیں۔ سر اس کا شاہ یاد، اوپر کا دھڑ خیابان آئزن ہاور، نیچے کا دھڑ خیابان شاہ رضا، اور دونوں جانب ہر سڑک اور ہر گلی میں اس کے پاؤں۔ ہزار پا جو ہوا۔ ایک ہیلی کاپٹر فضا میں بلندی پر اڑ رہا ہے۔ دوربین کی حد سے پرے، عام ہتھیاروں کی زد سے باہر۔ یہ اندازہ لگانا بڑا آسان ہے کہ اس میں کون سوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس بلندی سے وہ شخص صرف ہجوم کو دیکھ رہا ہے یا اس کے نعرے بھی سن رہا ہے۔

نعروں کے معاملہ میں ایران اور پاکستان میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ حمایت کے لئے ہمارے ہاں "زندہ باد" ہے اور یہاں "درود"۔ مخالفت کے لئے ہمارے ہاں "مردہ باد" ہے اور یہاں "مرگ"۔ جوش پیدا کرنے کے لئے دونوں جگہ اللہ اکبر۔ نعرہ لگانے کا طریقہ البتہ دونوں ملکوں میں مختلف ہے۔ ان کا نعرہ پھلجھڑی کی طرح ہوتا ہے اور ہمارا پٹاخہ کی طرح۔ یہ بے حد بڑا جلوس ہے اور شہنشاہ سے اس قدر کی ناراضی ہے مگر ان دونوں باتوں کا احساس نعرہ سے نہیں ہوتا۔ مرگ بر شاہ ایک بے رعب اور پھس پھسا نعرہ ہے۔ نہ رواں پڑھا جا سکے۔ نہ بے ساختہ لگایا جا سکے۔ نہ انترا اٹھایا جا سکے۔ اس میں نہ "مردہ باد" کا دبدبہ۔ نہ "لے کے رہیں گے" کی دھاک۔ نہ مطلب کیا، لاالہ الا اللہ، کی ایمان افروزی۔

انقلاب کے بنیادی نعرے وہی تین ہیں۔ مرگ بر شاہ، درود بر خمینی، مرگ بر امریکہ۔ پچھلے چند دنوں سے ان نعروں کی نئی نئی صورتیں پڑھنے اور سننے میں آرہی ہیں۔ پہلے نعرے کا ایک کورس بنالیا ہے۔ پہلے مصرع کو لوگ بدل بدل کر دہراتے ہیں کہ شاہ ایسا ہے اور ویسا ہے پھر ٹیپ کا مصرع پڑھتے ہیں۔ مرگ بر ایں شاہ مرگ بر ایں شاہ۔ ایک

جلوس میں کپڑے پر یہ شعر نما سلوگن بھی لکھا ہوا دیکھا۔ مہدی بیا، شاہ مسلمان شدہ۔ آب وضوش خون جواناں شدہ۔ مہدی منتظر اب آ بھی جایئے۔ شاہ مسلمان ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کے خون سے وضو کر رہا ہے۔ تیسرے نعرہ میں پچھلے دنوں یہ اضافہ ہوا ہے کہ جو کوئی جس کسی ملک سے ناراض ہے وہ امریکہ کے ساتھ اس کا نام بھی شامل کر لیتا ہے۔ سب سے زیادہ وظیفہ مرگ بر امریکہ کے نام کا پڑھا جا رہا ہے۔ تاہم روس، برطانیہ اور چین بھی اب اس نعرہ کی زد سے باہر نہیں رہے۔

دو نعرے نفرت کی نذر ہیں۔ ایک محبت کے لئے وقف ہے۔ نفرت شہنشاہ سے اور امریکہ سے۔ محبت آیت اللہ خمینی سے۔ نفرت ایک جگہ ٹھہری ہوئی ہے۔ محبت ہے کہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ درود بر خمینی کے بغیر کام ہوتا ہے نہ کلام۔ یہ مرکز ہے۔ دوسرے نعرے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ دوسرے نعرے جوش اور غصہ سے لگائے جاتے ہیں۔ مگر یہ نعرہ ادب اور احترام سے لگایا جاتا ہے۔ اس نعرہ کی کچھ نئی صورتیں بھی دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ نہضت ما حسینی است۔ رہبر ما خمینی است۔ جدوجہد حسینی ہے اور رہنما خمینی ہے۔ ایک نعرہ لکھنے کے کام زیادہ آتا ہے۔ صرف تین لفظ ہیں۔ خدا، قرآن، خمینی۔ وہ نعرہ جو لوگوں کے جذبات کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے زبان زد خلائق ہے بالکل سیدھا سادا ہے۔ اللہ اکبر، خمینی رہبر۔ اس نعرہ کی دلکشی میں کچھ حصہ اس کے سر اور آہنگ کا بھی ہے۔

ایک دن بڑا دلچسپ نعرہ سننے میں آیا۔ جس نے بھی سنا وہ ذرا دیر کے لئے حیران ہو گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہی اس نعرہ کا مقصد ہے۔ مرگ بر شاہ کا کورس گاتے گاتے جب بہت دیر ہو گئی تو ایک غصیلا گروہ یکایک خوشدلی سے زندہ باد شاہ کا نعرہ لگاتا ہے۔ دو تین بار زندہ باد شاہ کہنے کے بعد ایک آواز آتی ہے۔ کدام شاہ۔ کون سا بادشاہ۔ اور پھر ہجوم اپنے ہزاروں پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر جواب دیتا ہے۔ شاہ نجف خمینی۔

جلوس کے منتظمین بڑی دور اندیشی اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ چند منتخب نعرے جو لاؤڈ سپیکر پر لگائے جائیں گے۔ ان کے علاوہ ہرگز کوئی نعرہ بے اجازت نہ لگایا جائے۔ اگر کوئی ساواکی یا خلل ڈالنے والا کسی اضافی نعرہ پر اصرار کرے تو فوراً اس کی نشاندہی کی جائے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلوس میں نظم و ضبط اور زیادہ

نمایاں ہو گیا۔

جب یہ جلوس تہران یونیورسٹی پہنچا تو گویا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ جلوس وہاں رک گیا۔ لوگوں نے ان نوجوانوں کو بہت یاد کیا۔ جنہیں ساواک۔ نے بڑی اذیت دے کر اور فوج نے بڑی بے رخی اور بے رحمی سے مار ڈالا تھا۔ ۔انش جو عزیز، شہادتت...... (اے پیارے طالب علم، تیری شہادت......) اس کے ا ندجہ کچھ کہا گیا وہ بات اقبال نے ایک دل آویز شعر میں یوں ادا کی ہے ۔ سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم۔ کہ خونش بانہال ملت ماساز گار آمد۔ میں شہید کی قبر پر گل لالہ کی لہو رنگ پتیاں نچھاور کر رہا ہوں کہ شجر ملت کو اس شہید کے خون سے سینچا جانا خوب راس آیا ہے۔ یہ فارسی شعر حافظ یوسف سدیدی خطاط نے سنگ مرمر پر لکھا اور سنگ سرخ و سنگ سیاہ کے حاشیہ کے ساتھ اسے بی آر بی نہر کے کنارہ اس مقام پر نصب کیا گیا جہاں ستمبر 1965 ء میں میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر نے اپنی جان اپنے وطن پر نچھاور کی تھی۔

کئی ماہ سے ہر روز گولیاں کھانے، خون بہانے، جنازے اٹھانے اور ماتم کرنے کے بعد آج سارا شہر اور سارا دن لوگوں کی اپنی ملکیت ہے۔ اور یہ ملکیت بلاشرکت غیرے ہے۔ غیروں کی مختصر فہرست میں شہنشاہ، فوج، پولیس اور شمالی تہران کے باشندے شامل ہیں۔ کل تک ہر چیز ان کے تصرف میں تھی۔ آج ہر چیز ان کی گرفت سے نکلی جا رہی ہے۔ اختیار ہاتھ سے جانے والا ہے۔ لوگ ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ ثبوت اس کا وہ جلوس ہے جو آج نکلا ہے۔ اندازہ سے بڑا، توقع سے بڑا، سوچ سے بڑا۔ اتنا بڑا کہ جلوس والے خود حیران ہیں۔ اگرچہ آج نویں محرم ہے اور تاسوعا کی نسبت سے اس جلوس کو غیر معمولی تائید اور تقویت ملی ہے لیکن اس اجتماع پر پوری طرح سیاست کی چھاپ لگی ہے۔

جلوس کی آخری منزل شاہ یاد کا بلند دروازہ ہے، جلوس وہاں پہنچ کر ایک قرار داد منظور کرتا ہے اور منتشر ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے جلوس کو منتشر ہونے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں۔ راستہ میں کہیں کہیں وین کھڑے ہیں جو نان اور کھجور تقسیم کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے سفید بازو بند باندھے ہوئے ہیں جن پر انتظامات لکھا ہوا ہے۔ وہ ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔ ابتدائی طبّی امداد، لاؤڈ سپیکر پر گمشدگی کا اعلان، ٹیلیفون پر خیریت کی اطلاع۔ ادھر جلوس ختم ہوا اور ادھر اہل ابلاغ میں ہلچل مچ گئی۔ خبر نگار اور نامہ نگار،

شدہ نگار اور تجزیہ نگار، عکاس اور فلم بردار، نمائندے اور آزاد قلم، سب نے ہلٹن اور انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل پر ہلہ بول دیا۔ ان کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں میں ہے۔ یہ سب دن بھر سے ایک بات پر غور کر رہے ہیں۔ جلوس نکل آیا۔ بہت بڑا تھا۔ اس کا اثر کیا ہو گا۔ نتیجہ کیا نکلے گا۔ ہر ایک بڑے انہماک سے اپنے سفری ٹائپ رائٹر پر جھکا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب تار گھر میں قطار بنائے کھڑے ہوں گے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ جائزہ لینے والا پانچ چھ افراد کا ایک گروہ حکم لگاتا ہے۔ پہلوی عہد ختم، عبوری دور شروع، سیکولر سیاسی گروہ حیران اور پریشان، فوج میں بازوں پر فاختاؤں کی فتح، آیت اللہ خمینی کے سامنے باقی سارے سیاسی رہنما اور دینی پیشوا ماند۔ میں نے کہا۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آج جب فیصلہ کن لمحہ آیا تو لاکھوں افراد کا جلوس جس کے سامنے حکومت نظامی اور شہنشاہ ایران دونوں بے بس ہو گئے تھے وہ صرف ایک قرار داد منظور کر کے کیوں منتشر ہو گیا۔

ٹیلیفون بجا۔ کوئی آدھی رات کا وقت ہو گا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ جلوس کی تعداد کا کون سا اندازہ آپ کو درست لگا۔ مقامی ریڈیو کہتا ہے تین چار لاکھ افراد ہوں گے۔ غیر ملکی ریڈیو دس سے بیس لاکھ کہہ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تیس لاکھ ہوں گے۔ بڑھ کر بولی دینے والے ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک جلوس میں شامل ہونے والوں کی تعداد کسی صورت پچاس لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ میں نے کہا جلوس ہاتھی ہوتا ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر دیکھنے کے بجائے ٹٹول ٹٹول کر اس کی جسامت کا اندازہ لگانے کی ریت چل نکلی ہے۔ میں نے سیکرٹریٹ کے بند کمرے میں بھی نوکری کی ہے اور صاحب ضلع اور صاحب قسمت کی حیثیت سے کھلی فضا میں بھی کام کیا ہے۔ فیلڈ افسر کی حیثیت سے ہجوم کی تعداد کا مسئلہ اکثر کھڑا ہو جاتا۔ ہر ادارہ علیحدہ تعداد بتاتا اور مصر ہوتا کہ اس کا اندازہ دوسرے اداروں کے مقابلہ میں حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان افسروں کے لئے جن کا واسطہ براہ راست عوام سے ہوتا ہے یہ مہارت کتنی ضروری ہے کہ وہ خود کسی اجتماع میں شامل ہونے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ ماتحت ادارے ہجوم کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے اتنی محنت نہیں کرتے جتنی اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کہ حکومت کو کتنی تعداد راس آئے گی۔ حتی الامکان وہ ایسا اندازہ پیش کرنا

چاہتے ہیں جو حکومت وقت کے لئے خوشخبری کا درجہ رکھتا ہو۔ جلسہ جلوس حق میں ہو تو مبالغہ سے اس میں کثرت پیدا کر دیں گے۔ خلاف ہو تو مغالطہ سے کام لیں گے۔

میں نے فون پر سوال پوچھنے والے سے کہا، بات لمبی ہو جائے گی مگر میں اپنا ایک تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ قیام پاکستان کے پہلے دس برس اہل لاہور عید کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ مسجد پوری بھر جاتی تھی۔ لوگ باہر بھی صفیں بنا لیتے۔ مولانا غلام مرشد کی گلو گرفتہ آواز لاؤڈ سپیکر پر حضوری باغ میں گونجا کرتی تھی۔ صدر دروازہ کی چھت پر کئی غیر ملکی اس زمانہ کے بھاری بھرکم کیمرے مضبوط سہ پایہ آہنی فریم پر لگائے ہوئے تصویریں اور فلمیں کھینچا کرتے تھے۔ عید کی چھٹی کے بعد جو اردو اخبار نکلتے ان کی سرخی کچھ اس طرح ہوتی کہ لاکھوں فرزندان توحید نے بادشاہی مسجد میں نماز عید ادا کی۔ متن میں اکثر تعداد چار پانچ لاکھ لکھی ہوتی۔ ایک سال کسی خوش فہم صحافی نے سرخی میں نمازیوں کی تعداد دس لاکھ درج کر دی۔ میرا صبر کا پیمانہ جو اس سلسلہ میں پہلے ہی لبریز تھا اس روز چھلک گیا۔ خوش فہمی اور خود فریبی کی بھی آخر کوئی حد ہونی چاہیئے۔ میں فیتہ والے دوستوں کے ہمراہ بادشاہی مسجد جا پہنچا۔ کچھ ناپا، کچھ ریکارڈ چیک کیا، کچھ حساب لگایا۔ پتہ چلا کہ اگر ایک مصلا دو فٹ چوڑا اور تین فٹ لمبا ہو تو بادشاہی مسجد میں کل باون ہزار نمازی سما سکتے ہیں۔ اندازہ کو بے انداز بڑھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر نشے کی طرح فریب کا نشہ بھی مہلک ہوتا ہے۔

ٹیلیفون پر دوسری طرف سے کسی نے لمبا سانس لیا اور کہا، آپ بات کو کہاں سے کہاں لے اڑے۔ میں نے پوچھا تھا کہ تاسوعا کے جلوس میں شریک ہونے والوں کی تعداد کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ذرا تمہید طولانی ہو گئی۔ وگرنہ بات بہت مختصر ہے۔ آج لوگ معجزہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کا اتنی بڑی تعداد میں نکل آنا ہی ایک معجزہ ہے۔

11ر دسمبر

آج وہی ہوا جو کل ہوا تھا۔ راہ پیمائی، مرگ، درود، قرار داد۔ اور ان چار عناصر سے مل کر ایک اور معجزہ۔

قرار داد وہی کل والی ہے۔ اسی میں سترہ دفعات ہیں۔ دفعہ تیرہ کی رو سے فوج کو

کوچہ و بازار میں لوگوں کے مقابل لا کھڑا کرنا خیانت ہے۔ فوج اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ بیرونی دشمنوں سے دشمنی نکالنے کے لئے ہوتی ہے۔ دفعہ سترہ کے مطابق مکمل فتح حاصل کرنے تک جدوجہد اور جنگ جاری رہے گی۔

زار روس کے بھگوڑے فوجیوں کے بارے میں لینن نے کہا تھا کہ بھاگنے والے ہاتھوں کی بجائے اپنے پیروں سے ووٹ ڈال رہے ہیں۔ کچھ اس سے ملتی جلتی بات ان دو دنوں میں نکلنے والے جلوسوں کے بارے میں بھی کہی جا رہی ہے۔ یہ جلوس نہیں بلکہ چلتا پھرتا ریفرنڈم ہے۔ اس ریفرنڈم میں شہنشا سو فیصد ووٹوں سے ہار گیا ہے۔ اسے ایک ووٹ بھی نہیں ملا۔ کل نہ آج۔ اور آج اس کے خلاف ووٹ ڈالنے والے کوئی بیس لاکھ افراد ہوں گے۔ فوج نے رائے دہی کا حق استعمال نہیں کیا۔ کل نہ آج۔ اس کی بے طرفی ہی شاہ کی برطرفی کے لئے کافی ہے۔

سردیوں میں عصر اور مغرب کے درمیان وقفہ بہت کم ہوتا ہے۔ میں اس مختصر مدت میں طویل سیر کا پورا لطف اٹھانے کے لئے ذرا تیز چل رہا ہوں۔ پارک شہنشاہی میں بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مرد کم ہیں۔ بچے اور عورتیں زیادہ ہیں۔ جھیل سے سیڑھیاں اتر کر جو دو پختہ روشیں ڈھلان پر کیاریوں کے دونوں جانب بنی ہوئی ہیں ان پر چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ بچے سکیٹ بورڈ پر سوار ہو کر تیزی سے ان روشوں پر پھسل رہے ہیں۔ گھٹنوں پر پیڈ باندھے ہوئے ہیں۔ گرتے ہیں اور کپڑے جھاڑ کر فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کچھ عمران کی طرفداری کرتی ہے اور کچھ پیڈ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی بوڑھے سے ٹکرا جائیں تو اس کی پیٹھ باقی عمر کے لئے بستر سے لگ جائے۔ خواتین نے جدید فیشن کے سرمائی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ دو چار سموری کالر والے کوٹ اتنے قیمتی ہیں کہ انہیں پہن کر پارک میں ٹہلنے کا خیال صرف اسی صورت میں آسکتا ہے جب ان کے استعمال کے دوسرے تمام مواقع ختم ہو جائیں۔ ان بیبیوں کے سر پر سیاہ سکارف بندھا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں کی یاد دہانی کے لئے کہ آج اسلامی کیلنڈر کے پہلے مہینہ کا کون سا دن ہے۔

(3)

اگلا ہفتہ

یہ فرصت و فراغت کا ہفتہ کتنی خونریزی کے بعد آیا ہے۔ نویں اور دسویں محرم کے بعافیت گزرنے کے بعد سب ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ حکومت، فوج، مظاہرین اور تہران کے غیر ملکی باشندے۔ آرام دلی کا دور دورہ ہے۔ نہ خون آلود سیاست کا تناؤ، نہ اس کے نتیجہ میں خون کا بڑھتا ہوا دباؤ۔ ذیابیطس کے مریضوں کا شوگر لیول خود بخود نیچے آگیا ہے۔ اعصابی مریضوں کو بھی افاقہ ہے۔ وہ لوگ جو قدم قدم پر رونق اور ہنگامہ چاہتے ہیں ٹیلیفون اور کیلنڈر لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ دوستوں میں تاریخیں تقسیم کر رہے ہیں۔ آج اس کے یہاں اور کل اس کے وہاں جمع ہوں گے۔ ہفتہ بھر کا پروگرام بنایا ہے۔ دو دن تاش، ایک دن شعر و شاعری، ایک دن موسیقی، دو دن وی سی آر فلمیں اور جمعۃ المبارک کو تلاوت اور دین کی باتیں۔ کھانا ہر روز ہو گا کہ اس کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا اور مل کر کھانے میں لذت اور برکت ہوتی ہے۔ کھانے کے بارے میں دبی زبان سے کچھ لوگوں نے مجبوریوں کا ذکر کیا۔ گوشت نہیں ملتا۔ مرغیوں کی تلاش میں خوار ہونا پڑتا ہے۔ مچھلی بازار میں ڈھیروں ہے مگر اجازت نامہ کے بغیر پکڑی ہوئی اور برف کے بغیر رکھی ہوئی۔ پیاز کی بات ہی الگ ہے۔ پہلے الہ دین کا چراغ ملے۔ پھر اسے گھس کر جن بلایا جائے اور اس سے پیاز کی فرمائش کی جائے۔ وہ بھی دن بھر گھومنے کے بعد تھکا ہارا خالی ہاتھ واپس آئے۔

جس کسی کے ذخیرے میں یہ چیزیں موجود ہیں وہ کہتا ہے، آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ میں ایمرجنسی کے پندرہ بیس دن کے لئے لخت لخت کر کے جوڑا ہوا سامان خورد و نوش ایک رات کی دعوت میں اڑا دوں۔ فون اور جوابی فون، تجاویز اور جوابی ترامیم، مشورے اور منظوری۔ حل نکل آیا۔ یہ فیصلہ میزبان پر چھوڑ دیا کہ دعوت اکلوتی ہانڈی والی ہوگی یا شراکتی ہانڈی والی۔ ون ڈش میں کئی خوبیاں ہیں۔ تردد کم، تکلف برطرف، بھرم برقرار۔ شراکتی کھانا اس لحاظ سے اچھا ہے کہ مل جل کر کھاؤ مگر اپنا کھاؤ۔ دستِ خود، دہانِ خود، طعامِ خود اور یارانِ خود۔

جمعہ کی نماز کے بعد ایک گروہ کے افراد سیر و تفریح کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ کئی

مقامات کا ذکر ہوا۔ کہیں فاصلہ زیادہ ہے اور کہیں مہنگائی۔ مسجد سلیمان اور شوستر دور ہیں۔ رشت اور رامسر مہنگے ہیں۔ جہاں کہیں پہاڑ کی برفانی ڈھلانوں پر اسکی بازی ہوتی ہے یہ ورزش بیزار جسم وہاں جاکر کیا کریں گے۔ اس لئے آب علی اور شمشک کا نام فہرست سے خارج۔ دربند اچھی جگہ ہے مگر بہت قریب ہے۔ وہاں پہنچ کر پکنک منانے کا احساس تک نہیں ہوتا لہٰذا وہ بھی نامنظور۔ بعض چیزوں سے لوگوں کو دلچسپی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ان کی خاطر سفر کی زحمت برداشت کی جائے۔ طاق شیریں فرہاد کے لئے کون استان ایلام کا سفر کرے۔ حکیم عمر خیام کی خاطر کون نیشاپور جائے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم نے شروع جوانی میں چار آنے دے کر شیریں اور فرہاد کو میکلوڈ روڈ کے کنارے پٹیالہ گراؤنڈ میں لگے ہوئے تنبو میں اپنی نادانی کی داستان دہراتے ہوئے دیکھا ہے۔ تھیٹر سے باہر نکل کر تماشائی نے تھیٹر والے سے پوچھا کہ شیریں عورت تھی کہ مرد۔ جواب ملا، مرد۔ کم خرچ تفریح کی تلاش کرنے والوں کی بات آخر کار کرج پر آکر ٹھہر گئی۔ اس تفریحی مقام پر ایک پاکستانی نوجوان کا سسرالی مکان واقع ہے۔ جنگل، پہاڑ، رود کوہی، خوبصورت ولا، ولا کے اندر کیاریاں، کھیتی باڑی، پھلدار درخت اور بلوچستان کے ہزارہ قبیلہ کے اردو بولنے والے منگول صورت ملازم۔

ہم لوگ توچال پہنچے۔ چیئر لفٹ کی سیر ہوگی۔ وہاں ایک شخص ملا کہنے لگا۔ میں ایک سوئس انجینئر ہوں جو اس چیئر لفٹ کے نصب ہو جانے کے بعد اس کی جانچ اور آزمائشی طور پر اسے چلانے کے لئے آیا ہوا ہوں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چار ماہ ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں میں ایک بار بھی اس بلندی سے اتر کر شہر تک نہیں گیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں نے آج تک تہران نہیں دیکھا۔ بس شہر کی ایک جھلک ایئرپورٹ سے اس پہاڑ پر آتے ہوئے دیکھی تھی۔ رات کو البتہ بہت دور اور بہت نیچے کچھ ننھی منی روشنیاں میرے کیبن سے نظر آتی ہیں۔ شاید وہی تہران ہو گا۔ یہ مدھم سی روشنیاں بھی کئی کئی دن نظر نہیں آتیں۔ شہر کا غبار، دھواں، اور کارخانوں، موٹروں اور ریفائنری کی وجہ سے آلودہ ماحول ان روشنیوں کو زمین کی سطح سے اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتا۔ اور اگر کہیں روشنی کی کوئی کرن اس غلیظ اور دبیز تہ کو چیرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر کہرا، بادل اور برف باری اسے راستہ میں روک لیتے ہیں۔ میرے اور شہر تہران کے درمیان فاصلہ نہیں بلکہ بلندی حائل ہے۔ سنا

ہے تہران میں انقلاب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جس دن انقلاب آگیا اُس روز کوہ البرز کی ساری برف پگھل جائے گی۔ تیسری منزل پر تعمیر کا کام جس حالت میں ہو گا اسے وہیں چھوڑ کر میں جھولے سے فوراً نیچے اتروں گا۔ اور جہاں جھولے کا سفر ختم ہوتا ہے وہاں سے پیدل شہر کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ انقلاب کی صورت کیسی ہوتی ہے۔ میں سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ہوں۔ ہم لوگ بڑے ناتجربہ کار ہیں۔ صدیوں سے ہم نے کوئی جنگ نہیں لڑی، کوئی انقلاب نہیں دیکھا۔ غیر جانبداری اور خوشحالی کے جھولے میں بیٹھے ہوئے فضا میں معلق ہیں۔ زمین سے دور سمندر سے بہت دور۔ غاروں اور کھائیوں سے بہت اوپر۔ برف سے ڈھکی چوٹیوں سے بس ذرا اوپر۔

آر سی ڈی کے سفر خرچ کے قانون میں ایک شق ایسی ہے کہ دو سال کے بعد اہل و عیال کے سفر کی صورت میں ایک معقول رقم مل جاتی ہے۔ بس ذرا تاویل سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک خاموش اور سادہ سے کارکن نے عرضداشت پیش کی کہ اس قانون کے تحت اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو راولپنڈی، کوئٹہ، دلبندین، زاہدان کے راستہ ریل سے اور زاہدان، کرمان، یزد، کاشان اور قم کے راستہ تہران تک بس کے ذریعہ سفر کرنے اور ایک ہفتہ بعد اسی راستہ سے واپس جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ ہوائی سروس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ سفر خرچ البتہ ہوائی سفر کا دیا جائے۔ میں نے نقشہ منگایا اور موجودہ حالات میں اس سفر کے خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد ان سے صرف اتنا پوچھا کہ آپ کو بچت عزیز ہے کہ بچے۔ وہ قریب قریب رو پڑے۔ باز پھر بھی نہیں آئے۔ بھیگی پلکوں کو کوٹ کی آستین سے خشک کرتے ہوئے کچھ اس طرح درخواست کرنے لگے جیسے میں تین ہزار کیلومیٹر راستہ کو لپیٹ کر مختصر کر سکتا ہوں اور ہنگاموں کو حکم دے سکتا ہوں کہ وہ ان کے بچوں کے قیام تک ٹھہرے رہیں۔ میں قواعد کی رو سے ان کو صرف ایک ہزار ڈالر دے سکتا تھا۔ وہ میں نے دے دیئے۔

دفتر کے سامنے ایلزبتھ بلوار پر گولیاں چل رہی ہیں۔ کسی جنازہ پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ حکومت اس جنازہ پر ایران کا پرچم ڈالنا چاہتی ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قومی حکومت کہتی ہے کہ ہو سکتا ہے۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ نوجوان سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ مظاہرہ خیابان پہلوی، ایزن ہاور

اور تختِ جمشید تک پھیل جاتا ہے۔ ٹائر جل رہے ہیں۔ دھوئیں کے سیاہ بادل اٹھ رہے ہیں۔ گولیاں معمول سے ذرا زیادہ چل رہی ہیں۔ افواہیں معمول کے مطابق ہیں۔ سنا ہے جس نے گولی چلانے کا حکم دیا تھا اس فوجی افسر کو دو ماتحت سپاہیوں نے مار ڈالا ہے۔ فوج میں اس طرح کی چھوٹی چھوٹی مقامی بغاوتوں کا چرچا عام ہے۔

ایران جل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے امریکی ہفتہ وار رنگین باتصویر رسالہ ٹائم نے چند ہی دنوں کے بعد دوسری بار سرورق پر شاہ کی جلتی ہوئی تصویر لگائی ہے۔ پہلی بار شاہ کی تصویر کو مظاہرین آگ لگا رہے تھے۔ اس مرتبہ شاہ کی تصویر قالین پر بنی ہوئی ہے اور قالین جل رہا۔ قالین ایک استعارہ ہے، ایران اور اس کی معیشت کے لئے۔ رسالہ کہتا ہے کہ اب ایران بدون شہنشاہ والی پالیسی کا زمانہ آگیا ہے مگر امریکی حکومت میں کچھ لوگ ابھی تک اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ امریکہ تو پھر ایک فاصلہ پر واقع ہے خود یہاں تہران میں کچھ شاہ پرست ایسے ہیں جو شاہ کی رخصت کی بات کرو تو آستین پکڑ لیتے ہیں۔

وہ ہفتہ جو اس امید کے ساتھ شروع ہوا تھا کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ جیتنے والے جیت گئے ہیں۔ اور ہارنے والا ہار گیا ہے، وہ اس خدشہ پر ختم ہوا کہ مقابلہ کا ایک خونریز دور ابھی باقی ہے۔ صلح صفائی کی امید کم ہے۔ خون خرابے کا خدشہ زیادہ ہے۔ اہل ایران متذبذب ہیں۔ ایران معلق ہے۔

اگلے چند ہفتے

تہران کے باشندوں کے آج کل صرف دو مشغلے ہیں۔ تظاہرات یا قطار بندی۔ جگہ جگہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔ جس جگہ ہنگامہ نہ ہو وہاں لوگ قطار بنا لیتے ہیں۔ ہنگامہ وہاں تک پہنچ جائے تو قطار چھوڑ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہنگامہ ختم ہو جائے یا کسی اور طرف نکل جائے تو لوگ دوبارہ قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے گنتی کرتا ہوں۔ ایک ہنگامہ، تین جلوس، دس قطاریں۔ ہنگامہ کی وجہ سے ہمیشہ راستہ بدلنا پڑتا ہے۔ جلوس کی وجہ سے موٹر کو کھڑا یا آہستہ کرنا پڑتا ہے۔ قطار کی وجہ سے سفر کے رخ اور اس کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

صبح سے شام تک جگہ جگہ قطار بندی ہوتی ہے۔ قطاروں کی تین قسمیں ہیں اور ان

کی لمبائی سے پتہ چل جاتا ہے کہ قطار کس قسم کی ہے۔ ایک قطار مختصر ہوتی ہے۔ اس میں خاموش لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری قطار طویل ہوتی ہے۔ شامل ہونے والے بیزار اور تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تیسری قطار سب سے لمبی ہوتی۔ اس میں شامل ہونے والے مرد عورت اور لڑکے بالے مضطرب اور پریشان نظر آتے ہیں۔ طویل ترین قطار ان لوگوں کی ہے جو پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ملک چھوڑ کر جا سکیں۔ طویل قطار پٹرول حاصل کرنے والے موٹر سواروں کی ہوتی ہے۔ مختصر قطار نان خریدنے والوں کی ہوتی ہے۔

ہڑتال کامیاب نہیں رہی۔ اعلان اگرچہ پیرس سے ہوا تھا مگر اخبار، فون اور تلکس کے بند ہونے کی وجہ سے مختلف افواہیں گشت کرتی رہیں۔ ہڑتال ہے۔ ہڑتال نہیں ہے۔ پتہ نہیں ہڑتال ہے کہ نہیں ہے۔ آخر اس وقت ہڑتال کی کیا ضرورت ہے۔ ضرورت پڑی تو چہلم پر زور باندھیں گے۔ تاسوعا اور عاشورا کے مظاہروں کے بعد محض گفت و شنید سے کام بن جانا چاہئے۔ کریم سنجابی کہتے ہیں کہ اعزائے عمومی کی تقریب سڑکوں پر نہیں بلکہ گھروں کے اندر منائی جائے۔ سیاست کار اب پریشان ہیں کہ تحریک ان کے ہاتھوں سے نکل کر روحانیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ بائیں بازو کے طالب علم کھل کر کہہ رہے ہیں کہ بیج ہم نے بویا، اپنے خون سے آبیاری ہم نے کی، اور فصل اہل جبہ و دستار کاٹ کر لئے جا رہے ہیں۔ ایک سفارت کار کہتا ہے کہ انقلاب کو مذہبی رہنماؤں نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ شاید اسی لئے بہت سے طبقے ہڑتال کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔

عذرا کا وہ اپریشن جو چند ماہ پہلے میری غیر ملکی سفری مصروفیات کی وجہ سے ملتوی ہو گیا تھا بخیریت تمام ہوا۔ الحمدللہ۔

(4)

جوڑ توڑ کے دن ہیں۔ ایک بحران ہے جسے ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق حل کرنا چاہتا ہے۔ طرح طرح کی تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔ تجویز پیش کرنے والا کہتا ہے کہ موجودہ

سیاسی کشمکش کا یہ سب سے اچھا حل ہے۔ اس میں ملک اور قوم کا فائدہ ہے۔ غور کریں تو اس میں صرف تجویز کنندہ کا فائدہ نظر آتا ہے۔ باقی نرا دکھاوا ہے یا کھلا دھوکہ۔ ایسی گفت و شنید چومکھی جنگ کی طرح ہوتی ہے۔ بار بار پینترا بدلنا پڑتا ہے تاکہ کوئی پیچھے سے حملہ نہ کر دے اور جونہی کسی دوسرے کی پیٹھ نظر آئے تو فوراً اس میں چھرا بھونک دیا جائے۔ شہنشاہ اپنے محل کے اندر دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑا ہے۔ محل کے باہر بے شمار لوگ اس دیوار کو ڈھانے کے لئے زور لگا رہے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں چھرا ہے۔

جوڑ توڑ کے بہت سے مراکز بن گئے ہیں۔ شاہ، شاہ پرست، فوج، ساواک، مجلس، نیشنل فرنٹ، امریکی سفارت خانہ، اور خاص اس مقصد کے لئے آنے والا ایک امریکی جنرل۔ اس کے باوجود ایران کی اصل سیاسی طاقت کا مرکز پیرس کے مضافات میں واقع ایک گاؤں ہے۔ اس گاؤں والے جوڑ توڑ کی تمام کوششوں کو بیکار اور لاحاصل قرار دیتے ہیں۔ وہ شاہ سے بات کرنے کے روادار نہیں۔ نہ اسے کسی صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ادھر جن تجاویز پر غور ہو رہا ہے ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ شاہ کی سرپرستی میں سخت گیر فوجی حکومت، شہنشاہ آرام کے لئے رخصت پر چلے جائیں، ولی عہد کے حق میں تخت سے دستبرداری، قائم مقام شاہی کونسل، قومی حکومت، آئینی بادشاہت، کوُدِتا۔ اس فہرست میں شاید کوئی صورت بھی اب قابل عمل نہیں رہی۔ سال دو سال پہلے آئین پر پوری طرح عمل کرنے کے معاہدہ سے لوگ خوش ہو جاتے۔ سال بھر پہلے آئینی بادشاہت کو لوگ خوشی خوشی قبول کر لیتے۔ آٹھ دس ماہ پہلے نیابتی کونسل اور ولی عہد کی تخت نشینی سے کام چل جاتا۔ اگست میں ریکس سینما میں تماشائیوں کے جل مرنے کے بعد پہلوی خاندان کے برسر اقتدار رہنے کے امکان بھی جل کر خاک ہو گئے۔ ستمبر میں میدان ژالہ میں ہزاروں مظاہرین کے ساتھ بادشاہت بھی کھیت رہی۔

اسفر جانی ہسپتال میں عذرا سے ملنے کے لئے آئیں۔ حال پوچھا۔ عذرا نے کہا۔ اللہ کا شکر ہے، اچھی ہوں، دو ایک روز میں گھر چلی جاؤں گی۔ تم سناؤ تمہارے شہنشاہ کا حال کیسا ہے۔ کہنے لگیں معلوم نہیں آپ کو ہسپتال سے پہلے چھٹی ملتی ہے یا شہنشاہ کی چھٹی پہلے ہوتی ہے۔ شہنشاہ کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ دیر صرف اس لئے لگ رہی ہے کہ یہ طے کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ شاہ کے جانے کے بعد کون حکومت کرے گا۔ جس کسی نے شاہ کی مخالفت میں

کبھی ایک کلمہ بھی کہا تھا وہ اب تخت کا دعویدار ہے۔ تودہ، مجاہدین، فدائین، طلبا، مصدق پسند اور جبہ و دستار والے اپنے اپنے دعوے اور جواب دعوے پیش کر رہے ہیں۔ فوج کا دعویٰ اس کے علاوہ ہے۔ جس شخص سے یہ سب لوگ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی کو اب ملک سے جانے نہیں دیتے۔ قائم مقامی اور جانشینی کے جھگڑوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس میں ایک اضافہ اور سہی۔

شاہ اور شاہ بانو کا لہجہ اور رویہ عاشورا کے بعد نرم پڑ گیا ہے۔ امریکی سفارت کار کہتے ہیں کہ شاہی جوڑے نے پہلے کاخ نیاوراں میں دونوں دن ٹی وی پر مظاہرے براہ راست دیکھے اور پھر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر اس عبرت ناک منظر کو بچشم خود دیکھا۔ افواج کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ اتنے بڑے ہجوم کا بندوبست کر سکتی ہیں یہ دونوں اب صورت حال سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ ملکہ نے سیاہ ماتمی لباس میں مشہد میں اعلانیہ اور نجف میں خفیہ سفر کے دوران ضریح پکڑ کر جو اشک بہائے تھے وہ آخر کس بات کی علامت ہیں۔ دینداری کا اچانک غلبہ، انا کی آخری شکست، ڈوبتے کو کسی تنکے کا سہارا نہ ملنے کا رنج و غم۔

اطالوی خاتون صحافی سے شہنشاہ کہتا ہے۔ ایک الٰہی اور لوگوں کو نظر نہ آنے والی قوت ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے ربانی پیغامات بھی ملتے رہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مجھے القا ہوتا ہے۔ میں نے امام مہدی علیہ السلام کو بذات خود دیکھا ہے۔ میں ایک بار حادثہ سے دوچار ہو گیا اور چٹان پر گر پڑا۔ امام مہدی میرے اور چٹان کے درمیان آ گئے۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور جو شخص میرے ہمراہ تھا وہ انہیں دیکھ بھی نہ سکا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ شخص جو انقلاب کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے اسے بچانے کے لئے امام مہدی اس مرتبہ کیوں نہیں آئے۔

شہنشاہ نے روس کے سفیر کو بلایا اور پوچھا۔ ان حالات میں اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سفیر نے بے رخی سے جواب دیا۔ میں کبھی بادشاہ نہیں رہا۔ جس کام کا مجھے کوئی تجربہ نہیں اس کے بارے میں میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ شاہ لاجواب اور آزردہ ہوئے۔ میکاولی کی مشہور اور 36 صفحات کی مختصر کتاب "دی پرنس" کا دیباچہ اگر شاہ نے غور سے پڑھا ہوتا تو وہ روس کے سفیر کو مناسب جواب دے سکتا تھا۔ نکولو میکاولی شاہزادہ

لورنزو دی پیرو دی میڈیچی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ اور نہ میں ان لوگوں سے اتفاق کرتا ہوں جو اس بات کو گستاخی پر محمول کرتے ہیں کہ ایک ادنیٰ اور حقیر شخص ان معاملات پر غور کرے اور فیصلہ صادر کرے جو شاہی حکمرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح پہاڑی مناظر کے مصور اپنے لئے نشیب میں ایسی جگہ منتخب کرتے ہیں جہاں سے وہ پہاڑوں اور چوٹیوں کی ساخت پر غور کر سکیں۔ اور وہ جو میدانوں کی منظر کشی کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے لئے پہاڑ کی اونچائی پر کوئی موزوں جگہ تلاش کرتے ہیں (جہاں سے ساری وادی نظر آئے)۔ اسی طرح عوام کے مزاج کو سمجھنے کے لئے شاہزادہ ہونا اور شاہزادگی کی فطرت کو سمجھنے کے لئے عوام میں سے ہونا ضروری ہے۔

بچے ایک دن کے لئے ایران زمین انٹرنیشنل اسکول گئے اور یہ خبر لائے کہ اسکول پھر تین ہفتہ کے لئے بند ہو گیا ہے اسکول میں ایک ایرانی لڑکی نے ہمت کی اور آیت اللہ خمینی کی طرفداری کا اعلان کیا۔ غل مچ گیا۔ سب اس کے پیچھے پڑ گئے۔ بحث اس طفلانہ دلیل پر ختم ہوئی کہ اسکول شہنشاہ نے بنوایا ہے۔ اگر تمہیں شہنشاہ پسند نہیں تو جاؤ شوق سے قم میں جا کر داخلہ لے لو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سوئٹزرلینڈ کا بیکا لاریٹ کورس پڑھنا اور تعریف کرنی ملاؤں کی۔

ایک پاکستانی صحافی ملنے کے لئے آئے۔ یہ آج ان سے میری دوسری ملاقات ہے۔ میں نے کہا جب آپ پہلی بار مل کر گئے تو تھوڑی دیر کے بعد آغا صاحب آ گئے۔ بس اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں جانتا ہوں اس نے آپ سے کیا کہا ہو گا۔ یہی نا کہ اس شخص سے بچ کر رہیئے گا۔ یہ جو آغا ہے وہ فکر و دانش کے لحاظ سے ایک بونا ہے مگر خوشامد اور سازش کی دنیا کی ایک قد آور شخصیت ہے۔ یہ بات میں آپ کو پہلی ملاقات میں بتا چکا ہوں کہ میری طبیعت اور میرے اصول ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے دو چار بار میرا گریبان چاک ہو چکا ہے۔ نوکری سے نکالا جا چکا ہوں۔ دو وقت کی روٹی ملنی مشکل ہو گئی۔ میں نے تنگی ترشی سے گزارا کیا مگر اس چاک گریبان کو معافی نامہ یا خوشامد سے رفو کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے اس سے کہا گلہ شکوہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا۔ بولے آپ کے دفتر کے پاس ایک سفارت خانہ ہے وہاں تک آیا تھا، سوچا تجدیدِ ملاقات کر لوں اور آوازِ دوست

سن لوں اس لئے بغیر اطلاع حاضر ہو گیا۔ آج کل میں کئی سفارت خانوں میں طلب کیا جاتا ہوں۔ بے چارے سفیروں کی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ ان کی حکومتیں ایران کی تازہ ترین سیاسی صورت حال پر اوپر تلے رپورٹیں مانگ رہی ہیں۔ تہران میں اخبار بند ہیں۔ نقل کیسے ماریں۔ ٹائم اور نیوز ویک سے نقل کریں تو ویسے مارے جائیں۔ ناچار میرے جیسے آزاد صحافیوں کو بلاتے ہیں۔ چائے پلاتے ہیں۔ باتیں سنتے ہیں اور معاوضہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک سفیر سے یہ طے ہے کہ جب کبھی انہیں کسی شخص کے بارے میں معلومات درکار ہوں تو وہ مجھے بلا لیتے ہیں۔ میں کبھی ایک جملہ میں بات ختم کر دیتا ہوں کبھی ایک صفحہ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ مجھے ایک شخص کا حال احوال بتانے کے سو ڈالر ملتے ہیں۔ کل ہی اس سفیر نے پوچھا۔ گل پائگانی اور گل سرخی ایک ہی شخص کے نام ہیں یا دو مختلف اشخاص ہیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ گل پائگانی زندہ ہیں اور آیت اللہ ہیں اور گل سرخی بائیں بازو کا شاعر اور انقلابی تھا۔ گرفتار ہوا اور پھانسی پا گیا۔ اس سفیر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میری باچھیں کھل گئیں کیونکہ ان جملوں کا معاوضہ دو سو ڈالر تھا۔ جناب والا، آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ سفارت خانوں کی ناواقفیت کا کیا عالم ہے۔ میں نے ایک اچھی خاصی رقم محض یہ بتا کر کمالی ہے کہ خمینی اور خامنہ ای میں کیا فرق ہے اور بہشتی، منتظری، مطہری، طالقانی، بازگان، امینی، کریم سنجابی، دکتر ملکی، سناتور محمد رضا، جلال نائینی، دکتر نزیہ، کون ہیں۔

میں نے کہا۔ اس وقت تہران صحافیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کیا وہ سب آپ کی طرح سفارت خانوں میں بلائے جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ مانگ ان صحافیوں کی ہے جو فارسی جانتے ہیں اور چار پانچ سال سے یہاں رہتے ہیں۔ عارضی طور پر مغرب سے آنے والے صحافیوں سے سفیروں کو کیا ملے گا۔ وہ خود ہمارے جیسے لوگوں کے مرہون منت ہیں۔ ہم ان سے بھی کچھ نہ کچھ وصول کر لیتے ہیں۔ البتہ مشرق سے آنے والے صحافی یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم انہیں لے کر پھراتے رہیں گے۔ مقامات، اشخاص اور مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔ کھانے کھلائیں گے، شاپنگ کرائیں گے اور پھر اپنی موٹر میں انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر آئیں گے۔ میں ان کے نزدیک نہیں جاتا۔

ملاقات کا وقت ختم ہونے کو آیا۔ میں نے کہا، اب اصل موضوع کی طرف آیئے یعنی آج کل کا ایران۔ آج کو جانے دیجئے۔ وہ مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ آپ کل کی بات

کریں۔ کہنے لگے۔ آئندہ چند سالوں میں سیاسی ابتری اور خلفشار کے سوا اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ خون کا ایک دریا ہے۔ اس دریا میں سیلاب آئے گا اور آس پاس کے ملک بھی اس سیلاب کی زد میں ہوں گے۔ یہ سارا علاقہ لہو رنگ ہو گا اور خلیج فارس کو خلیج خون کے نام سے پکارا جائے گا۔

ایک مسلمان ملک کے سفارت کار ملنے کے لئے آئے۔ کہنے لگے۔ یہ ملک جتنی تیزی سے ترقی کر رہا تھا اب اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ اقتصادی ابتری کی طرف جا رہا ہے۔ کئی ملکوں کی یہی خواہش تھی اور وہ پوری ہو رہی ہے۔ ایران کے عوام شہنشاہ کے خلاف ہیں اور بیرونی طاقتیں ایران کی ترقی کے خلاف ہیں۔ باہر والے اندر والوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ ایک سپر پاور ملک کا اپنے ترقی پذیر دوست ملک سے وہی تعلق ہوتا ہے جو عامل اور معمول کا ہوتا ہے۔ عامل کہتا ہے۔ بول بچہ جو کچھ میں کہوں گا وہی کرے گا۔ معمول جو آنکھیں بند کئے زمین پر بے سدھ پڑا ہوتا ہے نیم بیہوشی کے عالم میں جواب دیتا ہے۔ حکم کا بندہ ہوں جو کچھ کہو گے وہی کروں گا۔ اس کھیل کے قواعد میں کوئی فرق نہیں ہوتا، خواہ عامل امریکہ ہو یا روس۔ مشرق وسطیٰ میں آزادی اور تیل کی دولت آئی۔ مغرب نے اسے دیا سلائی کی ڈبیہ کے برابر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ملک پر ایک مطلق العنان حکومت مسلط کر دی۔ نہ دولت اسلام کے کام آئی اور نہ آزادی مسلمانوں کے کام آئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر شمالی عراق سے جنوبی اومان تک تیل کے سارے کنوئیں ایک مسلمان وفاقی یا نیم وفاقی ریاست میں واقع ہوتے تو اس ملک کی طاقت اور ہیبت کے سامنے کون ٹھہر سکتا تھا۔ دور کیوں جائیں ایران کو دیکھ لیں۔ مشرق وسطیٰ میں لے دے کے صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے پاس رقبہ، آبادی، دولت اور اپنی عظمت کے خواب ہیں۔ ایسے ملک کو ترقی کے لئے پچاس برس کی مہلت دینا کتنا مہلک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی وحدت اور اقتصاد کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا اور اب اس پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے۔

ایرانی لاتعداد گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ شاہی، فوجی، روحانی، سیاسی، لسانی، طبقاتی، علاقائی۔ ہر ایک گروہ میں دائیں بائیں کا اختلاف ہے اور خود دائیں بائیں میں شخصیات اور سرپرست ملکوں کے فرق نے لوگوں کو تقسیم کر رکھا ہے۔ کوئی گروہ بھی اتنا باا‌ثر

اور طاقتور نہیں ہے کہ دوسروں پر حاوی ہو جائے اور ایران کی ترقی کی رفتار کو بحال کر سکے۔
ایک مدت تک یہ ملک خود اپنے آپ سے لڑتا رہے گا۔ دوسرے تماشا دیکھتے رہیں گے۔
امریکہ کا اثر ایران میں ہر جگہ ہے۔ شاہ، فوج، حکومت، مخالفین، سب اس کی بات سنتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ آج کل ایران میں حکومت بھی امریکی چلا رہے ہیں اور حکومت کے خلاف تحریک کو ہوا بھی وہی دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایران کی نئی تاریخ لکھنے کا حق انہیں ایک سپر پاور کی حیثیت سے حاصل ہے۔ وہ ایران میں اِس حق کو دوسری بار استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش شاید پوری نہ ہو سکے۔

میں کرنل شمیم کو ہمراہ لے کر آر سی ڈی کے دفتر سے روانہ ہوتا ہوں۔ خیابان تخت جمشید پر ایک کلب نما ریستوران میں کھانے کی میز رزرو ہے۔ یہی کوئی دو میل کا فاصلہ ہے جو بھیڑ پڑنے کے باوجود خیال ہے کہ پندرہ بیس منٹ میں طے کر لیں گے۔ دفتر سے نکلے اور بلوار ایلزبتھ پر بھیڑ دیکھ کر بغلی سڑک پر ہو لئے وہاں بھی ہجوم ملا اور ہم گلی میں مڑ گئے۔ ایک گلی آرام سے طے کی مگر دوسری گلی بند پائی۔ واپس مڑنا چاہا لیکن اس وقت تک واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ چالیس منٹ بے حرکت موٹر میں بند بیٹھے رہے۔ پھر اتر کر پیدل دفتر واپس آ گئے۔ دوسری سٹاف کار لی۔ وسط شہر میں کھانا کھانے کا ارادہ ترک کیا اور میلوں لمبا فاصلے طے کرنے کے بعد کلوب شہنشاہی پہنچ گئے۔

میں کلب میں کئی ہفتوں کے بعد آیا ہوں۔ ہر طرف اداسی برس رہی ہے۔ بے رونقی پھیلی ہوئی ہے۔ کھانے والے کمرے میں کل پانچ چھ افراد ہوں گے۔ ہمارے آنے سے یہ تعداد بڑھ کر چھ سات تک پہنچ گئی۔ ایک میز پر جیمس انڈرووڈ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا۔ اخبار نظر نہیں آتے۔ تعجب ہے کہ فارغ ہونے کے باوجود اخبار والے بھی نظر نہیں آتے۔ اس نے کہا۔ اخبار چھپتے نہیں، گھڑ دوڑ ہوتی نہیں، لوگ کلب میں نہیں آتے۔ میں بیکار، میرے گھوڑے بھی بیکار، اور میرا کلب ویران۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ میں تظاہرات میں شامل ہونے سے رہا۔ بھاگنے والوں کا ساتھ دینے سے رہا۔ بس گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ ہاں، سنائیے، آر سی ڈی کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا۔ تمہارے ریس کے گھوڑوں کی طرح تہران کے اصطبل میں بندھی ہوئی چارہ کھا رہی ہے اور سوچ بچار کر رہی ہے۔ دوسرے دو ملکوں میں اس کے چھوٹے بڑے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ اس نے

اپنے ہمراہی سے تعارف کرایا جس نے اپنی چھوٹی سی تسبیح دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کی اور مصافحہ کیا۔ معلوم نہیں یہ منور تسبیح ذکر و وظائف والی ہے کہ دوا دارو والی۔ تسبیح والا تہران یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہے۔ سامنے والی میز پر ملکہ فرح کے بیورو کے سربراہ اور سابق وزیر تعلیم اداس اور خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ چند ماہ قبل میں نے ان کا ٹھسا دیکھا تھا۔ بات اس انداز سے کرتے تھے جیسے الفاظ آسمان سے نازل ہو رہے ہیں۔ آج ان کی خاموشی اور مایوسی کہہ رہی ہے کہ ایران نو کا ایک اور پیغمبر جعلی اور فرضی نکلا۔

کلب کے بیرے خاموشی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پلیٹیں لگاتے اور کھانا لاتے ہیں۔ پھر استعمال کئے ہوئے برتن اٹھاتے اور میز صاف کرتے ہیں۔ خاموش وہ پہلے بھی ہوتے تھے جب ان کی تعداد دس بیس ہوا کرتی تھی۔ خاموش وہ آج بھی ہیں جب کہ وہ صرف دو ایک ہیں۔ مگر دونوں خاموشیوں میں فرق ہے۔ وہ تربیت یافتہ کارکنوں کی پیشہ ورانہ خاموشی تھی۔ یہ بے دلی اور بے نصیبی کی خاموشی ہے۔ یکایک مجھ ایسے محسوس ہوا جیسے کھانے کی میز شاہی کلب کی پر تکلف طعام گاہ کی بجائے خیابان شاہ رضا کے بیچوں بیچ رکھی ہوئی ہے۔ چاروں طرف ہزارہا مظاہرین کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ گولی چلتی ہے اور چند مظاہرین خون میں لت پت ہو جاتے ہیں۔ زخمیوں کو موقع واردات سے یوں اٹھایا جاتا جیسے کھانے کی میز سے استعمال شدہ پلیٹیں۔ میز کی طرح سڑک کو بھی صاف کیا جاتا ہے۔ جس طرح صاف پلیٹیں دوبارہ لگائی جاتی ہیں اسی طرح صاف اور تازہ خون نوجوان دوبارہ سڑک پر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا خیال ہے۔ یہ کیسی تشبیہ ہے۔ میری بھوک مر گئی۔ کیسپین سے آیا ہوا اور تازہ مکھن میں سرخ کیا ہوا جمبو جھینگا دستی کانٹے کی نوک پر لگا کا لگا رہ گیا۔

میں کلب سے واپس گھر روانہ ہوا۔ اسفندر یار جیسی کشادہ سڑک کا بیشتر حصہ جلے ہوئے کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا ہے۔ آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔ دھواں کہیں کہیں سے اٹھتا ہے مگر اونچا ہونے سے پہلے ہی فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ میرا گھر اسی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ گھنٹی بجائی۔ سلمان دوڑا دوڑا آیا اور بڑے جوش سے بلوا کا آنکھوں دیکھا حال سنانے لگا۔ اب تک وہ اخباروں میں پڑھتا یا ٹی وی پر سنتا آیا تھا کہ فلاں جگہ مظاہرین نے ہنگامہ کیا اور آگ لگا دی۔ آج اس نے گھر کے سامنے اس کا ایک چھوٹا سا

مظاہرہ خود دیکھا۔ اب وہ تاریخ کا براہ راست گواہ بن گیا ہے۔ لڑکپن میں اس مرتبہ پر فائز ہونے کا جوش اس کی باتوں میں نمایاں ہے۔ اس نے بتایا کہ خیابان پہلوی سے چند لڑکے اور لڑکیاں بھاگ کر اس بغلی سڑک پر آ گئے۔ پہلے نعرے لگاتے رہے۔ جونہی ذرا سا خطرہ محسوس کرتے فوراً ادھر ادھر ہو جاتے۔ دیواروں اور دروازوں کی آڑ لے لیتے۔ گلیوں اور گیراجوں میں چھپ جاتے۔ دکانوں میں گھس جاتے۔ نامکمل مکان جن پر ہنگاموں کی وجہ سے کام رکا ہوا ہے ان کے بہترین مورچے اور پناہ گاہیں ہیں۔ جب وہ سمجھتے کہ کوئی تعاقب کرنے والا نہیں رہا تو کمیں گاہوں سے نکل آتے اور دوبارہ سڑک پر جمع ہو جاتے۔ پھر نہ جانے کہاں کہاں سے کباڑ ڈھونڈ کر لائے۔ اینٹ، پتھر، سریا، ٹوٹا ہوا پرانا فرنیچر، ایک ناکارہ موٹر، پرانے اخبار اور بہت سے ٹائر۔ شاہ پر مرگ بھیجتے اور سامان جمع کرتے کرتے ایک آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کسی نے خطرہ کا اشارہ دیا۔ انہوں نے فوراً سامان کو آگ لگائی اور دوڑ کر پارک شہنشاہی کے ذخیرہ درختاں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد فوج آئی اور ان کی کارروائی پر تھوڑا سا پانی ڈال کر کسی اور طرف نکل گئی۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ فوج اتنا پانی کہاں سے لائے گی۔ اور اگر پانی مل بھی گیا تو اتنی فوج کہاں سے آئے گی۔ جب سارے شہری آگ لگانے کے کام میں لگ جائیں تو فوج خواہ کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو آگ بجھانے کے لئے ہمیشہ تھوڑی پڑ جاتی ہے۔

موسم ذرا کھلا۔ دھوپ نکلی۔ مظاہرین بھی گھروں سے نکل آئے۔ وردیاں اور فل بوٹ پہن کر اور ہاتھ میں رائفل لے کر فوجی ان کے تعاقب کے لئے آ پہنچے۔ گاہ بگاہ گولی چلنے کی آواز آنے لگی۔ میں ان آوازوں کا راستہ چھوڑتے ہوئے سونی گلیوں اور سنسان سڑکوں کو تلاش کرتا کرتا ڈیڑھ دو گھنٹہ میں بیمارستان جم جا پہنچا۔ عذرا کے آپریشن کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور آج انہیں گھر واپس لے جانا ہے۔ یہ واپسی کا سفر بھی کسی اپریشن سے کم نہیں۔

غسل صحت کا جشن ابھی کچھ دور ہے لیکن گھر واپس آنے کا جشن دھوم دھام سے منایا جا سکتا ہے۔ ہسپتال سے میں نے وصول کیا اور گھر کے دروازے پر دو حاضر بچوں نے خوش آمدید کہا۔ تیسرے اور غیر حاضر بچے کی طرف سے چھپا ہوا کارڈ استقبالیہ کمرہ میں شیشہ والی میز پر رکھا ہوا ہے۔ بس یہی ساری دھوم دھام ہے۔ خوش آمدید ختم بلکہ سب

کچھ ختم۔ اس کے آگے راوی چین ہی چین لکھنا چاہتا ہے مگر کیسے لکھے۔ اس کی دوات میں سیاہی ختم۔ اس برفانی موسم میں گھر کو گرم رکھنے والے انجن میں ڈیزل ختم۔ چولھا گرم کرنے والی گیس کا سلنڈر خالی۔ بجلی بند۔ فرج ناکارہ۔ موٹر میں پٹرول کی مقدار بتانے والی سوئی صفر کے نشان کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ ٹیلیفون اٹھایا۔ صدائے برنخاست۔ خانساماں قربان حسین بیمار۔ گھر میں روٹی ہے نہ سالن۔ کھانا ہوٹل سے منگا کر کھایا۔ کھانے کے بعد عذرا نے کہا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اب آپ مجھے واپس ہسپتال چھوڑ آئیں۔

سوائے ہنگامہ کے باقی ہر چیز کمیاب ہے۔ ہنگامہ ہے کہ فرو ہونے میں نہیں آتا بلکہ پھیلتا جاتا ہے۔ ہر ہنگامہ کے بعد افواہیں زور پکڑتی ہیں۔ افواہوں سے مشتعل ہو کر لوگ نعرے لگاتے ہیں۔ نعرے سن کر باوردی لوگ زباں بندی کے لئے آجاتے ہیں۔ اور ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں کسی کام سے باہر نکلا مگر بیشتر سڑکوں پہ ہنگامہ ہونے کی وجہ سے فردوسی چوک تک نہ پہنچ سکا دور سے دیکھا۔ چاروں طرف رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے۔ میدان فردوسی میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ عوام اس میدان میں شاہنامہ کا آخری باب تحریر کر رہے ہیں۔ آج شام تک اس باب کے کئی گمنام مصنف بہشت زہرا کے قبرستان میں دفن ہو چکے ہوں گے۔

ایران کے ایوان بالا نے عوام کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے جو ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے کے بعد بے چینی کے اسباب کا پتہ لگائے گی اور اسے دور کرنے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ کیا سینٹ کے اراکین نے پچھلے چار ماہ سے کوئی غیر ملکی اخبار نہیں پڑھا، رسالہ نہیں دیکھا، ریڈیو نہیں سنا۔ اس معصوم جائزہ کمیٹی کو آج صبح اگر میدان فردوسی بھیج دیتے تو ساری بات کا پتہ چل جاتا۔ اس پرچۂ ترکیب میں اتنی قباحت ضرور ہے کہ کمیٹی وہاں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی مگر وہاں سے سلامت لوٹ آنا اس کے اراکین کے لئے ممکن نہ ہوتا۔ سینٹ کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک نئی کمیٹی بنانی پڑتی کہ پہلی جائزہ کمیٹی کہاں گم ہو گئی ہے۔

تیل کے کنوئیں بند ہو گئے ہیں۔ کارکن ہڑتال پر چلے گئے ہیں۔ وہ پہلے بھی ہڑتال پر جاتے اور واپس آتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیداوار بے قاعدہ، برآمد بے قاعدہ اور

زر مبادلہ کی آمدنی بے قاعدہ۔ معیشت جھٹکے کھانے لگی۔ پھر پیداوار گھٹنی شروع ہوئی۔ بر آمد بند۔ ملک میں تیل کی کمی۔ آج کل ہڑتال مکمل ہے۔ پیداوار صفر ہے۔ سردی زیادہ ہے۔ لوگ تیل نہ ہونے کی وجہ سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ معیشت بھی منجمد ہو گئی ہے۔

اخبار مدت سے بند ہیں۔ کبھی کبھی کوئی من چلا ایک صفحہ چھاپ کر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ جونہی اس کا بنڈل ختم ہوا وہ شخص جو اس غیر قانونی اخبارچہ کا مالک، مدیر، ناشر اور ہاکر ہے منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب آج ایسے ہی دو پرچے خرید کر لائے ہیں۔ ایک کا نام بورس ہے۔ قیمت دس ریال۔ تاریخ 26 ر محرم 1399 ھ۔ اخبار کی سرخی ہے۔ "دنیا از کاہش تولید نفت ایران بہ لرزہ در آمد"۔ ایران میں تیل کی پیداوار کی کمی کے سبب دنیا پر لرزہ طاری ہو گیا ہے۔ خود فریب صحافت نے تیل کی بر آمدات میں کمی کو بھی اپنے امتیازات اور کمالات میں شامل کر لیا ہے۔

میں دوسرا اخبار اٹھا لیتا ہوں۔ نام ہے فرمان۔ سارا صفحہ تصویروں سے بھرا ہوا ہے۔ عبارت کہیں کہیں معذرت کے طور پر درج ہے۔ اخبار کا نام وسط میں چھپا ہوا ہے اور اس سے اوپر ایک قطار میں آیت اللہ خمینی، شریعت مداری، خوئی اور مرعشی نجفی کی تصاویر چھپی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی لکھا ہوا ہے کہ آیت اللہ گلپایگانی کی تصویر نہیں مل سکی۔ کوشش جاری ہے۔ آئندہ اشاعت کا انتظار کیجئے۔ صفحہ اول کے درمیان اخبار کے نام کے ساتھ ایک تصویر ڈاکٹر صدیقی کی ہے جن کا نام احتمالی وزیر اعظم کے طور پر بار بار لیا جاتا ہے۔ تصویر میں وہ آقائی اللیہار خاں صالح کی عیادت کر رہے ہیں۔ بیمار اپنے تیمار دار سے زیادہ توانا اور تندرست لگ رہا ہے مگر یہ عمر رسیدہ اور کمزور سا شخص بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ سنا ہے مجلس کے ایک جانے پہچانے، تند خو اور شاہ دشمن رکن داریوش فروہر ڈاکٹر صدیقی سے ملنے گئے اور کہنے لگے کہ آپ جیسے چہرۂ باشرف، پاکدامن، خدمت گزار اور باوجدانی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کابینہ بنانے اور حکومت چلانے جیسے سیاسی اور انتظامی معاملات میں ملوث ہو جائے۔ ڈاکٹر غلام حسین صدیقی نے جواب دیا جو ہر سبق آموز کہانی کے آخری جملہ کی طرح آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ جناب من، اگر آپ قبول کرتے ہیں کہ میں روشن ضمیر، آبرومند، پارسا اور دلیر ہوں اور علاوہ ازیں حسن وطن پرستی رکھتا ہوں تو کیا یہ بات درست ہو گی کہ میں ان ساری خوبیوں کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں۔ حالات کا

تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں میں ان خوبیوں کا عشر عشیر بھی ہو انہیں ملک کی خدمت کے لئے سامنے آنا چاہیئے۔

ملک کی خدمت کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ جب صاحبِ اقتدار کو لوگ ناپسند کرنے لگیں اور اس کی ذات وجہ فساد بن جائے اس وقت برضا ورغبت منظر سے ہٹ جانا ہی قوم اور ملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ عہدہ اور کرسی کا چھوڑنا ہو یا تاج و تخت سے دستبرداری، اگر یہ فیصلہ بروقت ہو تو جانے والا تھوڑی بہت عزت بچا کر ساتھ لے جاتا ہے وگرنہ جانے والا خوار، لوگ خستہ اور ملک خراب۔

آج دس بجے صبح کسی نے ایک خبر سنائی۔ غیر متوقع نہ تھی مگر آج کل افواہوں کا ریلا اتنا زبردست ہے کہ وہ سچ کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔ میں اس خبر کی تصدیق چاہتا ہوں۔ ریڈیو بالآخر تصدیق کرتا ہے۔ اعلان ہوا کہ شہنشاہ ایران خرابی صحت کی وجہ سے رخصت پر جا رہے ہیں۔ رخصت کی تاریخ کا تعین وہ خود فرمائیں گے۔ آج ۳۱ر دسمبر ہے۔ یہ سال بھی کیسا سال ہے۔ طلوع ہوا تو ایران کا شہنشاہ امریکہ کے صدر کارٹر کے ہمراہ جشن رقص و سرود میں شامل تھا اور ختم ہوا تو بادشاہ کی چھٹی کے اعلان کے ساتھ ختم ہوا۔

پرسنل سیکرٹری مسز امینی بھی رخصت پر امریکہ جا رہی ہیں۔ چھٹی ڈیڑھ ماہ کی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ رخصت محض لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ نقل مکانی مستقل ہے۔ آج بھی پچھلے کئی دنوں کی طرح مسز امینی بنک گئیں تاکہ اپنے جمع کئے ہوئے ریالوں کے بدلے ڈالر حاصل کریں۔ ڈالر کیا ملتے ان کے بنک نے ریال دینے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ پریشانی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ بہت ناراض ہیں۔ مگر کس سے ناراض ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر رونا شروع کر دیتی ہیں۔

دفتر کے سامنے چوک میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ وہ جو ہر روز مظاہرین اور وردی والوں کے درمیان ہنگامہ ہوتا ہے یہ اس سے مختلف ہے۔ ایلزبتھ بلوار پر نیلی اسٹیشن ویگن کھڑی کر کے راستہ تنگ کر دیا گیا ہے۔ رائفل بردار نوجوانوں کا ایک گروہ جگا ٹیکس وصول کر رہا ہے۔ میں اپنے دفتر کی کھڑکی سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میرے ساتھ دو چار ساتھی افسر بھی یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک آہستہ سے بولے۔ سر، شہنشاہ کے اس اعلان

کے بعد کہ وہ رخصت پر جا رہے ہیں، اب یہاں کوئی حکومت نہیں رہی۔ جنرل اظہری بیمار اور ناکامیاب۔ صدیقی کی شرائط نامنظور لہٰذا وہ نادستیاب۔ شاہپور نامزد مگر نامقبول۔ روحانیان مقبول مگر ناتجربہ کار۔ ناسازی لشکر کا یہ عالم کہ ادنیٰ فوجی بددل اور بھگوڑا، اعلیٰ فوجی افسر متذبذب اور باہم بیگانہ۔ جرنیلوں اور کمانداروں کے جوڑ بندھے ہوئے ہیں۔ اویسی اور قرہ باغی، قرہ باغی اور شفقت، شفقت اور طوفانیاں، طوفانیاں اور فردست، ربیعی اور آذربارزن۔ عجیب کشتی ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ نہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ تنہا ہے۔ باقی سب اس کے خلاف ہیں۔

بات کرنے والا خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہوں۔ دوسرے ساتھی بھی خاموش ہیں۔ خاموشی سے اداسی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی اداس فضا میں 31 ر دسمبر کا سورج غروب ہو گیا۔

(5)

یکم جنوری

یہ کیسا نیا سال چڑھا ہے کہ جو خبر بھی آتی ہے، خون میں نہائی ہوئی آتی ہے۔ اور غسل کے بعد سیاہ ماتمی لباس پہن لیتی ہے۔ وقت کے صرف دو رنگ ہیں سرخ اور سیاہ۔

مشہد اور زنجان میں فوجی بغاوت۔ سینکڑوں افراد ہلاک۔ سنندج یک پارچہ خون می شود۔ شہر قم یک پارچہ آتش است۔ سپاہیوں نے قم کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ لوگ گھروں میں بند ہیں۔ کشتار عظیم در قزوین۔ اصفہان و نجف آباد میں فداکاری ملت کے مناظر۔ تبریز را در آتش و خون غرق کردند۔ شہر بہ شہر قتل عام شاہانہ۔ قریہ بہ قریہ ایجاد وحشت۔ کوچہ و بازار میں تیرہای ہوائی۔ سرتاسر ایران سیاہ پوش و عزادار است۔

تہران کی بیشتر سڑکیں سنسان ہیں۔ لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ اور اتنی بہت سی فوج نہ جانے کہاں سے آگئی ہے۔ ہر ناکے پر فوج، ہر چوک میں فوج، بند بازار کے اندر فوج، بند دفاتر کے باہر فوج۔ سڑکوں پر گشتی دستے، ہوائی اڈے والی سڑک پر مورچہ بند

فوج۔

ایک سفارت کار نے فون پر کہا۔ ہیپی نیو ایئر۔ یہ تین بے موقع لفظ فضا کو اور زیادہ اداس کر گئے۔ آخر یہ کیا ہے۔ طنز ہے، سادگی یا مغربی روایت کی بے محل پیروی۔

بنک مرکزی میں قیمتی پتھروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ چند ہفتہ قبل ایک افواہ کے مطابق شہنشاہ نے بہت سے جواہرات نکلوا لئے اور ملک سے باہر بھیج دیئے۔ دوسری افواہ کے مطابق فوج نے جواہرات والے علاقہ میں بار بار کرفیو اس لئے لگایا کہ وہ جواہرات کو محفوظ مقام پر منتقل کرنے کے بہانہ اس دولت میں سے اپنا حصہ حاصل کر لے۔ ایک بیان ہے کہ شاہ خائن سے شاہی خزانہ ہر قیمت پر واپس لیا جائے گا۔ دوسرا بیان ہے کہ اگر بنک والوں نے جواہرات شہنشاہ کو دے دیئے تو قوم ان کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ایک لطیفہ کے مطابق جواہرات خورد برد نہیں ہوئے۔ بالکل محفوظ ہیں۔ ان کی حفاظت کے نئے الیکٹرونکی اور دشوار گیر حفاظتی انتظامات میں بہت سی چابیاں بہت سے بٹن اور بہت سے کوڈ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سارا کام بہت سے کارکن مل کر کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو یرغمال بنا لیا گیا ہے۔ بعض فرار ہو گئے ہیں۔ کچھ ڈر کے مارے روپوش ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں خزانہ تک پہنچنے کے سارے راستے بند ہیں۔ عجیب صورت حال ہے۔ نگہبان غائب لہٰذا خزانہ محفوظ۔ الٹی بات ہی سیدھی نکلی۔

2 ر جنوری

آج میں اس لئے دفتر نہیں جا سکتا کیونکہ میری سرکاری موٹر میں پٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ اور یہ واقعہ اس شہر میں پیش آیا ہے جو دنیا میں تیل پیدا اور بر آمد کرنے والے ایک ممتاز ملک کا دارالسلطنت ہے۔ ہنگاموں سے پہلے یہ ملک تقریباً دو سو ملین ٹن سالانہ کے حساب سے تیل پیدا کر رہا تھا۔ یومیہ پیداوار کوئی چار ملین بیرل یعنی اکتیس بتیس ملین لیٹر بنتی ہے۔ ایک لیٹر تیل فل سائز کی بوتل میں آ جاتا ہے۔ ہر بوتل میں تیل کے ہزاروں قطرے ہوتے ہیں۔ اس سارے حساب کتاب کے باوجود میری موٹر میں اس وقت پٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ تیل تیل زیر زمیں تیل ہی تیل۔ ہڑتال ہڑتال بر سر زمین ہڑتال ہی ہڑتال۔

میں نے ایک ترک سفارت کار کو فون کیا کہ اگر میرے گھر کے راستہ سے ہو کر دفتر

جانے میں جو لیٹر دو لیٹر زائد پٹرول خرچ ہو گا اس کی گنجائش ہو تو مجھے ہمراہ لے لینا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آگئے۔ راستہ میں ایک پٹرول پمپ پر موٹروں کی قطار لگی ہوئی دیکھی۔ ہم نے اس کی لمبائی چوڑائی دیکھ کر حساب لگایا تقریباً ایک ہزار موٹریں وہاں کھڑی تھیں۔ نہ جانے کب سے اور نہ جانے کب تلک۔

دفتر پہنچے۔ یونیورسٹی کی جانب سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ خاصا گہرا ہے۔ ایک دل جلے نے کہا۔ پٹرول آخر کیسے ملے۔ ایک اس کی رسد کم ہے۔ دوسرا آگ لگانے کے لئے اس کا استعمال اتنا عام ہو گیا ہے کہ موٹروں کے لئے کچھ بچتا ہی نہیں۔

وہ دن گئے جب کسی علاقہ میں معمولی ہنگامہ ہونے کے بعد شہر میں کھلبلی مچ جاتی تھی۔ اب لوگ عادی ہو گئے ہیں۔ جائے واردات کے گھماؤ سے دو تین سو میٹر کے فاصلہ کو محفوظ علاقہ سمجھ کر کسی بھگدڑ اور ہلچل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ آر سی ڈی کے دفتر کی چوتھی منزل کی کھڑکی سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہم لوگ صوفہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ شیشہ کی میز پر چائے اور کافی رکھی ہوئی ہے۔ آگ دھوئیں اور چائے کافی کے درمیان ذرا سا فاصلہ ہے۔ یہی کوئی سو دو سو میٹر ہو گا۔ اس فاصلہ کے ایک طرف آگ، لہو اور انقلاب ہے اور دوسری طرف تماشا بینی، سفید خون اور ٹھنڈا سفارتی گوشت۔

رضوانی کہتے ہیں کہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ دراصل ہم سب جو یہاں بیٹھے ہیں اور وہ سب جو ہمیں دفتر کی کھڑکی سے نیچے چوراہے پر آتے جاتے نظر آ رہے ہیں ایمرجنسی کی طوالت کے باعث تھکاوٹ محسوس کر رہے ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ مگر ہر شخص تھکا ہوا ہے۔ حکومت بھی تھک گئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پورا ملک تھکن کے مارے ڈھیر ہو جائے۔

6 / جنوری

میں ملک کو بچانے کے لئے آیا ہوں۔ میں اسے تباہ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ نئے وزیراعظم شاہپور بختیار کی آواز ہے۔ بعض لوگوں نے جوش اور ناواقفیت کی وجہ سے خیانت اور جنایت کا محاسبہ خود ہی شروع کر دیا ہے۔ عزیزانِ من، ایسے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں مت لیجئے۔ سقوط رژیم اور برقراری نظام عدل اسلامی کا انتظار کیجئے۔ یہ طالقانی کی آواز ہے۔ ہماری جدوجہد تا بہ وصول نتیجہ جاری رہے گی۔ حکومت اسلامی کے قوانین اسلامی

قوانین ہوں گے۔ میں کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔ حسب سابق ہدایت ملت پر اکتفا کروں گا۔ امریکہ چاہتا ہے کہ سارے ملک اس کے مطیع ہو جائیں مگر یہ بات ہمیں قبول نہیں ہے۔ مستقبل قریب میں ہم شاہ کو ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ توانا آوازیں پیرس کے مضافات سے آرہی ہیں۔ ایک نحیف سی آواز سعد آباد پیلس سے بھی آرہی ہے۔ میں چھٹی پر جانے کی تاریخ خود طے کروں گا۔

آج کا دن بڑا اہم اور یادگار دن ہے۔ آج پورے باسٹھ دن کے بعد اخباروں کی ہڑتال ختم ہوئی ہے۔ اس دس ہفتہ میں کتنی بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ جس شخص کا نام چھاپنا بھی ممنوع تھا اس کی بڑی بڑی تصویریں ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر چھپی ہوئی ہیں اور وہ شخص جس کے نام اور کام سے اخبار بھرے ہوتے تھے اس کا نام اب خوردبین لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

ایران کے ایک بادشاہ کے پاس ایسا جام ہوا کرتا تھا جس کے ذریعہ وہ آنے والے دور کی خبریں وقت سے پہلے پڑھ لیتا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ بادشاہ وقت کو دو مہینے سے پڑھنے کے لئے کوئی مقامی اخبار نہیں ملا۔ مستقبل تو ایک طرف رہا وہ حال اور صورت حال سے بھی ناواقف ہے۔ آج جو کچھ اخبارات میں چھپا ہے اس کے پیش نظر کون سا وزیر حضوری اتنا ناعاقبت اندیش ہو گا جو ان اخبارات کو ملاحظہ عالی کے لئے حضور ہمایونی میں پیش کرے۔ اندریں حالات شہنشاہ کے لئے اخباروں کی ہڑتال ابھی جاری ہے۔ عوام البتہ موج منا رہے ہیں۔ تین اخبار تو ہر ایک نے خریدے ہیں۔ اطلاعات، کیہان اور آیندگان۔ کوئی شخص دوسرے کو اپنا اخبار دینے کا روادار نہیں کیونکہ اس نے ہر پرچہ کو ابھی صرف دو بار پڑھا ہے اور طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ آج رات بہت سے لوگ تکیہ کے بجائے سر کے نیچے اخبار رکھ کر سوئیں گے۔

میں پارک شہنشاہی کی طرف روانہ ہوا۔ دائیں بائیں دیکھتا ہوا۔ گاہے مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوا۔ سنسان علاقہ میں اکیلے غیر ملکی کو لڑکے بالے گھیر لیتے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ اس لئے میں وسوسوں میں گھرا ہوا ہوں۔ ایسی سیر سے ہاتھ پیر کو جو دفتر اور گھر میں بند اور بے حرکت رہنے کی وجہ سے سست ہو جاتے ہیں بڑا فائدہ پہنچتا ہے مگر انسانی جسم کے اندر جو کیمیاوی کارخانہ کام کر رہا ہے اس پر اس کا اثر بڑا خراب ہوتا ہے۔ یہ کارخانہ ایسے حالات

کے تحت کبھی خون میں شکر کی مقدار کا اضافہ کر دیتا ہے، کبھی خون کے دباؤ کو بڑھا دیتا ہے، کبھی جوڑوں کے درد کے لئے ہڈیوں کو گلا دیتا ہے۔ یہ اسی کارخانہ کی کارکردگی کا شاخسانہ ہے کہ اچھا خاصا خوش مزاج آدمی جھگڑالو بن جاتا ہے۔ دفتر سے بیزار، بیوی سے ناراض، بچوں سے خفا، نوکروں کے لئے سراپا آزار۔ اور جب وہ لوگوں سے لڑنے جھگڑنے سے فارغ ہوتا ہے اور اسے تنہائی میسر آتی ہے تو وہ اپنی ذات کو دو حصوں میں بانٹ کر ان میں لڑائی کرا دیتا ہے۔

میں پارک کی سیڑھیاں چڑھ کر جھیل کی طرف جا رہا ہوں۔ سیڑھیوں کے ساتھ منڈیر پر دونوں طرف بادشاہوں کے تانبہ میں ڈھلے ہوئے سر نصب ہیں۔ یہ سائرس وہ دارا اور اس کے بعد کسریٰ۔ سارے بادشاہوں نے یہی تین نام آپس میں تقسیم کر لئے ہیں۔ بس سن جلوس کے حساب سے انہیں نمبر شمار ملے ہوئے ہیں۔ سیر کرنے والے اب گستاخ ہو گئے ہیں۔ ان مجسّموں سے مذاق کرتے ہیں۔ ایک بادشاہ کے سر پر آئس کریم کا کپ الٹا رکھا ہوا ہے۔ آئس کریم بہ کر اندھے ڈھیلوں کو سفید کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کو کراہت ہوتی ہے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چبوترے پر پہنچ جاتا ہوں۔ جھیل کا پانی گدلا ہے۔ سبزہ کہرے کی وجہ سے مرجھا گیا ہے۔ جانوروں کو کئی دن سے کسی نے دانہ نہیں ڈالا۔ مور میلا میلا لگ رہا ہے۔ مرغِ زرّیں کے پروں میں وہ پہلی سی چمک دمک نظر نہیں آتی۔

خیابان پہلوی پر ایک دیوانہ نظر آیا۔ اس نے اینٹ اٹھائی ہوئی ہے۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ کسی راہ گیر نے اسے چھیڑ دیا۔ وہ اینٹ لے کر لوگوں کی طرف دوڑا۔ سیر کے لئے آنے والے تتر بتر ہو گئے۔ ذرا فاصلہ پر ایک فوجی دستہ کھڑا ہے۔ ایک سپاہی دیوانہ کی طرف لپکا۔ چند قدم گیا ہو گا کہ اس کے افسر نے واپس بلا لیا۔ میں نے اسے ایک اچھا شگون سمجھا۔ ان دنوں فوج کو واپس بلانے میں ہی عافیت ہے۔ دیوانوں سے ٹکر لی تو نقصان اٹھائے گی۔

میں بستر میں لیٹا ہوا ہوں۔ کمبل کے اوپر پولیسٹر کی رضائی ہے جو بار بار پھسل جاتی ہے۔ میں اس کے اوپر دوسرا کمبل ڈال دیتا ہوں۔ گیس کا چھوٹا سا فرانسیسی لمپ جس کا اوپر کا حصہ دودھیا شیشہ کا اور نچلا نیلے رنگ کا حصہ دھات کا ہے بڑی تیز روشنی دے رہا

ہے۔ میں اس روشنی میں اخبار پڑھنا شروع کرتا ہوں۔ میری نظر نئے وزیر اعظم کے بیانات پر پڑتی ہے۔ میں تحریک آئین جمہوری کے ایک سردار کا بیٹا اور ملت کے رہبر عظیم ڈاکٹر محمد مصدق کا ایک وفادار ترین دوست قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے آخری سانس تک ملک کے دشمنوں سے جنگ کروں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس سرزمین میں اسلام کو رائج کروں گا اور دوسرے مذاہب کی عزت کروں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایران اور اہل ایران کو نقصان پہنچانے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ سارے سیاسی قیدی رہا کر دوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ فرد کی آزادی اور حقوق بشر فوراً بحال کروں گا ...... کوئی تہدید یا تردید مجھے راہ خدمت گزاری سے ہٹا نہ سکے گی۔ من مرغ طوفانم نیندیشم ز طوفاں۔ میں مرغ طوفان ہوں طوفان سے نہیں ڈرتا۔ ادھر مرغ طوفان قسمیں کھانے میں لگا ہوا ہے ادھر طوفان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نیشنل فرنٹ اعلان کرتا ہے کہ شاہپور بختیار کو پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ پیرس سے خبر آتی ہے کہ نئی حکومت بالکل غیر قانونی ہے۔ اسے شاہ نے بنایا ہے جس کی بادشاہت بذات خود خلاف قانون ہے۔ اسے پارلیمینٹ کے جن دو ایوانوں نے اعتماد کی رائے دی ہے ان کی تشکیل بھی خلاف قانون ہے۔ گویا ہر قدم خلاف قانون ہر بات خلاف شرع۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ عہدہ کا حلف اٹھانے کے بعد کوئی وزیر بھی اپنی وزارت کی عمارت میں داخل نہیں ہو سکا۔ ساری سڑکوں پر مظاہرین نے روک لگا رکھی ہے۔ سارے راستے انقلاب نے بند کر دیئے ہیں۔

میں گرم بستر سے باہر نکلتا ہوں۔ فارسی لغت اٹھاتا ہوں تاکہ یہ پتہ کروں کہ مرغ طوفان کس پرندہ کو کہتے ہیں۔ لغات میں سوائے مرغ طوفاں کے باقی ہر طرح کے مرغ کا ذکر ہے۔ عیسیٰؑ کا مرغ اور سلیمانؑ کا مرغ، چمن کا مرغ اور خانگی مرغ، سحر کا مرغ اور آبی مرغ۔ شاخدار مرغ اور مگس خور مرغ۔ میرے پاس مرزا علی اکبر دہخدا کی وہ فرہنگ نہیں ہے جو الفاظ کا ایک قابل ستائش، قابل رشک اور قابل تقلید انسائیکلوپیڈیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس فرہنگ کی میم کی پٹی والی جلد چھپ چکی ہے یا چھپنے والی ہے۔ میں اپنی کرید جاری رکھتا ہوں۔ مرغ کو چھوڑ کر طوفاں کے معنی تلاش کرتا ہوں۔ ایک لغت میں لکھا ہے، انقلاب شدید در ہوا۔ اس وقت ایران میں جو انقلاب برپا ہے وہ صرف ہوا میں

نہیں بلکہ ساری فضا اور سارے ماحول میں ہے۔ کوئی پرندہ اتنے شدید انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایسے حالات میں پرندہ اپنی تھوڑی سی عقل، بڑے سے حوصلہ اور خوش. نما مگر توانا پر و بال سے کام لیتا ہے اور اڑ کر کہیں دور چلا جاتا ہے۔

دوبارہ بستر پر لیٹا۔ ذرا سی دیر کی غیر موجودگی میں بستر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ نیند جو میری ہم آغوش تھی وہ بھی اٹھ کر کہیں چلی گئی ہے۔ ناراض ہے کہ تم مجھ سے زیادہ لغت کو عزیز رکھتے ہو۔ میں دل کو سمجھاتا ہوں۔ یوں جاگنے سے کیا فائدہ۔ سو جاؤ۔ آرام کرو۔ کوئی طوفان نہیں آیا۔ احتجاج ہے نہ مظاہرہ، شورش ہے نہ بغاوت، گولی ہے نہ خون۔ دل کہتا ہے۔ تم جو کچھ کہتے ہو وہ درست ہو گا مگر سونے اور نہ سونے پر اب مجھے اختیار نہیں رہا۔ ذرا بتاؤ کہ یہ شور کیسا ہے۔ کان بج رہے ہیں یا باہر کہیں گولی چل رہی ہے۔

(6)

8 ر جنوری

سارے ملک میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ جابجا گولی چل رہی ہے۔ مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کل بھی ہڑتال تھی اور آج بھی ہڑتال ہے۔ حکومت چونکہ ہڑتال روک نہیں سکتی اس لئے وہ بھی کوئی بہانہ بنا کر ہڑتال کی اپیل میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ ملک روز روز کی ہڑتالوں سے ہلکان ہو چکا ہے۔

آج ایک طویل آزاد نظم پڑھنے کو ملی۔ عنوان ہے۔ زبان حال۔ اس کا ایک مختصر بند پسند آیا۔ میں نے نقل کر لیا۔

میہن
جائے است
کہ می تواں دراں
گرفت
بست

زد

کشت

کشت

و تقدیر شد......

صدائے گلولہ......

وطن فردش راکشتند۔ توی کوچہ

جاسوس بود

نان می خواست

خانہ می خواست

و می گفت آزادی۔

وطن وہ جگہ ہے کہ جہاں یہ ممکن ہے گرفتار کر لو۔ قید میں ڈال دو۔ مار پیٹ کرو۔ جان سے مار دو۔ جان سے مار دو۔ اور کہہ دو قضا میں یہی لکھا تھا۔ گولیوں کی آواز...... وطن فروش کو ہلاک کر دیا۔ کوچہ کے اندر۔ جاسوس تھا۔ (کھانے کے لئے) روٹی مانگتا تھا۔ (رہنے کے لئے) مکان چاہتا تھا۔ اور کہتا تھا مجھے آزادی چاہیئے۔

شاعر نے بات کھل کر کی ہے۔ رسالہ نے ہمت کر کے چھاپ دی ہے۔ مگر ابھی شاعر کو سامنے آنے میں تامل ہے۔ اپنے نام ابجد کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اتا پتا صرف اتنا ہے۔ م۔ ع۔ الف۔

دو دن کی ہڑتال سے صاف ظاہر ہے کہ نیشنل فرنٹ نام کی سیاسی پارٹی پچیّس برس شاہ کی مخالفت کرنے کے باوجود شاہ کی وارث نہیں بن سکتی۔ شاہ کی وراثت اس شخص کے حصہ میں آئے گی جسے اہل ایران نے چودہ برس سے دیکھا بھی نہیں۔ اس مدت میں کسی اخبار نے اس شخص کا بیان چھاپا نہ کسی رسالہ نے اس کی تصویر شائع کی۔ وہی بے تصویر چہرہ اب ایران کی تقدیر اور اس کا مستقبل ہے۔

9ر جنوری

کل رات جب ہم لوگ سوئے تو زمین خاکی تھی، مکان خاکستری، سڑک سیاہی مائل،

گھاس مٹیالی سبز اور کاج کے نوکدار پتے گہرے سبز۔ علی الصبح میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ ہر شے سفید رنگ کی نظر آئی۔ حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کو اس منظر نے بڑی ٹھنڈک پہنچائی جو دل سے ہوتی ہوئی رگ و پے میں سما گئی۔ سرما کی پہلی شدید برف باری رات کے پچھلے پہر ایسے چپ چاپ ہوئی کہ صبح ہونے تک کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبحدم جو دیکھا تو ہر شے برف سے ڈھکی ہوئی پائی۔ تازہ، دودھیا، نرم، شفاف، بے داغ برف۔ جہاں بھی برف کو پاؤں دھرنے کی جگہ ملی وہاں اس نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے۔ کچھ عارضی ٹھکانے ہیں۔ سورج نکلے گا تو پانی بن کر بہ جائیں گے۔ کچھ دیرپا ہیں۔ جب تک سردیاں ہیں اس وقت تک وہ بھی برقرار ہیں۔

بالکنی کی منڈیر پر برف کی سفید لکیر بنی ہوئی ہے۔ گلاب کے سخت جان کانٹوں کی نوک پر بھی شبنم کا موتی جم کر رہ گیا ہے۔ کاج کے تنہ میں کسی نے سفید سلائیاں چبھو دی ہیں۔ کالے پھاٹک پر راتوں رات کسی نے سفید رنگ کر دیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں کوئی اس کے سنہری ہینڈل اتار کر لے گیا ہے اور ان کی جگہ سفید چاندی کے ہینڈل لگا کر چلا گیا ہے۔ گھر کے لان میں واقع تیراکی کا تالاب جس کی گہری نیلی ٹائلیں ہر وقت پانی کو آسمانی بنائے رکھتی تھیں آج زمین میں شیشہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ میں نے پردہ بند کیا اور اپنے دو ٹین ایجر بچوں کے کمروں کی طرف بھاگا۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا کہ آؤ ایک عجیب و غریب منظر دکھاؤں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے میرے پیچھے آئے۔ میں نے ماسٹر بیڈ روم کے باہر کی جانب والی شیشہ کی دیوار کے پاس انہیں کھڑا کیا اور یکدم دیواری پردے کے ایک پرت کو جھٹکے کے ساتھ دائیں اور دوسرے کو بائیں طرف ہٹا دیا۔ حیرت سے جو دبی دبی چیخ سلمان کے خشک حلق سے نکلی وہ سننے کے لائق تھی۔ مسرت سے جو چمک عالیہ کی آنکھوں میں پیدا ہوئی وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ جن کے لئے دنیا محض مٹی، ریت اور گرمی سے عبارت تھی وہ برف کدہ کی پہلی صبح کے پر جلال نظارہ میں کھو گئے۔ بچوں کو حیرت زدہ اور خوش دیکھ کر جو والدینی مسرت مجھے ہوئی وہ ساری عمر یاد رہے گی۔

آج کا دن محمد رضا شاہ کو بھی ساری عمر یاد رہے گا۔ وہ جن کا ہاتھ اس کی پشت پر تھا انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ امریکہ نے کھلے بندوں آج سے شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ایک بیان چھپا ہے کہ ہم شاہ کے ہوا خواہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ

کو ملک چھوڑ کر چھٹی پر چلا جانا چاہئے۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔
اگر شاہپور بختیار نے شہنشاہ کو ایران سے باہر جانے کی اجازت دی تو گویا وہ اپنے پروانہ مرگ پر دستخط کر دے گا۔ ایک بیان۔ اگر شاہ ملک چھوڑ کر چلے گئے تو کمیونسٹ اس پر غالب آجائیں گے۔ دوسرا بیان۔ اور یہ بیان بری فوج کے ہوائی دستہ کے کمانڈر منوچہر خسرو داد کا ہے۔ ایران ایک گلا سڑا سیب ہے۔ کسی وقت بھی درخت سے زمین پر گر پڑے گا۔ تیسرا بیان۔ یہ خروشیف کا بیان ہے اور کئی سال پرانا ہے۔ آج یاد آرہا ہے اور تازہ خوشبو دار سیب کی طرح لگ رہا ہے۔ بختیار آخری آئینی حل ہے۔ چوتھا بیان۔ یہ امریکی سفارت کا بیان ہے۔ اب حل آئینی نہیں انقلابی ہو گا۔ پانچواں بیان۔ یہ نیشنل فرنٹ کے کریم سنجابی کا بیان ہے۔ یہ امت بیانات میں کھو گئی۔

ہنگاموں کا سب سے زیادہ زور تبریز میں رہا۔ بنک، دفاتر، سینما، دکانیں، بسیں اور موٹریں جلائی گئیں۔ آخری اطلاع آنے تک آگ ابھی تک بجھی نہیں۔ تہران کیوں پیچھے رہ جاتا۔ ہنگاموں نے یہاں بھی خوب زور باندھا۔ فرق اتنا ہے کہ رات جو برف پڑی تھی اس نے آگ بجھا دی ہے۔ البتہ یہاں ایک اور آگ بھڑک اٹھی ہے جسے یہ برف باری بھی نہیں بجھا سکتی۔ یہ انتقام کی آگ ہے۔ کل تہران کے مضافات میں لوگوں نے دو ڈاکو پکڑ لئے۔ کلانتری نے کہا انہیں آیت اللہ خمینی کے پاس پیرس لے جاؤ۔ لوگ انہیں تھانہ سے باہر لائے۔ عدالت لگائی۔ سزائے موت سنائی۔ ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ عوامی عدالت کا بر سرعام سزا دینا انقلاب کی ایک شرط ہوا کرتی ہے۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی۔ تہران پیرس بن گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی والا انقلابی پیرس۔

اخبارات آج کل ان لوگوں کی تصویریں شائع کر رہے ہیں جو کل تک عقل کل اور مختار کل تھے اور آج اقتدار سے محروم ہی نہیں بلکہ سرکاری مہمان بنے ہوئے ہیں۔ امیر عباس ہویدا سابق وزیراعظم کے جیل کے کمرے میں قالین بچھا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور تازہ سنترے رکھے ہوئے ہیں۔ گیلان کے وہ چھوٹے سنترے جن کی وجہ سے حکومت ایران کی وزارت تجارت کو پاکستان سے کینو کی درآمد پر پابندی لگانی پڑی تھی۔ چار پانچ سال میں درآمد کا یہ حال ہو گیا تھا کہ سردیوں میں ہر دوسرے دن ایک اسپیشل مال گاڑی کینو سے لدی ہوئی زاہدان پہنچتی تھی۔ اتنی بڑی مقدار میں درآمد ہونے کے باوجود یہ پھل مہنگے

داموں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا۔ گیلانی سنترے کا گاہک ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا تھا۔ شاید ان کا بہترین استعمال یہی ہے کہ وہ جیل خانہ میں قیدیوں کو سزا کے طور پر کھانے کے لئے دیئے جائیں۔

ایک تصویر ہمایوں داریوش کی ہے۔ اس ذات گرامی کو ہنگاموں کا آخری اور فیصلہ کن دور شروع کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ چند ماہ پہلے وزیر اطلاعات تھے۔ آیت اللہ خمینی کے خلاف وہ حد اعتدال سے گرا ہوا تنقیدی مضمون انہی کی وساطت سے چھپا تا جسے پڑھتے ہی لوگ ایسے مشتعل ہوئے کہ آج تقریباً ایک سال کے بعد بھی ان کے جذبات ٹھنڈے نہیں پڑے۔ کفارہ کے طور پر وزیر موصوف نے ڈاڑھی رکھ لی ہے مگر کوئی اس طرف دیکھتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں مجھے اوپر سے بند لفافہ میں ایک مضمون ملا تھا کہ اسے فوراً چھپوا دو۔ میں نے مضمون پڑھے بغیر حکم کی تعمیل کی مگر کوئی میری بات سنتا ہی نہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں آرام کی خاطر بال بچوں کے ساتھ ملک سے باہر جارہا تھا۔ سفر کے لئے ڈیڑھ ملین ریال کا زرمبادلہ حاصل کیا تھا۔ آدھی رقم باہر بھیجنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ کسی تفتیش کے سلسلہ میں میری ضرورت ہے میں نے پروگرام ملتوی کر دیا۔ ملک میں ٹھہر گیا۔ زرمبادلہ کی نصف رقم بھی ملک میں ہے البتہ میں جیل میں ہوں۔ حاشیہ لگانے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ ایک صاحب یہ خبر پڑھ کر خود ہی ایک عدالت سجاتے اور حکم لگاتے ہیں۔ بیچارہ سچ کہتا ہے۔ اسے اوپر سے حکم ملا۔ شاہ، فوج یا ساواک کا۔ اس نے حکم کی تعمیل میں بند لفافہ اس قابل اعتماد صحافی کو دے دیا جو اس مضمون کے ملنے کے بعد اسے اپنے دفتر میں گھومتا ہوا نظر آیا۔ یہ شخص واقعی بے قصور ہے۔ اس الزام سے اس ملزم کو بری کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا مقدمہ دائر کیا جاتا ہے۔ نااہلی اور خونریزی کا۔ اس وزیر بے تدبیر نے بغیر پڑھے ایک ایسی تحریر کی اشاعت کا حکم دیا تھا جس کے چھپنے کے بعد اب تک سینکڑوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ جرم ثابت۔ مجرم سزائے موت کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ یہ عدالت کسی شخص کو اس کے حق سے زیادہ عرصہ تک محروم نہیں کرنا چاہتی۔ اسے فوراً گولی مار دی جائے۔

اخبار میں ایک تصویر جنرل نصیری کی بھی چھپی ہے۔ پاکستان میں چند ماہ سفیر رہے اور وہاں سے سیدھے ایرانی جیل میں پہنچے۔ اخبار لکھتا ہے کہ انہوں نے طنزاً فرمایا، اس

کال کوٹھری میں میری تصویر کھینچنے کا کیا فائدہ۔ لوگ اب کسی بات کا اعتبار نہیں کرتے۔ تصویر دیکھیں گے اور کہیں گے کہ حکومت ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی ہے۔ بھلا جنرل نصیری، ساواک کا سابق سربراہ، قید ہو سکتا ہے۔ وہ تصویر اتروانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے جیل میں اس طرح آیا ہو گا جیسے ایکٹر فلم کے سیٹ پر آتے ہیں۔ تصویر بنوا کر وہ ملک سے فرار ہو گیا ہو گا۔

اخبار کا پہلا صفحہ ماضی کے وزیروں اور حال کے اسیروں کی تصاویر سے بھرا پڑا ہے۔ فریدوں مہدوی وزیر تجارت۔ کینو والے۔ شیخ اسلام زادہ۔ وزیر صحت۔ بنکاک کی عیش گاہوں میں جام صحت نوش کرنے والے۔ منوچہر روحانی وزیر زراعت۔ حلال و حرام کا فرق مٹانے والے۔ قصہ یوں ہے۔ وزارت زراعت کی نئی فلک شگاف بیس منزلہ عمارت کی بغل میں آر سی ڈی کا سیکرٹریٹ واقع ہے۔ ایک دن وزارت زراعت کے اجلاس میں شرکت کے بعد اقوام متحدہ کے ایک مشیر مجھے ملنے کے لئے آ گئے۔ کہنے لگے۔ ایران میں پروٹین کی کمی دور کرنے کے معاملہ پر غور ہو رہا تھا۔ دوسرے ملکوں سے اتنی بڑی مقدار میں گوشت درآمد کرنا پڑتا ہے کہ مقامی پیداوار بڑھانے کے سارے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ وزیر زراعت نے فرمایا کہ لحمیات کی کمی پوری کرنے کے یہ سارے منصوبے اپنی جگہ درست ہیں مگر ان پر عمل کرنے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے۔ فوری حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم سوئر پالنے اور اس کا گوشت استعمال کرنے کے منصوبہ پر پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ دیں۔ یہ وزیر واقعی بھوک سے بہت بے تاب لگتا ہے۔ اتنی بے تابی دیکھی نہیں جاتی۔ حرام حلال کر دیا جاتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف حرام کیا ہے مردار کو، اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر بھی جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص کو کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے۔" جب اس وزیر کی توجہ ایف اے او کے مسلمان مشیر نے لحم الخنزیر کے حرام ہونے کی طرف مبذول کرانی چاہی تو وزیر محترم نے بات کاٹ دی اور ایسے غصے کی نگاہ سے دیکھا جیسے وہ انہیں کچا چبا جائے گا۔ پھر چبا چبا کر انگریزی بولی۔ سوال کیا۔ آپ کس قماش کے انسان ہیں۔ کنزرویٹو، آرتھوڈاکس، فنڈامنٹلسٹ، دقیانوسی اور لکیر

کے فقیر۔ رسمی اور محدود نظر۔ کٹر اور متعصب۔

10 ر جنوری

شہنشاہ نے اعلان کیا ہے کہ شاہی خاندان کی ساری جائیداد پہلوی فاؤنڈیشن کو ہبہ کر دی گئی ہے۔ اتنا بڑا انقلابی قدم اتنی دیر سے اور ایسے حالات میں اٹھایا گیا ہے کہ اس اعلان میں رضا و رغبت کا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔ سراسر مجبوری۔ جیسے کوئی چور فرار ہوتے ہوئے یہ اعلان کر دے کہ وہ سارا سامان جو میں ہمراہ نہیں لے جاسکا اسے میں اہل خانہ کے لئے وقف کرتا ہوں۔ لوگوں کو ایسے مضحکہ خیز اعلانات پر اب ہنسی بھی نہیں آتی۔ گیا ہے وقت نکل۔ اس قسم کے اعلانات سے وہ واپس آنے سے تو رہا۔

شاہپور بختیار نے مجلس میں اعلان کیا ہے کہ وہ ایک نئے قانون کا مسودہ ایوان میں پیش کریں گے جس کی رو سے موجودہ ہنگاموں میں مرنے والوں کو سرکاری طور پر شہید کا درجہ دیا جائے گا۔ اس اعلان پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ ایک حکومت جھگڑے میں ایک طرف سے مرنے والوں کو سرکاری شہید قرار دے گی۔ مخالف حکومت آئے گی اور وہ دوسری طرف سے مرنے والوں میں شہادت کی اسناد تقسیم کرے گی۔ اس طرح شہیدوں کی روحیں جنت میں بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں گی۔ دونوں کے ہاتھوں میں شاہپور بختیار کے اس نئے قانون اور اس میں ترمیم کا مسودہ ہو گا۔ اتنے میں تیسری حکومت کا دور آ جائے گا۔ سفارش چلے گی۔ جعل سازی ہو گی۔ سرکاری کاغذات میں تحریف ہو گی۔ اور وہ سب کچھ ہو گا جو متروکہ جائداد کے قانون کو نافذ کرتے وقت پاکستان میں کئی سال تک ہوتا رہا۔ بعض زندہ اشخاص اپنی شہادت کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور انہیں دکھا کر شہری سکنی اور دیہی زرعی زمین انعام کے طور پر اپنے مرحوم نام پر الاٹ کرا لیں گے۔ پکڑے جانے پر سپریم کورٹ تک مقدمہ بازی ہو گی۔ وکیل صفائی یہ ثابت کرنے میں پورا زور صرف کرے گا کہ شہید زندہ ہوتا ہے۔ تاویل کا باب کھلے گا۔ قرآن کو پاژند بنانے کی کوشش ہو گی۔ حوالہ دیا جائے گا۔ ”اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے“۔ عدالت نظریۂ ضرورت کا سہارا لے گی۔ جعل ساز مقدمہ جیت جائیں گے۔

گھنٹی بجی۔ خانساماں قربان حسین پھاٹک تک گئے۔ پہلے پوٹھواری میں اردو ملائی پھر اس ملغوبہ میں بڑے فخر سے فارسی کے وہ چار پانچ الفاظ شامل کئے جو انہوں نے بڑی مشکل سے پچھلے تین ماہ میں سیکھے ہیں۔ گفتگو کی کوشش ناکام ہوئی۔ بڑبڑاتے ہوئے واپس آئے۔ میں خود دروازے پر پہنچا۔ دیکھا ایک ٹینکر والا کھڑا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا آپ کو فرنس آئل درکار ہے۔ میں نے دام پوچھے۔ جواب ملا 15 ریال فی لیٹر۔ یہ سرکاری نرخ سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ اگرچہ گھر ٹھنڈا ہے۔ انجن روم خاموش ہے۔ ہمیں اتنی سردی کی عادت نہیں۔ مگر کیا کریں اتنے اسراف کی بھی عادت نہیں ہے۔ میں گھر کے زیر زمین ٹینک میں دو ہزار روپیہ کی بجائے دس ہزار روپیہ کا فرنس آئل ڈلوانے کا روادار نہیں ہوں۔ خیلے متشکرم کہا اور انکار کر دیا۔ وہ شخص اگلے گھر کی طرف چلا گیا۔ بلیک مارکیٹ اب برسرعام گھروں کے دروازے پر دستک دینے اور گھنٹی بجانے لگی ہے۔

13 رجنوری

تہران یونیورسٹی کا بست ختم ہو گیا ہے۔ آیت اللہ طالقانی اور کریم سنجابی نے تقریریں کیں۔ دو تین لاکھ کا مجمع تھا۔ پہلے اس پلیٹ فارم سے صرف اشتراکی تقریریں کیا کرتے تھے۔ اب روحانیون بھی اسے استعمال کر رہے ہیں۔ نیشنل فرنٹ کے مقرر تیسرے درجہ پر ہیں۔ کل تک بولنے والے منقار زیر پر تھے یا خود ہی زیر زمیں تھے۔ اب یہ کفن پھاڑ کر بول رہے ہیں۔ جس دن سے شاہ کے چھٹی پر جانے کی خبر آئی ہے اس روز سے شہنشاہ کی مذمت سے لوگوں کو گرمانا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر جلد ہی کوئی اور موضوع میسر نہ آیا تو جلسوں کی رونق ماند پڑ جائے گی۔ ہر مقرر کوئی نیا شگوفہ کھلانے یا نیا شوشہ اٹھانے پر مجبور ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہنشاہ کی جگہ امریکہ کو ملنے والی ہے۔ اس سپر پاور کو جتنا برا بھلا کہیں داد اسی نسبت سے زیادہ ملتی ہے۔

مجلس میں بحث جاری ہے۔ گاہے ٹی وی پر دکھائی جاتی اور گاہے ریڈیو پر سنائی جاتی ہے۔ اخبارات بھی مزے لے لے کر روداد چھاپتے ہیں۔ یہ اظہار رائے کی آزادی بھی بارہ مسالے کی چاٹ ہے۔ مجلس کا ایک رکن کہتا ہے۔ جناب وزیر اعظم آپ انقلاب کے خلاف ہیں اس لئے آپ کی حکومت کی کامیابی ناممکن ہے۔ دوسرا مقرر کہتا ہے آپ کو امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ سنا ہے جنرل ہیوزر فوج کو آپ کے حق میں ہموار کر رہا ہے۔ آپ

خود مختار نہیں ہیں۔ آپ کے پاس کسی دوسرے کا دیا ہوا مختار نامہ ہے۔ دکتر داریوش نے کہا۔ وزیر اعظم بختیار، تم مطلبی اور موقع پرست ہو۔ اشرف حریری نے کہا۔ حکومت میں حکمرانی کی صلاحیت اور قوت ہی نہیں ہے۔ لطیف شیخ الاسلامی نے کہا۔ آج ملت اس مقام پر کھڑی ہے جہاں اسے دوست اور دشمن کی تمیز ہی نہیں رہی۔ ایک مقرر نے کہا۔ یہ کیسی آزادی ہے۔ کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ کسٹم والوں کی مثال لے لیجئے۔ دو تین ماہ سے محکمہ میں کام بند ہے۔ ایران کی تجارت تباہ ہو گئی ہے۔ خوراک کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ حالات اسی نہج پر چلتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب لوگ ایک دوسرے کو مارنے اور کھانے لگیں گے۔

شہنشاہ کے چھٹی پر جانے کی وجہ سے ایک شاہی نیابتی کونسل بنائی گئی ہے۔ آیت اللہ کے واپس آنے اور اسلامی حکومت بنانے کی خاطر ایک انقلابی کونسل تشکیل دی گئی ہے۔ تضاد بڑھتا جا رہا ہے۔ مقابلہ کی تیاری علی الاعلان ہو رہی ہے۔ ٹکراؤ ہو گا۔ لوگ ایک دوسرے کو مارنے اور کھانے لگیں گے۔

(7)

14ر جنوری

ہر شے جسے چلنا چاہئے وہ کھڑی ہے۔ ریل، بس، ٹرک، ہوائی جہاز، سب بے حرکت۔ ہر شے جسے کھلنا چاہئے وہ بند ہے۔ بنک، ہوائی اڈا اور بازار بزرگ۔ وزرا کے دفاتر مقفل۔ طلباء کے وظائف بند۔ ہوسٹل بند۔ تعلیمی ادارے بار بار بند۔ منصوبے ملتوی۔ تعمیر رکی ہوئی۔ ماہرین کی تنخواہیں بند۔ ٹھیکہ داروں کے واجبات منجمد۔

ہر وہ قانون جو لوگوں کو ناپسند ہے اس کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ ان میں وہ قانون بھی شامل ہے جس کی رو سے ایران میں رہنے والا امریکی باشندہ ایران کے جرم و سزا کے قوانین اور عدالت و انصاف کے نظام کے تابع نہیں ہوتا۔ ایرانی عدالتوں کا جو اختیار پندرہ سال پہلے مجلس کے اراکین نے سلب کیا تھا اسے لوگوں نے بالآخر انقلاب کی بدولت

واپس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ کرمان میں لوگوں نے امریکی فوج کے ایک کرنل کو گھیرا اور اپنے حق حاکمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہلاک کر دیا۔

15 ر جنوری

یہ ملک اب رہنے کے لائق نہیں رہا۔ شاہی خاندان کے افراد آج اسے چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ صرف رضا شاہ اور فرح دیبارہ گئے ہیں۔ محل کی تنہائیاں بڑھ گئی ہیں اور وسعتیں تنگ ہو گئیں ہیں۔

16 ر جنوری

مشرقی ایران میں زلزلہ آیا ہے۔ اگر ارضی اور سماوی آفات کا معاشرہ کے معاملات سے کوئی تعلق ہوتا ہے تو آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ ایران کی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ کی تبدیلی کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں کہ زمین یوں ہلنے لگے۔ نئے فرسٹ سیکرٹری کہتے ہیں۔ اے لوگو، ہتھیار اٹھالو۔ اس رژیم اور فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہو۔ یہ اعلان بھی کوئی اتنا انوکھا نہیں کہ اس کی نشاندہی اور یاد دہانی کے لئے ایک ہزار افراد اپنے گھروں کے ملبہ کے نیچے دب کر مرجائیں۔ کمیونسٹ شروع سے ایسے خوں بار بیان دیتے چلے آئے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے۔ کمیونزم خون چاٹے بغیر آسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم مستقل خطرہ بن سکتا ہے مگر ایک مستقل نظام زندگی نہیں بن سکتا۔

دفتر کے راستہ میں کھلی سڑک پر ایک صاحب نے پریشانی کے عالم میں اپنی پرانی پیکان موٹر کار سے میری سرکاری سٹاف کار کو ٹکر مار دی۔ دونوں موٹریں رک گئیں۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئے۔ اپنا کارڈ دیا اور میرا کارڈ لیا۔ کہنے لگے غلطی میری ہے لیکن میں بہت جلدی میں ہوں۔ اس وقت اجازت چاہتا ہوں۔ جونہی فارغ ہوا آپ کے دفتر حاضر ہو جاؤں گا۔ میں دفتر پہنچا۔ ابھی کمروں کی صفائی ہونے والی ہے۔ دو چار دروازے کھلے ہیں۔ باقی دروازوں کے تالوں میں چابیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ تیسری منزل سے برقی جھاڑو مشین کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔ جب سے ہنگاموں نے زور پکڑا ہے اس مشین کی دیکھ بھال کرنے والی کمپنی کا کوئی کاریگر اسے دیکھنے کے لئے نہیں آیا۔ مشین کی آواز اونچی اور بھاری ہو گئی ہے۔ اردگرد کی خاموشی اور ادھ کھلے کمروں کی بند اور باسی ہوا کے ساتھ مل کر جھاڑو مشین کی بھدی آواز بڑی ڈراؤنی لگ رہی ہے۔ اس مشین کا کام یہ ہے کہ جہاں

کہیں بھی اسے پھیرا جائے یہ ہوا کے زور سے وہاں کی تمام بیکار چیزوں کو کھینچ کر کوڑا کرکٹ کے تھیلے میں پہنچا دیتی ہے۔ انقلاب سے بھی یہی کام لیا جاتا ہے۔ آج کل ایران میں انقلاب کی جھاڑو مشین چل رہی ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ بہت پائدار اور کار آمد ہیں اس مشین کے سامنے پل بھر کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکیں۔ مشین نے انہیں خس و خاشاک سے زیادہ نہیں سمجھا۔ ان میں 1906 ء کا آئین بھی شامل ہے۔ لوگ منتظر ہیں کہ یہ مشین دو نسل پرانی پہلوی بادشاہت کو جذب کر لے اور شہنشاہ رضا شاہ کو دور کہیں کوڑے کے ڈھیر پر ڈال آئے۔

مسز التر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ خاتون چودہ سال ہوئے ترکی سے آکر آر سی ڈی سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئی تھیں۔ گیارہ سال سے ایک ایرانی کی بیوی ہیں۔ شوہر بہائی ہیں۔ روہانسی ہو رہی ہیں۔ انہیں خود ارمنی باشندوں سے خطرہ ہے اور شوہر کو مولویوں سے۔ وہ ہر قیمت پر فوراً ایران سے رخصت ہونا چاہتی ہیں۔ انہوں نے لمبی چھٹی کی عرضی دی اور کہنے لگیں۔ عرضی منظور ہو یا نامنظور میں بہرحال یہاں سے جا رہی ہوں۔ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہیں مگر واپسی کی موہوم سی آس کو خود توڑنا نہیں چاہتیں۔ میں نے پوچھا، کیا آپ کچھ اس طرح چھٹی پر جا رہی ہیں جیسے محمد رضا شاہ۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مسز اسفر جانی کئی دن سے دفتر نہیں آئیں۔ ان کا فون آیا ہے کہ وہ آج بھی نہیں آئیں گی۔ ان کے بھائی جو وزیر خزانہ تھے ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ یہ ان کا ضروری اور قیمتی سامان باندھنے اور امریکہ بھیجنے میں مصروف ہیں۔ عملہ کے چار پانچ افراد جو دفتر آئے ہیں وہ ملاقات کے لئے وقت چاہتے ہیں۔ آج کل وقت وافر ہے میں انہیں فوراً بلا لیتا ہوں۔ جو ایرانی ہیں وہ تنخواہوں میں اس اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں جس کا اعلان پچھلے چند ماہ میں یکے بعد دیگرے بدلنے والی حکومتوں میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ جو غیر ایرانی ہیں وہ مہنگائی الاؤنس مانگتے ہیں۔ ان دو علیٰحدہ مطالبات کے بعد وہ مشترکہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پراویڈنٹ فنڈ اور مکان، سفر، علاج اور شادی بیاہ کے لئے جتنی رقم بھی قاعدہ کی رو سے پیشگی مل سکتی ہے وہ ساری کی ساری ہر ایک کو فوراً ادا کر دی جائے اور ادائیگی امریکی ڈالروں میں ہونی چاہئے۔

لطف علی گیس کمپنی سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ کہتے ہیں آپ کو گیس کا کوٹہ ایک ہفتہ کے بعد ملے گا۔ باورچی خانہ میں گیس کا چولھا جو پہلے ہی کئی دنوں سے بجھا ہوا ہے اب کئی دن اور بجھا رہے گا۔ سارا دارومدار بجلی کے چولھے پر ہے اور وہ بڑا ناقابل اعتبار ہے۔ بجلی کی آمدورفت کی وجہ سے، جس میں رفت کا وقفہ آمد کے وقفے سے کہیں زیادہ طویل ہوتا ہے، ہم انڈہ ایک دن پھینٹتے ہیں اور آملیٹ دوسرے دن بناتے ہیں۔

صبح جن صاحب کی موٹر سے ٹکر ہوئی تھی وہ بھی آ گئے کہنے لگے مجھے انتہائی ضروری کام سے ہوائی اڈے جانا تھا اور میں بوکھلاہٹ میں اپنی موٹر پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور ٹکر ہو گئی۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میں نے جواب دیا۔ آپ کی شرافت سے متاثر ہو کر کہ آپ خود چل کر میرے دفتر آئے ہیں اور معذرت پیش کر رہے ہیں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ چلئے میری طرف سے بات ختم۔ کہنے لگے۔ شکریہ۔ اب ایک چھوٹی سی بات رہ گئی ہے وہ بھی عرض کروں۔ آپ کی گاڑی سرکاری ہے اور میری ذاتی۔ دفتر کو ایسی ٹکر کے سلسلہ میں ہونے والے اخراجات کی کیا پرواہ۔ میرا نقصان البتہ ذاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ انشورنس کمپنی سے وصول کروں۔ اس لئے میں آپ کی طرف سے یہ بیان لکھ کر لایا ہوں کہ غلطی دفتر کے ڈرائیور کی تھی۔ آپ دستخط کر دیں۔ میں انشورنس کمپنی سے اگلی پچھلی ساری کسر نکال لوں گا۔ اس بہانے پیکان کی مرمت ہی نہیں بلکہ رنگ بھی ہو جائے گا۔ بالکل نئی ہو جائے گی۔ آج کا دن واقعی ایک خاص دن ہے کہ میری ٹکر بھی ہوئی تو ایک بھلے مانس سفارت کار کی سرکاری موٹر سے۔ ہرجانہ کی بجائے الٹا فائدہ ہو رہا ہے۔ بھلے مانس سفارت کار نے خاموشی سے سب کچھ سنا مگر بھل مانسی کا ثبوت دینے سے انکار کر دیا۔

دفتر میں دو بجے دن کی خبریں بیٹری سے چلنے والے ریڈیو سیٹ پر بڑے اہتمام سے سنی جاتی ہیں۔ جو کوئی بھی دفتر آیا ہو وہ واپسی سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس وقت بلوہ کہاں ہو رہا ہے اور کہاں نہیں ہو رہا تاکہ وہ گھر جانے کے لئے نسبتاً محفوظ راستہ منتخب کر سکے۔ خبروں کو شروع ہوئے پانچ منٹ ہو گئے کہ یکایک اناؤنسر کا لہجہ بدلا۔ وہ ذرا سا رکا اور پھر ذرا فکرمند آواز میں بولا۔ ایک انتہائی اہم خبر ابھی ابھی موصول ہوئی ہے۔ شہنشاہ آج دوپہر ایک بج کر تیس منٹ پر تہران سے روانہ ہو گئے ہیں۔

لفٹ خراب ہے۔ میں یہ خبر سنتے ہی دفتر کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چوتھی منزل سے

استقبالیہ میں پہنچا۔ سبز کوہی کو ساتھ لیا اور موٹر کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ شیشہ کھول کر سر ذرا سا باہر نکالا اور برفانی تیز ہوا میں بے اختیار جھپک جانے والی آنکھوں کو زور لگا کر کھولنے کے باوجود مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ شاید لوگوں کو ابھی اس خبر کا پتہ نہیں چلا۔ گھر پہنچا۔ قربان حسین کھانے کی میز درست کرنے لگے۔ میں نے کہا بھوک لگی ہے مگر تحقیق اور تماشا کی اشتہا اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میں سلمان کو لینے آیا ہوں۔ ایک تاریخی لمحہ سے اس ٹین ایجر کی ملاقات کرانی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بزرگ راہوں، خیابانوں اور گلی کوچوں میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور جدھر منہ کا رخ ہوا ادھر چلنا شروع کر دیا۔ موٹر والوں نے پٹرول کی کمی کو بھلا دیا اور بے اختیار گیراج سے گاڑیاں نکال کر سمت اور منزل کا تعین کئے بغیر سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ فیصلہ سڑک پر چھوڑ دیا کہ وہ کدھر جاتی ہے اور یہ فیصلہ ہجوم پر چھوڑ دیا کہ کس رفتار سے چلنا ہے، کہاں ٹھہرنا ہے اور کہاں سے گھر لوٹ جانا ہے۔ خیابان پہلوی موٹروں سے بھر گئی ہے۔ گنی چنی چند گاڑیوں کا رخ شمال کی جانب ہے۔ کچھ مغرب کی طرف جا رہی ہیں۔ باقی سب کا رخ وسط شہر یا جنوب شہر کی جانب ہے۔ ہر ماڈل اور ہر رنگ کی موٹریں، ٹیکسیاں، مال بردار پک اپ گاڑیاں سڑک پر نظر آ رہی ہیں۔ البتہ بسیں اور ٹرک غائب ہیں۔ ہر موٹر گاڑی کی بتیاں روشن ہیں۔ وائپر اٹھا کر ہوا میں کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ سواریاں کھڑکیوں سے سر یا ہاتھ باہر نکالے ہوئے ہیں۔ گاڑی چلانے والا ایک خاص دھن میں ہارن بجا رہا ہے۔ وہ ہارن کو ایکدم زور سے دباتا اور پھر چھوڑ دیتا ہے۔ جونہی آں آں کی گونج یا بازگشت گم ہونے لگتی ہے وہ پھر ہارن کو دبا دیتا ہے۔ مختلف قسم کے ہارن ہیں اور ہر ایک ڈرائیور اپنے حساب سے بجاتا اور وقفہ دیتا ہے لہٰذا سُر ملنے کا سوال ہی نہیں۔ پس پوں پوں پاں پاں اور پی پی کا ایک تال بے تال شور ہے جو بڑھتا جا رہا ہے۔ چوک میں سبزہ زار کے بڑے دائرے کے گرد جہاں گاڑیاں آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے پھنس کر رک جاتی ہیں وہاں شور بے حد بلند ہو جاتا ہے۔ لوگ ہارن زور سے بجاتے ہیں اور وقفہ بھی نہیں دیتے۔

سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لوگ انگلیوں سے چرچل کی طرح وی فار وکٹری کا نشان بنا رہے ہیں۔ پیادہ رو پر چلنے والے اونچی آواز میں گفتگو کر رہے ہیں اور جب ہنستے ہیں

تو آواز اور زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں، دوستوں کے یا اہل خانہ کے۔ لڑکے بالے مست ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ خوشی کا اظہار کس طرح کریں۔ جی تو چاہتا ہو گا کہ گٹار بجائیں۔ اور گت بھریں۔ فٹ پاتھ پر سٹریو کیسٹ پلیئر رکھ کر اتنا اونچا بجائیں کہ کان کے پردے اڑا دیں۔ سڑک پر دیوانہ وار ناچیں۔ پاپ یا بریک۔ وگرنہ کم از کم سنیک۔ مگر مجبور نظر آتے ہیں۔ مٹک رہے ہیں۔ اچھل کود ہو رہی ہے۔ مگر ناچنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ اس انقلاب کے سربراہ ایک آیت اللہ العظمی ہیں۔ جس ماہ میں یہ تحریک اوج پر پہنچی وہ محرم تھا۔ دو چار دن کے بعد چہلم کی تقریب ہے۔ ان حوالوں نے خوشی کے اظہار کی حد بندی کر رکھی ہے۔

کچھ نوجوان ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ لڑکے دوڑ کر ایک سٹور سے دیوار پر رنگ کرنے کا سامان لے آئے ہیں۔ وہ کارٹون بنانے اور نعرے لکھنے میں مصروف ہیں۔ ان کے گرد جمگھٹا ہو گیا۔ تماشائی مشورہ دے رہے ہیں۔ جو تصویر یا نعرہ پسند آئے اس کی داد رنگ کے خشک ہونے سے پہلے مل رہی ہے۔ دیواری تحریروں اور تصویروں کے لئے اب وہ پرانے زمانہ والا اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔ بالٹی، رنگ، پانی، کوچی، سیڑھی، صافی اور کٹواں حروف والی ٹین کی نقش ساز تختی۔ ان سب چیزوں کی جگہ سپرے پینٹ کے ڈبہ نے لے لی ہے۔ ڈبہ کی ساخت ایسی ہے کہ آرام سے ہاتھ میں آجاتا ہے اور سطح اتنی چکنی ہے کہ ہتھیلی کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ ڈھکن اتاریئے۔ پلاسٹک کے بٹن کو لبلبی کی طرح دبایئے۔ ہوا کے دباؤ سے رنگ کی ایک پھوار نکلے گی۔ جو چیز بھی سامنے آئے چاہے لوہے کا پھاٹک ہو یا سیمنٹ کی دیوار یہ اس پر ایسا گہرا نقش بنائے گی کہ موسم کے اثر سے بے نیاز، دھوپ میں چمکے اور بارش میں نکھرے۔ ان نقش گروں نے سیڑھی کی کمی کا بڑا اچھا حل نکالا ہے۔ جہاں ہاتھ نہ پہنچے وہاں یہ مجمع کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ایک جیالا آگے بڑھتا ہے اور عوامی آرٹسٹ کو کاندھوں پر سوار کر لیتا ہے۔ ایک لمبی سی دیوار ان لڑکوں کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ وہ اس پر نعرے لکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں بھی دیکھنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک لڑکے نے لکھا۔ مرگ بر شاہ۔ دوسرا بھاگتا ہوا آیا اور شاہ کے آگے سابق لکھ دیا۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ دیوار پر تازہ رنگ سے لکھا ہوا ہے۔ شاہ فراری کرد، تو ننگ شاہینی، مبارک باد، آزادی مبارک، درود بر شہیداں، حزب

ماحزب اللہ، رہبر ماروح اللہ۔ جہاں یہ آخری نعرہ سیاہ رنگ میں لکھا ہوا ہے اس کے آگے ایک نوجوان نے سرخ رنگ سے لکھا ہے۔ سلام بر گل سرخی۔ یہ سلام بائیں بازو کے ایک ہیرو کے لئے ہے۔ بائیں بازو والے یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ اس انقلاب کا انتساب ایک آیت اللہ کے نام ہو جسے وہ اپنی جدوجہد کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔

پٹرول کی کمی کی وجہ سے ایک موٹر کھڑی ہو گئی۔ سواریاں اتریں اور اسے دھکیل کر فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ پھر موٹر میں سے دری نکالی اور اسی فٹ پاتھ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ بعض موٹروں کے پچھلے حصہ کا ڈھکن کھلا ہے۔ اس میں بچے بالے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض موٹروں کی چھتوں پر ہلکے پھلکے لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو چار موٹریں ایسی بھی ہیں جن کی ایک سواری بونٹ پر بیٹھی لوگوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ داد کی خاطر آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔ یہ سواری بار بار پھسلتی ہے اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس بار یہ ضرور نیچے گر جائے گی۔ ایک موٹر جھٹکے کھا رہی ہے۔ چلانے والا اسے کنارے پر لے گیا ہے۔ موٹر میں سے دو لڑکے تیزی کے ساتھ نیچے اترے۔ پٹرول کا ڈبہ نکالا۔ ٹینکی میں انڈیلا۔ ایک درخت کی جھکی ہوئی ٹہنی توڑی اور پٹرول کے خالی ڈبہ کو زور زور سے بجانے لگ گئے۔ دو چار من چلے تالیوں سے سنگت دے رہے ہیں۔

کئی میل گھومنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں فوج کے دو ٹرک کھڑے ہیں۔ ایک ٹرک پر بڑا بڑا لکھا ہوا ہے۔ ارتش بہ ملت ملحق شد۔ فوج ملت کے ساتھ شامل ہو گئی ہے۔ ایک فوجی بلند اور محفوظ جگہ پر کھڑا خوشیاں منانے والے کاروان کو دیکھ رہا ہے۔ ہجوم جب اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہے تو وہ عوام کو بندوق سے سلامی دیتا ہے۔ لوگ اس منظر میں گم ہیں۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ آج دوپہر شاہ کو سلامی دے کر رخصت کرنے والی فوج سہ پہر کے وقت عوام الناس کو سلامی دے رہی ہے۔ ایک نوجوان ٹیلہ پر چڑھ کر ایک آدھ دیوار پھاند کر اس فوجی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پہلے فوجی سے ہاتھ ملایا پھر اسے چوما۔ شوخی اور تعظیم دونوں اس بوسہ میں شامل ہیں۔ ہجوم میں سے ایک لڑکی آگے بڑھی اور فوج کے ٹرک تک جا پہنچی۔ وہاں ایک قطار میں پانچ دس فوجی کھڑے ہیں۔ اس لڑکی نے قطار کے سرے پر کھڑے ہوئے افسر کو کارنیشن کا پھول پیش کیا۔ حجاب اٹھ رہا ہے۔ فاصلے کم ہو رہے ہیں۔ کچھ ہجوم آگے بڑھا کچھ فوجی آگے بڑھے۔ ہاتھ ملائے

جارہے ہیں۔ گاہے گلے بھی مل رہے ہیں۔ سلمان نے کہا یہ فوج بھی خوب نکلی۔ اوپر سے شاہ کے ساتھ، اندر سے آیت اللہ کے ساتھ۔ کل تک گولیاں چلانے والے اور معتوب، آج چومے جانے والے اور پھول کا تحفہ وصول کرنے والے محبوب۔

شاہ اور اس کے باپ کے مجسمے توڑے جارہے ہیں۔ جو مجسمہ ٹوٹتا نہیں اس کے گلے میں رسی ڈال کر لوگ اسے علامتی پھانسی دے دیتے ہیں۔ ایک چوک میں تین چار آدمیوں کے گرد تماشبینوں کا جمگھٹا لگا ہے۔ ہم بھی اس میں جاملے۔ یہ آدمی خاموش کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں سب سے بڑی رقم کے کرنسی نوٹ ہیں۔ ایک نوٹ میں شاہ کی آنکھوں میں سوئیاں پروئی ہوئی ہیں۔ دوسرے میں شاہ کا سر اور گردن کاٹ کر سوراخ کر دیا ہے۔ تیسرے نوٹ میں آیت اللہ خمینی کی اخبار سے کاٹی ہوئی تصویر شاہ کی تصویر کے اوپر گوند سے چپکائی ہوئی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بلند و بالا زیر تعمیر عمارت کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ اس کی سب سے اونچی منزل پر ایک مزدور نعرے لگا رہا ہے۔ عمارت اتنی اونچی ہے کہ اس مزدور کے نعرے سڑک پر کھڑے ہجوم کو سنائی نہیں دیتے۔ یہی حال جوابی نعروں کا ہے۔ وہ اتنی بلندی تک چڑھنے سے قاصر ہیں۔ اتنے میں ایک موٹر سائیکل سوار آیا اس کا انجن بہت بڑی طاقت والا ہے۔ اس نے آواز روک آلہ اتارا ہوا ہے اور بار بار ایکسیلیٹر کو گھماتا ہے۔ سب لوگوں کی توجہ اس بھیانک آواز کی طرف ہو گئی۔ موٹر سائیکل سوار اجتماعی خوشیوں کے ملے جلے غل غپاڑے میں اس بے ہنگم شور کا اضافہ کرنے پر بہت خوش نظر آتا ہے۔ اس نے کارڈ بورڈ پر انا فتحنا لکھ کر ہینڈل کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔

واپسی میں ہم ایسے گلی کوچوں سے بھی گزرتے ہیں جو سنسان ہیں۔ ایسی ہی ایک گلی میں ایک موٹی عورت سیاہ چادر اوڑھے اونچی آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ ناراض ہے۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ کس سے ناراض ہے۔ اگر اس کی ناخوشی کا سلسلہ جنوبی تہران سے قصرِ سعد آباد تک دراز ہے۔ اور وہ اپنی تمام محرومیوں کا ذمہ دار شہنشاہ کو ٹھہراتی ہے تو اس وقت اسے خوش ہونا چاہئے نہ کہ ناراض۔

میدان ونک کے پاس ایک موٹر میں چند خوش پوش خواتین نظر آئیں۔ ان میں سے ایک کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔ ایک قطرہ بہ نکلا۔ اس نے فوراً منہ دوسری

طرف کر لیا۔ سنا ہے شہنشاہ کی رخصت کا منظر بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ محل سے چلے تو عملہ کے کچھ لوگ رو پڑے۔ ہوائی اڈے پر چند فوجی پیروں پر گر پڑے۔ چند عہدہ دار آنسو روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ رکے، کچھ بہ نکلے۔ کچھ اس لئے نظر نہ آسکے کہ آنکھوں کے سامنے رومال تھا یا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ ملکہ فرح سب کے سامنے بار بار اپنے آنسو پونچھتی رہیں۔ شاہ نے کوہ البرز کی برف پوش چوٹیوں پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے بھی منہ پھیرا اور جہاز میں داخل ہو گیا۔ اس ہوائی جہاز نے جسے وہ خود اڑا رہے تھے شاہ یاد کا ایک چکر لگایا اور رخ موڑ کر جنوبی مصر کے شہر آسوان کی جانب روانہ ہو گیا۔ شاہ کے توشہ میں ایران کی مٹھی بھر خاک بھی شامل ہے۔ اس وسیع و عریض سرزمین میں بس اس کا اتنا ہی حصہ رہ گیا ہے۔ چپہ بھر زمین بھی ایسی نہیں جس کا وہ بادشاہ ہو۔ ملک جاتا رہا۔ مٹھی بھر خاک اس کے قبضہ میں رہ گئی۔ وہ اسے کہاں ڈالے گا۔

تھوڑی سی دیر کے لئے ہم ایک پاکستانی دوست کے گھر رکے۔ وہاں چند احباب جمع ہیں۔ سب جلدی میں ہیں مگر بات بھی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا ذرا اپنے ایرانی دوستوں اور ہمسایوں کا ردعمل بتایئے۔ ایک خاتون بولیں، میں نے ہمسائی کو مبارکباد دی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کہنے لگی، معلوم نہیں آپ کس بات کی مبارکباد دے رہی ہیں۔ میں یہ سمجھ کر آپ کی مبارکباد وصول کر رہی ہوں کہ گولی چلنی بند ہوگی۔ کرفیو اٹھے گا۔ ہنگامہ ہو گا نہ ہڑتال۔ بنک کھلے گا اور بازار۔ ہسپتالوں میں عملہ کام پر واپس آئے گا۔ اسکول میں پڑھائی ہو گی۔ ریل میں سفر ہو گا۔ نفت سے گھر گرم ہو گا۔ گیس سے چولھا جلے گا۔ بجلی سے اندھیرا دور ہو گا۔ آلو اور پیاز ملے گا۔ اور ہم از سرِ نو ایک باتمیز زندگی بسر کریں گے۔

دوسرے دوست نے کہا میرا ایرانی ہمسایہ کہتا ہے کہ یہ چھٹی عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے۔ یہ 1953ء نہیں 1979ء ہے۔ اس رخصتی کا انتظام بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس کی تاریخ کا باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا۔ آپ کو وہ ناول یاد ہو گا جس کا عنوان ہے، Crash-1979 ۔ یہ سب سی آئی اے کی کارستانی ہے۔ وہ ایسی کتابیں لکھواتے اور چھپواتے ہیں۔ شروع سال میں چھپنے والی پیش گوئیاں سی آئی اے کے سالانہ تخریبی پروگرام کا حصہ ہوتی ہیں۔ کچھ اطلاع کچھ بہکاوا۔ کچھ دھمکی کچھ الٹی میٹم۔ شاہ کو دراصل چند ہفتہ

پہلے چلا جانا تھا مگر اسے روکے رکھا تاکہ کریش 1979ء کی پیش گوئی پوری ہو سکے۔

میزبان نے کہا، میرا ہمسایہ پڑھا لکھا اور ذہین انسان ہے۔ میں اسے بلا لیتا ہوں۔ وہ اپنی رائے خود بتائے گا۔ وہ آیا اور بلا تکلف اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے کہا، جو ہوا سو ہوا۔ کیوں ہوا اس پر پھر کبھی بات ہو گی۔ آج کا مسئلہ شہنشاہ کی رخصت ہے۔ ہم خواہ شاہ دوست ہوں یا شاہ دشمن، اس بات سے کوئی ایرانی انکار نہیں کر سکتا کہ بادشاہت اس ملک میں مرکزیت کی علامت ہے۔ اگر ہم بادشاہت ختم کریں گے تو ہمیں ایک نئی علامت کی ضرورت ہو گی۔ جب تک اس علامت کا ظہور اور اس پر اتفاق رائے نہیں ہو گا اس وقت تک یہ ملک انتشار کی زد میں ہو گا۔ طبقاتی کشمکش، علاقائی جھگڑے، نسلی اختلاف، لسانی اختلاف، قبائلی جھگڑے، یہاں تک کہ ذاتی رنجشیں بھی سیاسی رنگ اختیار کر لیں گی۔ فساد ہو گا۔ اس کو ہوا دینے والے بہت ہوں گے۔ پنڈورا کا صندوقچہ کھل گیا ہے۔ جس شخص کے پاس اس کے تالے کی چابی تھی وہ جاتے ہوئے اسے خرابکاروں کے حوالہ کر گیا۔ انہوں نے صندوق میں بند سارے تنازعات کو چوک شاہ یاد میں الٹ دیا ہے۔ صندوق میں صرف ایک چیز باقی رہنے دی اور اسے دوبارہ تالا لگا دیا۔ وہی چیز جو یونانی دیومالا کے مطابق پنڈورا کے صندوقچہ میں بند رہ گئی تھی۔ وہ جسے امید کہتے ہیں۔ صندوقچہ کی چابی کسی نے خلیج فارس میں پھینک دی ہے۔

میں دن بھر کا تھکا ماندہ ہوں۔ چل چل کر تھک گیا ہوں۔ دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔ سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔ اب کیا ہو گا۔ دوپہر سے اس سوال کا سامنا کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ یہ دیکھ کر تھکن بڑھ گئی کہ آج قومی ریڈیو اور ٹی وی سے چھ بجے شام خبریں نشر ہوئیں نہ دس بجے رات۔ میں تھکن کے مارے بستر پر دراز ہو جاتا ہوں۔ سونے کا وقت ہے مگر نیند اڑ گئی ہے۔ میں نے خوش نما سفری گیس لیمپ کو بند کیا۔ چار سو اندھیرا ہو گیا۔ گھر میں اندھیرا ہے۔ آس پاس کے گھروں میں بھی اندھیرا ہے۔ سڑک کی بتیاں بند ہیں۔ چاند نہ جانے کہاں چھپ گیا ہے۔ زمین کے دوسرے نصف کرہ میں یا اسی ملک کے سیاہ بادلوں میں۔ اندھیرا گھپ اور گہرا ہے۔ اگر روشنی کی کوئی کرن کہیں سے پھوٹ رہی ہے تو وہ ایک اخبار ہے۔ اخبار بھی نہیں بلکہ ایک ورق کا ضمیمہ ہے۔ آج شام کو شائع ہوا تھا۔ ایک طرف بالکل خالی ہے۔ دوسری طرف آدھے صفحہ پر سرخی لکھی ہوئی ہے۔ باقی

صفہ پر آٹھ دس سطر کی عبارت ہے۔ سرخی صرف دو لفظ پر مشتمل ہے۔ شاہ رفت۔ نصف صدی کی پہلوی سلطنت کا قصہ دو لفظ میں تمام ہو گیا۔ شاہ کے ملک بدر ہونے کی خبر جب پیرس میں آیت اللہ خمینی کو ملی تو ان کا ردعمل بھی صرف دو لفظ پر مشتمل تھا۔ اللہ اکبر۔

ایران کی تاریخ کا نیا باب اس کے نام سے شروع ہو رہا ہے جو زمین اور آسمانوں کا بادشاہ ہے۔

آمد نامہ

باب نہم

باز گشت

یکم فروری

چودہ پندرہ دن پہلے جو شخص بے بسی اور نامقبولی کے عالم میں تخت اور ملک چھوڑ کر چلا گیا اس نے کوئی چودہ پندرہ سال پہلے بادشاہ وقت کی حیثیت سے ایک شخص کو جلاوطنی کی سزا سنائی تھی۔ سزا یافتہ کی سزا بالآخر ختم ہوئی۔ وہ آج واپس آنے والا ہے۔ سزا دینے والے کی جلاوطنی اب جا کر شروع ہوئی ہے اور عمر بھر کے لئے ہے۔ جانے والا شہنشاہ ہے اور آنے والا درویش۔ ایک جلالت مآب اور دوسرا صاحب جلال۔ جانے والے کو لوگ بے ایمان، ظالم اور گناہگار، اس کے خاندان کو فساد کی جڑ، اس کے ساتھیوں کو شیطان کا ٹولا اور اس کی حکومت کو رژیم ابلیسی لکھتے ہیں۔ اخبار، رسالے، کتابیں، پمفلٹ، پوسٹر اس طرح کے القابات سے بھرے پڑے ہیں۔ اور جب اس شخص کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو پہلے پانچ دس لاکھ افراد جمع ہو کر ایک جلوس نکالتے ہیں پھر مل کر نعرہ لگاتے ہیں۔ مرگ بر شاہ۔ آنے والے کو لوگ رہبر بزرگ، قائداعظم، بت شکن، آیت اللہ، آیت اللہ العظمیٰ، نائب امام، امام اور فرشتہ لکھتے ہیں۔ اور جب اس کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو پہلے دس پندرہ لاکھ افراد جمع ہو کر ایک جلوس نکالتے ہیں پھر مئودب ہو کر کہتے ہیں۔ درود بر خمینی۔

جلاوطن آیت اللہ وطن واپس آ رہے ہیں۔ ایک سال سے ذرا کم ترکی میں رہے۔ تیرہ سال عراق میں گزارے۔ چار ماہ فرانس میں۔ جلاوطنی کی کل مدت چودہ سال تین ماہ

بنتی ہے۔ اتنا عرصہ نظروں سے اوجھل رہنے والے کو لوگ بھول جاتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ الٹ ہے۔ جلاوطنی کے باوجود وہ شخص لوگوں کے دل میں بسا رہا اور آج ہر ایک اس کے لئے چشم براہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مہر آباد کے ہوائی اڈے سے بہشت زہرا کے قبرستان تک کتنے لوگ اسے لینے اور دیکھنے کے لئے آئیں گے۔ ایک ملین، دو ملین یا اس سے بھی زیادہ۔ اس ہجوم میں دو پاکستانی بھی ہوں گے۔ میں اور پندرہ سولہ سالہ سلمان مسعود۔ لیکن اس ہجوم میں وہ ایرانی نوجوان دوست شامل نہیں ہو گا جس سے میں نے چند روز ہوئے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ ہمارا رہبر بن کر ہمیں کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں سے آیت اللہ خمینی کی واپسی کا منظر آرام سے دیکھا جا سکے۔ اس نے کہا میں ایک دو دن کے بعد جواب دوں گا۔ دوبارہ پوچھا۔ کہنے لگے۔ میں نے بیوی سے مشورہ کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں اس عالم جوانی میں بیوہ ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور نہ میں یہ سوچ سکتی ہوں کہ اس عمر میں میرا شوہر رنڈوا ہو جائے۔ خبردار، جو تم آیت اللہ کی واپسی کے موقع پر ہوائی اڈے سے لے کر شاہ یاد اور شاہ یاد سے لے کر جامعہ تہران تک جو علاقہ ہے اس کے آس پاس کہیں دیکھے گئے۔ پھر رک رک کر الفاظ تلاش کرتے ہوئے اور بعض الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ میں آپ کو خطرے کے بارے میں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ پچھلے کئی ماہ سے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس نے بہت سے لوگوں کے اعصاب اور ان کی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی سرپھرا شاہ پسند، کوئی خودپسند فوجی، کوئی کرائے کا بیرونی ایجنٹ، کوئی بائیں بازو کا مذہب بیزار کارکن، کوئی خطر پسند بے پروا، کوئی حادثہ جو من چلا یا ایسے سب لوگ مل کر خرابکاری کریں اور اتنی خونریزی ہو جس کا لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میری رائے مانئے اور اس روز ہرگز اپنے گھر سے باہر قدم نہ رکھیئے۔

(2)

پچھلے دو ہفتے حیص بیص میں گزر گئے۔ آئے گا آنے والا۔ جی نہیں حکومت کی شرائط منظور کئے بغیر نہیں آسکتا۔ کیوں نہیں آسکتا۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ روک سکے۔

ہمت کی بات نہیں حکومت کی بات ہے۔ حکومت کے پاس فوج ہے۔ ادھر یہ بحثا بحثی ہو رہی تھی کہ ہوائی اڈا تکنیکی وجوہات کی بنا پر بند کر دیا جاتا ہے۔ ایران ایئر والے ہوائی جہاز تہران سے پیرس بھیجنا چاہتے ہیں مگر اسے جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ پیرس میں ایئر فرانس کا جہاز تیار کھڑا ہے مگر اسے آنے کی اجازت نہیں ملتی۔ نہ صرف ہوائی اڈا بند ہے بلکہ ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک بھی بند ہے۔ ہوائی پٹی پر رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ سڑک پر فوج کے مورچے بنے ہوئے ہیں۔

بحث پھر زور پکڑ لیتی ہے۔ میں بہت جلد واپس آ رہا ہوں۔ بس ہوائی اڈے کے کھلنے کا انتظار ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ واپسی کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیں۔ یہی کوئی تین ہفتہ کے لئے۔ شاہی نیابتی کونسل کا صدر آپ سے ملنے کے لئے پیرس آ رہا ہے۔ میں کسی عہدہ دار سے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ اپنے عہدہ سے استعفا نہ دے دے۔ تہرانی استعفا دیتے اور باریاب ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ میں ملاقات کے لئے پیرس جا رہا ہوں۔ ان کے لئے بھی استعفا کی شرط رکھی گئی۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں وزیر اعظم ہی نہ رہا تو ملاقات کا کیا فائدہ۔ وہ فائدے کی تلاش میں پیرس کا سفر منسوخ کر دیتے ہیں۔

وہ جمعہ کو آئیں گے۔ جمعہ بھی گزر گیا اور وہ نہیں آئے۔ واپسی کا سفر ایک بار پھر ملتوی ہو گیا۔ التوا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ لوگ آئین کے نام پر امجدیہ اسٹیڈیم میں جمع ہو کر انقلاب کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سارے جتن کئے مگر بیکار۔ ایک طرف لاکھوں افراد کا مہینوں ہر روز خود بخود سڑکوں پر جمع ہو کر احتجاج کرنا اور گولیوں کا مقابلہ کرنا۔ دوسری طرف شاہ کے حواریوں اور حکومت کا پورا زور لگانے کے باوجود چار ماہ میں صرف ایک جلسہ اور وہ بھی سٹیڈیم کی محفوظ فضا میں۔ شریک ہونے والے پانچ دس ہزار ہوں گے۔ ایسے جلسے کہیں انقلاب کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ دیکھنے اور سوچنے والوں کے لئے اس ناکام کوشش نے دلچسپی کا ساماں فراہم کیا۔ اجتماع کا ایک نعرہ تھا۔ ایرانِ من ایمانِ من۔ دوسرا نعرہ تھا۔ خدا، قرآن، رسول خدا۔ یہ خدا، قرآن، خمینی کا جواب ہے۔ اس اجتماع میں ساری کی ساری تصویریں حضرت علیؓ کی تھیں۔ یہ آیت اللہ کی تصویروں کا جواب ہے۔ جن سے سارا تہران بھرا پڑا ہے۔ آئین کے یہ حامی نہ جانے اس وقت کہاں سے پیدا ہو

گئے۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب کوئی شخص یہ باتیں سننے کے لئے تیار نہیں کہ حکومت
ناتجربہ کار مولویوں کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایران کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے حوالہ کی
جائے۔ یہ طبقہ قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روشن مستقبل
اور ایک کامیاب فردا صرف اس پل پر سے گزر کر آسکتا ہے۔ جو مستقبل کسی اور پل یا
راستہ سے آیا ہو وہ مخدوش ہو گا۔ لوگ ایسے بے فیض ہوگئے ہیں کہ اس مشورہ کا شکریہ
بھی ادا نہیں کرتے۔

فوج نے موقع غنیمت جانا اور اخبار والوں کے لئے امپیریل گارڈ کا ایک خصوصی
مظاہرہ منعقد کیا۔ ڈیڑھ ہزار کمانڈو قواعد، ورزش اور پرخار راستہ طے کرنے کی مہارت دکھا
رہے ہیں۔ قواعد کے ہر حصہ کے پورا ہونے پر، ورزش کے ہر جزو کی تکمیل پر اور رکاوٹوں
میں سے ہر روک کو پار کرنے کے بعد وہ ذرا سی دیر کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور نعرہ لگاتے
ہیں۔ جاوید شاہ۔ شاہ دائم و قائم رہے۔ اس نعرہ سے شرک کی بو آتی ہے۔ ابدی
بادشاہت صرف ایک ہے۔ الملک القدوس السلام المومن المہیمن العزیز الجبار المتکبر۔ اور یہ
بے مغز سپاہی تنخواہ کی خاطر ایک جلاوطن ابن جلاوطن اور اس کے خانہ زاد سلسلہ بادشاہت کو
1979ء میں پائیداری کی سند دے رہے ہیں۔ کوئی انہیں جا کر بتائے کہ برطانیہ کے
بادشاہ چارلس اول کے پروانہ سزائے موت پر دارالعوام کے اراکین کو دستخط کئے ہوئے
تین سو سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور پیرس کے بڑے چوک میں فرانس کے سولھویں
لوئی کی گردن پر جلاد کو خط کھینچے ہوئے کم و بیش دو سو سال ہونے والے ہیں۔ دونوں
بادشاہوں نے عوام سے اختیارات کی تقسیم پر جھگڑا مول لیا۔ اس کے نتیجہ میں تاج باقی رہا نہ
وہ سر جس پر تاج رکھا جاتا تھا۔

یہ افواہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ چند دن کے وقفہ کے بعد اڑتی ہے کہ کودتا ہو گیا
ہے۔ فوج کو تردید کرنی پڑتی ہے۔ کچھ فوجی اس بار بار کے انکار سے نالاں ہیں۔ مبصر کہتے
ہیں شگاف عظیم درمیان نظامیان موافق و مخالف رژیم۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔
واقف حال کہتے ہیں۔ کُودِتا افواج کے رئیس قرہ باغی کے بس کی بات کہاں۔ وہ ژندار مری
کے جنرل تھے، شہنشاہ نے جاتے جاتے انہیں افواج پر مسلط کر دیا۔ اس کی جگہ اگر فوج کا
جنرل ہوتا وہ خواہ کتنا ہی یتیم اور مسکین کیوں نہ ہوتا اب تک کُودِتا کر دیتا۔ آیت اللہ کہتے

ہیں کہ اگر فوج نے کوُدِ نا کیا تو میں اہل ایران کو فوج کے خلاف جہاد کا حکم دے دوں گا۔ اس بیان کے ساتھ ہی بھگوڑوں، فراریوں اور استعفوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نچلے طبقے کے فوجیوں کو شہ ملتی ہے۔ وہ چھوٹے پیمانہ پر دو چار چھاؤنیوں میں بغاوت کر دیتے ہیں۔ سنا ہے اس سلسلہ میں فضائیہ کے فنی کار کن دوسروں سے بہت آگے ہیں۔

پچھلے پندرھواڑے موٹروں والے بڑے خوار ہوئے۔ شہر کے شمال میں شاہی گارڈ کے چند افراد گاہے اشارہ دے کر موٹر روکتے اور سواریوں سے آیت اللہ کے خلاف نعرہ لگانے کی فرمائش کرتے۔ جو تعمیل حکم میں ذرا ہچکچاتا اس کی موٹر کا شیشہ رائفل کا کندا مار کر توڑ دیتے۔ جنوب شہر میں جو موٹر آیت اللہ کی تصویر سجائے بغیر چلتی ہے اسے بھی نیا شیشہ لگوانا پڑتا ہے۔ شیشہ کی تلاش میں اگر وسط شہر جانے کا اتفاق ہوتا تو راستہ بند ملتا۔ چہلم پر تہران میں دس لاکھ افراد کا جلوس نکلا۔ ایک ہفتہ بعد شہر سے ہوائی اڈے کو جانے والے راستہ پر ایک لاکھ افراد جمع ہو گئے۔ ہنگامہ ہوا، آگ لگی، دھواں اٹھا۔ گولی چلی، خون گرا۔ اگلے دن پھر پانچ دس لاکھ آدمی سڑکوں پر جمع ہو گئے۔ دن بھر آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ سیاسی آنکھ مچولی بھی جاری ہے۔ شاہ کو برا کہنے والے اب امریکہ اور بختیار کو برا کہہ رہے ہیں اور فوج کو بہ یک وقت بہلانے پھسلانے، سمجھانے اور دھمکانے میں مصروف ہیں۔ آیت اللہ گلپایگانی کا بیان ہے کہ جس فوجی نے عوام پر گولی چلائی اس نے گویا اسلام اور قرآن پر گولی چلائی۔ یہ بیان پڑھ کر بر عظیم جنوبی ایشیا کے وہ بہت سے سیاسی فتوے یاد آئے جن کی رو سے سیاسی مخالفین کے نکاح ٹوٹ جاتے تھے۔ ہر الیکشن میں فتویٰ دینے والے ہار جاتے اور وہ اکثریت جسے نکاح فسخ ہونے کی وعید ملی تھی جیت جاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بے نکاحی اور فارخطی کو بر عظیم کے مسلمانوں میں جتنا فروغ حاصل ہو گا جمہوریت اسی قدر مستحکم ہو گی۔ لیکن نہ مولوی صاحب کا فتویٰ کامیاب ہوا اور نہ جمہوریت۔ دونوں مذاق بن کر رہ گئے۔

حالات کا اثر سب پر پڑا ہے۔ یہاں تک کے اخبار کے اشتہار بھی اس سے نہیں بچ سکے۔ اشتہارات کی ایک بالکل نئی قسم دیکھنے میں آئی ہے۔ طرفداری کا بیان، بے طرفی کا بیان، صفائی کا بیان، غلط فہمی کا ازالہ، وضاحت، بے جرم ہونے کا دعویٰ، وضع بدلنے کا اعلان۔ میں ان اشتہارات کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ ایک نیا مشغلہ ہاتھ آیا ہے۔ روزنامہ آئندگان میں ایک اشتہار چھپا ہے۔ جناب وزیر صحت محترم رزم آرا صاحب۔ ہم

کو آپ کی ذات سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن وظیفہ شرعی اور دستور مرجع کے مطابق ہم آپ کو وزیر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور آپ سے استعفا دینے کی درخواست کرتے ہیں۔ ہم ہیں آپ کے تابع اور مخلص، وزارت صحت کے ملازمین۔ بنک عمران نے اشتہار دیا ہے۔ ہمارا حساب پاک ہے۔ ہم نے اعلیٰ حضرت ہمایونی اور خاندان سلطنت کو ملک سے باہر سرمایہ منتقل کرنے کی کوئی سہولت نہیں دی اور اس کے علاوہ کوئی اور خدمت بھی نہیں کی۔ افواہوں پر کان نہ دھریں اور اگر یقین نہ آئے تو بنک مرکزی سے پوچھ لیں۔ ایک اور اشتہار ایک گروہ کی طرف سے عہد نامہ کی صورت میں ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ ایک اشتہار تین سو اٹھاسی بہائیوں کی طرف سے شائع ہوا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایک اعتراف اشتہار کی صورت میں ارمنی باشندوں کے کسی نمائندہ کی طرف سے چھپا ہے۔ لکھا ہے کہ اگر اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران نہ ہوتے تو لوگ ہماری تکا بوٹی کر ڈالتے۔

چھوٹے بڑے جرائم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کرفیو کے دوران دارو خانہ تخت طاؤس سے دو ملین ریال چوری ہو گئے۔ معلوم نہیں چوروں کے پاس کرفیو پاس تھا یا وہ کرفیو نافذ کرنے والوں میں شامل تھے۔ فرمانیہ میں ڈاکوؤں نے ایک گھر پر حملہ کیا جس میں تین جرمن انجینئر رہتے ہیں۔ ایک مقابلہ کرتے ہوئے شدید زخمی ہو گیا۔ پاکستانی مدرسہ کا ایک استاد ٹیکسی میں گھر جا رہا تھا۔ ٹیکسی والا اسے ایک سنسان جگہ پر لے گیا جہاں دوسرے تین مسافروں نے ٹیکسی والے کے ساتھ مل کر اسے مارا پیٹا۔ گھڑی، رقم اور ڈائری چھین لی۔ جاتے جاتے اسے چاقو کا ایک زخم بھی لگا دیا۔ وہ پیدل چلتا ہوا نزدیک ترین گھر تک پہنچا اور گھنٹی بجائی۔ اس ایرانی خاندان نے مرہم پٹی کی اور پولیس کو فون کیا۔ جواب ملا کہ ہم جائے واردات پر نہیں آسکتے۔ وہاں خطرہ ہے۔ زخمی اگر چاہے تو ٹیکسی لے کر ہمارے دفتر میں آجائے۔ ایک فوجی دستہ نظر آیا۔ اس سے مدد کی درخواست کی۔ جواب ملا کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

غلام حسین دانشی آبادان سے مجلس کے نمائندہ منتخب ہوئے تھے۔ تہران میں ان کی موٹر کے سامنے اچانک ایک موٹر آگئی۔ ادھر سے بریک لگائی گئی ادھر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ دانشی شدید زخمی ہو گئے۔ ہسپتال میں ہیں۔ معلوم نہیں وہاں سے کس

حالت میں واپس آتے ہیں۔ صحت یاب، معذور یا لاش کی صورت۔ حالات کچھ اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ دانش تری نہ کچھ میری دانشوری چلے۔ ایک دکاندار روہانسا ہو کر بولا۔ میں بازار بزرگ کا سرمایہ دار سوداگر نہیں ہوں۔ میری گزر بسر روزانہ آمدنی پر ہے۔ مہینوں سے جم کر دکان چلانے کا موقع نہیں ملا۔ جمع پونجی ختم ہو گئی ہے۔ بچے بھوکے ہیں۔ دکان کھولتا ہوں تو کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں سے آنکلتا ہے اور کہتا ہے۔ یا ببندید یا فاتحہ مغازہ بخواں۔ دکان بند کرو یا اس کا فاتحہ پڑھو۔ دکان بند کر کے گھر پہنچتا ہوں۔ بیوی کہتی ہے آج پھر خالی ہاتھ آگئے۔ آؤ مل کر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور ملک کا فاتحہ پڑھتے ہیں۔

روسی اخبار پراودا لکھتا ہے کہ تہران میں ایک امریکی جنرل کُودِتا کے امکانات اور انتظامات پر مشورہ دے رہا ہے۔ روسی ریڈیو اپنے فارسی پروگرام میں ایک عجیب و غریب خبر نشر کرتا ہے۔ اس خبر کے مطابق شہنشاہ چاہتا ہے کہ مصری اور مراکشی فوجیں مل کر ایران پر حملہ کر دیں۔ مراکش اس مہم جوئی کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اس منصوبہ کو امریکہ کی منظوری حاصل ہو۔

ایک سفارت کار نے بتایا کہ امریکہ کے قواعد و ضوابط کی رو سے غیر ممالک میں رہنے والے امریکی باشندوں کے لئے خطرے کے درجہ بدرجہ پانچ مراحل ہوتے ہیں۔ صفر کی بے خطر حالت سے لے کر نمبر چار کے مکمل خطرہ ہی خطرہ کے مرحلہ تک۔ سال بھر پہلے ایران میں امریکی باشندوں کو کسی چیز کا خوف نہ تھا لیکن شہنشاہ کے چھٹی پر جانے کے بعد خطرہ انتہائی درجہ سے صرف ایک درجہ کم رہ گیا ہے۔ پینتالیس ہزار میں سے پینتیس ہزار امریکی پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہیں۔ باقی ماندہ کو اب نکل جانے کا حکم مل گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک افسر نے بتایا کہ سیکرٹری جنرل نے نیویارک سے فون کیا تھا کہ ماہرین کی جانیں بڑی قیمتی ہوتی ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ دفاتر بند کرو۔ چوکیدار بٹھا دو۔ نہیں ملتا تو بے فکر ہو کر تالا لگا دو۔ اور فوراً ملک چھوڑ دو۔

ادھر لوگ ملک چھوڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اُدھر کوئی ملک واپس آرہا ہے۔ اس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کمیتہ استقبال از امام نے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ پچاس ہزار افراد امام کی حفاظت کے لئے مامور ہوں گے۔ رضا کار

بازو بند باندھے ہوں گے جن پر لکھا ہو گا، انتظامات۔ لوگوں کو مشورہ دیا جارہا ہے کہ راستے کو صاف رکھیں اور صدقہ کے گوسفند، گاؤ اور شتر سڑک کے کنارے ذبح نہ کریں۔ جو لوگ استقبال کے لئے دور سے آئیں انہیں چاہئے کہ تھوڑی سی خوراک اور ایک دستی ریڈیو ہمراہ لائیں۔ ہوائی اڈے سے مہمان سیدھا بہشت زہرا جائیں گے۔ وہاں قبرستان میں تقریر کریں گے۔ اس کے بعد وہ مرکز شہر میں واقع مدرستہ رفاہ میں قیام کریں گے۔ مدرسہ کی عمارت کی مرمت شروع ہے۔ اخباری خبر ہے کہ ایک منزل پر دو ملین ریال کے قالین بچھائے گئے ہیں جو بازار نے رضا کارانہ فراہم کئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس مدرسہ کے باورچی خانہ میں روزانہ ایک ہزار مرغ، تیس بکرے، اور چار سو بیس کیلو چاول پکائے جائیں گے۔ لوگوں کو یقین ہے کہ جس روز آیت اللہ واپس ایران پہنچیں گے اس روز ذبح ہونے والے ایک ہزار مرغ میں وہ ایک مرغ بھی شامل ہو گا جسے مرغ طوفان کہتے ہیں۔

وزیر اعظم شاہپور بختیار نے اپنی بے خوفی اور بگڑے ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کا ذکر دو استعاروں کے ذریعہ کیا تھا۔ ایک وہی بات کہ میں مرغ طوفاں ہوں طوفاں سے کیا ڈرنا اور دوسرا یہ کہ، موجم نہ آں موجی کہ از دریا گریزد۔ میں تو دریا کے اندر رہنے والی ایک موج ہوں نہ کہ مقابلہ سے گریز کرنے والا فراری۔ پندرہ دن تک اس مرغ نے طوفان کا مقابلہ کیا۔ دو ہفتہ تک سیلاب میں آئے ہوئے دریا کی موج دریا کے اندر ہی پیچ و تاب کھاتی رہی۔ مگر تابہ کے۔ مرغ اڑ گیا۔ موج ساحل فرانس پر سرپٹک کر خشک ہو گئی۔

انتظار موت سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اب لوگ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہوائی اڈا کھل جائے اور آنے والا آجائے۔ وگرنہ وہ مہر آباد ایئر پورٹ پر حملہ کر دیں گے۔ اگر فردا امام ما نیاید۔ مسلسلہا بیروں می آید۔ اگر کل تک ہمارے امام واپس نہ آئے تو ہم مشین گنیں لے کر نکل آئیں گے۔ خمینی، آپ کے لئے ہوائی اڈا ہمارے دل کی گہرائیوں میں واقع ہے۔ اے شیخی باز بختیار، اے نوکر بے اختیار، خواہ مخواہ ڈینگیں نہ مار۔ تمہیں کون نہیں جانتا۔ نہ مرغ طوفانی نہ موج دریائی۔ مرگ بر تو......۔ بختیار کہاں تک اور کب تک مقابلہ کرتا۔ پولیس مقابلہ سے پہلے ہی منتشر ہو گئی۔ کُودِتا ملتوی ہوتے ہوتے ممکن سے ناممکن کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ فوج کی ہچکچاہٹ ختم ہوئی۔

ہوائی اڈا کھل گیا۔ آج کوئی چودہ پندرہ برس کے بعد خمینی ایران واپس آرہے ہیں۔
آقای سے آیت اللہ، آیت اللہ سے آیت اللہ العظمی . آیت اللہ العظمی سے نائب امام، نائب امام سے امام۔ القابات اور درجات کا یہ سفر ایران واپس آنے والے رہنما نے کوئی پندرہ سولہ سال میں طے کیا ہے۔

(3)

وہ سفر جو آج بہشت زہرا کے قبرستان پہنچ کر ختم ہو گا، 1963 ء میں قم سے شروع ہوا تھا۔ اس سال ایران کے شہنشاہ نے ازراہ رعایا پروری اور فیض رسانی ایک ترقیاتی منصوبہ کا اعلان کیا۔ نام "انقلابِ سفید" رکھا۔ اس منصوبہ کی رو سے زمین کی حد ملکیت قائم ہونی تھی، جنگلات قومی ملکیت میں لئے جانے تھے، سرکاری صنعتیں نجی تحویل میں دی جانی تھیں، مزدوروں کو کارخانوں کی خالص آمدنی کا بیس فی صد حصہ ملنا تھا، خواتین کو حق رائے دہندگی اور دوسرے سیاسی حقوق ملنے تھے اور تعلیم کو عام کرنے کے لئے "سپاہِ دانش" کا قیام عمل میں لانا تھا۔ منصوبہ کی عوامی تائید کے لئے ریفرنڈم کی تاریخ کا اعلان بھی کیا گیا۔ مصلحت یہ تھی کہ ریفرنڈم میں کامیابی کے بعد انقلابِ سفید کو شہنشاہ اور عوام کا مشترکہ انقلاب قرار دیا جائے اور تاریخ جو بادشاہوں کی شہ زوری اور عوام کی منہ زوری کے مقابلوں سے بھری پڑی ہے اس میں ان دو قوتوں کے پرامن باہمی تعاون کے نئے باب کا اضافہ کیا جائے۔

اعتراض کرنے والوں نے کہا کہ اصلاحات امریکہ کے مفاد کی خاطر نافذ کی جا رہی ہیں۔ ان کے نفاذ سے زراعت اور اخلاق دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ ایران کا دارومدار صرف تیل کی آمدنی پر رہ جائے گا اور وہ امریکی مصنوعات کی منڈی بن کر رہ جائے گا۔ غریب کو اس منصوبہ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ عورتوں کی آزادی کے نام پر ملک میں فحاشی اور گناہ کو فروغ حاصل ہو گا۔ آئین میں ریفرنڈم کی کوئی گنجائش نہیں۔ شرع میں بھی اس طرح کے سفید انقلاب کی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ انقلاب صرف اس حد تک سفید ہے کہ اسے وائٹ ہاؤس میں تیار کیا گیا ہے۔ اٹھو کہ قرآن خطرہ میں ہے۔ آنکھیں کھولو کہ اسلام

خطرہ میں ہے۔

رفرنڈم وقت مقرر پر ہوا اور سرکاری گنتی کے مطابق لوگوں نے منصوبہ کے حق میں پچپن لاکھ ووٹ دیئے۔ منصوبہ کی مخالفت میں صرف چار ہزار ایک سو پندرہ ووٹ پڑے۔ ووٹوں کے اتنے بڑے فرق کے باوجود مخالفت نے مزید زور باندھا۔ زور توڑنے کے لئے فوج کے گوریلا دستہ نے قم میں مدرسہ فیضیہ پر حملہ کر دیا۔ چاند ماری کے لئے دینیات کے طلباء کو منتخب کیا۔ کچھ زخمی ہوئے، کچھ مارے گئے۔ جو خوف کے مارے چھت سے کود گئے ان کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ جن کی ٹانگیں سلامت تھیں وہ جوتے کپڑے اور کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حملہ آوروں نے بھاگنے والوں کی پگڑیاں جمع کیں اور انہیں آگ دکھا دی۔ جشن کا الاؤ روشن ہو گیا۔ شہنشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا۔ اتنے بڑے انقلاب کی خاطر معاشرہ کو تھوڑا بہت خون بہانا پڑتا ہے۔

آقای خمینی نے جو تسبیح پھیرنے اور وعظ و کتاب کی دنیا میں مگن رہنے والے علماء کے برخلاف عام لوگوں کی دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے ایک فتویٰ جاری کیا۔ شہنشاہ اور وزیراعظم اسداللہ عالم کی حکومت کو مدرسہ فیضیہ پر حملہ کے سلسلہ میں بہت برا بھلا کہا۔ "علما کے ایک مرکز پر حملہ نے منگولوں کے حملہ کی یاد تازہ کر دی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ منگولوں نے ایک غیر ملک پر حملہ کیا تھا۔ ...... شاہ سے وفاداری کا مطلب ہے۔ غارت گری، اسلام کی اہانت، مسلمانوں کے حقوق کی پائمالی، علمی مراکز کی بے حرمتی، قرآن اور اسلام پر وار کرنا، آثار اسلام کو مٹا دینا ...... (سن اے شہنشاہ) اب میں نے اپنے دل کو تیرے کارندوں کی سنگینوں سے چھیدے جانے کے لئے تیار کر لیا ہے۔ میں تیری قوت اور تیرے ظلم و ستم کے آگے جھکنے سے انکار کرتا ہوں۔" یہ تحریر، کبھی خفیہ جیبوں میں سلی ہوئی اور کبھی پھل کے ٹوکروں میں چھپا کر رکھی ہوئی، چپکے چپکے سارے ملک میں پھیل گئی۔

ماہ محرم شروع ہونے والا تھا۔ حکومت کی طرف سے علما کے ساتھ رابطہ قائم کیا گیا اور ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ محرم کی مجالس میں تین باتوں سے احتراز کریں۔ شاہ کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا جائے۔ اسرائیل کی مخالفت نہ کی جائے۔ اور یہ بات ہرگز نہ کہی جائے کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ اس فرمائش میں ایک سنگین دھمکی چھپی ہوئی تھی۔

عاشورا کا دن آیا۔ سہ پہر کو آقای خمینی نے تقریر شروع کی۔ کہنے لگے۔ ایران کی فاشستی حکومت چوٹی کے شیعہ علما سے متصادم ہے۔ یہ لوگ قرآن کے خلاف ہیں۔ ان کو اسلام اور علماء اسلام سے کیا واسطہ۔ یہ تو ان بنیادوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اسرائیل نہیں چاہتا کہ اس سرزمین میں عالم اور سائنس دان باقی رہیں۔ لوگ ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ اسرائیل اس لوٹ میں شامل ہے۔ شاہ کو چاہئے کہ ایسی پالیسی سے باز رہے وگرنہ ایک دن اس کا وہی حشر ہو گا جو اس کے باپ کا ہوا تھا۔ اس کے سارے حاضر باش دوست اسے چھوڑ جائیں گے کیونکہ ان لوگوں میں یقین ہے نہ وفا۔ وہ صرف ڈالر اور دولت کے دوست ہیں۔ ایران خطرہ میں ہے۔ اسلام خطرہ میں ہے۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔

تقریر ختم ہوئی اور دن بھی ختم ہو گیا۔ رات آئی اور وہ بھی ختم ہونے والی تھی کہ تہجد کے وقت فوج کے گوریلے اور چترباز آقای خمینی کے گھر نازل ہوئے۔ کچھ چھت کے راستہ آئے اور بہت سے دیوار پھاند کر اندر صحن میں کود گئے۔ وسط صحن میں لگے ہوئے خیمہ میں تلاش کیا۔ سارے کمرے چھان مارے۔ تہ خانہ بھی کھول کر دیکھ لیا۔ چھت پر ڈھونڈتے رہے مگر جس کی تلاش تھی وہی نہ ملا۔ انہوں نے مہمانوں سے بازپرس شروع کی۔ اتنے میں سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا اور آواز آئی۔ میں روح اللہ خمینی ہوں۔ فوجیوں نے جلدی سے انہیں گلی میں کھڑی چھوٹی سی سیاہ رنگ فوکس ویگن میں سوار کیا اور چل دیئے۔ سڑک پر پہنچ کر موٹر تبدیل کی اور تہران کے لئے روانہ ہو گئے۔ صبح ہوئی اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ پہلے قم اور تہران میں، پھر دوسرے شہروں میں۔ حکومت نے انہیں سختی سے کچلنے کی کوشش کی۔ سڑکوں پر ٹینک نکل آئے۔ فضائیہ کے طیاروں کی نیچی پرواز نے ہراس پھیلایا۔ مشین گن چلتی رہی۔ ایک سو افراد ہلاک ہو گئے۔

اس بات کا خدشہ تھا کہ حکومت کہیں آقای خمینی کو پھانسی نہ دے دے۔ علما نے انہیں بچانے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ آیت اللہ شریعت مداری قم سے چلے اور چپکے سے رے میں شاہ عبدالعظیم کے روضہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں بہت سے علما جمع ہوئے۔ انہوں نے باہم مشورہ کے بعد اعلان کیا کہ خمینی آیت اللہ ہیں، مجتہد ہیں، مرجع تقلید ہیں۔ پھانسی تو ایک طرف رہی اس اعلان کے بعد آیت اللہ خمینی کو کوئی معمولی سی سزا دینے کی گنجائش بھی باقی نہ رہی۔ ایران کے پرانے آئین کے ضمیمہ کی دفعہ ۲ میں علماء دین کے ذکر کے ساتھ ہی

قوسین میں درج ہے کہ اللہ ایسے صاحبان علم و احسان کی عمر دراز کرے۔ جس گروہ کی درازیٔ عمر کی دعا آئین میں موجود ہو اس کے کسی فرد کی تقریر کو باغیانہ قرار دے کر اس پر مقدمہ چلانا اور اسے سزائے موت دینا ایک قطعاً غیر آئینی فعل ہوتا لہٰذا چاروناچار گرفتاری کے آٹھ دس ہفتہ کے بعد آیت اللہ خمینی رہا کر دیئے گئے۔ حراست ہو کہ نظر بندی، آزادی ہو کہ جلاوطنی، آیت اللہ کے اس نظریہ میں سرمو فرق نہیں آیا کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔ آیت اللہ نے کہا میں وہ ملا نہیں جو ہاتھ میں تسبیح لے کر بے طرف ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں کوئی پوپ نہیں جو صرف اتوار کے دن مذہبی رسوم ادا کرتا ہے۔

آیت اللہ کو اگلا قدم اٹھانے کے لئے زیادہ دیر نہیں لگی۔ حکومت نے خود ہی موقع فراہم کر دیا اور وہ بھی ایک اندھیری رات میں جب وہ آدھی گزر چکی تھی۔ سینٹ اور مجلس کے خصوصی شبینہ اجلاس ہوئے اور ایک سطر کا یہ قانون منظور کیا گیا کہ ایران میں امریکی فوجی مشن کے افراد کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ویانا کنونشن کے مطابق سفارت کاروں کو دیئے جاتے ہیں۔ وزیراعظم نے کہا یہ ایک سادہ سا قانون اور سیدھی سی بات ہے۔ آیت اللہ خمینی نے کہا۔ "میں اپنے دل کا درد بیان نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں دل گرفتہ ہوں اور دن گن رہا ہوں۔ موت کب آئے گی...... انہوں نے ہمیں فروخت کر دیا ہے۔ ہماری آزادی کا سودا کر لیا ہے...... ہماری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ ایران کا وقار جاتا رہا...... اگر ایک امریکی نوکر یا خانساماں بیچ بازار آپ کے مرجع تقلید کو مار ڈالے...... تو ایرانی پولیس کو اس کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہو گا۔ ایرانی عدالتوں کو اس پر مقدمہ چلانے کا اختیار بھی نہیں ہو گا۔ یہ معاملہ امریکہ میں پیش کرنا ہو گا...... اہل ایران کے مرتبہ کو اتنا گھٹا دیا ہے کہ وہ امریکی کتے سے بھی کمتر حیثیت کے ہو گئے ہیں...... اگر شاہ ایران کی موٹر کار کی ٹکر کسی امریکی باشندہ کے کتے سے ہو جائے تو اسے تفتیش کا سامنا کرنا ہو گا۔ لیکن اگر کوئی امریکی خانساماں شاہ ایران یا اعلیٰ ترین عہدہ دار کو موٹر تلے کچل دے تو ملک کا قانون بے اثر اور قانون نافذ کرنے والے بے اختیار ہوں گے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ یہ لوگ امریکہ سے قرضہ لینا چاہتے ہیں...... حضرات، آج میں آپ کو ایک خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اے افواجِ ایران، میں خطرہ کا اعلان کرتا ہوں۔ اے اہل سیاست، میں

تمہیں خطرہ کے بارے میں تنبیہ کرتا ہوں۔ اے اہلِ تجارت، میں تمہارے لئے خطرہ کی نشاندہی کرتا ہوں۔ اے علما ایران، اے اسلام کے مرجع تقلید میں آپ کو بھی اس اندیشہ سے آگاہ کرتا ہوں۔ اے اہل علم و فضل، اے طالبانِ علم، اے حوزۂ علمیہ ، اے نجف، اے قم، اے مشہد، اے تہران، اے شیراز، میں آپ سب کو خبردار کرتا ہوں ...... ازراہِ کرم اس قوم کا بھی کچھ خیال کیجئے۔ قرضوں کے انبار مت لگایئے۔ اس حد تک غلامی قبول مت کیجئے۔ لاریب (قرض کا) ڈالر اپنے ہمراہ غلامی لے کر آتا ہے ...... وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ حکومت کے خلاف کبھی کوئی آواز نہ اٹھائی جائے کیا وہ ان بیرونی قرضوں کے معاملہ میں بھی یہی رویہ اپنانا چاہتے ہیں۔ کیا ہم چپ رہیں اور کچھ نہ کہیں۔ وہ ہمارا سودا کر دیں اور ہم پھر بھی لاتعلق رہیں۔ وہ ہماری آزادی کو بیچ دیں اور ہم محض خاموش تماشائی بنے رہیں!"

اس تقریر کے ایک ہفتہ تک کچھ نہ ہوا۔ لوگ تعجب کرنے لگے۔ ادھر سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ جواب کی تلاش میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ پھر سال گزشتہ کی طرح کمانڈو دستے آئے۔ ہر جگہ قبضہ جمایا۔ محلّہ، گلی اور گھر۔ دیواریں، چھت اور صحن۔ پھر کمرا کمرا تلاشی لینی شروع کی۔ جو کمرا بند پایا اس کا دروازہ توڑا۔ آیت اللہ اس کمرے کے دوسرے دروازہ سے نکل کر گلی میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں قم سے ہمراہ لیا اور مہر آباد ایئرپورٹ جا پہنچے۔ وہاں ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ وہ اڑا تو مقرر کو پتہ چلا کہ تقریر کی پاداش میں اسے جلاوطن کر دیا ہے۔ کوئی سال بھر ترکی، پھر سالہا سال عراق اور اب چند ماہ سے مضافات پیرس۔

کچھ عرصہ سے لوگ ان کی واپسی کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔ بالآخر انتظار ختم ہوا۔ آج چودہ سال دو ماہ اور ستائیس دن کی جلاوطنی کے بعد آیت اللہ خمینی واپس آرہے ہیں۔ یہ واپسی بھی کیا واپسی ہے۔ جس نے دیس نکالا دیا تھا۔ اسے خود ملک بدر ہونا پڑا تاکہ آیت اللہ وطن واپس آسکیں۔ کسی ملک میں بہ یک وقت دو بادشاہ سما سکتے ہیں نہ دو ایسے فرد جن میں سے ایک ظالم بادشاہ ہو اور دوسرا اس کو روکنے اور ٹوکنے والا درویش۔

(4)

دن ویسے ہی چڑھا جیسے پہاڑ کے دامن میں سردیوں کے دن چڑھا کرتے ہیں۔ سورج دیر سے نکلا۔ اس کی تپش میں کوئی تیزی نہیں ہے۔ جیسے اس نے گرمیوں میں فضول خرچی کی ہو اور سردیوں میں کنگلا ہو گیا ہو۔ سورج بھی سیلانی ہے۔ گرمیوں میں سوا نیزے پر آجاتا ہے اور سردیوں میں ترانوے ملین میل دور چلا جاتا ہے۔ اس کی دوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں سے برف آجاتی ہے اور کوہ البرز کو ڈھانپ لیتی ہے۔

استقبال میں شامل ہونے کے لئے ہم نے بڑی منصوبہ بندی کی تھی۔ کپڑے رات ہی کو نکال کر صوفہ پر پھیلا دیئے تھے۔ سلیٹی فلینل کی گھسی ہوئی پتلونیں، نئی تھرمل بنیانیں، پرانی قمیصیں، پوری آستین کے سویٹر، بھاری جوتے اور اونی موزے۔ سلمان نے مصنوعی ریشہ بھرا صدری کوٹ پہنا جو آج کل عام استعمال کے لئے نوجوانوں میں بڑا مقبول ہے۔ میں نے چمڑے کا سفاری کوٹ پہنا۔ ٹائی کے بجائے دونوں نے گلے میں مفلر ڈال لئے۔ احتیاط یہ کی کہ وہ دیکھنے والے کو بے احتیاطی کے ساتھ لپیٹے ہوئے نظر آئیں۔ میں نے گھڑی باندھی ہی نہیں۔ کلائی کی سنہری گھڑی کو خواہ مخواہ چغلی کھانے کا موقع کیوں دیتا۔ البتہ سلمان نے لڑکے بالوں والی ہندسہ نما جاپانی گھڑی باندھی ہوئی ہے۔ سواری کے بارے میں بھی اسی قسم کی منصوبہ بندی سے کام لیا گیا۔ میں نے کل دفتر سے دوسری سٹاف کار منگائی تھی۔ یہ نیلے رنگ کی والوو اسٹیشن ویگن ہے۔ رنگ جگہ جگہ سے اڑا ہوا۔ باڈی جگہ جگہ سے پچکی ہوئی۔ سفارتی نمبر پلیٹ اتار کر عمومی نمبر پلیٹ لگالی ہے۔ بس جیبوں میں پستہ بھرنے کی دیر ہے کہ تیاری ہر طرح سے مکمل ہو جائے گی۔

انتظامی تجربہ، سیاحتی مہارت اور مساحتی علم کام آیا۔ ہم کسی نہ کسی طرح چوک شاہ یاد کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ دائیں جانب کھلے میدان میں لاتعداد بسیں، ویگن اور موٹریں کھڑی ہیں۔ ان میں ایک گاڑی کا اضافہ ہماری وجہ سے ہو گیا۔ پیدل مینار کی طرف روانہ ہوئے۔ قدم بقدم وہ نزدیک آتا اور ہاتھوں اونچا ہوتا چلا گیا۔ بھیڑ میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا ہے۔ دو افراد کا اضافہ ہماری وجہ سے ہوا ہے۔ بھیڑ اتنی ہے کہ یہ دو افراد اس میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے جائزہ کے مطابق جلوس دیکھنے کے لئے سڑک کا وہ ذرا سا ٹکڑا سب سے اچھا ہے جہاں موٹر شاہ یاد کے گرد چکر لگا کر آہستہ ہونے کے بعد پھر سیدھی ہو کر موڑ کاٹے گی۔ سیدھی سڑک پر دیکھنے والے کو نظارگی کے تین چار سیکنڈ ملیں گے۔ اس موڑ پر کھڑے ہونے والوں کو کم از کم دس پندرہ سیکنڈ مل جائیں گے۔ ہر تاریخ ساز لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ اس حساب سے پندرہ لمحات کی طویل مدت کتنی بیش قیمت ہوگی۔ جائزہ اور تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دائیں سڑک کے دائیں کنارے پر کھڑا ہونا چاہئے کیونکہ تشریفات کے اصول کے تحت مہمان خصوصی موٹر میں اسی طرف بیٹھے ہوں گے۔ ہم نے جگہ کا تعین کرنے کے بعد اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ کبھی ہجوم میں دو قدم آگے بڑھنے کا موقع ملا، کبھی چار قدم پیچھے دھکیل دیئے گئے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہم جس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں بالاخر وہاں پہنچ گئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد پیچھے والوں نے بنشیں بنشیں کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ اگلی صفوں نے ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا۔ پھر کہیں سے انتظامات کا بیج لگائے میگافون ہاتھ میں لئے ہوئے ایک باریش نوجوان آگیا۔ اس نے حکم دیا۔ آقایاں بنشیں ۔ اس کا اتنا کہنے کی دیر تھی کہ سامنے کھڑے ہونے والوں کی پانچ دس قطاریں زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ میں اور سلمان بھی تار کول کی سڑک پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سڑک کی سطح سخت ہے مگر نہایت ہموار اس لئے چوکڑی مارنے کی عادت نہ ہونے کے باوجود دیر تک سڑک پر یوں بیٹھے رہنے میں کوئی خاص دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بس پہلو بدلتے رہے۔ میں کبھی کبھی اور سلمان بار بار۔ سڑک ٹھنڈی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ گرم کپڑوں اور گرم جوش ہجوم کی موجودگی میں اس مسئلہ پر کوئی توجہ دی جائے۔ سڑک پر بیٹھنے والوں کی آخری صف بڑی مشکل میں ہے۔ اس کے پیچھے جو لوگ کھڑے ہیں ان کے پاؤں کبھی کبھی ریلم ریلا کی وجہ سے اکھڑ جاتے ہیں اور وہ بیٹھے ہوؤں پر گرنے لگتے ہیں۔ بیٹھے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پہلے ہلچل پڑتی ہے پھر سکون ہو جاتا ہے۔ بہت سے بیٹھنے والے کچلے جانے کے ڈر سے کھڑے رہتے ہیں اور بہت سے کھڑے رہنے والے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں اور سلمان پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آخری صف کا پتہ نہیں چلتا کہ کونسی

ہے اور کہاں ہے۔ پانچ دس منٹ کے وقفہ کے بعد اس آخری صف کی صورت اور جگہ بدل جاتی ہے۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے کوئی تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اس مدت میں لوگوں کی کیفیت مزاج میں نمایاں فرق آگیا ہے۔ ابتدا میں ہر شخص پر شوق کا غلبہ تھا۔ کشاں کشاں اور خوشی خوشی چلا آرہا تھا۔ فکر صرف اتنی تھی کہ جگہ ملے گی یا نہیں۔ کچھ نظر آئے گا یا نہیں۔ باخبر کہ موقع کتنا اہم ہے۔ لیکن اس سے بے خبر کہ ہجوم میں اس کی جگہ کہاں ہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک رہی جب تک لوگوں نے کھڑے ہونے کے لئے سڑک کا کوئی نہ کوئی حصہ منتخب نہ کر لیا۔ پھر بڑے شوق سے دیر تک ہوائی اڈے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر لوگ استقبال کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہو گئے جہاں انتظار کے خلا کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند گھنٹے اس خلا میں گزارنے کے بعد تھکن نے ان کے چہرہ پر اپنا ٹھپہ لگا دیا۔ لوگ جمائیاں لینے اور اپنا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

ان لوگوں کو جلوس اور مظاہرہ کی عادت اور مشق ہے۔ جس میں گھنٹوں ہر ایک پوری طرح چست اور مصروف رہتا ہے۔ یہاں نہ فوج، نہ فوج کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹیں۔ نہ آنسو گیس، نہ گولی۔ نہ سڑک کے بیچ زخمی، نہ سڑک کے کنارے لاشیں۔ وقت کٹے تو کیسے کٹے۔ خدا خدا کر کے تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ مجمع میں جان پڑ گئی۔ لوگوں کو توقع ہے کہ اک آرزو جو وہ گھر سے لے کر نکلے تھے اگلے ایک گھنٹہ میں پوری ہونے والی ہے۔ چہرے کھل اٹھے ہیں۔ لوگ دائیں بائیں دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ انسیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ناواقف سے خود ہی گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ وہ بھی جیسے منتظر بیٹھا ہو۔ بڑے تپاک سے باتوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

اجتماع کے جس حصہ میں ہم شامل ہیں اس کا ماحول دوستانہ ہے۔ ٹوٹی پھوٹی فارسی سن کر لوگ خوش ہوتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک کے باشندہ نے بھی ان کی کامیابی کے اس نقطۂ اوج پر ہجوم میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے اور سڑک پر زانو بہ زانو بیٹھنے میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ میں نے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ لباس اور چہرہ مہرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر لوگ کم آمدنی والے اور متوسط طبقہ کے ادنیٰ حصہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پڑھے

لکھے متوسط طبقہ کی نمائندگی بھی ہو رہی ہے۔ امراء کے طبقہ سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ اس موقع پر لوگوں سے گھل مل جائیں گے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اس شخص کا استقبال کریں گے جو ان کی امارت کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ عورتیں اور بچیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ اسی طبقہ کی ہیں جن کے مرد یہاں جمع ہیں۔ جوان لڑکے، کیا خواندہ اور کیا نیم خواندہ، بے شمار اور بے حساب ہیں۔ جوان لڑکیاں خال خال ہیں۔ جوان خوشحال پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈے سے نظر نہیں آتی۔ یہ نقشہ مینار شاہ باد کے سایہ میں میری نشست کے ارد گرد جما ہوا ہے۔ یہاں سے لے کر بہشت زہرا کے قبرستان تک طبقاتی نمائندگی کا حال مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں جتنا مجھے نظر آ رہا ہے۔ اور جب سے آقایاں بنشیں کا حکم ملا ہے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میری نظر کھڑے ہونے والوں کی قطار تک پہنچ کر رک جاتی ہے۔ ہجوم اسے آگے جانے کا راستہ نہیں دیتا۔

میں لوگوں کے چہروں اور لباس کا جائزہ لیتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے دو تین دن سے کسی نے خط نہیں بنوایا۔ چہرہ کی سفید رنگت کچھ بے حجامت سبزہ نے ڈھک لی ہے اور کچھ سرما کی لائی ہوئی سرخی نے چھپالی ہے۔ ان کی گرم پتلونیں بے رنگ اور گھسی ہوئی ہیں۔ ان کے پائینچے گردش روزگار کی طرح گول ہیں۔ ان استری نا آشنا پتلونوں میں شکنیں بہت سی ہیں۔ ان کی بہتات میں وہ شکن گم ہو گئی ہے جو پتلون کی کریز کہلاتی ہے۔ امراء کا خوش لباس طبقہ محض اس شکن کی آب و تاب سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کے یہاں یہ سلوٹ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہوتی ہے۔ جونہی دھار بیٹھ جائے وہ کپڑے تبدیل کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ تبلیغی دورہ پر آئے ہوئے ایک کرنل کہنے لگے۔ پتلون کی کریز کسی ایسے شخص کی ایجاد ہے جو مسلمانوں کو بے نماز بنانے پر مقرر تھا۔ سننے والے نے پوچھا۔ جناب من، کیا وہ سارے مسلمان تہجد گزار ہوتے ہیں جن کی پتلونیں سلوٹ سلوٹ اور شلواریں شکن شکن ہوتی ہیں۔

میری بائیں جانب جو لڑکا زمین پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی عمر پندرہ سولہ برس ہو گی۔ اس نے اتنی سردی کے باوجود صرف قمیص اور پتلون پہنی ہوئی ہے۔ قمیص کسی موٹے کپڑے کی ہے مگر اس کے کئی بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ پھٹا پرانا فوجی فل بوٹ پہنا ہوا ہے۔ جس کی چوڑی نوک اس وقت میرے پہلو میں گڑی ہوئی ہے۔ آدھ گھنٹہ اس جوتے کے

ساتھ یوں جڑ کر بیٹھنے کے باوجود میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ پہلی بار نظر بھر کر اس وقت دیکھا جب اس لڑکے نے ایک پاؤں سے جوتا نکالا اور اسے درست کرنے کے بعد دوبارہ پہننے لگا۔ یہ جوتا اس کے پاؤں کے ناپ سے بہت بڑا ہے۔ اس نے جوتے کے پنجہ میں پھٹے ہوئے کپڑوں کا ایک گولا بنا کر اڑسا ہوا ہے۔ تلے سے لے کر پنڈلی تک اس فل بوٹ کی سلائی ادھڑی ہوئی ہے۔ اس نے جوتا پہنا اور اسے رسی سے باندھ لیا۔ رسی کا ایک بل تلے سے پیر کے اوپر تک ہے اور دو چار بل ٹخنے سے پنڈلیوں تک دیئے ہوئے ہیں۔ یہ لڑکا حال مست ہے۔ جوتوں کپڑوں اور الجھے بالوں کی جانب سے بالکل بے فکر۔ مسکراتا اور ہنستا ہے۔ خواہ کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو وہ گاہے سب کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں ایک آدھ جملہ کہہ دیتا ہے۔ نعرہ لگاتا ہے تو اپنی عمر سے بڑا لگتا ہے۔ ایک بار اس نے اچھل اچھل کر اس زور سے مرگ بر شاہ کا نعرہ لگایا کہ اس کے جوتے کی رسی ٹوٹ گئی۔

میری دائیں جانب جو بے چہرہ ہجوم ہے اس میں ایک خوش پوش گھرانہ بڑا نمایاں ہے۔ جوان میاں بیوی، سات آٹھ سال کی لڑکی، ایک بزرگ خاتون۔ یہ خاتون اگر پچاس برس کی ہے تو اسے نانی ہونا چاہئے۔ اگر ساٹھ کے پیٹے میں ہے تو دادی ہو گی۔ باپ نے گرم پتلون پر سیاہی مائل گہرے سبز رنگ کارڈ رائے کی سفاری بش شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ بچی نے فرکوٹ پہنا ہوا ہے۔ بچی کے ہاتھ میں اسکول کی کاپی کا ایک ورق ہے جس پر چند نعرے اور دو چار مدحیہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد وہ تہ کئے ہوئے ورق کو کھولتی ہے اور اس میں سے پڑھ کر نعرے لگانا شروع کرتی ہے۔ دور دور تک جہاں اس کی مہین اور معصوم آواز بھی نہیں جاتی لوگ یکدم خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی معصومیت اور جذبہ کے ساتھ، ایک فطری ہے اور دوسرے میں کسی قدر مشق کو بھی دخل حاصل ہے، سارا ورق اونچی آواز میں پڑھ جاتی ہے۔ آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ آواز بدل جاتی ہے۔ پندرہ بیس منٹ دم لینے اور لیمن ڈراپ چوسنے کے بعد وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاغذ نکالتی ہے اور نعرے لگانے لگتی ہے۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے اس کا نازک گلا بیٹھ گیا ہے۔ آواز بھرا گئی ہے۔ معصومیت بڑھ گئی ہے۔ جوش البتہ کم نہیں ہوا۔ قدر دانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ماں باپ نہال ہیں۔ بڑی اماں واری ہو رہی ہیں۔

نعرہ لگانے کے لئے ہجوم خود بخود ٹکڑیوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ جہاں کہیں کوئی نعرہ زن موجود ہے اس کے ارد گرد جمع ہونے والوں کو اس کی قیادت تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ہر ٹکڑی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگا رہی ہے۔ موقع ہی ایسا ہے۔ تحریک ہی ایسی ہے۔ جس ٹکڑی کو کوئی ماہر اور تجربہ کار نعرہ زن ملا ہے اس کا ولولہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نعرے لگوانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ ماہر فنکار وہ ہوتا ہے جو سوئے ہوئے مجمع کو جگا دے اور جاگے ہوئے کو مشتعل کر دے۔ پاکستان میں ہر بڑی سیاسی تحریک نے اپنے نعرہ زن پیدا کئے اور انہیں طرح طرح کے القاب سے یاد کیا۔ مولوی پٹاخا اور مولانا پٹاس۔ مولوی ہلچل اور مولانا للکار۔ ملا شور بازار اور ملا زور شور۔ خان بمبار خاں اور میرزا ایٹم بم۔ اس معاملہ میں اہل ایران برعظیم کے گھاگ نعرہ بازوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اس وقت ہمیں نعرہ لگانے والی تین ٹکڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ ایک میں ہم لوگ خود شامل ہیں، دوسری سڑک کے پار ہے اور تیسری ذرا فاصلہ پر۔ ہمارا نعرہ زن ادھیڑ عمر کا باریش شخص ہے۔ وہ کہتا ہے۔ حزب ماحزب خدا۔ مجمع بھی دو بار یہی نعرہ لگاتا ہے۔ حزب ماحزب خدا۔ حزب ماحزب خدا۔ اس کے بعد نعرہ زن نیا نعرہ کھینچتا ہے۔ رہبر ماروح خدا۔ لوگ اس کی پیروی میں دو تین بار ان الفاظ کو دہراتے ہیں۔ ہماری ٹکڑی میں جو نعرہ سب سے زیادہ لگایا جا رہا ہے وہ خاصا طویل ہے۔ بار بار لگانے کی وجہ سے اس کی ایک خاص لے بن گئی ہے اور لوگوں کو بھی سر جمانے کی مشق ہو گئی ہے۔ لوگ دائیں ہاتھ کی مٹھی ہوا میں لہراتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ماگوش بر آوازِ توایم خمینی (وقفہ) ۔ ماسربازانِ توایم خمینی۔ ہم آپ کے فرمان کے منتظر ہیں۔ ہم آپ کے جانباز سپاہی ہیں۔

دیر تک ایک ہی نعرہ زن کا ساتھ دینے کے بعد اب لوگوں نے یکسانی سے گھبرا کر ایک نیا انداز اپنا لیا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب جو لوگ جمع ہیں وہ آ ہستہ آ ہستہ آگے کھسکتے ہوئے اب ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ مسکراہٹیں اور اشارے سڑک پار کر لیتے ہیں۔ دونوں طرف یگانگی کا احساس بڑھا تو ایک طرف سے کسی نے نعرہ اچھالا اور دوسری طرف والوں نے اسے اچک لیا۔ پھر ادھر سے نعرہ لگا اور ادھر سے مجمع نے جواب دیا۔ ایک کنارے سے نعرہ دوسرے کنارے سے جواب سب کو بڑا اچھا لگا۔ تھکے ہوئے

لوگ تازہ دم ہوئے۔ اکتائے ہوئے چستی دکھانے لگے۔ نرم آواز گھکنے لگے۔ گہما گہمی اور گرم بازاری بڑھی۔

اس اثنا میں سڑک پر ایک چھوٹی سی بس نظر آئی۔ اس کے لئے جگہ بنانے کی خاطر چند قطاروں میں کھلبلی پڑی۔ ہم دونوں نے ذرا حوصلہ سے کام لیا اور پہلی قطار میں زمین پر جم کر بیٹھے رہے۔ منی بس کی چھت پر ایک مرد روحانی سیاہ جبہ پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ سیاہ دستار اور سیاہ ریش میں گھرے ہوئے چہرہ کا بس ذرا سا حصہ نظر آرہا ہے۔ پیشانی، ناک اور گال کی ہڈی کا ابھرواں حصہ۔ اگرچہ میں اس کو نظر بھر کر دیکھ رہا ہوں لیکن شناخت پریڈ ہو تو ہرگز اس شخص کو پہچان نہ سکوں۔ جسم کپڑوں میں چھپا ہے۔ چہرہ صافہ اور بالوں میں۔ منہ کے آگے میگافون ہے۔ شناخت کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔

منی بس سڑک پر آ ہستہ آ ہستہ چل رہی ہے۔ چونکہ ہوائی اڈے کی طرف سے آرہی ہے اس لئے سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ لوگ میگافون کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہیں مگر اس کی بیٹری کمزور ہے۔ کسی کو ایک آدھ لفظ سنائی دیا کسی کو دو چار۔ پوری بات کسی کے پلے نہ پڑی۔ بات کو چھوڑ کر لوگ منظر میں دلچسپی لینے لگے۔ میگافون والے ملا چلتی بس کی چھت پر کھڑے جھول رہے ہیں۔ ایک رضا کار اس منی بس کی چھت پر بیٹھا ہوا ہے اور اس نے ملا صاحب کی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا ہے۔ یہ رضا کار بھی کوئی جم کر نہیں بیٹھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اگلے موڑ پر وہ بس کی چھت سے پھسل کر نیچے سڑک پر گر جائے گا۔ چونکہ فرض شناس ہے اس لئے زمین پر چت ہونے کے باوجود اس نے مولوی صاحب کی ٹانگیں مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوں گی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

بس گزر گئی۔ جو لوگ راستہ بنانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے وہ بیٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ سب ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ یکایک کہیں سے دو تین رضا کار انتظامات کا بلّا لگائے آ نکلے۔ وہ ہجوم سے گزارش کرتے ہیں کہ اگلی دس بارہ قطاروں میں جو لوگ زمین پر بیٹھے ہیں وہ بیٹھے رہیں اور ہرگز کھڑے نہ ہوں۔ جو لوگ کھڑے ہو گئے تھے از راہ کرم فوراً بیٹھ جائیں۔ اعلان کے دوسرے حصہ پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ رضا کار لطفاً لطفاً اور خواہشمندیم خواہشمندیم کی گردان کرتے

ہیں۔ جو لوگ پیچھے کھڑے ہیں وہ ناراضی کا اظہار لُولُو اور ہُو ہُو کی آوازوں سے کرتے ہیں۔ سامنے کھڑے ہونے والے ان جان بن جاتے ہیں۔ ایک رضا کار نے تنگ آکر کہا۔ بنشیں بختیار بنشیں ۔ بختیار آج کل وزیر اعظم ہیں اور بالکل بے اختیار ہیں۔ انقلاب کا راستہ روکنا چاہتے ہیں مگر انہیں کوئی دفتر تک جانے کا راستہ نہیں دیتا۔ جو اعلان اس کے نام کے ساتھ کیا گیا ہے اس کا پاکستانی سیاست کے حوالہ سے بامحاورہ ترجمہ کچھ اس طرح ہو گا۔ ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔ حکومت کا چمچہ ہائے ہائے۔ چند کھڑے ہونے والے اس طنز کی تاب نہ لاسکے اور فوراً بیٹھ گئے۔

ایک رضا کار نے اعلان کیا کہ جو دیدار کے لئے آیا ہے وہ بیٹھ جائے اور جو ضد انقلاب ہے وہ کھڑا رہے۔ لوگوں نے اس اعلان کا برا منایا اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔ سب لوگ دیدار کے لئے آئے ہیں۔ وقت اور پروگرام کا پتہ نہیں چلتا۔ جگہ پر ہو چکی ہے۔ ہجوم بے تحاشا ہے۔ کیا بیٹھنے والے اور کیا کھڑے ہونے والے سب کی نظریں ہوائی اڈے کی جانب لگی ہیں۔ ایک شخص کہنے لگا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ چلتے چلتے اور کھڑے کھڑے خستہ ہو گیا ہوں اور اس شخص کی یہ مجال کہ مجھے ضد انقلاب کہتا ہے۔ دوسرے بھی اسی طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ لوگوں کو یوں بگڑتے ہوئے دیکھا تو رضا کار وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا، سڑک پر کیا نظر آرہا ہے۔ میں نے کہا، خالی سڑک۔ یہ دو لفظ ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے کہ ایک سفید مرسیڈیز کار ہوائی اڈے کی طرف سے آئی اور تیزی کے ساتھ سامنے سے گزر گئی۔ اتنے میں ایک اور کار نمودار ہوئی۔ یہ قدرے سست رفتار ہے۔ کوئی اسے آہستگی اور احتیاط سے چلا رہا ہے۔ وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جب موٹر سامنے سے گزری اور اس کی پشت پر ہماری نظر پڑی۔ موٹر کا پچھلا حصہ کھلا ہے۔ صندوق میں فوٹو گرافر شست باندھے بیٹھے ہیں۔ فوٹو گرافر کی آنکھ کیمرہ سے لگی ہوئی ہے۔ کیمرہ کی آنکھ لوگوں پر جمی ہوئی ہے۔ گاہے فوٹو گرافر بٹن دباتا ہے۔ کیمرہ کی آنکھ کا پردہ کھل جاتا ہے اور ساتھ ہی فلیش بلب سے نکلنے والی تیز روشنی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس موٹر کے پیچھے ٹیلیویژن والوں کی بس ہے۔ اس کی چھت کیمروں اور تصویر کھینچنے والوں سے بھری ہوئی ہے۔ بھاری کیمرے مضبوط تپائیوں میں جڑے ہوئے

ہیں۔ کچھ کاندھوں پر رکھے ہوئے ہیں اور کچھ گلے میں لٹکائے ہوئے ہیں۔ اس بس کے پیچھے ایک سفید ویگن نظر آرہی ہے۔ اس کی چھت پر پانچ چھ نوجوان سوار ہیں۔ دو چار نے ہاتھوں میں آیت اللہ خمینی کی تصویریں اٹھائی ہوئی ہیں۔ سامنے انجن کے ڈھکن پر ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے دیکھنے والے کی توجہ بٹ جاتی ہے اور شیشہ کا وہ حصہ بھی ایک حد تک چھپ جاتا ہے۔ جس کے پیچھے اگلی نشست پر آیت اللہ خمینی بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے ان کو نظر بھر کر دیکھا۔ یہ مہلت صرف چند لمحوں کے لئے تھی۔ گریز پا لمحات موٹر پر سوار ہو کر تیزی کے ساتھ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس ایک جھلک کا پہلا تاثر یہ ہے کہ شکل جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ انہیں شاید پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ پچھلے چند ہفتہ میں ان کی تصویریں بڑی کثرت سے دیکھی ہیں اور یہ ایک ایسا چہرہ ہے جسے کیمرہ ہو بہو نقل کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ شکل کچھ اور تصویر کچھ اور۔ دوسرا تاثر حیرت کا ہے۔ اچھا یہ ہے وہ مرد درویش جس نے ایک بادشاہ سے ٹکر لی اور اس کا تختہ الٹ دیا۔ اور بادشاہ بھی کیسے کروفر والا بادشاہ۔ شاہوں کا شاہ۔ تیل سے مالا مال ملک کا فرمانروا۔ فرمانبردار فوج کا سردار۔ سپر پاور کا منظور نظر۔ مطلق العنان اور جابر۔ دوسری طرف یہ ایک شخص تن تنہا اور خالی ہاتھ۔ قلندر صفت۔ جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔

سالوں کے بعد وہ دن آیا جس کے بارے میں چند ماہ پہلے تک یہ خیال تھا کہ شاید کبھی طلوع نہیں ہو گا۔ دنوں کے تذبذب کے بعد وہ موقع آیا جس کے بارے میں کچھ عرصہ سے یہ خیال تھا کہ حکومت جو چاہے کر لے یہ ٹل نہیں سکتا۔ گھنٹوں سڑک کے کنارے کھڑے رہنے کے بعد وہ گھڑی آئی ہے جس کا سب کو انتظار تھا۔ لیکن یہ کیسا لمحہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کچھ دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ گزر گیا۔ سامنے والوں نے سوار کی جھلک دیکھی۔ پیچھے والوں نے سواری دیکھی۔ ان سے پیچھے والوں نے صرف ہلچل دیکھی۔

(5)

گھر پہنچے۔ عذرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ نے آیت اللہ کو ہوائی جہاز سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا کیا محل اور مقصد ہے۔ اس نے گھر بیٹھے ہوئے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہزاروں لاکھوں افراد کے اجتماع میں ہمیں ہوائی اڈے سے میلوں دور کہیں سڑک کے کنارے کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے ملی ہو گی۔ پھر یہ استفسار کیسا۔ سوال میں طنز کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ اس خاتون خانہ کے اسلحہ خانہ میں طنز نام کا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ وہ اس بات کی قائل ہے کہ ہتھیار صرف ایک آدھ مگر انتہائی مہلک ہونا چاہئے۔ وہی Nuclear Deterrent والا نظریہ۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت خاتون کا جو رویہ ہے وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں نے زچ ہو کر جواب دیا۔ چہ خوش، چہ خوب۔ عذرا نے میرے طرز گفتار کو نظر انداز کیا اور بولیں۔ پھر تو ہم آپ پر بازی لے گئے۔ وہ منظر جو آپ کو دیکھنے کو نہیں ملا وہ ہم نے گھر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔

ٹی وی نے پہلے تو یہ کمال کیا کہ آیت اللہ کی آمد کا منظر ہوائی اڈے سے براہ راست دکھایا اور پھر یہ جھک ماری کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا۔ اس کی جگہ شہنشاہ کی تصویر لگا دی اور پس منظر میں وہ دھن بجانی شروع کر دی جسے بے وقت کی راگنی کہتے ہیں۔

شہنشاہ کا فرار انقلاب کی کامیابی کا پہلا مرحلہ تھا۔ آیت اللہ کی آمد اور استقبال اس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ مہر آباد کے ہوائی اڈے سے بہشت زہرا کے قبرستان تک سارا راستہ دیدار کے لئے آنے والوں سے پٹا پڑا ہے۔ یہ فاصلہ تینتیس کیلومیٹر ہے۔ لوگ پروانہ وار کھنچے کھنچے آئے ہیں۔ دیوانہ وار منتظر کھڑے ہیں۔ اس موقع پر ٹیلیویژن پہلوی خاندان کا شاہی ترانہ بجا رہا ہے۔ بے عقلی کوئی شہر نہیں کہ اس کی فصیل ہو۔ حماقت کوئی ملک نہیں کہ اس کی سرحد ہو۔ یہ ایک خلا ہوتا ہے جس میں ہر شے بے وزن اور معلق ہوتی ہے۔ تہران کا ٹی۔ وی اس وقت ایسے ہی ایک خلا میں تیر رہا ہے۔

ہوائی اڈے پر ایک طالب علم نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ مختصر اور پرجوش۔ القابات کے سلسلہ میں ایرانی مزاج میں بڑی سخاوت اور فارسی زبان میں بڑی وسعت ہے۔ طالب علم نے رہنما کو یوں مخاطب کیا۔ اے روح خدا، اے ابراہیم بت شکن اسلام، اے

بندۂ پاک باز، اے جان عزیز ملت ایران، رہبر فدا کار و روشن بیں، اے بندہ پاک باز خدا، اے مسلمان محمدی، اے شیعہ صادق، اے آیت خدا، اے رہبر عظیم الشان۔ موقع ایسا ہے کہ جذبات کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ زبان کی ٹکسال میں نئے نئے سکے ڈھالے جا رہے ہیں۔ شاید رہنما کی عظیم الشان خدمات کی قیمت ان سکوں میں ادا ہو سکے۔ اس خطبہ میں آیت اللہ کی جلاوطنی کو یاد آور ہجرت جد مکرمتان رسول خدا اور واپسی کو یاد آور فتح مبین. و. عظیم مکہ کہا گیا۔ یہ بھی کہا کہ آپ کی شخصیت اور تجربہ زندگی میں ہم نے خدا کے اس وعدہ کو پورا ہوتے ہوئے دیکھا ہے جو اس نے اپنی راہ میں چلنے والوں اور جنگ کرنے والوں سے کیا ہے۔

خطبہ استقبالیہ کے آغاز میں جو فارسی شعر پڑھا گیا وہ ایک جانا پہچانا شعر ہے۔ اس شعر سے میری شناسائی بچپن میں ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ شہر علی گڑھ، مقام مسلم یونیورسٹی، محلّہ تار والا بنگلہ، گھر حاجی حمیدالدین خاں کا، شادی ان کے کسی دوست کے لڑکے کی۔ وہ دھوم دھام تھی کہ اب تک اسے بھلا نہیں سکا۔ دعوت، نامہ منظوم، کاغذ مہین، چھپائی سنہری، لفافہ جہازی۔ نظم کسی ایسے پیشہ ور منشی کی لکھی ہوئی تھی جو گاہک کی خواہش کے مطابق مضمون کو بوجھل نثر یا بھرتی کے اشعار میں منتقل کرنے کی مہارت اور مشق رکھتا ہو۔ کاغذ اتنا باریک جیسے کسی ورق ساز کی دکان سے خریدا ہو۔ چھپائی تازہ، ایسی کہ سنہری ذرات رگڑ سے اتر کر کاغذ پر افشاں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ منظوم دعوت نامہ تقریب کی ساری تفصیلات یعنی نوعیت، شجرہ، مقام، وقت اور اسلامی، انگریزی اور ہندی تاریخیں اردو شعر کی معرفت دینے کے بعد ایک فارسی شعر پر ختم ہوتا تھا۔ یہ شعر شاید باقی نظم کے مقابلہ میں اس لئے جلی لکھا گیا کہ اس میں کہیں سکتہ نہیں پڑتا۔ شعر یہ تھا۔ رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست۔ کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست۔

شعر کی رو سے ہر مہمان کو حق حاصل تھا کہ شادی والے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے۔ میں دعوت نامہ ہاتھ میں لے کر شادی گھر میں اس انداز سے داخل ہوا جیسے میرے ہاتھ میں سند ملکیت ہے۔ وہاں دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ دولھا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آنے اور دلہن کے ڈولی میں سوار ہو کر جانے کے وقت آنے، دونیوں اور چونیوں کے ڈھیر جن میں کچھ تولہ بھر چاندی والے روپے بھی ملائے ہوئے تھے، مٹھیاں بھر بھر کر نچھاور

کیئے گئے۔ ہر مہمان کو ریشمی رومال میں بندھی ہوئی مٹھائی کی رکابی بھی ملی۔ میں نے گھر جا کر رومال کی گرہ کھولی۔ مٹھائی نکال کر ایک طرف رکھی۔ قلعی کی ہوئی تانبہ کی رکابی پر ابھرے ہوئے نقش و نگار کے درمیان وہی شعر لکھا ہوا تھا جس پر منظوم دعوت نامہ ختم ہوا تھا۔ شعر کا لفظ بہ لفظ مطلب مجھے معلوم نہ تھا۔ مفہوم کا کچھ اندازہ ضرور تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ شعر بڑے کام کا ہے۔ جس موقع پر چاہیں اسے استعمال کر لیں۔ ضیافت، شادی، خیر مقدم۔ جس شے پر چاہیں اسے نقش کر لیں۔ دعوت کا رقعہ، استقبالی پرچم، مٹھائی کی رکابی۔

آزادی ملی اور برطانوی ہند کے اثاثہ کی تقسیم ہوئی تو بھارت نے اسلحہ سازی کے کارخانے خود رکھ لئے اور شعر سازی کے کارخانے ادھر منتقل کر دیئے۔ غلہ رکھ لیا اور خالی بوریوں میں شعر بھر کر ادھر بھیج دیئے۔ انہی بوریوں میں سے وہ فارسی شعر بھی بر آمد ہوا جس کا ذکر ہو رہا ہے۔ حصول پاکستان سے نزول مارشل لا تک اس شعر سے بڑا کام لیا گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے لان، شالیمار کے باغ اور میونسپل کمیٹی کے ہال میں پیش کیئے جانے والے ہر سپاس نامہ کا آغاز اسی شعر سے ہوتا رہا۔ سننے والے تنگ آ گئے۔ یہاں تک کہ فیلڈ مارشل آئے اور سپاس نامہ پڑھنے کا یہ طریقہ متروک ہو گیا۔ میونسپل کمیٹی بھی اس شعر سے عاجز تھی۔ اس نے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اتنے پڑھے لکھے لوگوں کو لاہور کا لارڈ میئر منتخب کرنا چھوڑ دیا جو اس فارسی شعر کو روانی سے پڑھ سکیں۔

ایک طویل مدت تک رسمی اور فرضی خوش اخلاقی کے مظاہروں میں اس استقبالی شعر کے استعمال کے بعد جب سنا کہ ہوائی اڈے پر جلاوطنی کے پندرہویں سال میں واپس آنے والے آیت اللہ کے استقبالیہ میں جاء الحق و زھق الباطل والی آیت کے بعد اس شعر کو ان پہلے الفاظ کا درجہ حاصل ہے جس سے اتنے بڑے انقلاب برپا کرنے والے رہنما کو ایک احسان مند قوم نے مخاطب کیا ہے تو مجھے اس شعر کی صحیح قدر و قیمت کا پہلی بار اندازہ ہوا۔ بیس پچیّس لاکھ افراد بیس پچیّس میل تک راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑے ہوں، لوگ غیابت اور انتظار کے معنی جانتے ہوں، آنے والا آیت اللہ العظمیٰ ہو، وہ ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کے خاتمہ کی سوغات ہمراہ لا رہا ہو، اس نے پہنچنے سے پہلے ہی ملک کی تاریخ اور لوگوں کی سوچ بدل دی ہو، اور آنے والا اپنے ہی گھر واپس آ رہا ہو تو ہر آنکھ کے آشیانہ بن جانے اور ہر

دل میں گھر کر لینے والے دعویٰ. پر کون ایمان نہ لائے گا۔ میں تو اس منظر کا چشم دید گواہ ہوں۔

ہوائی اڈے سے جو جلوس چلا تھا وہ شاہ یاد تک بھی یکجا نہ رہ سکا۔ موٹر سائیکل سوار دستے، متحرک حفاظتی دستے، استقبالیہ کمیٹی کی موٹریں، ہمراہیوں کی بسیں۔ ایک طویل کاروان تھا جسے بھیڑ نگل گئی۔ صرف ایک پائلٹ کار، مجمع کی تصویر بنانے والوں کی کار، ٹی. وی اور کیمرہ والوں کی بس اور آیت اللہ کی کار شاہ یاد تک پہنچ سکی۔ شہر میں داخل ہوئے تو گنتی کی ان چار سواریوں کو بھی راستہ نہ ملا۔ حفاظت کرنے، ہجوم پر قابو پانے، سڑک کو ٹریفک کے لئے کھلا رکھنے کے لئے جو پچاس ہزار رضا کار کام پر لگائے گئے تھے وہ بھی ہجوم میں گم ہو گئے۔ آیت اللہ کی گاڑی کو کون راستہ دیتا ہے۔ سب کہتے ہیں ہمارے اوپر سے گذر کر چلے جایئے۔ لوگوں کی یہ بات مان لی گئی۔ آیت اللہ ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے اور لوگوں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے بہشت زہرا کے قبرستان کے قطعہ نمبر ۱۷ میں جا اترے۔

(6)

سہ پہر کو میں موٹر لے کر نکلا۔ دیکھوں شہر کی کیا حالت ہے، شہر والوں کی کیا کیفیت ہے۔ رخ پہلے جنوب کی طرف ہے۔ وہاں کا چکر لگا کر شمال شہر کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ سڑکیں لوگوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک سرشاری کا عالم ہے۔ کوئی گھر کے اندر ٹھہرنے کے لئے راضی نہیں۔ جونہی موقع ملتا ہے سڑک پر آجاتا ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ دوسرے اس کو دیکھ کر تسکین پاتے ہیں۔ آنکھیں روشن ہیں۔ چہروں پر رونق ہیں۔ باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ چال بدلی ہوئی ہے۔ کچھ ڈوبتے سورج کی تھکی ہوئی کرنوں کی وجہ سے اور کچھ میری خوش فہمی کے باعث یوں لگا جیسے آیت اللہ کی آمد کے چند گھنٹہ بعد وہ تمام نوجوان جن کے چہرہ پر آج صبح سبزہ نظر آتا تھا یکایک بارلیش ہو گئے ہیں۔ نوجوانوں کی گھنی اور سیاہ داڑھیوں میں دن بھر کے اندر جو اضافہ ہوا ہے اس کا سبب میں نے

سائنس کی مدد سے خود ہی دریافت کر لیا۔ خوف سے اگر بال اچانک سفید ہو جاتے یا گر جاتے ہیں تو خوشی کے موقع پر انہیں فوراً نکلنا اور سیاہ ہونا چاہیئے۔

میں نے موٹر ایک سفارت کار کے ولا کے باہر کھڑی کی۔ وہاں پہلے ہی دو چار موٹریں کھڑی ہیں۔ گول کمرے میں نشست جمی ہوئی ہے۔ تاش کا کھیل ہو رہا ہے۔ انہماک دیکھنے والا ہے۔ مجھے خوش آمدید کہا۔ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ بھی ملایا۔ مگر نظریں مسلسل پتوں پر جمی رہیں۔ کہنے لگے، شوق کیجئے۔ لیکن آج تختہ مشروبات تک آپ کو خود چل کر جانا ہو گا۔ من پسند مشروب کی بوتل بھی خود ہی کھولنی ہو گی۔ آپ جتنی دیر میں ڈرنک لیں گے اس وقت تک بازی ختم ہو جائے گی۔ دراصل آج ہمارے یہاں کوئی ملازم کام پر نہیں آیا۔ کھانا بھی بیگم کو پکانا پڑا۔ کہتے تھے ہم آیت اللہ خمینی کو لینے جا رہے ہیں۔ میں نے اجازت لی۔ ایک اور سفارت کار کے گھر پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ دروازہ دیر سے کھلا۔ خاتون خانہ نے پہلے جھانکی میں سے دیکھا اور پھر دروازہ کھولا۔ انتظار کے لئے معذرت چاہی۔ کہنے لگیں میں برتن دھو رہی تھی۔ آج ملازم نہیں آئے۔ وہ آیت اللہ کے استقبال کے سلسلہ میں چھٹی پر ہیں۔ میرے شوہر بھی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ سفارت خانہ میں ہیں۔ آیت اللہ کے استقبال کی رپورٹ بھیجنے میں مصروف ہیں۔ میں نے اجازت چاہی۔ اتنے میں ان کے شوہر ایک سفارت کار ساتھی کو ہمراہ لئے آن پہنچے۔ ہم نے دروازہ پر کھڑے باتیں شروع کر دیں۔ اندر چل کر بیٹھنے اور دم لینے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ مضمون واحد ہے۔ آج کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع کہاں ہے۔

میں نے پوچھا، کچھ پتہ چلا کہ آیت اللہ نے بہشت زہرا والی تقریر میں کیا کہا ہے۔ میزبان کہنے لگے۔ ہم نے تین مختلف ذرائع سے اس تقریر کے مختصر اشارات اور تحریری یادداشت حاصل کرنے کا انتظام کیا تھا۔ مجھے ان کا موازنہ اور ترجمہ کرنے میں بڑا وقت صرف کرنا پڑا۔ ان کے ساتھ آنے والے سفارت کار نے اس موقع پر مداخلت کی اور بولا۔ یہ حضرت آدھا دن سفارت خانہ کے اس حصے میں رہے جس پر داخلہ ممنوع کا بورڈ لگا ہوا اور دروازہ پر تالا پڑا ہے۔ میں اسے پرائیویٹ جیل کہتا ہوں۔ جو شخص کام کی غرض سے اندر جانا چاہتا ہے اسے اندر بھیج کر باہر سے تالا لگا دیتے ہیں۔ رہائی کے لئے اندر سے باہر فون کرنا پڑتا ہے اور یہ اندر باہر دونوں ایک عمارت کے ایک ہی فلور پر واقع ہیں۔ مجھے آج اس

جیل خانہ میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا جہاں اس تقریر کا پہلے فارسی سے ہماری قومی زبان میں ترجمہ ہوا، پھر ترجمہ کو خفیہ لغت میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے باوجود میں آپ کو اس تقریر کے تمام اہم نکات بتا سکتا ہوں میں نے وزارت خارجہ میں بیس برس بھاڑ نہیں جھونکا۔

غور سے سنئے۔ آیت اللہ نے پندرہ سال پہلے جن واقعات کی بنا پر انہیں جلاوطن کیا گیا تھا انہیں یاد کیا۔ جلاوطنی کے مصائب کا ذکر کیا۔ پھر فقید المثال استقبال پر قوم کا شکریہ ادا کیا۔ اس استقبال کو رفرندم کا درجہ دیا۔ اپنی حکومت بنانے کا اعلان کیا۔ فوج کا نیا سربراہ نامزد کیا۔ پچاس برس سے زائد عمر کے تمام سول اور فوجی افسروں کو ملازمت سے فارغ کر دیا۔ ساواک کو توڑنے اور اس کے سربراہوں کو چوک شاہ یاد میں پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ شاہ اور اس کے حواریوں کو ڈاکو اور لٹیرا کہا۔ لوٹی ہوئی قومی دولت کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کے پیٹ چاک کر کے وہاں سے بھی نکال لینے کے عزم کا اظہار کیا۔ تمام محلات اور پہلوی خاندان کی جائداد قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا۔ شاہ کو معزول کیا اور اس پر مقدمہ چلانے کے لئے ٹریبونل قائم کیا۔ خارجہ پالیسی پر بڑا پرجوش بیان دیا۔ ایرانی تیل اور گیس کی دولت لوٹنے والوں سے حساب لینے اور پرانے معاہدے توڑنے کا اعلان کیا۔ ایک سپر پاور کا طفیلی ملک ہونے کی حیثیت ختم کی اور ایران کو غیر وابستہ ملک قرار دیا۔ ایران میں اسلامی امامت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ ولایت فقیہہ کے خدوخال بیان کئے۔ اور آخر میں انقلاب کے دوران شہید، بیوہ، یتیم اور اپاہج ہونے والوں کو زبردست خراج تحسین پیش۔ قبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت پڑھی کہ شہید زندہ ہیں۔ لوگ قبروں کی طرف دیکھ کر بہت روئے۔ ان کی آہ وبکا میں ہیلی کاپٹر کا شور شامل ہو گیا۔ آیت اللہ وہاں سے مدرسہ رفاہ چلے گئے۔

یہ سفارت کار بڑے تر دماغ اور چرب زبان ہوتے ہیں۔ موصوف نے ایسا سماں باندھا جیسے وہ تقریر کے وقت بہشت زہرا کے اجتماع میں پہلی صف میں موجود تھے۔ میں نے کہا باقی باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم جلسہ گاہ تک کیسے پہنچے۔ میزبان نے کہا۔ اگر اس شخص نے اپنا گلاس پورا ختم کر لیا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ آیت اللہ اس سے کہیں زیادہ دھواں دھار تقریر کرتے۔ یہ میرا ساتھی، یہ میرا پیارا بھائی، اپنی انہی باتوں کی وجہ سے مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔ یہ آج دوپہر تک سوتا رہا۔ چھٹی مناتا رہا۔ اس کے بعد سفارت خانہ پہنچ کر اپنی ڈاک نکالنے

میں مصروف ہو گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ بہشتِ زہرا میں کیا ہوا اور کیا کہا گیا۔ مگر یہ بات اس طرح کر رہا ہے جیسے خمینی نے اپنی تقریر اسی سے لکھوائی تھی۔

آیت اللہ کی تقریر جذبات، شعریت اور خیال بندی سے خالی تھی۔ جوش، ہیجان، آگ اور دھوئیں سے عاری تھی۔ نہ کوئی فخریہ بات جو ایسے موقع پر بے اختیار منہ سے نکل جاتی ہے۔ نہ فتح مندی کا نشہ جو کامیابی کے بعد بن بتائے چڑھ جاتا ہے۔ ساری تقریر استدلالی اور منطقی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ بادشاہت ایک ایسا نظام ہے جو غیر قانونی، غیر عقلی اور حقوق انسانی کے تقاضوں کے خلاف ہوتا ہے۔ اصول یہ بیان کیا کہ لوگوں کی تقدیر ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ انہیں یہ فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق ہوتا ہے کہ ان کا حکمران کون ہو گا۔ دلیل یہ دی کہ اگر ساری قوم نے ووٹ دے کر آقای محمد خاں قاچار کو بادشاہ بنا دیا ہوتا تو چونکہ یہ معاملہ محمد خاں قاچار اور ووٹ دینے والوں کے درمیان طے ہوا تھا لہٰذا وہ فریقین تک محدود رہتا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ جب ہماری نسل کی باری آئے تو ہماری مرضی معلوم کئے بغیر احمد شاہ قاچار ہمارا حکمران بن جائے۔ سوڈیڑھ سو سال پہلے لوگ اپنی تقدیر اور اپنی حکومت کا فیصلہ تو کر سکتے تھے مگر ہماری تقدیر اور ہماری حکومت کا فیصلہ کرنے اور ہم پر ایک خاندان کی بادشاہت ٹھونسنے کا حق انہیں ہرگز حاصل نہ تھا۔

آیت اللہ نے یہ دلیل دینے کے بعد کہا کہ محمد رضا شاہ کی حکومت بہر عنوان غیر قانونی ہے۔ اس نے ایران کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا زور تین باتوں پر تھا۔ معیشت کی تباہی، اخلاق کی تباہی اور غیر ملکیوں کی غلامانہ فرماں برداری۔ اخلاق کی تباہی کے سلسلہ میں انہوں نے یہ مثال دی کہ تہران میں میخانوں کی تعداد کتب خانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ صورت حال کے اس منطقی جائزہ میں صرف دو جملے شروع میں اور ایک جملہ آخر میں نظام پادشاہت سے ہٹ کر کہا۔ آغاز میں کہا کہ ملت نے قتل، ظلم اور غارت کی صورت جو مصیبت برداشت کی ہے اس کی میں کہاں سے تلافی کر سکتا ہوں۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ دے گا۔ آخر میں کہا اسلام تمہارے لئے کفر سے بہتر ہے۔ اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر ہوتے ہیں۔

یہ اس تقریر کا خلاصہ ہے جس کے لئے ایک دنیا اس ڈر سے گوش بر آواز تھی کہ

جب آتش فشاں پھٹے گا تو نہ جانے کون کون سی بستی اس کی زد میں آکر ویران ہو گی۔ اور تو اور وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ آج غالب کے پرزے اڑیں گے وہ بھی حیرت سے کہنے لگے۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا۔ شاہ کے بارے میں بڑے ٹھنڈے دل سے باتیں کیں۔ آواز بلند ہوئی نہ سخت الفاظ استعمال کیئے۔ صرف اتنا کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ وہ واپس آئے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اسے واپس کیا جائے۔ جب شہنشاہ کا ذکر آیا اور اس کو جی بھر کر برا بھلا کہنے کا موقع ملا تو ساری بات دو لفظ میں کہہ ڈالی اور جس موضوع پر بات ہو رہی تھی اسے جاری رکھا۔ ایک جملہ معترضہ تک نہ کہا۔ صرف دو اسم صفت استعمال کیئے۔ خائن اور خبیث۔ اس تقریر پر ایک جہاں دیدہ سفیر کا تبصرہ صرف اتنا تھا۔ ڈرو اس شخص سے جو اپنے نفس پر اتنا اختیار رکھتا ہو۔

رات گئے ایک ایرانی دوست کا فون آیا۔ آقای مختار مسعود، آپ سے ایران کی صورت حال پر پچھلے چھ ماہ میں بارہا گفتگو ہوئی۔ آپ نے مجھے ہراساں پایا ہو گا حالانکہ میں اپنی پریشانی چھپانے کے لئے سب ٹھیک ہو جائے گا کہہ کر بحث ختم کر دیتا تھا۔ لیکن آج میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج کا دن ایران کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ اس لمحہ جو میرے احساسات ہیں میں انہیں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

ہوائی اڈے پر ایک غیر ملکی صحافی نے پوچھا۔ آپ ایک طویل جلاوطنی اور عظیم جدوجہد کے بعد ایران واپس پہنچ گئے ہیں۔ کامیاب و کامران۔ یہ بتایئے اس لمحہ آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ آیت اللہ نے بغیر رکے اور بغیر پلک جھپکے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ہیچ۔ کچھ بھی نہیں۔

(7)

صبح ہوتے ہی لوگوں نے مدرسہ رفاہ کا رخ کیا۔ جوق در جوق اور غول کے غول۔ گلیوں میں جمگھٹا ، سڑکوں پر ہجوم، شاہراہوں پر شلوغ۔ کل سارے راستے ہوائی اڈے کی

طرف جاتے تھے آج وہ مدرسہ کی طرف جاتے ہیں۔ لوگوں کا ایک سیلاب ہے جو مدرسہ کے آس پاس سارے علاقہ میں پھیل گیا ہے۔ یہ سیلاب اس کوچہ میں سے کیسے گزرے گا۔ اونٹ بھی کبھی سوئی کے ناکہ میں سے گزرا ہے۔ لوگ دیدار عام کی امید میں اڈے آرہے ہیں مگر اتنے بہت سے لوگ مدرسہ کی عمارت تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ جس کو جہاں تک راستہ ملا وہاں تک پہنچ جائے گا۔ اور پھر دیر تک اس امید میں وہاں کھڑا رہے گا کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ عمارتیں پیچھے ہٹ جائیں۔ راہیں یکایک کشادہ ہو جائیں۔

جہاں بھی جاؤ وہاں امام خمینی کی واپسی پر گفتگو ہو رہی ہے۔ آج ہر شخص آیت اللہ کے بجائے امام کا لقب استعمال کر رہا ہے۔ کل جس طرح ان کا استقبال ہوا اس کے بعد یہ لقب خود بخود لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا ہے۔ ہر شخص استقبال کو بے مثال اور بے نظیر کہہ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ آج تک کسی فرد واحد کے استقبال کے لئے اتنے لوگ جمع نہیں ہوئے۔ یہ سب اپنی مرضی سے آئے تھے۔ انہیں کوئی گھیر کر نہیں لایا۔ نہ کوئی سرکاری ادارہ اس کام پر مامور تھا، نہ کوئی سیاسی پارٹی اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سرکار اور دربار اس آمد کے خلاف تھے اور سیاسی پارٹی کا یہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ شاہ نے جو سیاسی پارٹیاں بنائیں وہ صرف عہدہ داروں پر مشتمل ہیں۔ جو مصدق کے زمانہ میں بنی تھیں اور پچیس برس سے معطل ہیں ان کے تو عہدہ دار بھی نہیں رہے۔ اس کے باوجود اتنے سارے لوگ خود بخود استقبال کے لئے جمع ہو گئے کہ تبصرہ نگار تاریخ کی کتابیں کھنگال رہے ہیں۔ حوالہ تلاش کر رہے ہیں۔ واقعات کے موازنہ میں مصروف ہیں۔ کیا پہلے کبھی ایران میں ایسا ہوا ہے۔ حاصل تحقیق۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔

میری موٹر کار کا رخ پاکستانی مدرسہ کی جانب ہے۔ رفتار تیز ہے۔ جمعہ کی نماز ہونے والی ہے۔ وقت تنگ ہے۔ خیابان ایران نویں سے مدرسہ والی گلی میں مڑا تو اسے سنسان پایا۔ جہاں دور تک موٹر پارک کرنے کے لئے جگہ نہیں ملتی وہاں آج میں پھاٹک کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ نمازیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مختلف کمروں، رہداریوں اور منزلوں میں بکھری ہوئی جماعت آج ایک کمرے میں سما جائے گی۔ نماز کے بعد جوتا بھی فوراً مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیر جہاں رکھا تھا وہاں پڑا ہو اور دوسرا سیڑھیاں چڑھ کر کسی دوسری منزل پر پہنچ جائے۔ مدرسہ میں ہر شخص استقبال کے ان مناظر کا ذکر کر رہا ہے جو اس نے

بچشم خود دیکھے تھے۔ ہر شخص کا تجربہ بالکل ایک جیسا ہے۔ سب متفق ہیں کہ ایسا استقبال دیکھا نہ سنا۔ جوش و ولولہ ناقابل یقین۔ عقیدت و ارادت ناقابل بیاں۔ اجتماع میں شامل ہونے والوں کی تعداد بے حد و حساب۔

نماز کے بعد ہم چھ سات دوست ایک فلیٹ میں کھانے کے لئے جمع ہوئے۔ وہاں چار پانچ خواتین پہلے ہی موجود تھیں۔ وہ آیت اللہ خمینی کے استقبال کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ ہم لوگ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ایک خاتون کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک دوست نے کہا۔ امام کے تین معنی ہیں۔ پہلا کامل اور رہنما، دوسرا پیش نماز اور تیسرا، سلسلہ امامت کی ایک کڑی۔ خمینی کے نام کے ساتھ جو امام کا سابقہ آج ہر جگہ سننے میں آرہا ہے وہ کامل اور پیشوا کے معنی میں ہے۔ ہمارے یہ ساتھی اسلامیات اور تاریخ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے گفتگو کا انداز بدل گیا۔ گول کمرے کی لاابالی جملہ بازی کی جگہ سنجیدہ گفتاری نے لے لی۔ صاحب خانہ دو چار کتب حوالہ بھی اٹھالائے۔ بحث میں دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ کسی نے خاتون خانہ کے اس اعلان کو قابل توجہ نہ سمجھا کہ وہ کھانا میز پر رکھنے لگی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بات بہت دور جا پہنچی۔ طرح طرح کے واقعات سننے میں آئے۔ نئے نئے انکشاف ہونے لگے۔

انیسویں صدی میں ایران میں ایک صاحب شیخ احمد احصائی نام کے ہوا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے کچھ اور لوگوں کا ظہور ہو گا جو آنے والے کے لئے راستہ ہموار کریں گے۔ اس راستہ کا دروازہ انہوں نے اپنی ذات کو بنایا۔ مگر وہ باب کے لقب سے مشہور نہ ہو سکے۔ یہ لقب ان کے ایک جانشین کے لئے محفوظ رہا۔ احصائی کے جانشین سید کاظم (وفات 1843ء) ہوئے اور ان کے بعد یہ تحریک تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ حاجی کریم خاں کرمانی والی شاخ کریم خانی۔ یہ لوگ سرکار آغا کہلاتے ہیں۔ حاجی مرزا شفیع تبریزی والی شاخ جسے شیخی کہتے ہیں۔ اور ملا حسین والی شاخ۔ ملا حسین بڑے ہوشیار انسان تھے۔ انہوں نے تنہائی میں تین دن اور رات ایک نوجوان کو یہ باور کرانے میں صرف کئے کہ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہے۔ پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند۔ پیر بے چارہ کہاں ہوا میں اڑتا ہے۔ یہ ہوائی مرید اڑاتے رہیں۔ سید علی محمد شیرازی نے بالآخر ملا حسین کی بات مان لی مگر پوری نہیں بلکہ آدھی۔ ملا حسین ان کو مہدی بنانا چاہتے تھے مگر شیرازی نے مہدویت

کا باب کہلانے پر اکتفا کی۔ مرید بابی کہلائے۔

باب کے مریدوں میں مرزا یحیٰ نوری (صبح ازل)، مرزا حسین علی نوری (بہاء اللہ) اور زریں تاج (قرۃ العین طاہرہ) شامل تھے۔ یہ طاہرہ وہی خاتون عجم ہیں جو علامہ اقبال کو فلک مشتری کے سفر کے دوران نظر آئی تھی۔ لباس سرخ، چہرہ روشن اور لب پر دردناک نالہ فراق۔ ہجر میں نہ جانے طاہرہ کے دل دیوانہ پر کیا قیامت گزری اور نہ جانے وہ کون سا عالم سرشاری تھا جس میں اس نے ایسے پر حسرت مگر خوش آہنگ شعر کہے جو نالہ کا نالہ ہیں اور نغمہ کا نغمہ۔ نوائے طاہرہ کے مطلع اور ہر دوسرے مصرع میں سہل اور سادہ الفاظ کو بائے مفتوحہ کے ساتھ ملا کر اس پر کاری اور چابک دستی سے دہرایا ہے کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ چہرہ بہ چہرہ روبرو، کوچہ بکوچہ کوبکو، چشمہ بہ چشمہ جو بجو۔ اس فارسی ترکیب کی وجہ سے سرود و سرور کی لذت اور فراق کی شدت اور حسرت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اشعار قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ غزل کے آخری شعر میں خود شاعرہ پڑھنے والے کو ہمراہ لے کر اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے ؎ در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا۔ صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو۔ طاہرہ نے اپنے دل کا چکر لگایا۔ وہاں تیرے سوا کچھ نہیں رکھا۔ ہر صفحہ پر، ہر تہ میں، ہر پردہ میں تو ہی تو موجود ہے۔

زریں تاج نے ایک مُلّا کی بیٹی، ایک مُلّا کی بیوی اور مُلّا محمد تقی مجتہد کی بھتیجی اور بہو ہونے کے باوجود باب کا مذہب اختیار کر لیا۔ باب نے اسے قرۃ العین کا لقب دیا اور طاہرہ تخلص تجویز کیا۔ ادھر مجتہد چچا نے بابیوں کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ جواب فتویٰ کی صورت یہ ہوئی کہ بابیوں نے مجتہد کو قتل کر دیا۔ طاہرہ پر کفر کا الزام پہلے ہی لگ چکا تھا اب اس پر قتل کی سازش میں شریک ہونے کا الزام بھی عائد ہو گیا۔ وہ بھاگ کر خراسان چلی گئی۔

1848ء کی بہدشت کنونشن میں بابی مذہب کو اسلام سے جداگانہ حیثیت دے دی گئی۔ یہ فیصلہ بہت دیر سے ہوا۔ اگر روز اول سے کیا ہوتا تو بات اور تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ علی محمد باب آذربائی جان کے ایک قلعہ میں بھیج دیئے گئے۔ ناصر الدین قاچار نے ایک بحث کا بندوبست کیا۔ علی محمد باب نے کئی مسائل کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

مجھے معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور بعض مسائل جن عربی جملوں میں بیان کئے ان کی گرامر غلط تھی اور تلفظ بھی اتنا خراب تھا کہ علما اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

علی محمد باب کو سزائے موت سنائی گئی۔ قلعہ کی دیوار سے رسیوں کے ذریعہ باندھ کر لٹکایا۔ عیسائی فوجی دستہ نے گولیاں چلائیں۔ ہر طرف بارود کا دھواں پھیل گیا۔ جب دھواں تحلیل ہوا تو دیکھنے والے حیران ہوئے کہ وہاں علی محمد باب کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص سکتہ میں آگیا۔ واقعی وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ ہو گا جسے اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ دراصل گولیوں کی باڑ رسیوں پر لگی۔ باب نے دھوئیں کا فائدہ اٹھایا اور وہاں سے بھاگ نکلے مگر جس کمرے میں پناہ کے لئے داخل ہوئے وہ پہرا چوکی والوں کا کمرا نکلا۔ دوسری بار باڑھ داغی گئی۔ درجن بھر سپاہی ہوں تو نشانہ بار بار خطا نہیں ہوتا۔ یہ 1850ء کی بات ہے۔

دو سال کے بعد طاہرہ گرفتار ہوئی اور اسے بھی موت کی سزا سنائی گئی۔ ناصرالدین قاچار نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ علماء سے جان بخشی کی سفارش کی۔ بگزارید کہ صورت زیبا دارد۔ اگر کچھ اور نہیں تو محض اس وجہ سے ہی معاف کر دیجئے کہ اس لڑکی کی صورت بہت اچھی ہے۔ لڑکی نے بابی مذہب ترک کرنے سے انکار کیا۔ علماء نے سزا معاف کرنے سے انکار کر دیا۔

علی محمد باب کو سزا ہوئی اور مرید تقسیم ہو گئے۔ ایک دروازہ بند ہوا اور دو نئے کھل گئے۔ ایک فرقہ ازلی بن گیا۔ دوسرا بہائی۔ دروازے اسی طرح کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ شمالی افریقہ میں مصر سے لے کر مراکو تک جگہ جگہ دعویدار پیدا ہوئے۔ حواریوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رد کرنے والوں نے جواب دعویٰ دائر کیا۔ مقابلہ ہوا یا مقدمہ چلا۔ دعویدار ہار کر قتل ہوتے اور پھانسی چڑھتے رہے۔ ابن خلدون نے ایک ایسے شخص کی نشاندہی کی ہے جو بہت سے لوگوں کا پیشوا، بہت سے شاگردوں کا استاد اور بہت سے خادموں کا مخدوم تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ چلو مغرب چلتے ہیں اور وہاں پہنچ کر اپنے ظہور کا اعلان کرتے ہیں۔ عقیدت مندوں کی ایک فوج کو ہمراہ لیا اور مغرب جا پہنچا۔ وہاں دوسروں کو اتنا باثر پایا کہ کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ ناچار ارادہ بدل لیا اور واپس چلا گیا۔

بحث جاری ہے۔ استقبال کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک دوست بڑی سنجیدگی کے ساتھ

کہنے لگے۔ ذرا اس بات پر غور کرو کہ ایک شخص چودہ سال سے ملک بدر ہے۔ عمر رسیدہ ہے۔ واپسی کا امکان نہیں۔ شاہ جم کر تخت پر بیٹھا ہے۔ اچانک وہ شخص جس کی شکل بھی لوگوں کو یاد نہیں انہیں ایک غیر ملک سے اشارہ کرتا ہے کہ شاہ کے خلاف قیام کرو۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پولیس اور فوج بے دردی سے گولی چلاتی ہے۔ لوگ مارے جاتے ہیں۔ ایک دو دن نہیں، ایک دو ہفتہ نہیں بلکہ مہینوں تک سڑکوں پر لوگ اس شخص کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ لہو اتنا بہتا ہے کہ بالآخر شاہ اس میں ڈوب جاتا ہے۔ راستہ صاف ہوا۔ اہل ایران کے دلوں اور ان کی جانوں پر حکومت کرنے والا ان دیکھا شخص وطن واپس آتا ہے۔ ہم سب نے کل اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاکھوں افراد نے میلوں لمبے راستہ پر کس طرح پروانہ وار بلکہ دیوانہ وار اس کا استقبال کیا۔ اہل ایران نے اپنے دیدہ و دل اس کی راہ میں بچھا دیئے۔ اپنی بے پناہ محبت اس شخص کی گزر گاہ پر نچھاور کر دی۔ احترام، احسان مندی اور اس طرح کے ہر جذبہ کو انہوں نے اس موقع پر بے دریغ خرچ کر دیا۔ اپنے پاس کچھ بھی بچا کر نہیں رکھا۔

بات کرنے والے نے یہاں پہنچ کر ذرا دم لیا۔ اس کے بعد صرف اتنا کہا۔ اگر اس وقت وہ آگئے تو............ اور جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

(8)

فلیٹ چھوٹا ہے۔ دوست بے تکلف ہیں۔ بات بڑی ہے۔ کہنے کو مہمان دعوت کے لئے جمع ہوئے ہیں مگر کھانے کا کسی کو ہوش نہیں۔ کیسا نہار اور کون سا ظہرانہ۔ سب گفتگو میں محو ہیں۔ آیت اللہ کی واپسی اور ان کے استقبال سے بات شروع ہوئی اور کہیں سے کہیں نکل گئی۔ بحث پر کوئی روک نہیں۔ ہر طرح کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ شرعی، قانونی، تاریخی، واقعاتی، ثقافتی اور ذاتی۔ موضوع میں بڑی لچک ہے۔ جس کو جو سوجھتا ہے اس کے بیان کی گنجائش نکل آتی ہے۔ خاص مسائل پر غور ہو رہا ہے۔ عام معاملات پر بحث ہو رہی ہے۔ گفتگو بہر عنوان جاری ہے۔ رسالت، ہجرت، عبادت، خلافت، امامت، غیابت اور

عیسائیت۔ بات سے بات نکل رہی ہے۔

ایک دوست کہنے لگے، ہم اپنے پیشواؤں کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ اگر دشمن اس سے فائدہ اٹھائے تو یہ رویہ ایک کمزوری ہے۔ اور اگر یہ خود داری کی علامت اور ضمانت بن جائے تو بڑی خوبی کی بات ہے۔ اس وقت یہ حالت ہے کہ اگر اخبار میں یہ خبر چھپ جائے کہ دنیا کے دوسرے سرے پر کسی غیر ملکی مصنف نے ہمارے کسی پیشوا کے بارے میں کوئی نامناسب بات لکھی ہے تو ہم فوراً اپنی اومنی بسیں، اپنی سرکاری عمارتیں اور غیروں کے سفارت خانے جلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ نقشہ پر نہ کوئی اس نام کا مقام ہے، نہ فہرست مطبوعات میں اس نام کی کتاب یا اس نام کا مصنف۔ غیرت مندی برحق مگر ہوشمندی نہ ہو تو غیرت اور حماقت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ہمیں اس معاملہ میں برداشت اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہئے۔ وہ برداشت نہیں جو ایک بے حیا میں ہوتی ہے۔ وہ سوجھ بوجھ نہیں جو سیکولر ہوتی ہے۔ ہمیں برداشت کی بھی حد بندی کرنی ہوگی وگرنہ رواداری کے نام پر ہم انتہا پسندی کی دوسری سرحد پار کر جائیں گے جیسا مغرب میں ہوا ہے۔

اہل مغرب اپنی آزاد خیالی میں اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ کسی کا ادب اور لحاظ باقی نہیں رہا۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ وہ خدا کو شاید اسی لئے مقدس باپ کہتے ہیں کہ ریش بابا سے کھیلنے کا موقع مل جائے۔ ان کے مصور بے خوف ہو کر خدا کی تصویریں بناتے ہیں۔ ان کے فلم ساز پیغمبروں کو اداکار اور اداکاروں کو پیغمبر بنا دیتے ہیں۔ ان کے ادیب کسی کو معاف نہیں کرتے۔ خواہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرے دوست کہنے لگے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ روسی ادیب دوستو فسکی نے اپنے ناول The Brothers Karamazov میں حضرت عیسیٰ کا کیا حال کیا ہے۔ اس ناول میں ایک نثری نظم کے حوالہ سے حضرت عیسیٰ کے ایک عارضی ظہور کا قصہ بیان کیا ہے۔ لوگ عرصہ دراز سے پشت در پشت حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کی دعائیں مانگ رہے تھے لہٰذا انہوں نے ازراہ نوازش یہ طے کیا کہ اصلی ظہور سے پہلے ذرا دیر کے لئے دنیا کا ایک چکر لگالیں۔ انہوں نے سولھویں صدی میں اسپین کے شہر سیول کو اپنے مختصر دورے کے لئے منتخب کیا۔ ان دنوں اسپین میں فرقہ واریت کا بڑا زور تھا۔ رومن کیتھولک چرچ

کی مذہبی عدالتیں لوگوں کے عقائد کی تفتیش میں سرگرم تھیں۔ جس کسی پر چاہتے الحاد کا الزام عائد کر دیتے اور اسے زندہ جلا دیتے۔

حضرت عیسیٰ. کے عارضی ظہور سے ایک دن پہلے جنوبی اسپین کے اس شہر میں عقائد کے محتسب اعلیٰ نے ایک سو افراد کو زندہ جلایا تھا۔ اس مذہبی تقریب میں شمولیت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بادشاہ، درباری، لاٹ پادری، خوبصورت خواتین اور سیوِل کی ساری آبادی جمع ہوئی تھی۔ ان حالات میں وہ چپکے سے شہر میں داخل ہوئے۔ محبت کا سورج ان کے دل میں روشن تھا۔ اس کی حرارت اور چمک ان کی آنکھوں میں تھی۔ ان کے چہرے پر لامحدود دردمندی اور رحم دلی کی نرم مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ لوگ پہچان گئے کہ وہ کون ہیں اور ان کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ لوگوں کو خیر و برکت کی دعائیں دینے لگے۔ ایک اندھے کو بصارت بخشی۔ ایک مردہ بچی کو زندہ کیا۔ لوگ بے اختیار کہنے لگے۔ یہ تو وہ لگتا ہے۔ یقیناً یہ وہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اتنے میں بوڑھے مذہبی محتسبِ اعلیٰ کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے بھیڑ دیکھی، معجزہ دیکھا، اور تہ کی بات کو جان لیا۔ دفع شر کی خاطر اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو فوراً گرفتار کیا جائے اور کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ لوگ بوڑھے محتسبِ اعلیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئے اور تعظیم بجالائے۔

رات کی تاریکی میں محتسب اعلیٰ جیل میں حضرت عیسیٰؑ سے ملا اور کہنے لگا۔ کیا یہ آپ ہی کی ذات گرامی ہے یا آپ سے مشابہت رکھنے والا کوئی اور شخص ہے۔ مجھے آپ کا جواب درکار نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ جواب میں کیا کہیں گے۔ میں کل صبح آپ کو بھی بدعتی قرار دے کر زند جلا دوں گا۔ یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی کہ پندرہ صدیاں گزرنے کے بعد ہمارے معاملات میں دخل دیں۔ آپ سارے اختیارات پوپ کو تفویض کر چکے ہیں۔ اب آپ کے ظہور کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ پھر محتسب اعلیٰ نے جیل کا دروازہ کھولا اور کہا۔ چلے جاؤ۔ خبردار، واپس مت آنا۔ ہرگز ہرگز واپس نہ آنا۔ قیدی نے بوڑھے محتسب کے ہونٹوں کو چوما اور خاموشی سے اپنی راہ لی۔ رات کی تاریکی میں وہ بہت جلد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے کہا۔ دوستوفسکی نے حضرت عیسیٰؑ کا بہت لحاظ کیا۔ میں نے فوٹو گرافی

کی ایک نمائش میں ان کو حال سے بے حال ہوتے دیکھا ہے۔ تصویروں کی یہ نمائش نیویارک
کے فوٹو گرافی کے اس میوزیم میں لگی تھی جو سنٹرل پارک کے شرقی کنارے پر سڑک کے اس
میل بھر کے حصہ میں واقع ہے جسے عجائب گھروں کی بہتات کی وجہ سے
Museum Mile کہتے ہیں۔ وہاں ایک فوٹو گرافر کی آٹھ دس تصویریں آویزاں تھیں
جن کا تعلق ایک ہی موضوع سے تھا۔ ان تصویروں کے اوپر عنوان اور نیچے ذیلی عنوان
درج تھے۔ عنوان تھا، مسیح کی آمد۔ تصویروں میں یہ دکھایا تھا کہ مسیح اصلاح دین و دنیا کے
لئے جب آسمانوں سے اترے تو سیدھے نیویارک پہنچے۔ گھوم پھر کر شہر دیکھا۔ پتہ چلا کہ
لوگ ان کی تعلیمات کو بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ خود غرضی، حرص اور ہوس میں گرفتار
ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت مایوس ہوئے۔ ایک تصویر میں یہ دکھایا تھا کہ وہ بھوک سے
نڈھال ہو کر ایک خستہ اور ویران گھر میں ایک موٹی، غریب اور بے روزگار حبشن کے پاس
پہنچے۔ اس عورت نے بھوکے مہمان پر ترس کھایا۔ خوراک کا مہر بند ڈبہ کھولا اور انہیں
کھانے کے لئے پیش کیا۔ بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ تصویر میں
ٹین کا وہ ڈبہ جس میں سے کھانا نکالا تھا بڑا نمایاں تھا۔ ڈبے پر لکھا تھا،
Dog Food -

ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ رات کو گھومتے ہوئے یسوع مسیح جو لوگوں کو اپنی
بھیڑیں اور خود کو چرواہا سمجھتے تھے نیویارک کے اس علاقہ میں جا نکلے جہاں گلیاں دن کے
وقت بھی غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ ایک نوجوان ٹھگ نے ان سے کہا کہ جو کچھ جیب میں ہے وہ
سیدھی طرح سے نکال دو ورنہ مجھ سے برا کوئی اور نہ ہو گا۔ وہاں سے کیا نکلنا تھا۔ جیب
خالی تھی۔ نیویارک کے سیاہ فام ٹھگ نے جیسا کہ ان کا وطیرہ ہے غصہ میں آکر ان کو گولی
مار دی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر تمہارے پاس ڈالر نہیں ہیں تو تمہیں اس دنیا میں آنے اور میری
چودھراہٹ والے علاقہ میں گھومنے پھرنے کا کوئی حق نہیں۔ خواہ تم مسیح موعود ہی کیوں نہ
ہو۔ اس آخری تصویر میں مسیحؑ کو نیویارک کی ایک گلی میں اوندھے منہ گرا ہوا دکھایا تھا۔
ان کا خون بہ کر فرش پر جم گیا تھا۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔ وہ آیا۔ اس نے
دیکھا۔ اور بے موت مارا گیا۔

تصویروں کی نمائش کا حال سن کر سب اداس اور خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا،

حضرت عیسیٰ ؑ کی واپسی کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور سنئے۔ کچھ عرصہ ہوا میں اور کموڈور اختر حنیف جنوبی ترکی میں بحر متوسط کے کنارے یونانی عہد کے کھنڈرات میں گھوم رہے تھے۔ گائیڈ کی ایک بات سن کر وہ چونک اٹھے۔ پوچھنے لگے کہ کیا اس علاقہ میں پہاڑی پر ایک چھوٹا سا پرانا اور متروکہ گرجا موجود ہے۔ اس نے کہا ہاں، وہ یہاں سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہو گا۔ کموڈور نے کہا، باقی سیر و سیاحت ملتوی، تم ہمیں فوراً اس گرجا میں لے چلو۔ گائیڈ نے انہیں نیک دل عیسائی سمجھا اور ہمیں اس مقام پر لے گیا۔ کچی سڑک پر موٹر سے اتر کر ایک سیدھی پہاڑی پر چڑھنے کے لئے ہمیں سخت محنت کرنی پڑی۔ جب ہم گرجا میں پہنچے تو اس میں سوائے پرانا، چھوٹا اور ویران ہونے کے اور کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ کموڈور حنیف نے اندر باہر اس کے کئی چکر لگائے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے بے کواڑ دروازے میں جو وادی کی طرف کھلتا تھا اس طرح کھڑے ہو گئے کہ جسم اندر تھا مگر ایک پاؤں باہر نکلا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔ یہ وہ مقدس جگہ ہے جہاں آج سے صرف تین برس کے بعد حضرت عیسیٰ ؑ کا نزول ہو گا۔

کموڈور حنیف کے پاس امریکہ سے عیسائیوں کے ایک فرقہ کا رسالہ آتا ہے۔ اس میں پچھلے برس ایک عورت کا خواب چھپا تھا۔ حضرت عیسیٰ ؑ نے اسے خواب میں بتایا کہ وہ فلاں سن میں فلاں تاریخ کو ایک پرانے اور اجاڑ گرجا میں اتریں گے۔ انہوں نے علاقہ اور گرجا کا نقشہ اس عورت کو دیا۔ وہ خواب سے بیدار ہوئی۔ نقشہ اس کے سرہانہ رکھا ہوا تھا۔ کموڈور کا بیان ہے کہ ماہرین ایک سال تک تحقیق کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ترکیہ کا یہ گرجا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی تحقیقات رسالہ میں شائع کر چکے ہیں تاہم وہ اس معاملہ کو زیادہ پبلسٹی نہیں دینا چاہتے۔ مبادا لوگ ابھی سے آکر اس پہاڑی پر ڈیرے ڈال دیں۔ غور کیجئے وہ عورت خدا ترس اور عبادت گزار ہے۔ اس کے دماغ کا معائنہ ہوا اور وہ بالکل نارمل نکلی۔ نقشہ کا معائنہ ہوا اور ابھی تک یہ معما حل نہیں ہو سکا کہ کاغذ کس چیز سے بنا ہے اور سیاہی کیوں اتنی روشن ہے۔ کموڈور کو اس عورت کی بات پر پورا اعتبار ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا خواب یقیناً سچا ہے۔

میں نے کموڈور اختر حنیف کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی انداز سے دروازہ میں کھڑے تھے جو ان کی دانست میں آنے والے کا انداز ہو سکتا ہے۔ جسم پوشیدہ اور

صرف ایک پاؤں دہلیز کے پار۔ کب دوسرا پاؤں اٹھے اور کب وہ انتظار کرنے والوں کو پوری طرح سے دکھائی دیں۔ ان کا انتظار کرنے والوں میں صرف دو آدمی ہیں، میں اور ہمارا گائیڈ۔ میں نے کہا، کموڈور اختر حنیف آپ کب تک یونہی خواب کی دہلیز پر کھڑے رہیں گے۔ اس کو پار کیجئے اور حقیقت کی دنیا میں واپس تشریف لائیے۔ وہ میرے ساتھ پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ بولے، آپ مجھے گمان اور وہم کی دنیا کا باشندہ سمجھ کر حقیقت کی دنیا میں واپس بلا رہے تھے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو شخص معاشیات کا طالب علم اور سول سروس کارکن ہو وہ اپنے وجود کے گرد ایک چھوٹی سی مادی دنیا تعمیر کر لیتا ہے۔ اس کے لئے وہی سچ ہے، وہی پوری کائنات ہے اور وہی اصل حقیقت۔

میں بھی خود فریبی کے اس دور سے گزرا ہوں جب یہ دنیا ہی میرے لئے پوری کائنات تھی۔ میں نے 1965ء میں حقیقی دنیا کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ ناقابل یقین واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ تین سال کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کو مذاق سمجھتے ہیں حالانکہ قدرت نے انسان کو عقل اور حواس دے کر اس کے ساتھ بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ آدمی کو آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ دیکھیں یہ غیب پر ایمان لاتا ہے یا انکار کر دیتا ہے۔

گفتگو میں شامل ایک خاتون کہنے لگیں۔ دوستوفسکی کی کہانی میں لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو پہچان لیا مگر اس کے باوجود جب پیشوائے وقت نے سختی سے کام لیا تو پھر بے یقینی کی حالت کی طرف لوٹ گئے اور محتسب اعلیٰ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے۔ مسیح کی آمد کے سلسلہ میں عکسی تصاویر کی جس نمائش کا ذکر ہوا اس کا حاصل یہ ہے کہ آنے والے کو پہچاننے کے لئے نظر چاہئے۔ یہ ہر ایک پاس نہیں ہوتی۔ لوگ بڑی مشکل میں گرفتار ہوں گے۔ جعلی اور نقلی دعویدار اتنے پیدا ہو چکے ہیں کہ اصلی کو بھی پہلے پہل غیر اصلی سمجھنا ایک فطری بات ہوگی۔ وہی شیر آیا، شیر آیا والی بات کہ جب شیر آیا تو کسی نے پکارنے والے کی بات پر کان نہ دھرا۔ یوں بھی آج مسیحی دنیا کا رنگ ڈھنگ اتنا نرالا ہے کہ آنے والے کو پہچاننے سے انکار کرنے والوں کی اکثریت ہونی چاہئے۔

ایک دوست جو بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے کہنے لگے۔ پہچان سے انکار دو وجہ کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ ایک وہ بے یقینی اور سابقہ تلخ تجربات جن کا ذکر خاتون نے کیا ہے۔ دوسری وجہ فرط اشتیاق اور درازئ شوق بھی ہو سکتی ہے۔ محبوب کے انتظار کی اپنی لذت

ہوتی ہے۔ جو شخص اس لذت کا مزہ لوٹ رہا ہو وہ کب چاہے گا کہ یہ دور ختم ہو جائے۔ وہ مارے شوق کے آنے والے کو پہچاننے سے انکار بھی کر سکتا ہے۔ یہ کیفیت اصفہان کے ایک شاعر نے کس خوبصورتی سے شعر میں بیان کی ہے۔ اے خوش آں منتظرِ وعدۂ دیدار کہ تو۔ بر سرش آئی و از شوق ترا نشناسد۔ تو اس کے سرہانہ تک آیا اور وہاں کھڑا رہا مگر وہ وعدۂ دیدار کی لذت میں کھویا ہوا عاشق اپنے محبوب کو نہ پہچان سکا۔

گفتگو اس شعر پر ختم ہوئی۔ قالین پر بیٹھے ہوئے لوگ صوفہ اور کرسیوں کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔ کمر سیدھی کی۔ ٹانگوں کو ہلا جلا کر دیکھا کہ گھٹنے کہاں تک عمر کا ساتھ دیتے ہیں۔ شاد نے صوفی صمد سے سرگوشی کرتے ہوئے آواز کو جان کر بلند کیا تاکہ سب سن لیں۔ کہنے لگے، سنا ہے کل کی واپسی اور استقبال کے بارے میں آیت اللہ شریعت مداری نے صرف ایک جملہ کہا ہے۔ آنے والا آئے گا، ضرور آئے گا، لیکن وہ بوئنگ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر نہیں آئے گا۔

کھانا تیسری بار گرم کرنے کے باوجود ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

باب دہم

خانہ جنگی

خانہ جنگی، علاقائی بغاوت، بدامنی اور فرزند خوری سے مل کر جو صورت حال بنتی ہے اسے انگریزی میں انارکی، عربی میں طوائف الملوکی، فارسی میں ہرج مرج، اصطلاحی اردو میں لاحکومیت یا لاقانونیت اور آسان اردو میں افراتفری کہتے ہیں۔ ایک مدت سے ایران میں بڑی افراتفری ہے، بلکہ اور بہت کچھ ہے۔

افراتفری کے بہت سے رخ ہوتے ہیں۔ جہاں مرکز پر قبضہ جمانے کے لئے کھلی لڑائی ہو وہ خانہ جنگی۔ جہاں مرکز گریز خیالات کی خاطر لوگ ہتھیار اٹھالیں وہاں علاقائی بغاوت۔ جہاں کئی گروہ چھپ کر حملے کریں وہاں بدامنی۔ جب انقلاب خود اپنے بچوں کو نگل جائے تو وہ دور فرزند خوری۔ یہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ بڑی شدت سے اور بڑے عرصہ سے۔

اس وقت ایران میں دو حکومتیں ہیں۔ ایک وہ جو شہنشاہ آریامہر جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ دوسری وہ جو آیت اللہ نے آنے کے بعد نامزد کی ہے۔ پہلی حکومت آئینی اور اصلی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری کا مطالبہ ہے کہ اسے انقلابی اور شرعی حکومت تسلیم کیا جائے۔ شاہپور بختیار کہتے ہیں کہ دوسرے وزیراعظم کی نامزدگی ایک لطیفہ ہے۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ لطیفہ بڑا سنگین ہے۔ ایک حکومت کے وزیروں کو عوام دفتر تک جانے نہیں دیتے۔ دوسری کے راستہ میں فوج حائل ہے۔ نام کو دو دو مگر کام کرنے کے

لئے ایک حکومت بھی نہیں۔ سب کے پریشان چہروں پر ایک ہی سوال لکھا ہوا ہے۔ اب کیا ہو گا۔ جواب آسان ہے مگر پریشانی میں اضافہ کرتا ہے۔ جہاں کہیں حکومت کے کئی دعویدار ہوں وہاں فیصلہ گنتی سے کیا جاتا ہے۔ امن ہو تو ووٹ گنے جاتے ہیں۔ بدامنی ہو تو لاشیں گنی جاتی ہیں۔

آج کل تلاش گمشد گان اخبار کے اشتہارات کا ایک مستقل عنوان ہے۔ عرصہ دراز سے گم ہونے والے نوجوانوں کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ کوئی سال بھر پہلے گم ہو گیا تھا اور کوئی دس پہلے۔ زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ اگر یہ دونوں بری الذمہ ہیں تو پھر سوائے ساواک کے یہ الزام اور کس کے سر تھوپا جائے۔ میں نے ایک ایرانی ہم کار سے کہا۔ اس عنوان کے تحت ایک اشتہار حکومت ایران کی گمشدگی کا اور دوسرا امن و چین کے اغوا کا بھی شائع ہونا چاہئے۔ اغوا کو سال بھر ہو گیا ہے اور گمشدگی کو چند ہفتے۔

یہ چند ہفتے لوگوں نے بڑی مشکل سے کاٹے ہیں۔ کوئی بااختیار ادارہ باقی نہیں رہا۔ لوگ کدھر جائیں۔ کس کی بات سنیں۔ کس سے اپنا حق مانگیں۔ ایک حکومت بے اختیار ہے۔ دوسری محض نامزد۔ ایک حکومت کہتی ہے دکانیں کھولو۔ دوسری کہتی ہے ہڑتال کرو۔ ایک کے حامی دکانوں کے نام میں اسلامی اور انقلابی کا اضافہ کرتے ہیں۔ دوسری کے خفیہ ادارے انہیں راتوں رات لوٹ لیتے ہیں۔ ایک رضا کاروں سے کام لیتی ہے دوسری ساواک کے اہل کاروں سے۔ ایک حکومت مجلس کا اجلاس بلاتی ہے۔ دوسری جلوس بھیج کر مجلس کی عمارت کا گھیراؤ کر لیتی ہے۔ ایک حکومت کرفیو لگاتی ہے۔ دوسری کرفیو کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ ایک حکومت کہتی ہے کہ چھاؤنیاں، پولیس اسٹیشن، وزارت خارجہ اور شمالی تہران ہمارا ہے۔ دوسری کہتی ہے مسجدیں، بازار، وزارت داخلہ اور جنوبی تہران ہمارا ہے۔ ایک طرف خواص ہیں دوسری طرف عوام۔ ایک طرف قصر شاہی دوسری طرف بہشت زہرا کا قبرستان۔ ایک طرف اسلحہ دوسری طرف صرف جذبہ۔ ایک طرف البرز کی چوٹی دوسری طرف وسعت صحرا۔

تاریخ کی کتابوں کے ہزاروں صفحے پڑھ جائیں یا برسوں طلبا کو تاریخ کا سبق پڑھائیں پھر بھی انقلاب کے معنی اس طرح کہاں سمجھ میں آسکتے ہیں جیسے آج کل ایران میں قیام کرنے اور آنکھیں کھلی رکھنے والوں پر روشن ہو رہے ہیں۔ انقلاب کی اپنی لغت ہوتی ہے۔

اس لئے کئی الفاظ کے اصل معنی کا پتہ چل رہا ہے۔ ان میں ایک لفظ انقلاب ہے اور دوسرا طوائف الملوکی۔ جونہی یہ دو لفظ حقیقت بن کر میرے سامنے آئے میں نے عذرا سے وہ بات کہہ دی جس کے لئے موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا، حالات ایک عرصہ سے خراب تھے مگر اب بگاڑ میں بڑی تیزی آگئی ہے۔ کسی وقت بھی اس شدت کی خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے کہ حکومت پاکستان کو سرکاری ملازمین اور ان کے اہل خانہ کے انخلا کا کوئی خصوصی انتظام کرنا پڑے۔ تم عالیہ اور سلمان کو ساتھ لے کر چلی جانا۔ میں کچھ دیر اور یہاں ٹھہرنے کی کوشش کروں گا۔ اس ناگہانی سفر کے لئے سامان کے تین دستی تھیلے تیار کر لو جنہیں ہاتھ میں اٹھا کر چلنا اور گود میں رکھ کر کھچا کھچ بھرے ہوئے ہوائی جہاز کی سیٹ پر بیٹھنا ممکن ہو۔ عذرا نے کہا، آپ فکر نہ کریں۔ اگر یہاں سے اچانک رخصت ہونے کی نوبت آئی تو ہم تینوں جس حالت میں ہوں گے اسی میں چل دیں گے۔ ہینڈ بیگ میں رکھنے کے لئے میرے پاس ڈالر ہیں نہ زیور۔ تنخواہ آپ کو آر سی ڈی کے لندن اکاؤنٹ سے ملتی ہے۔ زیور کا مجھے شوق نہیں۔ فیروزے عالیہ کے لئے لینے ہیں مگر دو سال کے بعد۔ کپڑے لتے کی گٹھڑی سر پر اور جوتیاں بغل میں دبا کر بھاگنے کی میں قائل نہیں۔ صرف ایک چیز ہمراہ لے کر جانا چاہوں گی اور وہ ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ جو آپ نے اپنے معمول کے خلاف آغازِ انقلاب سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا ہوا ہے۔ اس کا مسودہ جاتے ہوئے مجھے دے دیجئے گا۔

سڑکیں آج پھر بند ہیں۔ مظاہرہ ہو رہا ہے کہ جناب شاہپور بختیار صاحب ازراہ کرم حکومت کی باگ ڈور مہدی بازرگان کے حوالہ کر دیجئے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ فوج کب تک یادِ ماضی میں گرفتار رہے گی۔ یہ لاکھوں افراد جو سڑکوں پر "بازرگان تقدیرِ ایران" کا نعرہ لگا رہے ہیں یہ خود تقدیرِ ایران ہیں۔ زندہ قومیں اپنی تقدیر خود بناتی ہیں۔ کاتب تقدیر ان سے املا لیتا ہے۔ بتا تیری رضا کیا ہے۔

روزنامہ کیہان میں تصویر چھپی۔ فضائیہ کی فنی شاخ کا دستہ ہمافر آیت اللہ کو سلامی دے رہا ہے۔ فوج کہتی ہے تصویر جعلی ہے۔ جوڑ کر بنائی ہے۔ فوج ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرے گی جو ایسی تصویریں بناتے ہیں۔ ایسی تصویریں بنانا اور چھاپنا ایک ناجوانمردانہ عمل ہے۔ معلوم نہیں افواج شاہی کی طرف سے اتنا بڑا سفید جھوٹ بولنا کہاں

کی جواں مردی ہے۔ آیت اللہ کہتے ہیں کہ تصویر اصلی ہے۔ ہمافر کے افراد جمعرات کے دن از من دیدن کردند۔ ہمافر والے کہتے ہیں۔ فوج جمعرات کی بات کرتی ہے۔ آج جمعہ ہے۔ دیکھنے والے دیکھ لیں کہ آج پھر ہم آیت اللہ کو سلامی دے رہے ہیں۔

شاہپور بختیار حالات کی تیزی کو دیکھتے ہوئے اپنی بیان بازی تیز تر کر دیتا ہے۔ میں شاہی حکومت کا حامی ہوں نہ شخصی حکومت کا۔ میں ایسی اسلامی حکومت بھی نہیں چاہتا جیسی پاکستان یا لیبیا میں قائم ہے۔ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں سیاست میں پیش وارد ہوں۔ 1936ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اس وقت سے سیاست میں حصہ لے رہا ہوں۔ خمینی تازہ وارد ہیں۔ 64-1963ء میں سیاست شروع کی۔ اور سیاست میں ان کی آمد بھی محض رنجش کی وجہ سے تھی۔ بختیار کو غلط فہمی ہے کہ سیاست میں سینارٹی کا اصول کار فرما ہوتا ہے۔ سیاست اگرچہ بے اصولی کا نام ہے مگر اس کا کم از کم ایک اصول ہوتا ہے۔ اور وہ ہے اکثریت۔ بختیار تنہا ایک طرف ہے، دوسری طرف سارا ملک ہے۔ ایسے میں سنیارٹی کس کام کی۔ بیان پڑھنے کے بعد سات وزارتوں کے عملہ نے اخبار میں اشتہار دیا کہ ہم حکومت انقلابی کے تابع ہیں۔ وزیر اعظم نمبر ایک کے پیروں تلے آخر زمین ہی کتنی ہے۔ اور وہ بھی تیزی سے سرک رہی ہے۔

شاہپور بختیار کہتے ہیں کہ میں اسی آئین کے تحت وزیر اعظم مقرر ہوا ہوں جس کے مکمل نفاذ کے لئے آیت اللہ نے پندرہ سال پہلے وزیر دربار کو ایک تار ارسال کیا تھا۔ ملک میں انقلاب آیا ہوا ہے۔ شاہ فراری ہے۔ لاکھوں کا ہجوم ان کی تقرری کے خلاف نعرے لگا رہا ہے مگر وزیر اعظم نمبر ایک کسی کتب خانہ تحقیق و حوالہ جات میں بیٹھے ہوئے پرانی دستاویزات میں اپنے تقرر کے لئے سند تلاش کر رہے ہیں۔ ہجوم کا ایک نعرہ ہے، بختیار بے اختیار۔ کتنا سہل ہے۔ کس قدر مسجع ہے۔ اس کے معنی جاننے کے لئے فارسی جاننا ضروری نہیں۔ بعض نعروں میں "خوار" کو بختیار کے قافیہ کے طور پر باندھا گیا ہے۔ یہ بھی کوئی مشکل لفظ نہیں۔ مشکل اس کو درپیش ہے جو خوار ہو رہا ہے۔ کیونکہ فارسی میں خوار ہونے والا اتنا ہی خراب و خستہ ہوتا ہے جتنا اردو میں۔

شاہپور بختیار نے جلسہ جلوس کے بارے میں ایک دلچسپ بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہنگاموں کی وجہ سے تفریح کی سہولتیں ناپید ہو گئی ہیں ناچار لوگ تفریح کی خاطر جلسہ

جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تفریح کے اپنے اپنے معیار ہوتے ہیں۔ میں تفریح طبع کے لئے بختیار کا یہ بیان بار بار پڑھتا اور مسکراتا ہوں۔

معلوم نہیں وزیر اعظم نمبر ایک آج کل ٹی وی دیکھتے ہیں یا نہیں۔ آج شام ٹی وی نے دن میں نکلنے والے جلوس کے بارے میں بڑی تفصیل سے خبر سنائی اور بہت دیر تک اس کی تصویریں دکھائیں۔ میدان شاہ یاد میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھانے کے بعد عکس بردار نے گود میں اٹھائے ہوئے ایک بچے کا کلوز اپ دکھایا۔ بچہ زیادہ سے زیادہ سال بھر کا ہو گا۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی جو بند مٹھی والا ہاتھ ہوا میں بلند کرتے اور اسلامی جمہوریہ کا نعرہ لگاتے، اس بچے نے بھی اپنی مٹھی بند کی اور ننھا سا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ یہ کونسی ہوا چلی ہے کہ بچہ بچہ، پتا پتا، بوٹا بوٹا انقلاب کا حال جانے ہے۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔

(2)

9-10-11 فروری

(جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار)

کئی دنوں سے ہر وقت خانہ جنگی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ آج وہ بھی جاتا رہا۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ قیامت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جمعہ کے دن قائم ہو گی۔ خانہ جنگی بھی ایک طرح کی قیامت ہے سو وہ بھی جمعہ کے دن شروع ہوئی۔ آج ہر ایک اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ صاحبان اقتدار، رہبران انقلاب، افسران فوج، اہل کاران ساواک، جانبازان شاہی گارڈ اور جوانان اشتراکی۔ اکھاڑہ میں بہ یک وقت کئی پہلوان اتر آئے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ لیکن جب لوگ آپس میں لڑنا چاہیں تو وہ خیر کیوں کرے۔ حکومت نمبر ایک نے آئین کے حامیوں کو امجدیہ اسٹیڈیم میں جمع کیا۔ حکومت نمبر دو نے تہران یونیورسٹی میں جلسہ کیا۔ سرخ سویرے والے کامریڈ جن سے یونیورسٹی کا قبضہ مولویوں نے چھین لیا ہے پہلی بار کسی دوسرے مقام پر جمع ہوئے۔ فوج ایک بار پھر اسلحہ سے لیس ہو کر

دوراہوں، سہ راہوں اور چوراہوں پر کھڑی ہے۔ شاہی گارڈ کی تیاری اس کے علاوہ ہے۔ ٹی وی کسی سے پیچھے کیوں رہ جائے۔ وہ ہر فریق کی خبر نشر کر رہا اور فلم دکھا رہا ہے۔ جو غالب آیا اسے اپنے تعاون کی عکسی سند پیش کر دے گا۔

میں نماز جمعہ کے لئے گھر سے نکلا۔ شہر خاموش اور اداس ہے۔ فضا میں کشیدگی ہے اور سڑکوں پر ٹینک ہیں۔ نماز جمعہ کے لئے آنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ غیر حاضری کا یہ عالم ہے کہ امام بھی نہیں آیا۔ کہیں سے خطبہ کا رسالہ ڈھونڈا اور کسی مقتدی کو راضی کر کے امامت کے لئے کھڑا کر دیا۔ نماز ختم ہوئی۔ معصوم شکل بنا کر ایک دوست نے مسئلہ پوچھا۔ کیا اتنی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا ہو جاتی ہے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اس سوال کا جواب کہاں سے آتا ہے۔ کسی نے بات ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی اور کہا، اجلاس ختم ہو چکا ہے لہٰذا اس وقت کورم کا مسئلہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور دوست نے جواب دینے کی کوشش کی۔ بولے۔ میں نے مسائل نماز کی کتاب میں پڑھا تھا کہ نماز جمعہ کی ادائیگی اور صحت کے لئے سات شرائط ہوتی ہیں۔ مجھے تین یاد ہیں، باقی چار بھول گئی ہیں۔ جماعت کی کم سے کم تعداد چار افراد ہے۔ ایک امام اور تین نمازی۔ ایک شرط خطبہ پڑھنے کے بارے میں ہے۔ تیسری شرط کے مطابق جس آبادی میں نماز جمعہ ادا کی جا رہی ہو اس کا کوئی سلطان ہونا چاہیئے۔ ہم یہ شرط پوری نہیں کر سکے کیونکہ جو شخص ایران کا سلطان ہوا کرتا تھا وہ اب مفرور اور لاپتہ ہے۔ رضا شاہ کے تخت چھوڑ کر بھاگ جانے سے ہماری نماز خراب ہو گئی ہے۔ اس کا ایک رکن ساقط ہو گیا ہے۔ ایک شوخ نے گرہ لگائی، جنابِ من۔ سلطان سے مراد حکومت وقت ہے۔ چونکہ یہاں آج کل ایک کے بجائے دو دو حکومتیں مصروف کار بلکہ مصروف پیکار ہیں اس لئے نہ صرف نماز جمعہ کی شرائط پوری ہو گئیں بلکہ اس کا ثواب بھی دگنا ہو گیا۔ اس کے علاوہ آپ حضرات کے کھاتے میں ایک ثواب اور بھی لکھا جائے گا۔ آج کل یہاں خوف کی حکمرانی بھی ہے، اس لئے آپ کو صلوٰۃ الخوف کا ثواب بھی ملے گا۔ اس جمعہ آپ نے اتنے ثواب لوٹ لئے ہیں کہ اسے حِج اکبر کی رعایت سے جمعہ اکبر کہنا چاہیئے۔

شام ہوئی اور فوج کے ایک حصہ نے دوسرے حصہ پر حملہ کر دیا۔ حملہ آور شاہی گارڈ، نشانہ زیر تربیت نوجوان، میدان جنگ فضائیہ کی چھاؤنی، علاقہ دوشن تپہ، شہر تہران،

طرف مشرق۔ حملہ آوروں کے اسلحہ میں ٹینک، مشین گن، ٹی وی اور کرفیو شامل ہیں۔ دفاع کرنے والوں کے اسلحہ خانہ میں صدائے اللہ اکبر، جوان خون اور خلق خدا شامل ہے۔ اندھیرے اور ہول پکار کی وجہ سے ہر شخص دہشت زدہ ہے۔ ٹی وی کہتا ہے سب خیریت ہے۔ سارے سرکاری ٹی وی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

صبح ہوئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ تین دائرے بنے ہوئے ہیں۔ چھوٹا دائرہ فضائیہ کے محصور عملہ کا ہے۔ درمیانہ دائرہ حملہ آور فوج کا ہے۔ فوج کے گرد ایک بہت بڑا دائرہ عوام کا ہے۔ فوج کے دستہ نے فضائیہ کے چار پانچ ہزار افراد کو گھیرے میں لیا ہوا ہے اور خود چالیس پچاس ہزار افراد کے گھیرے میں آگئی ہے۔ لوگ جو رات بھر اینٹ پتھر اور خانہ ساز مولوٹوف کاکٹیل سے کام چلاتے رہے اب وہ رائفلیں سنبھالے ہوئے ہیں اور ریت کی بوریوں سے مورچہ بندی کر رہے ہیں۔ اسلحہ کچھ لوٹا ہے، کچھ فوجیوں نے خود دیا ہے۔ جو اسلحہ اشتراکی نوجوانوں نے اس دن کے لئے زیر زمین ذخیرہ کیا ہوا تھا وہ بھی باہر آگیا ہے۔ فضائیہ کے گھرے ہوئے دستہ نے خود ہی اپنا اسلحہ خانہ لوٹ لیا ہے۔ اب وہ بھی مسلح ہیں۔ فوج دونوں طرف سے گھر گئی ہے۔ اب اس کی باری ہے کہ وائرلس پر بار بار کمک کمک اور ایس او ایس کا پیغام نشر کرے۔

فوجیوں کو تعجب ہے کہ اب تک امدادی دستے کیوں نہیں پہنچے۔ امدادی دستوں کو تعجب ہے کہ یہ حقیر، عاجز اور نہتے لوگ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کا راستہ کیسے روک لیتے ہیں۔ کہیں سڑک کاٹ دی ہے۔ کہیں ملبہ ڈال دیا ہے۔ کہیں خندق کھود دی ہے۔ کہیں درخت گرا دیئے ہیں۔ یہ لوگوں کو یکایک کیا ہو گیا ہے۔ یہ جذبہ، یہ بے خوفی، یہ ہشیاری، یہ بیداری کہاں سے آگئی ہے۔ وہ عاجزی، وہ خوف، وہ ذلت، وہ مسکینی کیا ہوئی۔ باپ اور بیٹے کے عہد میں کتنا فرق ہے۔ رضا خاں کے دور میں ایک باوردی سپاہی پورے گاؤں کو گرفتار کر لیتا تھا۔ لوگ اس کے حکم پر گھروں سے نکل آتے اور وہ انہیں ایک ایک کر کے رسی سے باندھ دیتا تھا۔ آج پچاس برس کے بعد وہی مسکین اور بے زبان لوگ مشرق وسطیٰ کی سب سے طاقتور فوج کے سامنے اس طرح ڈٹ گئے ہیں کہ تین طرف سے آنے والی کمک میں سے کوئی دستہ بھی تہران نہیں پہنچ سکا۔

ناشتہ کے بعد دو گھنٹے میں نے بڑی بے چینی سے گزارے۔ خیال آیا کہ نامہ نگاری

بھی کیا پرخطر پیشہ ہے کہ جہاں کہیں ہنگامہ ہو رہا ہو وہی جگہ فرائض کی ادائیگی کے لئے دفتر کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے نامہ نگار اس وقت دوشن تبہ کے میدان جنگ کے گرد منڈلا رہے ہیں اور میں گھر میں بیٹھا ہوا ریڈیو سن رہا ہوں۔ مجھے اس وقت دفتر میں ہونا چاہئے۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی ہے نہ چھٹی کا اعلان کیا ہے۔ یہ کیسی فرض شناسی ہے جو گولی کی آواز سن کر گھر میں دبک گئی ہے۔ مجھے لاہور میں کوپر روڈ والے گھر کی انیکسی میں چار سال کے لئے گودام کی ہوئی کتابوں میں سے ایک ہلکی سبز رنگ کی جلد اور موٹے کاغذ والی کتاب کی یاد آئی۔ عنوان، Duty ۔ مصنف سیموئل سمائل۔ پہلی اشاعت 1880ء۔ انیسواں ایڈیشن، 1950ء۔ سال خرید، 1952ء۔ دکان اسٹینڈرڈ بک ایجنسی۔ 174 ۔ انار کلی لاہور۔ خریدار، نوجوان اسسٹنٹ کمشنر، لائل پور۔

آج ایک عرصہ کے بعد سیموئل سمائل مجھے پھر یاد آیا۔ ایسے لگا جیسے وہ میرے صوفہ کے پیچھے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے۔ دفتر جانے کی تیاری کیجئے۔ میں نے مانا کہ اس وقت خانہ جنگی ہو رہی ہے مگر خطرہ کی حالت میں فرائض ساقط نہیں ہوتے بلکہ کھرے اور کھوٹے کا فرق کرنے کے لئے ایک کسوٹی بن جاتے ہیں۔ میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اٹھارویں صدی میں نیو انگلینڈ میں سورج گرہن ہوا۔ دن تاریک ہو گیا۔ لوگ سراسیمہ ہو گئے۔ گمان گزرا کہ شاید روز قیامت آن لگا ہے کنیٹیکٹ کی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک ممبر نے اجلاس ملتوی کرنے کی تجویز پیش کی۔ دوسرے رکن نے جس کا نام دیون پورٹ تھا التوا کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ اگر یہ قیامت ہے تو میں چاہوں گا کہ وہ مجھے اپنی جگہ پر موجود اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف پائے۔ چھٹی کیسی، موم بتی جلاؤ اور اجلاس جاری رکھو۔

میں خانہ جنگی کو نظر انداز کرتے ہوئے موٹر پر سوار ہو کر دفتر کی طرف چل دیا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ فرض شناس کہلانے کے لئے جس راہ پر چلنا پڑتا ہے وہ کتنی پرخطر ہوتی ہے۔ ہر جگہ گولیاں چل رہی ہیں۔ جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے۔ فضا میں دھوئیں کی لمبی اور اونچی لکیریں دکھائی دے رہی ہیں۔ سڑکیں ویران ہیں۔ گاہے کسی موٹر کے گزرنے یا کسی پیادہ کے نظر آجانے سے اس ویرانی میں کمی ہونے کی بجائے

اضافہ ہو جاتا ہے۔ موٹر جو بھی نظر آئی وہ شہر سے باہر جاتی ہوئی نظر آئی۔ رفتار اتنی تیز جیسے کوئی موٹر ریس ہو رہی ہو۔ پیدل چلنے والے خال خال ہیں اور وہ بھی سر پر پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ دکانوں کے حفاظتی کواڑ مقفل ہیں۔ لوہے کی خمدار چادروں پر مٹی کی تہ جمی ہوئی ہے۔ بازار اندھا ہو گیا ہے۔ فلیٹوں کی کھڑکیاں بند ہیں۔ شیشوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بالکنی میں سر سبز گملے نہ الگنی پر چھوٹے بڑے کپڑے۔ فلیٹ گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ میں نے دفتر کے پھاٹک پر گاڑی کھڑی کی۔ چوکیدار نے درز میں سے جھانکا اور حیران ہو گیا۔ اس نے تالا کھولا، کنڈی کھولی، پھاٹک کے پٹ کھولے۔ یہ سارا کام اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ کیا۔ کوئی کھڑکا ہوا نہ کھٹکا۔ سناٹے کو توڑنے والی آواز خود اس کی اپنی تھی۔ اس نے مجھ سے آنکھیں چار نہیں کیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے میرے کان کے پاس آکر زیر لب صرف اتنا کہا۔ آقای، ایران تباہ شد۔

دفتر کے لمبے سے کمرہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے کو دفتر میں ٹھہرنا کہہ سکتے ہیں تو میں گھنٹہ بھر سے دفتر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ گاہے، ذرا سی دیر کے لئے بالکنی میں کھڑا ہو جاتا ہوں جہاں دھماکوں اور نعروں کی آواز زیادہ صاف سنائی دیتی ہے۔ جدھر سے آواز آرہی ہے ادھر منہ کرتا ہوں۔ سامنے عمارتیں ہیں اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی اوٹ میں شہر کے جنوب اور مشرق میں ہونے والی خانہ جنگی میں کتنے مرے اور کتنے زخمی ہوئے۔ دفتر میں اس وقت تین افراد موجود ہیں جنہیں گھر واپس جانا ہے۔ محمد ہرندی، مس جہانگیری اور میں۔ چوکیدار عمارت کے تہ خانہ میں قیام کرے گا۔ میں نے ہرندی اور جہانگیری کی فرض شناسی کی تعریف کی اور خیریت سے گھر پہنچنے کی دعا دی۔ انہوں نے کچھ اسی قسم کے جذبات کا مودبانہ اظہار میرے لئے کیا۔ عمر رسیدہ مس جہانگیری کہنے لگیں۔ میرے بیشتر رشتہ دار کینڈا میں آباد ہیں۔ میرے پاس کینڈا کی شہریت ہے۔ ٹورنٹو میں میرا ایک فلیٹ بھی ہے۔ ارادہ تھا کہ چار پانچ سال اور یہاں کام کر لوں پھر پنشن لے کر کینڈا چلی جاؤں۔ مگر آج کا دن اس دفتر میں میرا آخری دن ہے۔ کہا سنا معاف۔

کرفیو کا وقت ہو گیا۔ عام طور پر اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سناٹا ہو جاتا ہے۔ مگر آج اس کے شروع ہوتے ہی شور و غل میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ نعرے، اعلانات، گڑگڑاہٹ، چیخم چاخ۔ ہم سب گھر کی چھت پر چڑھ گئے۔ آس پاس کے مکانات اور سڑک

کے دوسری طرف فلیٹوں کی چھتوں پر بھی لوگ جمع ہیں۔ اشارے ہو رہے ہیں۔ لوگ منہ کے گرد ہاتھوں سے بھونپو بنا کر چیخ چیخ کر دوسروں تک اپنی بات پہنچا رہے ہیں۔ کچھ دیر کی افراتفری کے بعد معما حل ہو گیا۔ آیت اللہ خمینی نے حکم دیا ہے کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرو۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ خیابان پہلوی اور خیابان جردن پر لوگ رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ جس شخص کے ہاتھ جو چیز بھی آئی وہ اس نے گلی بیچ ڈال دی۔ بڑی سڑکوں پر بڑی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ درخت، کھمبے، ریت کی بوریاں، ملبہ۔ اندھیرا ہوا۔ لوگوں نے عارضی اور مدھم روشنی کا انتظام کیا اور کام جاری رکھا۔ نوجوانوں نے مورچے بنا لئے۔ صبح ہوئی۔ دیکھنے والے حیران ہوئے کہ مورچہ والے راتوں رات ہتھیار بند ہو چکے ہیں۔

لوگوں نے اپنے اپنے علاقہ میں پولیس کی چوکیوں اور فوج کی چھاؤنیوں پر حملہ کر دیا۔ تھانوں اور چھاؤنیوں پر لوگوں کا حملہ کامیاب رہتا ہے۔ یکے بعد دیگرے یہ ادارے عوام کے سامنے ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ معاملہ یک طرفہ ہو گیا ہے۔ کل تک جو طاقت کے بل پر مختار کل بنے ہوئے تھے آج اتنے خوفزدہ اور تنہا ہو گئے ہیں کہ مقابلہ کی سکت باقی نہیں رہی۔ پولیس کے تیس چالیس، جوانوں کو جب پانچ دس ہزار افراد گھیر لیں اور فوج کے تین چار سو افراد کی پادگان کو جب پچیس تیس ہزار افراد گھیرے میں لے لیں تو وہ چند گولیاں چلانے کے بعد سفید جھنڈا لہرانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ عوامی فتوحات کی فہرست میں ہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد اضافہ ہو جاتا ہے۔ کلانتری شمارہ 14 بدست مردم افتاد۔ کلانتری شمارہ 16 توسط مردم سقوط کرد۔ کلانتری شمارہ 21 بوسیلہ مردم تسخیر شد۔ کلانتری شمارہ 9 تخلیہ شد۔ کلانتری شمارہ 6 تخلیہ و آتش زدہ شد۔ کوئی کہاں تک گنے جائے۔ پولیس بھاگ رہی ہے۔ تھانے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں کہیں پولیس کو بھاگنے کا موقع نہیں ملا وہاں وہ ہتھیار ڈال رہی ہے۔ جو تھانہ بہت بدنام ہو اور عملہ کو جان کا خطرہ ہو وہاں پولیس والے آیت اللہ خمینی کی تصویر اٹھائے درود پڑھتے باہر آ جاتے ہیں۔ عوام کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

پاکستانی سفارت خانہ کے پاس جو پادگان ہے اسے لوگوں نے کل رات سے گھیرا

ہوا ہے۔ فوجی افسروں کی حالت غیر ہے۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوئی۔ بیڈ ٹی غائب، حاضری غیر حاضر، بیرا روپوش، سپاہی گم۔ جان کو جو خطرہ لاحق تھا وہ ہر لمحہ ہجوم میں اضافہ کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ کھڑکیاں کھل رہی ہیں۔ سفید چادریں لٹکائی جا رہی ہیں۔ ہتھیار ڈالنے کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ ایک فوجی افسر دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اس نے پادگان کی پچھلی دیوار پھاند کر سڑک کے دوسری طرف کھڑے ہوئے ہجوم کی طرف رخ کیا۔ فریاد کرتا جاتا ہے اور کپڑے اتارتا جاتا ہے۔ بھاگتے ہوئے وردی کا کوٹ اتار کر پھینکا۔ رکا، جھکا اور پتلون اتار کر پھینک دی۔ گریباں چاک کیا۔ قمیص کے ٹکڑے سڑک پر بکھیر دیئے۔ وہ صرف جانگیہ پہنے ہوئے ہجوم کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ ایک سردی اور دوسرا خوف۔ چیخ کر بولا، مرگ بر شاہ، درود بر امام خمینی۔ ہجوم اتنی سی بات پہ خوش ہو گیا۔ غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ ایسے برفانی موسم میں اس شخص کو یوں عریاں ہو کر معافی مانگتے، کانپتے، توبہ کرتے دیکھ کر بہت سے دل پسیج گئے۔ ایک شخص نے بڑھ کر اسے اپنا اوور کوٹ پہنایا۔ دوسرے نے فرکی ٹوپی اس کے گنجے سر پر رکھ دی۔ جو آسودگی عریاں جسم کو گرم کوٹ سے ملی وہ کسی کو خلعتِ فاخرہ پہن کر کب حاصل ہوئی ہوگی۔ فرکی ٹوپی کے عطیہ نے اسے جاں بخشی کا یقین دلایا اور اس یقین سے پیدا ہونے والی خوشی کی لہر جو اس کے تن بدن میں اٹھی وہ کسی بادشاہ کو تاج پوشی کے وقت بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ وہ شخص کوٹ اور ٹوپی پہن کر لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں رکا۔ بھاگتا ہوا ہجوم میں گھس گیا۔ لوگوں نے راستہ دیا اور وہ گلی میں گم ہو گیا۔ ایک نوجوان نے دیوار کے پاس جا کر اس کی وردی اٹھا کر دیکھی۔ خوشی سے نعرہ لگایا او بانس پر ٹانگ کر ہوا میں لہرانے لگا۔ اس وردی پر کرنل کے عہدہ کے امتیازی نشان لگے ہوئے تھے۔

اس ٹھنڈ میں توبہ کرنے والے عریاں بدن کرنل نے جرمنی کے بادشاہ ہنری چہارم کی یاد تازہ کر دی جو پوپ گریگوری ہفتم سے عمر بھر لڑتا جھگڑتا رہا۔ ایک بار اس نے پوپ سے معافی مانگی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ پوپ شمالی اٹلی میں کسی قلعہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جرمنی کا بادشاہ تین دن تک قلعہ کے باہر فصیل کے نیچے پالا جمی ہوئی زمین پر نادم جاتری کے سادہ لباس میں پڑا گڑگڑاتا رہا۔ بالآخر پوپ کو رحم آ گیا۔ قلعہ کا دروازہ اور توبہ کا باب دونوں کھل گئے۔ ہنری کے مخالف کہتے ہیں کہ اس نے چوغہ کے نیچے گرم سویٹر پہنے ہوئے

تھے۔ یہ فوجی کرنل شاہ ہنری چہارم سے بازی لے گیا۔ اس نے سب کے سامنے سارے کپڑے اتار کر زیر جامہ میں معافی اور جان کی امان مانگی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کام جو ہجوم نے نہیں کیا وہ ڈبل نمونیہ کر دکھائے۔

فوجیوں کی ایک مشکل آیت اللہ خمینی نے حل کر دی۔ فتویٰ جاری ہوا کہ فوج کے اہل کاروں نے جو حلف ایک طاغوتی طاقت کی فرمانبرداری کے لئے اٹھایا تھا وہ باطل ہے۔ لشکری پہلے ہی کسی بہانہ کی تلاش میں تھے۔ اس فتویٰ کے بعد انہیں لوگوں سے جا ملنے کا جواز اور پروانہ مل گیا۔ یہ بات ہر سپاہی کو خواہ وہ کتنا ہی کند ذہن کیوں نہ ہو معلوم ہو چکی ہے کہ بادشاہ کے خلاف سارا ملک اٹھ کھڑا ہوا ہے اس لئے اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ نوکری اور سلامتی درکار ہے تو انقلاب کا ساتھ دینا ہو گا۔ آیت اللہ کا کہنا مان لینے سے دین اور دنیا دونوں کا بھلا ہو گا۔ تنخواہ کا خرما بھی ملے گا اور عبادت کا ثواب بھی ہو گا۔ آیت اللہ نے جس دن بازرگان کو وزیر اعظم نامزد کرنے کا اعلان کیا تھا اس روز یہ بھی کہا تھا کہ حکومت بازرگان کی مخالفت شرع کی مخالفت ہو گی اور فقہ اسلام کی رو سے حکومت الٰہی کی مخالفت خدا کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس روز بہت سے لوگوں نے اس فتویٰ پر غور نہیں کیا بلکہ دل میں یہی سوچا کہ فقیہانِ دین جب چاہتے ہیں فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ آج عوام کی طاقت اس فتویٰ کو نافذ کر رہی ہے اور لوگ اس پر صاد کر رہے ہیں۔

ہر مرد عورت اور بچہ شاہی فوج اور پولیس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ مسلمان بپا خیز کا اعلان ہو رہا ہے۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت لڑائی کہاں ہو رہی ہے اور تیزی سے ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں اور دوشن تپہ میں ابھی تک گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ایسے گھمسان میں جان و مال کا بڑا نقصان ہوتا ہے مگر اس کا فائدہ اس کے نقصان سے زیادہ ہے۔ گھمسان کا رن ہمیشہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اور امن لڑائی کا فیصلہ ہونے کا نام ہے۔

(3)

خانہ جنگی شروع ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ چار بجے سہ پہر فوج کی طرف سے ایک اعلان جاری ہوا۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ سب نے اس اعلان کو سنا۔ امرائے ارتش یعنی فوج کے اعلیٰ افسروں نے طے کیا ہے کہ موجودہ سیاسی جھگڑے میں فوج غیر جانبدار رہے گی لہٰذا فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً اپنی بارکوں میں واپس آجائیں۔ اس حکم کے ساتھ ہی لڑائی بند ہو گئی۔ فوجی ادارے خاموش اور فوجی اڈے سنسان ہو گئے۔ بانوے دن کے بعد فوجی ٹینک ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن سے واپس چلے گئے۔ ہر جگہ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی فرار ہو گئے۔ درجہ دار فوجیوں نے اپنی وردیاں پھاڑ دیں۔ درجہ کے نشان نوچ ڈالے۔ بڑے افسر گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ بعض فوجیوں نے اپنے ٹھکانوں پر آیت اللہ خمینی کی تصویریں آویزاں کر لیں۔ جس فوجی کے جی میں جو آیا اس نے وہی کیا۔ شکست خوردہ فوج کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے۔

تھانوں اور چھاؤنیوں پر عوامی قبضہ سے بات چلی اور دور تک نکل گئی۔ عوام نے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے وزیراعظم کے دفتر پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے گلستان پیلس پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے تہران کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو گرفتار کر لیا۔

ریڈیو کہتا ہے۔ توجہ بفرمائید، توجہ بفرمائید، توجہ بفرمائید۔ ایں صدائے انقلاب است۔ ٹی وی پر نیا ترانہ بجایا گیا۔ اس نئے ترانے کے ساتھ نیا ایران وجود میں آگیا۔ اس وقت شام کے سات بجے ہیں۔ بادشاہت کا سورج غروب ہو گیا ہے۔ میں نے اسے غروب ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب یہ سورج طلوع ہوا تھا تو اس روز میں وہاں موجود نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیسے کہ یہ بات ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ جب ایران میں انقلاب آیا تو میں یہاں موجود تھا۔ آج جب انقلاب کے نتیجہ میں بادشاہت کو شکست ہوئی ہے تو میں یہاں موجود ہوں۔ یہ واقعہ چند گھنٹہ پہلے رونما ہوا ہے۔ آج اتوار کا دن ہے۔ گیارہ تاریخ ہے۔ مہینہ فروری کا ہے۔ سال عیسوی 1979 ہے۔ شام کا وقت ہے۔ میں موم بتی کی روشنی میں روزنامچہ لکھ رہا ہوں۔ خوشی کے مارے موم بتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔

(4)

انقلاب نے کبھی کسی کو ریہرسل کا وقت نہیں دیا۔ نہ اہل فرانس کو ملا تھا۔ نہ اہل ایران کو ملے گا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر ہر بار نئے لوگوں اور نئے ناموں کے ساتھ جنہیں وہ ریہرسل کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ٹی وی ریڈیو پر طرح طرح کے اعلان ہو رہے ہیں۔ اناؤنسر ان اعلانات کو بغیر ریہرسل اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔ ہسپتال خون کا عطیہ مانگ رہے ہیں۔ خون دینے والے قریبی ہسپتال سے رجوع کریں۔ بیمارستان قلب سابق پہلوی حال مہدی رضا کے لئے رضا کار در کار ہیں۔ آسیب آتش زدگی والے ہسپتال کو ایمبولینس کی فوری ضرورت ہے۔ جن لوگوں نے کاخ گلستان پر قبضہ کر لیا ہے وہ خود داری سے کام لیں۔ اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ محلات اور ان کا مال اسباب اب بیت المال کی ملکیت ہے۔ جن لوگوں نے سرکاری دفاتر پر قبضہ کیا ہے وہ سرکاری دستاویزات کی حفاظت کریں۔

ایک نئے اعلان کو چپکے چپکے پڑھتے ہوئے ٹی وی اناؤنسر کی بھوؤں کے درمیان عمودی شکنیں ابھر آئیں جیسے وہ بے یقینی کے عالم میں پوری توجہ کے ساتھ اس اعلان کو دوسری بار پڑھ رہا ہو۔ اس نے سر اٹھایا اور گھبرائی ہوئی آواز سے اعلان کیا۔ ایک اطلاع کے مطابق تہران کے ذخیرہ آب میں زہر ملا دیا گیا ہے۔ پانی کی جانچ کی جا رہی ہے۔ جونہی نتیجہ ملا اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ تاہم آپ اپنی تسلی کے لئے پانی کو دودھ میں ڈال کر ابال لیں۔ اگر دودھ پھٹ جائے تو گویا پانی مسموم ہے۔ اعلان کرنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ اس تجربہ کے لئے دودھ اور چولھا جلانے والی گیس کہاں سے ملے گی۔ یہ بات البتہ طے ہے کہ اس اعلان کے بعد کون کافر ہو گا جو صدائے انقلاب اسلامی پر کان نہ دھرے اور کون سورما ہو گا جو اگلے اعلان سے پہلے پانی کا ایک گھونٹ بھی زہر مار کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ہم نے فوراً گھر میں رکھے ہوئے پانی کا جائزہ لیا۔ سردی کا موسم ہے اس لئے فرج میں پانی کی کوئی بوتل نہیں ہے۔ کل سرمایہ ایک جگ پانی، کوکا کولا کی چھ بوتلیں اور جوس کے دو ڈبے ہیں۔ اس خیال سے ڈھارس بندھی کہ چھت پر کچھ برف جمی ہوئی ہے

اور ہم سایہ کا سوئمنگ پول پانی سے بھرا ہوا ہے۔ کیا ہم ان کے تالاب سے دو بالٹی پانی نہیں لے سکتے۔

ٹی وی اناؤنسر کی شکل پر پھر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے۔ اعلان ہوا کہ تازہ ترین اطلاع یہ ہے شاہی گارڈ نے دوشن تپہ پر دوبارہ حملہ کر دیا ہے۔ ہر شخص جس کے پاس کسی قسم کا ہتھیار ہے وہ فوراً وہاں پہنچ جائے۔ ایک اعلان اور سنئے۔ جن فوجی اڈوں کا عوام نے محاصرہ کیا ہوا ہے اگر وہاں سفید جھنڈا لہرا دیا جائے تو لوگ محاصرہ ختم کر دیں اور کوئی انتقامی کارروائی نہ کریں۔ ایک اور اعلان سنئے۔ اطلاع ملی ہے کہ بعض مسلح اشخاص شہر میں لوٹ مار کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نوجوان اپنے اپنے علاقہ میں تین سے نو افراد تک کے گروپ بنا لیں اور محلّہ کی حفاظت کریں۔

ایک اہم اعلان وقفہ کے ساتھ بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ فوج نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آیت اللہ خمینی کی نامزد حکومت کو تسلیم کرتی ہے۔ ہر بار اس اعلان کے بعد ایران کا نیا قومی ترانہ بجایا جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں رات ڈھل گئی۔ سکرین پر نیشنل ایرانین ریڈیو اینڈ ٹیلیویژن کی جگہ ٹیلیویژن ملی ایران لکھا ہوا ہے۔ نام نیا، مونوگرام نیا۔ ٹی وی نے ناظرین کو اس نئی صورت حال پر تہنیت پیش کی۔ گرامی باد نو بہارِ ایران۔ نیا ترانہ بجا اور ٹی وی کل تک کے لئے خاموش ہو گیا۔

شورش اور شوریدگی کی اس فضا میں خاموشی کی توقع عبث ہے۔ ہر طرف شور برپا ہے۔ آدھی رات سے گولیاں چلنی شروع ہوئیں اور ساڑھے تین بجے تک مسلسل چلتی رہیں۔ اس کے بعد ان کے تسلسل میں فرق آ گیا اور وقفہ وقفہ سے گولی چلتی رہی۔ فجر کے بعد گولی چلنے کی آواز بند ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ساری رات جاگنے کے بعد اس وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔

(5)

یہ دیکھنے کے لئے کہ ایک کامیاب انقلاب کا تازہ اور دمکتا ہوا چہرہ کیسا ہوتا ہے میں

عذرا کو موٹر میں لے کر دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ میلہ کا سماں ہو گا۔ لوگ سڑکوں پر دھمال ڈال رہے ہوں گے۔ لنگر اور مٹھائی تقسیم ہو رہی ہو گی۔ ہر راہ گیر کو روک کر گلے میں ہار ڈالیں گے۔ پھولوں کی پتیاں نچھاور کریں گے۔ معاملہ بالکل مختلف نکلا۔ مورچے اور اسلحہ، خوف اور بے یقینی۔ سڑکیں اور چوک خالی۔ لوگ خوف سے گھروں میں بند۔ رائفل بردار نوجوان کا راج۔ غول کے غول کوچہ گرد۔ جان، مال اور عزت غیر محفوظ، قانون ان رائفل والوں کی مرضی۔ آئین ان کی ادا۔ ہر ایک بادشاہ۔ اس چپہ کا جہاں وہ کھڑا ہے اور اس لحہ کا جب وہ کوئی کارروائی کرنا چاہے۔

میں نے ایک ساتھی کو فون کیا۔ انہیں یقین نہ آیا کہ میں دفتر سے بول رہا ہوں اور نہ صرف خود موٹر چلا کر آیا ہوں بلکہ بیگم کو بھی ہمراہ لایا ہوں۔ میں نے فون بند کیا تاکہ وہ میرے دفتر کے نمبر پر فون کر کے اپنی تسلی کر سکیں۔ جونہی میں نے ان کی طرف سے آنے والی کال کا جواب ہیلو سے دیا ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ کہنے لگے، جناب والا، یہ بہادری دکھانے کا کون سا موقع ہے۔ خانہ جنگی کے دوران گھر سے باہر نکلنے کے لئے کوئی اشد ضروری کام ہونا چاہئے۔ آپ ایسے گھوم رہے ہیں جیسے کوئی پکنک منا رہا ہو۔ ان حالات میں خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو کوئی آپ کی فرض شناسی کی داد نہیں دے گا۔ سب آپ پر الزام دھریں گے کہ آبیل مجھے مار کا اشتہار لگا کر سڑکوں پر یوں مارا مارا پھرنے کے لئے کس نے کہا تھا۔ میں نے کہا۔ آج میں جس جذبہ کے تحت گھر سے نکلا ہوں اس کا تعلق فرض شناسی سے نہیں ہے۔ اصولاً آج چھٹی ہے اور ایک اعلان کے مطابق یہ کرفیو کا وقت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس حکومت نے یہ اعلان کیا تھا اس کی چھٹی ہو گئی ہے اور کرفیو کے حکم پر جس مارشل لا ایڈ منسٹریٹر نے دستخط کئے تھے وہ اس وقت حراست میں ہے۔ دراصل ایسے دن تاریخ میں بہت مدت کے بعد آتے ہیں۔ ایران میں یہ دن ڈھائی ہزار سال کے بعد چڑھا ہے۔ میں آج کے دن رضائی اوڑھ کر بستر میں لیٹے رہنے کا روادار نہیں ہوں۔

ہم دونوں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل سے ہوتے ہوئے امیر آباد والے چوراہے جا پہنچے۔ یکایک ایک شور بلند ہوا۔ لینا پکڑنا کا غل مچ گیا۔ تہران یونیورسٹی کی جانب سے چیخ و پکار کی جو آوازیں آ رہی ہیں وہ بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ دو چار موٹر سائیکل سوار تیزی سے آئے اور اشارے کرتے اور اونچی آواز سے کچھ کہتے ہوئے شمال کی طرف نکل گئے۔ میں نے موٹر

سڑک کے ایک کنارے کھڑی کر دی اور یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تہران یونیورسٹی سے آنے والا عوامی فوج کا ایک بپھرا ہوا موٹر سوار دستہ ہمارے سامنے سے گزر کر شمال کی جانب جا رہا ہے۔ چھوٹی اور بڑی، نئی اور پرانی موٹریں، ہر ماڈل کے وین، ہر ساخت کے ویگن، تھوڑے سے ٹرک۔ ساری گاڑیاں تیز رفتار ہیں۔ سارے ہارن پورے زور سے بج رہے ہیں۔ ساری سواریاں شور مچا رہی ہیں۔ کچھ سواریاں چھت پر بیٹھی ہیں۔ کچھ ادھ کھلی ڈکی میں سے جھانک رہی ہیں۔ موٹروں کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والے شیشہ اتار کر اور ہاتھ باہر نکال کر موٹر کے دروازے پیٹ رہے ہیں۔ اس بے قاعدہ جنگ جُو دستہ میں اکثریت نوجوانوں کی ہے مگر کھچڑی ڈاڑھیاں اور گنجے سر بھی کم نہیں۔ وردی کے معاملہ میں یہ دستہ بڑا بے ڈھنگا ہے۔ دو آدمی بھی ایسے نہیں جن کا لباس ایک جیسا ہو۔ طرح طرح کے سویٹر ہیں۔ موٹے اور پتلے، آستین والے اور بغیر آستین والے، ہاتھی کی گردن کے گھیر جتنے کھلے گلے والے اور کچھوے کی خول در خول گردن کی طرح بند گلے والے۔ ہر طرح کے کوٹ ہیں۔ فوجی، شکاری، غیر رسمی۔ پتلونیں رنگ برنگ ہیں مگر ساری بدرنگ۔ اسلحہ کا حال بھی کپڑوں جیسا ہے۔ مشین گن، رائفل، دو نالی بندوق، چھرے والی بچوں کی بندوقیں، چاقو، چھریاں، لوہے کے ٹکڑے، لکڑی کے ڈنڈے۔ جن کے پاس کچھ بھی نہیں وہ مٹھی بند کر کے ہوا میں مکہ لہرا رہے ہیں۔ ان تمام لوگوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ سب مشتعل اور پر جوش ہیں۔ قربانی دینے کے لئے نہ صرف تیار بلکہ پہل کرنے کے لئے آمادہ۔ اس ہا ہو میں صرف دو لفظ میری سمجھ میں آئے۔ نیاوران، نیاوران اور کمک، کمک۔

میں نے ایک منتظم سے جو اپنی موٹر روک کر دوسروں کو ہدایات جاری کر رہے ہیں پوچھا کہ بات کیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اس پدر سوختہ شہنشاہ کی شاہی گارڈ نے نیاوران محل کے پاس لوگوں پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم لوگ ان کا دماغ درست کرنے کے لئے وہاں جا رہے ہیں۔ سڑک کے دوسرے کنارے بار برداری کی دو تین چھوٹی گاڑیوں والے آلو اور پیاز بیچ رہے ہیں۔ منتظم نے ایک اشارہ کیا اور چند رضا کار آلوؤں اور پیازوں کے اوپر بیٹھ گئے اور یہ گاڑیاں بھی نیاوران جانے والے قافلہ میں شامل ہو گئیں۔ قافلہ کا آخری حصہ اس غیر عادی فوج میں نئے بھرتی ہونے والوں پر مشتمل ہے۔ ایک شخص میرے پاس آیا اور

پوچھا، اسلحہ داری۔ میں نے کہا، بلے۔ اس نے کہا پھر انتظار کس بات کا ہے۔ چلو، جلدی چلو۔ اس نے ہاتھ سے ٹریفک کو رکنے کا اشارہ کیا اور میں موڑ کاٹ کر عوامی فوج میں شامل ہو گیا۔ عذرا ساتھ والی سیٹ پر سکون سے بیٹھی ہیں۔ صرف اتنا پوچھا کہ موٹر میں وہ کون سا اسلحہ رکھا ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ نے ہاں کہہ دیا تھا۔ میں نے کہا، تم دیکھ رہی ہو کہ عوامی اسلحہ میں سریا، ڈنڈا، اینٹ اور پتھر شامل ہے۔ موٹر میں لوہے کے اوزار رکھے ہیں جو ان سے زیادہ کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہمارے آگے جو پرانی اور بڑی سی موٹر ہے اس کی ڈکی میں تین لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک نے دونوں ہاتھوں سے ڈھکن کو سنبھالا ہوا ہے مگر وہ سنبھلنے میں نہیں آتا۔ موٹر تیز ہو یا موڑ کاٹے تو ڈھکن نیچے کی طرف گرتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے لڑکوں کی پوری کوشش کے باوجود کبھی کبھی ان کے سر سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں سے دو لڑکے رائفل لئے ہوئے ہیں۔ نالی کا رخ ہماری موٹر کی طرف ہے۔ اگر کسی ہچکولے یا حادثہ کی وجہ سے رائفل چل جائے تو نشانہ خطا نہیں ہو گا کیونکہ گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے بمپر سے بمپر ملا کر چل رہی ہیں۔ ہماری موٹر کے پیچھے جو آلو والی وین ہے اس پر سوار لڑکوں کی رائفل کا رخ سامنے کی طرف ہے اور اس طرف پہلی گاڑی ہماری ہے۔ آگے اور پیچھے دونوں طرف سے ہم بھری ہوئی بندوقوں کی زد میں ہیں۔ یہ صورت حال مضحکہ خیز بھی ہے اور خطرناک بھی۔ یہ کوئی ڈراما نہیں۔ یہ کسی فلم کا منظر نہیں۔ یہ ایک خونیں انقلاب کی کامیابی کا پہلا دن ہے۔ آئین ہے نہ اس کی حفاظت کرنے والے۔ قانون ہے نہ اسے جاری کرنے والے۔ ہربونگ ہے اور ہرج مرج۔ لوگ بے قابو ہیں۔ افواہیں سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ بندوقیں عام ہیں۔ چلانے والے عوام ہیں۔ پوچھنے والا کوئی بھی نہیں۔ کسی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

عوامی فوج کا یہ موٹر سوار دستہ تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ اسلحہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار افراد کے پاس ہو گا۔ وہ چھوٹے غیر رسمی ہتھیار جو صرف ایک بار استعمال کے بعد ناکارہ ہو جائیں گے اور جس پر وار کیا جائے اس کا شاید کچھ بگاڑ بھی نہ سکیں کوئی ہزار پانچ سو نوجوانوں نے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ باقی ماندہ عوامی فوج صرف غم و غصہ سے لیس ہے۔ ہم دونوں کے پاس وہ بھی نہیں۔ ہم کچھ زیادہ ہی نہتے ہیں۔ ہم رائفلوں

اور وسوسوں میں گھرے ہوئے آٹھ دس کیلو میٹر کا سفر اس بے قاعدہ ہنگامی فوج کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ جہاں سے گزر ہوتا ، وہاں لوگ راہ چھوڑ دیتے۔ جس چوراہے پر پہنچتے وہاں راستہ کاٹنے والی سڑک کی ٹریفک اس کی خاطر رک جاتی۔ یہ قافلہ جس کی لمبائی دو تین کیلو میٹر ہے بلا روک ٹوک ونک چوک تک آ گیا۔ یہاں پہنچ کر ٹریفک جام ہو گیا۔ ہارن بج رہے ہیں۔ ہر شخص موٹر گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر بلند آواز میں دوسروں کو مشورہ دے رہا ہے مگر خود کوئی مشورہ قبول نہیں کرتا۔ چند رضا کار لڑکے اور لڑکیاں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں مگر بے سود۔ گاڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں جیسے کسی نے ٹریفک کو گرہ لگا دی ہو۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ بے چینی اور تناؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ امدادی دستہ لڑائی میں شامل ہونے کے لئے جا رہا ہے اور ٹریفک جام میں پھنس کر رہ گیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ ایک آدمی اس چوک کے وسیع گول دائرہ کے وسط میں پہنچ کر اپنی رائفل آسمان کی طرف کرتا ہے اور جتنی گولیاں اس کے پاس ہیں وہ ساری کی ساری چلا دیتا ہے۔ افراتفری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کچھ ڈرائیور موٹریں چھوڑ کر ادھر ادھر پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ بے ڈرائیور گاڑیوں کی وجہ سے صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ میں بھی گاڑی سے نیچے اتر کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ پتہ چلا کہ اس چوک میں ایک چھوٹا سا عوامی فوج کا دستہ پہلے ہی موجود تھا۔ اس کا رخ کسی اور جانب تھا لہٰذا دونوں دستے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

رضا کاروں نے آواز لگائی اور دور تک پیغام پہنچانے کے لئے ہاتھ سے اشارے کئے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ موٹر کا ریڈیو چلا کر تازہ اعلان سنو۔ ریڈیو کہہ رہا ہے کہ اس وقت صرف سلطنت آباد میں کمک کی ضرورت ہے۔ وہاں شاہی فوج نے بڑا حملہ کر دیا ہے۔ لوگ فوراً وہاں پہنچیں۔ نیاوران، نیاوران کی جگہ سلطنت آباد، سلطنت آباد کا شور مچ گیا۔ منزل بدل گئی۔ اس تبدیلی نے ٹریفک جام کو سلجھانے میں بہت مدد دی۔ جونہی ٹریفک کھلی میں نے ارادہ اور رخ بدل لیا۔ ہلٹن ہوٹل کی طرف نکل گیا۔ ہلٹن کے پاس گولیاں چل رہی ہیں۔ میں گاڑی موڑ کر ایک گلی میں گھس جاتا ہوں۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم بالآخر بخیریت گھر پہنچ جاتے ہیں۔ موٹر ابھی پھاٹک کے باہر کھڑی ہے کہ ریڈیو پر نیا اعلان ہوتا ہے۔ سابقہ اعلان منسوخ سمجھا جائے۔ وہ غلط فہمی کی بنا پر نشر ہوا تھا۔ سلطنت

آباد پر حملہ کی خبر غلط نکلی۔ وہاں صرف پانچ دس سپاہیوں نے ایک پارک میں فائر کھولا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں لوگ امداد کے لئے پہنچ چکے ہیں۔ جو لوگ راستہ میں ہیں وہ براہ کرم گھروں کو واپس چلے جائیں۔

پھاٹک کھلا اور ہم دونوں بھوکے پیاسے اور تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے۔ موٹر سے اترتے ہوئے پہلی بار ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ عوامی فوج کے ساتھ جو وقت گزرا اس میں ہم ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے اور ایک دوسرے کو بے خوفی کا تاثر دیتے رہے۔ اگر ہم واقعی اتنے بے خوف تھے تو اس وقت ہمارے چہروں پر "ولے بخیر گزشت" کیوں لکھا ہوا ہے۔

ریڈیو کہہ رہا ہے کہ جو لوگ کمک کے لئے مہر آباد ایئرپورٹ گئے ہیں وہ واپس آجائیں۔ اسرائیلی سفارت خانہ کو آگ لگا دی گئی ہے۔ ہلٹن ہوٹل پر چند لوگوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اسپورٹس ویلیج پر بھی حملہ ہو گیا ہے۔ عوام سے اپیل ہے کہ سفارت خانوں، سرکاری عمارتوں، اور کارخانوں کو آگ نہ لگائیں۔ کرج کی فوجی چوکی سے اسلحہ لوٹنے والے فوراً یہ غیر شرعی کام بند کر دیں۔ انٹر کان ہوٹل کے باہر لڑائی کرنے والے دستوں سے گزارش ہے کہ وہ گولیاں چلانی اور آگ لگانی بند کر دیں تاکہ وہاں ٹھہرے ہوئے بیرونی نامہ نگار ہوٹل سے باہر نکل سکیں۔ خوش خبری، خوش خبری۔ نیاوران محل اور فوجی ہیڈکواٹر پر عوامی قبضہ ہو گیا ہے۔ سہ پہر کے وقت تمام نوجوان مساجد میں جمع ہو جائیں۔ شکرانہ ادا کریں۔ اسلحہ واپس کر دیں۔ تمام غیر اسلامی شعائر سے پرہیز کیا جائے۔ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے سے گریز کیا جائے۔ علما سے درخواست ہے کہ وہ لوگوں کو بالخصوص نوجوانوں کو اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کریں۔

یہ شاہراہ انقلاب ہے۔ اعتدال کی راہ یہاں سے کئی ماہ و سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فرانس میں باسٹیل جیل کے قیدیوں کی رہائی سے نپولین کی آمد تک دس سال کا وقفہ ہے۔ نپولین نے بھی راہ اعتدال پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور فرانس اگلے سولہ برس تک ان راہوں پر چلتا رہا جو میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ مارینگو، آسٹرلٹز، عیلا، واگرام، بورودینو، ماسکو، لیپزگ، واٹرلو۔ باسٹیل سے واٹرلو تک اور انقلاب سے اعتدال تک فرانس کو چھبیس برس لگے تھے۔ آج کا دن انقلاب ایران کا محض پہلا دن ہے۔

پیرس کی طرح تہران میں بھی لوگوں نے ایک جیل پر حملہ کیا۔ فرانس میں بے گناہ اور باضمیر سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے جیل توڑی گئی تھی۔ یہاں اس کے برعکس بالکل مختلف وجوہات کی بنا پر جمشیدیہ جیل پر حملہ کیا گیا ہے۔ وہاں شہنشاہی دور کے چند بڑے آدمی نظر بند ہیں۔ عوام ان سے خود ہی سوال جواب اور حساب کتاب کرنا چاہتے ہیں۔ ظالمو جواب دو، خون کا حساب دو۔ ستائے ہوئے لوگ بدلہ لینے کے لئے بے صبر ہوتے ہیں۔ ان بے صبر اور بے منصوبہ لوگوں نے بغیر سوچے سمجھے کئی جگہ سے چار دیواری توڑ دی۔ افراتفری میں چند مطلوبہ آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ وہ شخص جسے سب سے بڑا مجرم کہتے ہیں لوگوں کے ہاتھ لگ گیا۔

کوچہ گردی اور انبوہ گردی کا زمانہ ہے۔ شہر میں جابجا چھوٹے بڑے گروہ شاہی دور کے اہم آدمیوں سے حساب چکانے میں لگے ہوئے ہیں۔ الزام نہ ثبوت۔ وکالت نہ عدالت۔ صاحب حیثیت ہونا جرم ہے۔ عدالت کے لئے چند افراد کا مسلح ہونا کافی ہے۔ جنرل بدرہ ای کی لاش کو ہسپتال لایا گیا ہے۔ ماتحت سپاہیوں نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔ شاہی گارڈ کے نائب کماندار جنرل بگلاری جو کل رات ٹی وی پر اپنی وفاداری کا اعلان کر رہے تھے آج ان کے ڈرائیور نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ جنرل جعفریاں اہواز میں مارے گئے۔ تہران میں جنرل رحیمی کو عوام نے کل حراست میں لے لیا تھا۔ وہ مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کی حیثیت سے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ اپنے دفتر پہنچے جو وزارت خارجہ کے سامنے والی عمارت میں واقع ہے۔ ان کے دفتر کے پاس درخت اونچے اور جگہ تنگ ہے اس لئے ہیلی کاپٹر وزارت خارجہ کے لان میں اترا۔ وہاں جو چپراسی، ڈرائیور، چوکیدار، لڑکے بالے اور راہ گیر کھڑے تھے انہوں نے مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کو گھیر لیا اور گرفتار کر لیا۔ وہ فوجی جس کے حکم سے شہر میں گرفتاریاں کی جاتیں اور گولیاں چلائی جاتیں اسے لڑکے بالے دھکیل کر آیت اللہ کے دفتر میں لے گئے۔ یہ دفتر ایک مدرسہ میں واقع ہے۔ آج کل اس مدرسہ میں انقلاب کا درس دیا جاتا ہے۔

(6)

یہ بڑا طویل دن ہے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ دن کئی دنوں سے چڑھا ہوا ہے۔ یکایک ٹی وی کی سکرین پر چار قیدی دکھائے گئے جنہیں دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جنرل نصیری، جنرل رحیمی، پولیس کے نائب سربراہ نوروزی اور ایک مچھیل پہلوان جو پاکستانی ہوتے تو اپنے علاقہ میں جگا ٹیکس کی وصولی کرتے اور تھانہ رجسٹر نمبر دس کے قابل توجہ شہریوں کی فہرست میں جگہ پاتے۔ یہ کل تک ایران کے ایوان بالا کے رکن تھے اور نام کے ساتھ سینیٹر لکھا کرتے تھے۔ میں ان کا نام نہیں سن سکا۔ اور اگر سن بھی لیتا تو میرے کس کام آتا۔

قیدیوں کا انٹرویو شروع ہوا۔ یہ کسی سٹوڈیو کے بجائے ایک معمولی سی عمارت کے بے سرو سامان کمرے میں لیا جا رہا ہے۔ دو چار بے ترتیب میز کرسیاں، چار پانچ ادھر ادھر کھڑے ہوئے نوجوان۔ اتنے میں ایک آدمی آگے بڑھا اور سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس شخص کا نام ڈاکٹر ابراہیم یزدی ہے۔ پچھلے دو ہفتہ میں جو چند نئے نام یکایک منظر عام پر آئے ہیں یہ ان میں ایک معتبر نام ہے۔ لوگ اس شخص کا اتا پتا پوچھتے ہیں۔ سنا ہے امریکہ سے آئے ہیں۔ پیشہ ڈاکٹری ہے اور مشغلہ شاہ کی مخالفت۔ خود پسندی چال ڈھال سے ظاہر ہو رہی ہے۔ آیت اللہ کی پہلی پریس کانفرنس میں یہ مترجم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس وقت وہ انقلاب کے عوام دشمن قیدیوں سے ٹی وی پر پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ پہلے دو تین سوالات سے یہ ظاہر ہے کہ وہ تیاری کے بغیر کیمرہ کے سامنے آ گئے ہیں۔ آخر وہ کیا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انقلاب کی طاقت، ملزمان کے لئے جرائم، اپنی اہمیت۔ انقلاب کی قوت لوگوں نے پہلے ہی دیکھ لی ہے۔ شاہ فراری ہے۔ اس کے بہت سے ساتھی لوگوں نے پکڑ کر موقع پر ہی مار دیئے۔ دو چار حواریوں کو ٹی وی پر بحالت گرفتاری دکھانے سے انقلاب کی ہیبت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو گا۔ ملزمان کو قابل نفرت ثابت کرنے کی کوشش غلط سوالات کی وجہ سے ناکام ہو رہی اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر یزدی کی لیاقت اور سوجھ بوجھ کا تاثر زائل ہو رہا ہے۔

پولیس کے نائب رئیس نوروزی نے سوال جواب کی جگہ ایک بیان پڑھا۔ میں ملت

اور عوام کا خادم ہوں۔ ایسے بیانات کا اب کیا فائدہ۔ چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ رضا شاہی ٹکسال کے جاری کردہ سکے متروک ہو چکے ہیں۔ نو روزی جیسے سینکڑوں عہدہ دار راتوں رات غیر اہم اور غیر متعلق ہو گئے ہیں۔ اب ان کی اہمیت کی نوعیت یہ ہے کہ کل جو شخص جتنا اہم عہدہ دار تھا آج وہ اتنا ہی اہم ملزم اور اتنا ہی بڑا مجرم ہے۔ یہ بات پہلوان قیدی اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی لئے وہ ڈاکٹر یزدی کے ساتھ بحث میں نہیں پڑتا۔ ہوں ہاں اور ہاں نہ سے کام چلا رہا ہے۔ چہرے سے خفگی، جھنجلاہٹ اور بد دماغی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اور وہ اس کیفیت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ سے خفا لگتا ہے۔ آخر اتنی ہشیاری، کامیابی اور دولت کے باوجود وہ اس بری طرح کیسے پھنس گیا جیسے چوہے دان میں چوہا۔

جنرل رحیمی کو معلوم ہے کہ وہ زیر حراست ہیں اور ان کی رہائی اور جاں بخشی کا کوئی امکان نہیں مگر وہ اس صورت حال کا مقابلہ ایک اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی کی حیثیت سے کر رہیں۔ پرسکون نظر آتے ہیں۔ سوال کا جواب ہی نہیں دیتے بلکہ سوال لوٹا دیتے ہیں۔ کہنے لگے، آپ جو کچھ کر رہے ہیں یہ سارا کام غیر قانونی ہے۔ مثلاً اس وقت آپ لوگ جو بندوقیں اٹھائے پھر رہے ہیں یہ سب بغیر اجازت اور بغیر لائسنس کے ہیں۔ آپ لوگ مجھ سے میری کارکردگی کے بارے میں جو سوالات پوچھ رہے ہیں ان سب کا ایک ہی جواب ہے۔ میں نے اپنے عہد اقتدار میں جو احکامات بھی جاری کئے ان کا اختیار مجھے قانون کی رو سے حاصل تھا۔ اور میں نے فوجی حکمران کی حیثیت سے ہمیشہ وہ احکامات جاری کئے جنہیں میں نے صورت حالات کے تحت ملک اور قوم کے لئے درست اور مناسب سمجھا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ اس وقت اختیار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کو حق حاصل ہے کہ مجھ سے وہ سلوک کریں جسے آپ درست اور مناسب سمجھتے ہیں۔

انقلابی نوجوانوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے پہلے چار قیدیوں سے ٹی وی پر گفتگو کا یہ بے ڈھنگا پروگرام اب اپنے کلائمکس پر پہنچ گیا ہے۔ آخری قیدی جنرل نصیری ہے۔ ساواک کا سابقہ سربراہ۔ بدنام زمانہ، رسوائے عالم۔ کل تک اس کے نام کی دہشت ایران کے ہر شہر ہر قصبہ اور ہر قریہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ مائیں اس کا نام لے کر بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔ ملک میں سخت حبس کا عالم تھا۔ تازہ ہوا کے ہر جھونکے کو چلنے سے پہلے نصیری سے

اجازت لینا پڑتی تھی جو اس نے تیرہ سال تک ایک بار بھی عطا نہیں کی۔ ستم گری اور شکنجہ گری کی ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانیں ساواک سے وابستہ ہیں کہ لاکھوں افراد جنہوں نے کبھی اس شخص کی تصویر بھی نہیں دیکھی اس کا نام سن کر غصہ سے تھرا جاتے ہیں۔ ٹی وی کے پروگرام میں اس کا تعارف جلاد، خونخوار، سفاک اور اسی طرح کے دوسرے القابات سے کرایا گیا۔ اس کے بعد سکرین پر ایک شخص دکھایا گیا۔ بوڑھا، فربہ، حواس باختہ، زخمی۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ چہرے پر مار پیٹ کے تازہ نشان ہیں۔ کچھ نیلگوں کچھ سرخ۔ انگلیاں اور ناخن زخمی اور تر ہیں جیسے ابھی ابھی خون رسنا بند ہوا ہو۔ اوسان خطا ہیں۔ گلا خشک ہے مگر ایک ہلکی سی آواز آ رہی ہے۔ سانس پھولا ہے یا شاید درد سے کراہنے کی آواز ہے۔ رائفل بردار لڑکے ادھر ادھر کھڑے ہیں۔ چہرے سپاٹ ہیں۔ ڈاکٹر یزدی ایک مصنوعی خشونت کے ساتھ سوال کر رہے ہیں۔ ادھر سے بس ایک ہی جواب ہے۔ نمی دانم۔ مجھے پتہ نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں اس بارے میں بالکل بے خبر ہوں۔ پھر یہ جواب گلے میں اٹک جاتا ہے۔ پانی کا گلاس لایا گیا۔ پانی پینے کے بعد اس کی بات کسی قدر سمجھ میں آنے لگی۔ وہ کہتا ہے کہ میں ادارہ کا سربراہ تھا۔ قیدیوں سے جن ساواکی ملازمین کا براہ راست تعلق ہوتا تھا وہ مجھ سے کئی درجہ کمتر تھے۔ یہ بات میرے علم میں نہیں آئی کہ ساواک کا عملہ قیدیوں سے غیر انسانی سلوک کرتا ہے۔ ادھر کوئی سال بھر کی بات ہے کہ مجھے چند شکایات ملیں۔ میں ذاتی طور پر جیل دیکھنے کے لئے گیا مگر کہیں بھی حالات کو شکایات کے مطابق نہیں پایا۔ ڈاکٹر یزدی بے مقصد جرح کرتے اور شور مچاتے رہے ادھر سے ہائے ہائے اور وائے وائے ہوتی رہی۔

پروگرام کی دوسری قسط میں کچھ اور قیدی دکھائے گئے۔ نوجوان انقلابی گروہ در گروہ شہر میں پھر رہے ہیں۔ لوگوں کو گرفتار کر کے مدرسہ رفاہ میں لے آتے ہیں جہاں سے ٹی وی ان کے انٹرویو دکھا رہا ہے۔ قیدیوں کی اس کھیپ میں کئی معروف و مشہور ہستیاں شامل ہیں۔ سابق وزیر اعظم امیر عباس ہویدا، فضائیہ کے چست و چالاک سربراہ لیفٹننٹ جنرل ربیعی، اصفہان کے مارشل لا ایڈ منسٹریٹر میجر جنرل رضا ناجی، بریگیڈیئر جنرل محققی، تین وزیر شیخ الاسلام زادہ، آزمون، روحانی، اور تہران کے میئر غلام رضا نک پئی۔ سوال جواب شروع ہوا۔ ہویدا نے کہا، میں کسی دوسرے شخص سے زیادہ قصوروار نہیں ہوں۔ دراصل

ساری ایرانی قوم قصوروار ہے جو مطلق العنان نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرتی رہی۔ غور کیجئے کہ تمام سابقہ وزیراعظم ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔ میں بہت پہلے اور بآسانی ملک چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ آج جمشیدیہ جیل سے نکلنے کے بعد بھی میں نے بھاگنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ فون کیا اور پوچھا کہ میرے لئے کیا ہدایات ہیں۔ مجھے کہا گیا کہ مدرسہ رفاہ پہنچ جاؤ اور میں آگیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ سابقہ حکومتوں نے غلطیاں کی تھیں تو اس نے جواب دیا، بلاشبہ ان سے غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اسی لئے میں آج یہاں اس طرح (ملزم بنا) بیٹھا ہوں۔ جب اس سے شہنشاہ کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے تنک کر کہا، یہ سوال شہنشاہ سے کرو۔ مجھ سے کیوں کرتے ہو۔ میں صرف اپنی ذات اور اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہوں۔

رات گئے یوں لگتا ہے جیسے انقلاب کا پہلا دن ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ اور اگر پہلا ختم نہیں ہوا تو دوسرا کیسے چڑھے گا۔

نہ جانے آنکھ کب لگی اور کتنی دیر کے لئے لگی۔ کسی نے سرہانے کے پاس اخبار لاکر رکھ دیا۔ قدموں کی آہٹ اور کاغذ کی سرسراہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ روزنامہ آیندگان کے پہلے صفحہ پر ایک خبر چوکھٹے کے اندر لگی ہوئی ہے۔ یہ جنرل نصیری کے اس انٹرویو کے متعلق ہے جو کل رات ٹی وی پر دکھایا گیا تھا۔ خبر کا عنوان ہے، نمائش نامعقول۔

باب یازدہم

خوف اور خون

میں انقلابِ عالم کے بارے میں ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہوں ۔ نظریں ایک نظم پر جاکر ٹھہر جاتی ہیں۔ یہ انقلاب فرانس کے بارے میں ہے۔ عنوان ہے، ترانۂ رخصت۔ ایک عہد رخصت ہو رہا ہے۔ اس سے عاجز آئے ہوئے لوگ اسے کس دھوم سے رخصت کر رہے ہیں۔ میں ترانہ کے چار مصرعوں کی گھن گرج سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں ان کا ترجمہ کرتا ہوں ۔ کل چار مصرعوں کی بات ہے۔ تین کے ترجمہ میں دقت ہوئی، مگر ایک مصرع ایسا بھی نکلا جس کے ترجمہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ مصرع یہ ہے۔ The Soverign people advance! اقبال پہلے ہی اس کا منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترانہ رخصت کے ایک بند کا ترجمہ میں نے اقبال کی مدد سے یوں مکمل کیا۔

اے فرانس کے دشمنو! خوف سے تمہارے کانپ اٹھنے کی گھڑی آپہنچی ہے۔
اے بادشاہو! اے جامِ خون اور پیالۂ غرور پی کر مدہوش ہونے والو۔ سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ،
ظالمو، ستم گرو، جلدی سے اپنے اپنے کفن اوڑھ لو۔

جلالی اشعار ہیں۔ غضبناکی کا وہی عالم ہے جو بال جبریل میں "فرمانِ خدا" کے ذیلی عنوان کے تحت چند اشعار میں ملتا ہے۔ غریبوں کو جگا دو، محلات کی بنیادیں ہلا دو، نقش کہن مٹا دو اور اگر زمینداری اور جاگیرداری ختم نہیں کر سکتے تو ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ انقلاب

اسی گھیراؤ جلاؤ کا نام ہے۔ سنبھلو، جھپٹو، اٹھو، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں۔

انقلاب کو پورا ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ صرف تین چار دن گزرے ہیں۔ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب جب آدھی بیت گئی تو مدرسہ رفاہ میں اسلامی انقلابی عدالت نے چند بڑے آدمیوں کے خلاف مقدمات کی سماعت شروع کی۔ راتوں رات چار مقدموں کی سماعت مکمل ہوئی۔ فیصلہ سنایا گیا۔ اس پر عمل بھی اسی سرعت کے ساتھ ہوا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد بھی رات اتنی باقی تھی کہ مجرموں کی تصویریں چند گھنٹہ کے بعد طلوع ہونے والی صبح کے اخباروں میں چھپ سکیں۔ اس روز اخبار بہت فروخت ہوا۔ خبر صرف ایک ہے اور تفصیل اس قدر ہے۔ ملک، ایران۔ شہر، تہران۔ مقام، مدرسہ رفاہ۔ عدالت، دادگاہ اسلامی۔ جرم، فساد فی الارض۔ سماعت، فوری۔ سزا، موت۔ فیصلہ پر عمل در آمد، فی الفور۔ عمل گزار، رضا کار۔ باڑھ داغنے کی جگہ، ایک گمنام مدرسہ کی چھت۔

اخبار میں سزا یافتہ مجرموں کے مردہ جسموں کی بڑی بڑی تصویروں کے نیچے وہ نام لکھے ہوئے ہیں جن سے یہ جسم اس وقت پہچانے جاتے تھے جب ان میں جان ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں یہ کچھ زیادہ ہی جاندار اور منہ زور ہوا کرتے تھے۔ انقلابِ زمانہ نے ان کی لاشوں کا حلیہ خراب کر دیا ہے۔ دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ گولیوں سے چھلنی جسم ٹھنڈے ہونے سے پہلے نصیری، رحیمی، خسروداد اور نجفی کہلاتے تھے۔ یہ چاروں ایرانی فوج کے نامور جنرل تھے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ان تصویروں کو دیکھ کر لوگوں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور فیصلہ کی پر جوش تائید کی۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ کل تک اس کی پہنچ سے باہر تھے وہ بالاخر آج ان سے ذاتی انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ہر شخص کو گمان ہے کہ انقلابی عدالت ان اختیارات کے تحت قائم ہوئی ہے جو اس نے احتجاجی جلسہ جلوس اور مظاہروں میں شامل ہو کر بذات خود انقلاب کو تفویض کئے ہیں۔

شام کو ٹی وی نے مقدمہ کی ایک جھلک دکھائی۔ مدرسہ کے ایک کمرے میں عدالت لگی ہوئی تھی۔ کرسیوں کی تین چار چھدری قطاریں تھیں جن پر چند خاموش تماشائی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر کپڑے کا پرچم چسپاں تھا۔ اس پر قصاص والی آیت لکھی ہوئی تھی۔ "اے ایمان والو! تم پر قصاص (خون کے بدلے خون) فرض کیا جاتا ہے۔ ...... (اس

قانون) قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ " ملزمان اس پرچم کے نیچے بنچ پر حیرت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ عدالت کے اراکین کی صورت نہیں دکھائی۔ کیمرے کو یہ تاب اور مجال کہاں۔

قصاص سے بچنے کے لئے بہت سے لوگ زیر زمین چلے گئے۔ ملک چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد میں یکایک اضافہ ہو گیا۔ فرار میں مدد دینے والوں کے حق خدمت میں اضافہ ہوا۔ نرخ تیز ہو گئے۔ جسے زیر زمین جانے کا موقع ملے نہ فرار کا راستہ وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ جنرل ایرج مقدم نے خودکشی کر لی ہے۔ وہ مشہور و معروف جنرل طوفانیاں کے جانشین اور فوج کا ساز و سامان خریدنے کے ذمہ دار تھے۔ خریداری کمیشن سے بنائی ہوئی بے حساب دولت ان کے کسی کام نہ آئی۔ دولت لاوارث ٹھہری۔ ساری عمر غیر ملکی بنکوں میں بدروحوں کی طرح بھٹکتی رہے گی۔ کرمان شاہ میں فوجی اڈا کے کمانداد کرنل امیری کو سپاہیوں نے ہلاک کر دیا۔ خراسان کے سابق گورنر جنرل عبدالعظیم اور فارس کے سابق گورنر جنرل منوچہر پیروز ایک فوجی ہسپتال سے فرار ہو گئے ہیں۔ شہزادی اشرف کا بیٹا شہزادہ شہریار شفیع جو بحری فوج میں تھا بندر عباس سے ایک موٹر بوٹ لے کر بھاگ گیا ہے۔ حاجبریزدانی تہران جیل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نصیری سے دوستی تھی۔ بہائی ہیں اور بے حد دولتمند۔ تعلق کی وجہ سے پھنس گئے۔ دولت کی وجہ سے چھُٹ گئے۔

ملک بھر سے قیدیوں کے جیلوں سے بھاگ جانے کی خبریں آرہی ہیں۔ کچھ جیلوں کے محافظ خود ہی فرار ہو گئے۔ قیدیوں کو بھاگنے کے لئے نظیر اور موقع مل گیا۔ کہیں ہجوم نے جیل کی دیواریں ڈھادیں۔ کہیں مخالف گروہوں نے جیل کا صدر دروازہ کھول دیا۔ جہاں یہ تینوں سہولتیں میسر نہ آئیں وہاں ڈالر کام آگئے۔ ہزاروں قیدیوں کے فرار کے باوجود جیلوں کی آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جتنے لوگ جیل توڑ کر بھاگ جاتے ہیں اس سے زیادہ گرفتار ہو کر جیل بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جتنی جیلیں ناکارہ ہو جاتی ہیں اس سے زیادہ عمارتوں کو عارضی جیل بنا دیتے ہیں۔ کسی کو خبر نہیں کہ جیل کہاں کہاں کھل گئے ہیں۔ کل قیدی کتنے ہیں۔ اور ان میں کون کون شامل ہے۔ سرکاری فہرست کی غیر موجودگی میں سخت کنفیوژن ہے۔ جن کے بارے میں خیال تھا کہ بھاگ کر یورپ یا امریکہ

چلے گئے ہیں ان کی تصویر چھپتی ہے کہ سزا ملی اور راہئی ملکِ عدم ہو گئے۔ جن کے بارے میں اندیشہ ہوتا کہ جیل میں چکی پیس رہے ہیں، ان کا پیرس سے ٹیلیفون آجاتا ہے۔

اپریل کی سات تاریخ تھی۔ ہم لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ دو ایک مہمان بھی موجود تھے۔ ٹی وی پر فارسی میں خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ خبریں پڑھنے والے نے بڑے آرام سے ٹھہر ٹھہر کر ہر لفظ کو علیٰحدہ علیٰحدہ اور صاف صاف ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلامی عدالت نے امیر عباس ہویدا سابق وزیراعظم کو موت کی سزا دی تھی جس پر ابھی کچھ دیر پہلے عمل در آمد ہو گیا ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی ایک ایرانی لڑکی کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ رنگ فق ہو گیا اور چہرہ اتر گیا۔ حلق سے صرف دو لفظ نکلے۔ پدر سوختہ۔ اور اس کا حلق خشک ہو گیا۔

مقدمہ کے دوران ہویدا نے کہا کہ ایران بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔ میں اپنے دفاع میں ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا جس سے مسائل کی پیچیدگی میں اضافہ ہو جائے۔ ہم سب ایک نظام کار کے تحت کام کر رہے تھے۔ اگر کوئی خامی اور خرابی تھی تو وہ اس سسٹم میں تھی۔ ان خرابیوں کا ذمہ دار عملہ اور کارندوں کو ٹھہرانا غلط ہو گا۔ سماعت ختم ہوئی۔ فیصلہ وہی ہوا جو انقلاب ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ ہویدا نے ایک ماہ کی مہلت مانگی تاکہ وہ اپنے مشاہدات پر مبنی ایک تحریری دستاویز تیار کر سکے۔ انقلاب ہمیشہ عجلت میں ہوتا ہے۔ وہ ضد انقلاب کو اتنی مہلت کہاں دے سکتا ہے کہ وہ کتابیں لکھتے رہیں۔ درخواست نامنظور ہو گئی۔ البتہ ایک درخواست جو اس نے پیش بھی نہیں کی تھی وہ منظور ہو گئی۔ اسے سزا سے پہلے اپنی والدہ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اس نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی۔ جواب ملا، می خواہم مادرم ہمہ تصویر قبلی را از من داشتہ باشد۔ میں چاہتا ہوں کہ ماں کی نظروں میں میری وہی قید و بند سے پہلے والی صورت بسی رہے۔

ہویدا کو سزا دینے کے دو دن بعد جنرل ربیعی، جنرل خواجہ نوری اور منوچہر آزمون کو بھی مفسد فی الارض قرار دے دیا گیا۔ وہی فوری سماعت، فوری فیصلہ اور فائرنگ سکواڈ کا فوری سامنا۔ ٹی وی پر حسب معمول مقدمہ کی جھلکیاں دکھائی گئیں۔ سلمان نے دیکھا اور کہنے لگا۔ اب تک جتنے فوجی افسر ٹی وی سکرین پر دکھائے گئے ہیں جنرل ربیعی ان میں سب سے زیادہ سمارٹ ہیں۔ جامہ زیب اور خوش شکل ہیں۔ باتیں ان کی دل لگتی ہیں۔ کیا مجرم

ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جنرل ربیعی فضائیہ کے سربراہ تھے۔ اپنا دفاع کرتے ہوئے اس نے کہا میں ایک عام گھرانہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ کوئی سفارش نہیں تھی۔ محض اپنی محنت اور لیاقت سے اس عہدہ تک پہنچا ہوں۔ پچھلے دنوں جب مجھے کہا گیا کہ مظاہرین پر بمباری کرو تو میں نے حکومت وقت کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ انقلاب کے بعد میں نے روپوش ہونے کے بجائے خود کمیتہ کو فون کیا۔ وہ لوگ میرے پاس آئے اور میں برضا ورغبت اور بقائمی ہوش وحواس ان کے ہمراہ یہاں چلا آیا۔

پاکستان فضائیہ کے ایک بہت پرانے ہوا باز جو مدت سے ایران میں رہتے ہیں جنرل ربیعی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور میں ونگ کمانڈر افضل کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب وہ پاکستان کی باسکٹ بال ٹیم کے کپتان ہوا کرتے تھے۔ میں ان دنوں مختلف کھیلوں سے شوقیہ کھلاڑی، بلامعاوضہ منتظم اور بلا ٹکٹ تماشائی کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد ونگ کمانڈر واپڈا کے چیف پائلٹ ہو گئے اور میں اتھارٹی کا ممبر ہو گیا۔ ان دنوں واپڈا کی انتظامیہ صرف تین افراد پر مشتمل تھی۔ غلام اسحاق خاں چیئرمین اور نورالحسن جعفری ممبر مالیات تھے۔ میں نے چھوٹے Cessna ہوائی جہاز میں کئی بار ونگ کمانڈر افضل کے ساتھ سفر کیا۔ ایک سفر میں انہوں نے جہاز کا کنٹرول کچھ عرصہ کے لئے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ پرواز ہموار رہے مگر ہوائی جہاز کو ضد تھی کہ وہ اس طرح چلے گا جس طرح پاکستانی جمہوریت۔ ہوائی جہاز مسلسل جھٹکے کھاتا رہا اور گاہے غوطہ لگاتا۔ غوطہ کے وقت دوسرے کنٹرول پر بیٹھے ہوئے ونگ کمانڈر اسے سنبھال لیتے۔ اس چھوٹے سے ہوائی جہاز میں پرواز کرتے ہوئے مجھے اشتراک اقتدار کے صحیح معنی کا پہلی بار پتہ چلا۔

ایک دن حکومت وقت نے ریٹائرڈ ونگ کمانڈر افضل پر تختہ الٹنے کی سازش میں شامل ہونے کے الزام کی تفتیش شروع کر دی۔ یہ پنجاب سی آئی ڈی کا نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ لے کر سٹیٹ بنک گئے۔ انہوں نے سفر خرچ کے لئے زرمبادلہ دینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے، سرٹیفکیٹ مرکزی حکومت کا ہونا چاہئے۔ وہ یہ سوچ کر بغیر زرمبادلہ تورخم پہنچ گئے کہ روپیہ پیسہ کے ہوتے ہوئے سازش کے تفتیشی مرکز کی نامہربانیوں سے غیر ملک میں بے درہم و دینار زندگی بسر کرنے کی سختیاں کمتر ہوں گی۔ انہیں یہ بھی توقع تھی کہ ان کے ملک سے باہر جانے کی پابندی کے احکامات ہوائی اڈوں پر پہنچ چکے ہوں گے مگر تورخم

کی سرحد تک پہنچنے میں انہیں کم از کم چوبیس گھنٹے لگ جائیں گے۔ ان کے پاس سرحد پار کرنے کے لئے بس ایک دن کے وہ آٹھ گھنٹہ تھے جب چوکی پر سرکاری دفتر کھلے ہوتے ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ سہ پہر تک سرحدی چوکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاسپورٹ دکھایا۔ اس پر مہر لگ گئی۔ نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ دکھایا۔ اس پر بھی مہر لگ گئی۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ سرٹیفکیٹ مرکز کی وزارت داخلہ کا نہیں بلکہ ایک صوبائی محکمہ کا جاری کیا ہوا ہے۔ یہ اپنا سمسونائٹ بیگ اٹھا کر سرحد پار کرنے لگے۔ پھاٹک کی زنجیر کا سرا پکڑ کر چوکی کے صوبیدار نے حکم صادر کیا۔ صاب، آپ نہیں جا سکتا۔ افضل کا سانس جہاں تھا وہیں رک گیا۔ افغانستان کی سرحد اور بغاوت کے ملزم کی رستگاری اس وقت صرف ایک قدم کے فاصلہ پر تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ مصرع پڑھا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند۔

قسمت کی خوبی یہ تھی کہ کمند نہیں ٹوٹی۔ دوسرے ہی سانس میں صوبیدار صاحب نے جملہ پورا کیا۔ صاب، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چائے پیئے بغیر چلا جائے۔ اشارہ پاتے ہی ایک سنتری نے ان کا بیگ گیٹ کے ستون کے ایک طرف رکھ دیا اور یہ خراماں خراماں گارڈ کے دفتر میں چائے پینے کے لئے چلے گئے۔ ونگ کمانڈر افضل کا بیان ہے کہ اس سے اچھی چائے انہوں نے زندگی میں پہلے کبھی پی تھی نہ بعد میں کبھی پی ہے۔ پریشاں خاطر تھے، تازہ دم ہو گئے۔ افضل نے دو سرحدی چوکیاں پار کیں اور ایران پہنچ گئے۔

ایران میں ونگ کمانڈر افضل نجی پرواز کے چھوٹے طیاروں کی ایک کمپنی سے منسلک ہو گئے۔ اثر و رسوخ بڑھا اور وہ ایران کی اہم شخصیات کی خصوصی پروازوں کے پائلٹ بن گئے۔ جب ہویدا نے لیلیٰ سے شادی کی تو یہ ان دونوں کو ہنی مون کے لئے کیسپین کے ساحل پر لے گئے۔ ان دنوں ربیعی فضائیہ کا میجر تھا۔ تنخواہ کم تھی۔ اکثر چھٹیوں میں ونگ کمانڈر افضل کے پاس جز وقتی نوکری کی تلاش میں آیا کرتا تھا۔ ان دنوں کوئی اہم ایرانی شخصیت وطنی ہواباز کا بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے وفادار گروہ سے ہواباز منتخب کرنے شروع کئے۔ غیر ملکی ہواباز فاضل اور فارغ ہوتے چلے گئے۔ ربیعی بھی ترقی کرتے کرتے فضائیہ کے سربراہ بن گئے۔

افضل کہنے لگے، ستھرا آدمی تھا۔ آیت اللہ خمینی کی واپسی کے وقت اس نے ہوائی اڈے کا کنٹرول خود سنبھال لیا تھا تاکہ وہاں کوئی سازش یا شرارت نہ ہو سکے۔ ناحق مارا گیا۔ انقلاب میں بسا اوقات دوست اور دشمن میں تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جنرل ربیعی سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ ہوا کا رخ پہچاننے میں ناکام رہا۔ مجھے دیکھئے، جونہی ہوا ذرا دیر کے لئے رکی میں نے اتنا انتظار بھی نہیں کیا کہ اس کے دوبارہ چلنے اور اس کا رخ دیکھنے تک پاکستان میں ٹھہرا رہوں۔ چند لمحہ میں فیصلہ کیا اور چند گھنٹہ میں اس پر عمل کرتے ہوئے ملک کی سرحدوں سے باہر نکل آیا۔ ہواباز اگر فیصلہ کرنے میں چند لمحے کی دیر کر دے تو وہ اپنا جہاز اور اپنی جان دونوں گنوا دیتا ہے۔

ایک دن ونگ کمانڈر افضل ذرا فلسفیانہ موڈ میں تھے۔ کہنے لگے۔ اگر میں فرار نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہی ناکہ تفتیش کے دوران اذیت سے دوچار ہوتا اور پھر زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال کی جیل ہو جاتی۔ پھانسی پانے کا کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ غالب امکان یہ ہے کہ جو ساتھی بغیر سزا کے چھٹ گئے تھے میں اس گروہ میں شامل ہوتا۔ ہمارے یہاں ملک کا بھلا چاہنے والوں کو سزا ملتی ہے مگر اسے تباہ کرنے والوں میں سے کبھی کسی کو سزا نہیں ملی۔ آپ ملک کی ترقی روک دیجئے۔ قرض کے بوجھ تلے اس کو دفن کر دیجئے۔ غیر ملکیوں کو اس پر مسلط کر دیجئے۔ اس کے دو ٹکڑے کر دیجئے۔ نوے ہزار کو جنگی قیدی بنا دیجئے۔ آپ کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک کمیشن بنے گا جو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی ایک فرد یا ادارہ کسی قومی المیہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جو کچھ ہوا وہ نظریہ ضرورت کے تحت ناگزیر تھا۔

نظریۂ ضرورت کی سب سے بڑی خرابی یہ نہیں کہ اس کی مصلحتوں کے تحت ہر بار غیر قانونی عمل کو قانونی قرار دیا گیا۔ بلکہ یہ ہے کہ اس نظریہ نے ہم کو بے حس اور بے تعلق بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک میں لاچاری اور لاپروائی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر قومی المیہ کو فوراً فراموش کر دینا ایک روایت بن گئی ہے۔ نہ کھلے دل سے جائزہ، نہ کھلے بندوں انکوائری۔ نہ عبرت ہے نہ ذوق۔ نہ سزا، نہ جزا۔ بس طاق نسیاں اور سرد خانہ۔ اس رویے کا فائدہ صرف مجرموں کو پہنچتا ہے۔ اور ایسے بدکردار لوگ جنہیں موت کی سزا ملنی چاہیئے، مملکت خداداد میں لوگوں کے حکمران اور خدا کے نائب بن بیٹھتے ہیں۔ ان سے کون

حساب لے گا۔ خدا، عوام یا دونوں۔ اور کب لے گا۔ آج، کل یا پرسوں۔ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات۔

(2)

انقلاب ابھی دو ہفتہ کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمیں مسلح افراد کی ایک کارروائی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رات کا کھانا کھائے ہوئے دو گھنٹہ ہو چکے تھے۔ بجلی تھوڑی دیر کے بعد پھر لوٹ کے جانے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ گھر کے تین کمروں میں چار افراد اپنے اپنے پلنگ کے ساتھ رکھے ہوئے ٹیبل لمپ جلا کر ورق گردانی قبل از خواب میں مصروف تھے۔ نیند کی جھپکی زیرِ مطالعہ کتابوں اور رسالوں میں کہیں دو چار صفحہ آگے کمیں گاہ میں چھپی حملہ کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ یکایک گھر کے تین اطراف سے کسی نے حملہ کر دیا۔ گولیاں چلنے لگیں۔ آواز سے پتہ چلتا تھا کہ حملہ آور بہت نزدیک آگئے ہیں۔ سلمان اور عالیہ دوڑ کر ہمارے کمرے میں آئے۔ سلمان نے چاہا کہ بالکنی میں کھڑا ہو کر باہر دیکھے مگر میں نے منع کر دیا۔ پہلے جلدی سے پھاٹک کی بتیوں کو بند کیا۔ پچھواڑے جو ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا اس کو بھی بند کیا۔ اس کے بعد ٹیبل لیمپ گل کر دیئے۔ جب گھر میں مکمل اندھیرا ہو گیا تو ہم نے دیوار اور پردہ کی آڑ سے باہر جھانکا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ ہر ایک نے بتیاں بند کر دی تھیں اور سارے علاقے میں اندھیرا تھا۔ یکایک حملہ آوروں نے روشنی کے گولے پھینکنے شروع کئے۔ اس روشنی میں عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ جنگ کی ڈاکومنٹری فلموں میں جس طرح سپاہی جھک کر بچتے بچاتے آگے بڑھتے ہیں اس طرح حملہ آور ہمارے گھر کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ معلوم نہیں یہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں جارہے ہیں۔ ہمارے گھر پر حملہ کے لئے اتنے اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ دن میں کسی وقت گھنٹی بجاتے اور کہتے کہ ہم آگئے ہیں۔ کیا یہ مسز فروغی کے گھر کا محاصرہ کر رہے ہیں۔ تنہا ایک عورت کو گرفتار کرنے کے لئے آتشیں گولے تو درکار نہیں ہوتے۔ اسی ادھیڑبن میں ہم سب زینہ میں چھت کے پاس جمع ہو گئے۔ اگر کوئی حملہ آور گھر میں گھس آیا تو ہم چھت سے ہوتے

ہوئے ہمسایہ کے گھر کود جائیں گے۔

میں چھت پر رینگتا ہوا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے جنگ کا نقشہ بڑا واضح تھا۔ حملہ آور ہمارے گھر کی دو دیواروں کی اوٹ سے آگے کی جانب گولیاں چلا رہے تھے۔ روشنی کے گولے سے جب سامنے والی سڑک اور پچھلی گلی خالی نظر آتی تو وہ دوڑ کر آگے بڑھ جاتے۔ دوبارہ گولیاں چلاتے، روشنی کرتے، موقع دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ پانچ دس منٹ کی شدید فائرنگ کے بعد حملہ آور جو پیچھے کہیں سے آئے تھے ہمارے گھر سے آگے نکل گئے۔

ہم لوگ اندھیرے میں راستہ ٹٹول کر پہلی منزل کے ہال کمرے میں پہنچے۔ ٹی وی چلایا اور صوفہ کرسیوں میں اسی طرح دھنس کر بیٹھ گئے جیسے وہ کوئی پناہ گاہ ہو۔ ٹی وی سکرین پر اناؤنسر کی شکل نظر آئی۔ پریشان اور بوکھلایا ہوا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے صاف نظر آرہے تھے۔ دائیں بائیں دیکھتا تھا جہاں سے اسے اشارے ہو رہے تھے۔ دو مرتبہ ایک ہاتھ آگے بڑھا اور میز پر کاغذ رکھ گیا۔ اناؤنسر نے ایک کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت دل ہی دل میں پڑھی اور کاغذ دینے والے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ دوسرے کاغذ کو دو ایک بار پڑھا اور پھر سر اٹھا کر کیمرہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ برادران اور خواہران۔ ٹی وی اسٹیشن پر ضد انقلاب نے حملہ کر دیا ہے۔ کچھ لوگ ٹی۔وی عمارت کے باہر محافظ دستوں سے لڑ رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ فوراً گھروں سے نکل آئیں اور ہماری مدد کے لئے پہنچ جائیں۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ جو حملہ آور ہمارے گھر کے پاس سے ابھی ابھی گزرے تھے وہ ٹی۔وی اسٹیشن پر حملہ کرنے والے گروہ کا ایک دستہ تھا۔

ذرا سی دیر میں مدد کے لئے پکارنے والوں کی خاطر ہزاروں افراد گھروں سے باہر نکل آئے۔ پاسداران کے لئے بھی کمک آن پہنچی۔ حملہ آور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گلیوں میں گم ہو گئے۔ وہی اناؤنسر جو آدھ گھنٹہ پہلے ہکلا ہکلا کر اعلان کر رہا تھا چہک کر بولا۔ حملہ پسپا ہو گیا ہے۔ مزید کمک کی ضرورت نہیں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔ ہم شکریہ وصول کرنے کے بعد بستروں میں گھس گئے جو ہماری غیر حاضری میں ٹھنڈے برف ہو چکے تھے۔ تین بجے رات پھر گولیاں چلنی شروع ہوئیں۔ اور وہ بھی بہت قریب سے۔ ہم نے گولیوں کی اس بوچھاڑ کو اس لائق نہ سمجھا کہ اس کی خاطر گرم بستر چھوڑ کر کہیں زینہ میں

جا چھپتے۔

خود رو بندوق بردار ٹولیاں اس خلا کو پر کر رہی ہیں جو فوج کے منظر سے ہٹ جانے اور پولیس کے انقلاب کی ہوا میں تحلیل ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ ہفتوں ان خود ساختہ انقلابی حکمرانوں نے اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ آپس میں ایک طرح کا سمجھوتہ ہو گیا کہ جو گروہ بڑا یا زیادہ اسلحہ رکھتا ہو گا اس کے موقع پر آتے ہی چھوٹا گروہ وہاں سے چمپت ہو جائے گا۔ بعض علاقے صبح ایک غول کے اختیار میں ہوتے اور شام کو کسی اور کے۔ یہ وقتی اور غیر رسمی گروہ ہیں۔ نظم و ضبط ڈھیلا ڈھالا ہے۔ لیکن بعض گروہ منظم ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ تنظیم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ عہدہ دار، ممبر، مقاصد، ہدف، تقسیم اختیارات۔ ایسے گروہوں نے اپنے دفتر کھول لئے ہیں۔ کسی بڑی سی عمارت یا احاطہ پر قبضہ کر لیا۔ خار دار تاروں سے راستے بند کر دیئے۔ دروازہ پر ریت کی بوریوں سے مورچے بنا لئے۔ چھت پر نقاب پوش رائفلیں لئے کھڑے ہو گئے۔ بس دفتر مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ رسد، رقم اور اسلحہ جمع کرو۔ کچھ موٹریں اور وین ضبط کرو۔ رضا کاروں کی بھرتی اور ٹریننگ کا انتظام کرو۔ کچھ لوگوں کو یرغمال بنا لو اور کچھ لوگوں کو گرفتار کرو اور سزا سنا دو۔

ہمارے دفتر کا ایک ڈرائیور جو مزاج کے اعتبار سے خود سر ہے۔ وہ بھی کسی ایسے گروہ کا رکن ہو گیا ہے۔ جے تھری ساخت کی ایک رائفل اور اس کے ساتھ بہت سے اختیارات مل گئے ہیں۔ سنا ہے ان اختیارات کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہوئے اس نے ایک قیمتی فلیٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ دفتر سے وہ پہلے ہی بغیر اجازت اور اطلاع غائب ہو جانے کا عادی تھا۔ اب بڑے دھڑلے کے ساتھ یہ کہہ کر چلا جاتا ہے کہ اپنے علاقہ کے معائنہ پر جا رہا ہوں۔ ایک عرصہ تک وہ اس نئی طاقت کے نشہ میں رہا۔ پھر ایک دن اس سے اسلحہ واپس لے لیا گیا۔ وہ اس کے بعد بڑی ناطاقتی اور ناراحتی کا شکار ہو گیا۔ پھر ایک اور دن ایسا چڑھا کہ اسے علاقہ کی انقلابی فورس سے نکال دیا گیا۔ کس منہ سے دفتر آتا چھٹی چلا گیا۔ اس کے بعد اسے فلیٹ سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس نے مزید چھٹی کی درخواست بھیج دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہر شہر، قریہ قریہ، محلّہ محلّہ کمیٹہ بن گیا۔ اوہ اتنے بن گئے اور اس

طرح کے بن گئے کہ شمار اور اختیار سے باہر ہو گئے۔ وزیر اعظم بازر گان نے تنگ آکر کہا کہ ان کی صحیح تعداد کا علم کسی کو بھی نہیں۔ نہ حکومت کو، نہ انقلابیوں کو۔ نہ وزیر اعظم کو، نہ امام کو۔ انقلاب اس ابتدائی دور سے گزر رہا ہے جس میں اس کے نام پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے مراکز وجود میں آجاتے ہیں اور مقامی طور پر بڑے بڑے فیصلے کرتے رہتے ہیں۔ نظم و ضبط غائب۔ رابطہ اور ضابطہ غیر ضروری۔ صرف تہران شہر میں تقریباً ڈیڑھ ہزار انقلابی کمیتہ کام کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی ڈیڑھ ہزار مساجد۔ معاملات الجھے ہوئے ہیں۔ الجھاوا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

کمیتہ کی تطہیر شروع ہوئی۔ یہ تطہیر کا لفظ پاکستان میں پہلی بار 1958ء کے مارشل لا کے بعد سننے میں آیا تھا۔ چند ہی دن میں اخبار اس بوجھل ترکیب کے استعمال سے تھک گئے اور بے دھڑک سکریننگ کی انگریزی اصطلاح کو اردو میں شامل کر لیا۔ انقلاب اور کُودِتا کے ادا شناس اور زبان انگریزی کے مزاج شناس کہتے ہیں کہ اس عمل کا اصل نام Screening نہیں بلکہ Purge ہے۔ ایران میں اس عمل کو پاک سازی کہتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں اسلحہ ہو ان کی پاک سازی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بار بار جھگڑا ہوا۔ گاہے بات بڑھ گئی۔ گولیاں چلیں۔ آدمی مرے۔

انقلابی پاک ساز اپنے پاؤں جماتے چلے گئے۔ دوسروں کو نکالتے اور اپنے آدمیوں کو بھرتی کرتے رہے۔ تقریباً پینتالیس ہزار افراد اس پاک سازی میں نکالے گئے۔ اس کے بعد ایک دن کمیتہ کی جگہ ایک نیم فوجی ادارے کو دے دی گئی اور اس کا نام پاسداران انقلاب رکھ دیا۔ کمیتہ ہو یا پاسداران، ان میں شامل ہونے کے لئے نوجوان ہونا شرط ہے۔ صحت مند اور مہم پسند، بے فکر اور نڈر۔ نہ جان لینے میں تامل، نہ جان دینے کا خوف۔ جنگ کی طرح انقلاب بھی نوجوانوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔ جب اسے بھوک لگتی ہے تو چڑھتی جوانیوں کو نگل جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایرانی انقلاب نے روزہ تو نہیں رکھا ہوا۔

(3)

انقلاب کی عمر تین ماہ ہے۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں۔ دل کی بات آخر کب تک دل میں رہتی۔ بالآخر وہ زبان پر آ ہی گئی۔ مگر اسے اس مختصر سفر میں کوئی دس بارہ ہفتے لگ گئے۔ پہلے تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ واقعات کی رفتار بہت تیز تھی۔ بات سمجھ میں آئی تو خوف نے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ کوئی دو ڈھائی ماہ اس گومگو کی حالت میں گزر گئے۔ اس کے بعد لوگوں میں اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ موقع محل دیکھ کر گرفتاریوں، مقدموں اور سزاؤں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ عام تاثر یہ ہے کہ گرفتاریاں درست ہیں۔ سزائیں کچھ درست اور کچھ ضرورت سے زیادہ سخت ہیں۔ البتہ عدالت کے طریق کار کی تعریف کرنے والا کوئی بھی نہیں ملتا۔ ایک ایرانی دوست کہنے لگے۔ آج ہم جس سرعت کے ساتھ انصاف فراہم کر رہیں ہیں اگر اس کی نصف رفتار سے ہم اپنے دوسرے کام سرانجام دیتے تو ایران کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ایک دوسرے ایرانی دوست نے گرہ لگائی۔ ہم نے انصاف کو لوگوں کی دہلیز تک پہنچا دیا ہے۔ گھر سے پکڑ کر لے آتے ہیں اور مدرسہ میں لے جا کر انصاف کا درس دیتے۔ یہ دن بھر کا مختصر کورس ہے۔ عنوان درس عبرت ہے۔ آج کل کام بڑی تیزی سے انجام پاتا ہے۔ اس کے تین مراحل ہوتے ہیں دستگیر شد (پکڑے گئے)، محکوم شد (سزا ہوئی)، تیرباراں شد (گولی مار دی گئی)۔ ایک پاکستانی نے کہا۔ میرا خیال ہے انصاف کی فراہمی کے صرف دو مرحلے ہیں۔ فرار نشد (بھاگ نہ سکے)، تمام شد (کام تمام ہو گیا)۔

برگ انبوہ جشنے دارد۔ آج کل یہاں ایک بہت بڑا جشن بپا ہے۔ کل رات اس جشن کی رونق بڑھانے کے لئے جو لوگ راہی ملک عدم ہوئے ان میں کئی مشہور و معروف اشخاص شامل تھے۔ ساواک کے پرانے سربراہ اور پاکستان میں ایران کے سفیر جنرل پاکرواں، ساواک کے آخری سربراہ جنرل ناصر مقدم، نامور وزیر خارجہ خلعت بری، شاہی گارڈ جاویداں کے کماندار جنرل علی نشاط، فدائین کو سزائیں دینے والی فوجی عدالت کے جج جنرل نقی مجیدی، وزیر زراعت منصور روحانی، تہران کے لارڈ میئر نک پئی۔ سپیکر عبداللہ ریاضی اور ایران سپورٹس کے جنرل حجت کاشانی۔ بیرونی نامہ نگار ان بڑے آدمیوں کی

تعداد گننے میں مصروف ہیں جنہیں سزائے موت دی جا چکی ہے۔ ناشتہ کی میز پر ایک دوسرے سے تازہ ترین سکور پوچھتے ہیں۔ آج شور مچ گیا کہ سنچری مکمل ہو گئی ہے۔

نامہ نگاروں اور سفارت کاروں کو اس بیان پر بڑی حیرت ہے جو خلعت بری نے عدالت میں دیا تھا۔ خلعت بری کو لوگ ایک سنجیدہ اور باوقار سفارت کار کے طور پر جانتے ہیں۔ اگر اس کا بیان رضاکارانہ ہے تو موصوف بہت بڑے منافق تھے۔ اس نے عدالت کو بتایا کہ شہنشاہ محمد رضا شاہ نے اپنے کئی زیر حراست مخالفین کو بدست خود قتل کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شہنشاہ کو اپنی ذات، اپنے تخت اور امریکی مفادات کے تحفظ کے علاوہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ سپہبد حجت سے جب عدالت نے سوال کیا کہ جس شخص کو اب پدر سوختہ کہتے ہو اس کو پہچاننے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ جواب خاموشی۔ سزا موت۔

شروع کے چند مہینوں میں جن لوگوں کو سزا ہوئی تھی ان میں منوچہر آزمون کا مقدمہ سب سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوا۔ یہ ایرانی مجلس کے ڈپٹی یعنی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ ان کی ایک پرانی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ ان دنوں وہ گورنر جنرل ہوا کرتے تھے۔ یہ منصب پاکستان میں کمشنر کے عہدہ کے برابر ہے۔ کمشنر منوچہر صاحب ایک بار دیہات کا دورہ کرتے ہوئے کسی ایسی جگہ پہنچے جہاں نشیب میں تھوڑا سا پانی کھڑا تھا۔ کیچڑ سے جوتے اور گدلے پانی کی چھینٹوں سے اپنے کپڑے بچانے کے لئے جناب گورنر جنرل صاحب ایک شخص کی پشت پر سوار ہو گئے۔ تصویر میں دوسرے تمام آدمی ٹخنوں سے بھی نیچے رہ جانے والے پایاب پانی میں پیدل چل رہے ہیں مگر منوچہر آزموں ایک غریب آدمی پر سوار ہیں جیسے وہ بار برداری کا جانور ہو یا ناز برداری کے لئے غلام۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا، پائے نازنیں کو کیچڑ سے بچانے کے لئے دوسروں پر سوار کرنے والا شخص۔ مقدمہ چلا اور کیچڑ کی چھینٹوں سے بچنے والا خون کی چھینٹوں سے تر ہو گیا۔ جب عوام اپنی گردن پر سوار ہونے والوں کو نیچے پٹک دیں تو اس عمل کو انقلاب کہتے ہیں۔ جب مفاد پرست عوام کی گردن پر سوار ہوں اور نیچے اترنے سے انکار کریں تو اس کیفیت کو زمینداری، جاگیرداری، سرداری اور تمن داری کہتے ہیں۔

ایک وزیر نے داد گاہ انقلاب کے فیصلوں کی حمایت کرتے ہوئے تاریخ کے پس منظر میں ان کی صفائی پیش کی۔ اس نے کہا، اعتراض کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں

کہ پچھلے ایک سال میں جنایت کار شہنشاہ اور مارشل لا کے تباہ کار حکام نے پچاس ہزار آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ اور لوگ اس بات پر کیوں غور نہیں کرتے کہ جہاں ہم نے گنتی کے چند آدمیوں کو سزا دی ہے وہاں انقلاب فرانس میں اس قدر سختی کی گئی تھی کہ تاریخ میں ستمبر 1793ء سے جولائی 1794ء کے دس ماہ کی مدت کو The Reign of Terror (عہد خوف و دہشت اور ایام خونیں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بیان کے بعد لوگوں نے تاریخ کی کتابوں سے بہت سی بھولی بسری باتوں کے حوالے نقل کرنے شروع کر دیئے۔

فرانس کے ایام خونیں کی بات ہے۔ ایک انقلابی نے جس کا نام یاں بپتستے کیریر تھا اپنے علاقہ کی عدالت کے سربراہ کو نوٹس دیا کہ آپ خواہ مخواہ اتنے بہت سے مقدموں میں الجھے ہوئے اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگر ایک گھنٹہ تک آپ نے ان سینکڑوں قیدیوں کے مقدمات مکمل کر کے ان کو سزا نہ سنائی تو میں آپ کو اور آپ کے عملہ کو گولی سے اڑا دوں گا۔ کیریر نے پندرہ سو قیدیوں کو کشتیوں میں بھرا اور دریا میں ڈبو دیا۔ ملزم دریا برد۔ مقدمہ خارج۔ عدالت برخاست۔ یہ قول بھی اسی انقلابی کا ہے کہ ہم فرانس کو ایک قبرستان بنا دیں گے مگر یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اس ملک کی تعمیر نو ہمارے بجائے کسی اور کے منصوبہ کے مطابق ہو۔

انقلاب بڑا خودسر ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ لینن نے روس کے زار شاہی دور کے نفاست پسند امرا اور ناچ گھر کے اصولوں کے پابند رؤسا پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ انقلاب کسی ایسی کارروائی کا نام نہیں جو پالش کئے ہوئے چمکتے دمکتے فرش پر ہاتھوں میں خوش نما دستانے پہن کر انجام دی جائے۔

انقلابِ فرانس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایام خونیں کے دوران ملک میں تقریباً اکیس ہزار افراد مارے گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد چالیس ہزار ہے۔ گرفتار ہونے والوں کی تعداد تقریباً تین لاکھ تھی۔ انقلاب ایران کے بارے میں ایک محتاط اندازہ یہ ہے کہ پہلے تین ماہ میں پچپن ہزار افراد گرفتار ہو کر مختلف عدالتوں میں انقلاب کے دشمنوں کی حیثیت سے پیش کئے گئے۔ بہت سے مقدمات خفیہ تھے۔ کسی کو فیصلہ اور سزا کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جن کے بارے میں پتہ چلا کہ انہیں گولی مار دی گئی ہے ان کی تعداد

ساڑھے تین سو بیان کی جاتی ہے۔

مغرور اور مفرور شہنشاہ بیان دیتا ہے۔ اے اہل وطن، آپ کو یاد ہو گا۔ میں نے آپ کو باخبر کیا تھا کہ میرے مخالفین آپ کو وحشت بزرگ کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ ایک انقلابی ایرانی دوست کہنے لگے، رسی جل گئی مگر بادشاہت کا بل نہیں گیا۔ یہ جس تمدن بزرگ کی بات کرتا ہے وہ کیا تھا۔ جشن دو ہزار پنج صد سالہ، جزیرہ کیش کی عیش گاہ، شہزادی اشرف کے سکینڈل، اسلحہ کے انبار اور انکل سام کی ماتحتی۔ اس شخص کو یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت ہے۔ یہ شخص تیل کی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور بربادی کا واحد ذمہ دار ہے۔ اس شخص نے اپنی روح، اپنا تخت اور اپنا ملک شیطان کے پاس گروی رکھ دیا تھا۔ شیطان بھی کوئی چھوٹا یا درمیانہ نہیں بلکہ سپر پاور شیطان یعنی شیطان بزرگ۔ اسے اندازہ ہی نہیں کہ اس نے لوگوں کو کچھ بھی نہیں دیا۔ وہ کارخانے جن کا دھواں ایران میں رہ جائے اور منافع باہر چلا جائے اور وہ تیل کے کنوئیں جو دوسروں کے تجربہ اور اہلیت کا نتیجہ ہوں ان سے آپ حال کی رونقیں خرید سکتے ہیں مگر مستقبل کو محفوظ نہیں کر سکتے۔ یہ شخص کس منہ سے تمدن بزرگ کی بات کر رہا ہے۔ کیا اس نے شیکسپیئر نہیں پڑھا جو اس کی داستان کو دو سطروں میں یوں بیان کرتا ہے۔

His Promises were, as he then was, mighty;

But his performance, as he is now, nothing.

وزیرے چنیں شہریارے چناں۔ جیسا بادشاہ ویسے اس کے وزیر۔ ایک سے بڑھ کر ایک خود غرض اور بے خبر۔ جن دنوں سابقہ وزیراعظم اور وزیر، فوج کے پنشن یافتہ اور حاضر جنرل. اعلیٰ افسر، بنک کار اور مجلس قانون ساز کے اراکین سینکڑوں کی تعداد میں گرفتار اور درجنوں کے حساب سے پھانسی پر چڑھ رہے تھے، انہی دنوں ایک سابق وزیر نے امریکہ سے دستی خط بھیج کر پوچھا کہ میری پنشن کا کیا بنا۔ کاغذات مکمل تھے۔ منظوری کے لئے بس ایک آدھ دستخط درکار تھا۔ آخر اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ جس رشتہ دار کو خط بھیجا ہے وہ سخت ناراض ہے کہتا ہے بے خبری اور حماقت کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ اس کا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور اسے پنشن کی فکر پڑی ہے۔ یہ لوگ انقلاب کو عارضی مذاق سمجھ رہے ہیں۔ چلئے آپ نے فرانس اور روس کے انقلابات کی تفصیل

نہیں پڑھی تونہ سہی۔ مگر آپ اپنے ملک کی موجودہ صورت حال سے اتنے ناواقف کیسے ہو سکتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس خط کے جواب میں یہ لکھ دوں کہ پنشن کے کاغذات مکمل ہیں۔ انقلابی حکومت کا متعلقہ اہل کار کہتا ہے کہ آپ جس دن، چاہیں دفتری اوقات میں خود آکر وصول کرلیں۔ یہ بات طے ہے کہ جس دن، وہ اپنی پنشن کے کاغذات لینے کے لئے مہر آباد کے ہوائی اڈاہ پر اترے وہ ان کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ پنشن کے کاغذات کی تکمیل کے لئے دستخط کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ سرورق پر صرف یہ لکھ کر مثل داخل دفتر کر دی جائے گی۔ کام تمام شد۔

(4)

افراتفری کے دنوں میں اخبارات پر ہر طرف سے دباؤ پڑا۔ انقلاب، حکومت، فوج، مسلح گروہ، پرانے تعلق دار۔ وہ کس کس کو خوش کرتے۔ جو خبر بھی لگاتے اس کی زد میں آنے والے چند رائفل بردار ہمراہ لے کر دفتر پہنچ جاتے اور پوچھتے کہ خبر کیوں لگائی ہے۔ کسی واردات کی تصویر چھاپتے ہیں تو کمیتہ والے پہنچ جاتے ہیں اور اصرار کرتے کہ تردید چھاپو۔ ایک روز آٹھ دس صفحات والے روزنامہ آیندگان نے صرف چار صفحہ کا ایڈیشن شائع کیا۔ ایک صفہ پر اداریہ اور باقی تین سادہ اور خالی۔ اداریہ میں لکھا تھا کہ اخبار کا کام خبر پہنچانا ہے۔ جو لوگ خبر اور پراپیگنڈا میں فرق نہیں کرتے وہ ہمارے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان حالات میں اخبارات کیسے چل سکتے ہیں۔

بائیں بازو کے طلبا نے ”سنگر“ (مورچہ) نام کا رسالہ نکالا۔ پہلے شمارہ میں لکھا کہ ہم نے قابلِ نفرت پہلوی رژیم کو نابود کر دیا۔ امریکی امپیریلزم کو متزلزل کر دیا۔ مگر انقلاب کے وارث ایک غیر منصفانہ نظام کی تائید اور تقلید کر رہے ہیں۔ جس نظام کو جڑ سے اکھاڑنا تھا اس پر آنچ تک نہ آنے دی۔ یہ کیسا انقلاب ہے۔ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر۔ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ اس اشاعت کے بعد سنگر دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایک رسالہ ”بنگر“ (دیکھو) کے نام سے نکلا مگر صرف دو بار۔ اعلان ہوا کہ

"چلنگر" (قفل ساز) کے نام سے اخبار نکالا جائے گا مگر اعلان پر عمل نہ ہو سکا۔ ایک اخبار "کارگر" کے نام سے چھپا۔ اس کے بیچنے والوں کو کمیٹہ پکڑ کر لے گیا۔ نئے اخباروں کے ساتھ آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ پرانے اخبار کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی کھیلنے ہی نہیں دیتا۔ مسلح گروہ آدھی رات کو اخبار کے دفتر میں گھس آتے ہیں۔ توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ زد و کوب کرتے ہیں۔ پھر چلے جاتے ہیں۔ ہمیں ناراضگی کی وجہ بھی نہیں بتاتے۔ جس دن اخبارات کو ناراضگی کی اصل وجہ پتہ چلی اس دن سینتیس اخبار اور رسالے بند ہو گئے۔

میں نے ایک ملاقات میں اس واقعہ کا ذکر صدر جنرل ضیاء الحق سے کیا۔ کہنے لگے۔ اخبار بند کرنا تو الگ رہا میں پریس ٹرسٹ کے کسی کام چور، خائن اور بد عنوان ملازم کے خلاف ایکشن لینا چاہوں تو شور مچ جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر، ڈکٹیٹر۔ پھر یکدم رک گئے جیسے کوئی بات زبان پر آتے آتے رہ جائے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کا جملہ مکمل کرنا چاہا۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ ڈکٹیٹر کون ہوتا ہے۔ جس دن کوئی ڈکٹیٹر آگیا، اس دن ...... میں نے بھی جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ تاریخ چاہے گی تو اسے مکمل کر دے گی۔

تہران کے ایک انگریزی اخبار میں ٹاؤن ٹاک کے نام سے ایک کالم چھپتا تھا۔ کسی زمانہ میں یہ کالم دولتمند شہریوں اور سفارت کاروں کی دعوتوں میں شامل ہونے والوں کی خاکہ کشی کے لئے مشہور تھا۔ ایک دن یہ کالم ہی نہیں بلکہ وہ سالم انگریزی اخبار ہی بند ہو گیا جس میں یہ کالم چھپا کرتا تھا۔ بند ہونے سے پہلے اس کے کالم چاروں طرف پھیلی ہوئی افراتفری کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ ایک کالم کا تراشا میرے پاس محفوظ ہے۔ لکھا ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد گھر سے نکلنا دشوار ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہو گیا ہے۔ کوئی اسلحہ بردار گروہ آپ کو روک سکتا ہے۔ جو حکم چاہے صادر کر سکتا ہے۔ کچھ مسلح گروہ شہر کے مختلف علاقوں میں ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اغوا کرنے میں مصروف ہیں۔ اسلحہ چار طرح کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ انقلابی، اشتراکی، شوقین مزاج اور جرائم پیشہ۔ اس میں سے صرف ایک گروہ اسلحہ واپس کرے گا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ تہران ایک عرصہ تک غیر محفوظ رہے گا۔

ایران ایک عرصہ سے بہت غیر محفوظ ہے۔ زندوں اور مردوں کے لئے، مقبروں اور مجسّموں کے لئے، عکسی اور روغنی تصویروں کے لئے۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ شہنشاہ

اور اس کے زن و فرزند کی تصویروں کی تعداد ان گنت تھی۔ بڑی رنگین تصویریں ہر جگہ نظر آتی تھیں۔ گھر، دفتر، دکان۔ گھروں کا یہ عالم تھا کہ وفاداری کے عکسی ثبوت کے طور پر شاہ کی تصویر جا بجا سجائی ہوتی تھی۔ دیوان خانہ، انتظار گاہ، دالان اور ڈیوڑھی۔ ایسے عقیدت مند بھی کم نہ تھے جنہوں نے شاہ کی تصویر اپنی خواب گاہ میں تختِ خواب کے سرہانہ لگائی ہوئی تھی۔ بادشاہ سے کس بات کا پردہ۔ اور اچھا بادشاہ تو وہ ہوتا ہے جو رعایا کے ہر معاملہ پر نظر رکھے۔

جب میں تہران پہنچا تو معلوم ہوا کہ تہران یونیورسٹی وہ واحد ادارہ ہے جہاں شہنشاہ کی ایک بھی تصویر موجود نہیں۔ شاہ نے بھی اصرار نہیں کیا۔ مہنگا سودا تھا۔ ہر تصویر پر چوبیس گھنٹہ پہرہ کون لگائے۔ وگرنہ ہر دوسرے تیسرے دن تصویر کون تبدیل کرے۔ بادشاہ وقت اپنی ان تصویروں کے انبار کا کیا کرتا جن پر کالک لگائی جاتی یا مرگ بر شاہ کا نعرہ لکھا جاتا یا چاقو مار کر پھاڑا جاتا۔ وہ بات جو مجاز لکھنوی نے مجازی طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا کے بارے میں کہی تھی وہ آج کل تہران یونیورسٹی کے طلبا پر صادق آتی ہے۔

یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں۔

بادِ مخالف کے پہلے جھونکے کے ساتھ سب نے شاہ کی تصویریں اتار دیں۔ آندھی چلنی شروع ہوئی تو ان نیم مجسّموں کی باری آگئی جو سرکاری، نیم سرکاری اور نجی عمارتوں کے استقبالیہ ہال میں نصب تھے۔ ان میں ٹھوس سونے کا وہ نیم تنہ مجسمہ بھی شامل تھا جو ایک دولت مند بہائی نے اپنے کمرۂ ملاقات میں سجایا ہوا تھا۔ مرگ بر شاہ کا نعرہ سنتے ہی اس نے مجسمہ کو بھٹی میں ڈال دیا۔ شہنشاہیت پگھل گئی۔ جو بھٹی سے نکلا وہ کندن تھا۔

جھکڑ چلا۔ طوفان آیا۔ معاملہ گلی کوچوں تک پہنچا۔ لوگ ان مجسّموں کو گرانے کے لئے نکل آئے جو شہر شہر اور جگہ جگہ نصب تھے۔ ہر چوک، ہر باغ اور ہر بڑی سرکاری عمارت کے باہر یہ مجسّمے موجود تھے۔ کچھ رضا خاں کے اور بہت سے رضا شاہ کے۔ کچھ پیادہ اور استادہ، بیشتر گھڑ سوار کی صورت میں۔ لوگوں کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ مجسمہ کو چوک سے ہٹانا کتنا مشکل اور کتنی مہارت کا کام ہے۔ مجسمہ ساز کو علم تھا کہ ان مجسّموں کو کبوتروں اور موسموں کے علاوہ اصل خطرہ انقلابیوں اور تخریب کاروں سے ہے۔ انہوں نے تعمیر میں وہ پختگی دکھائی کہ مجسّموں کو توڑنے، گرانے اور ہٹانے کا کام بہت مشکل ہو گیا۔ شوقیہ سیاسی

مخالف جب کدالوں۔ ہتھوڑوں، زنجیروں اور ڈنڈوں سے ان مجسّموں کا کچھ نہ بگاڑ سکے تو بت کے چہرہ پر سیاہی ملی۔ گلے میں پھٹے پرانے جوتوں کا ہار ڈالا اور تھک ہار کر گھر چلے گئے۔ دو چار جگہ دھماکہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ سنگ خارا کا پایہ ستون اور تانبہ کا گھڑ سوار کتنا مضبوط ہوتا ہے۔ اور وہ جوڑ جو سیسہ پگھلا کر بٹھایا جائے اسے ہلانے کے لئے اتنے زور کا دھماکہ درکار ہے کہ پہلے آس پاس کے فلیٹ ڈھے جائیں گے تب کہیں یہ شہسوار گھوڑے سے نیچے اترے گا۔ مظاہرین بے بس ہو گئے۔ ماہرین بلائے گئے۔ بھاری بھرکم بلڈوزر آئے۔ اونچی اونچی کرین مشینیں موقع پر آ پہنچیں۔ خار دار تار لگا کر مجسّموں کے آس پاس کے علاقہ کو خطرناک قرار دیا۔ کئی دن لگے تب جا کر یہ مہم مجسمہ بہ مجسمہ سرکی گئی۔

ایک مجسّمہ ایسا نکلا جسے سرنگوں کرنے میں دنوں کے بجائے ہفتوں کی محنت صرف ہوئی۔ میں نے اس بت شکنی کے مختلف مراحل غور سے دیکھے۔ ہربار مجھے مسلم یونیورسٹی رائڈنگ اسکول کے ماسٹر بے اختیار یاد آئے۔ خاکی پگڑی، مہندی رنگے پٹے، گھنی خضابی موچھیں اور ان کی موم خوردہ نوکدار شاخیں۔ جہلم کے پنشنر دفعدار گھڑ سواری سکھاتے ہوئے جس نوجوان طالب علم سے خوش ہوتے اس سے کہا کرتے۔ ایک ایسی راز کی بات بتاؤں گا کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو شہسوار بن جاؤ گے۔ ایک دن مجھ پر مہربان ہوئے اور شہسواری کا سینہ بسینہ راز مجھے منتقل ہو گیا۔ ان کا فرمانا تھا کہ جب سوار کی پیٹھ اور گھوڑے کی پشت اس طرح یک جان ہو جائیں کہ سوار گھوڑے کے جسم کا حصہ بن جائے تو یہ کمال شہسواری کی انتہا ہوتی ہے۔ کمال حاصل کرنے کے لئے گھوڑے کی ننگی پشت پر زین اور رکاب کے بغیر سواری کی مشق کرنی چاہئے۔ رضا خاں نے نہ جانے ننگی پشت پر کتنی سواری کی تھی کہ دو ہفتہ تک چوک میں نصب گھوڑا گرانہ سوار۔ تیسرے ہفتہ جب ماہرین شکست و ریخت اس مجسّمے کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بادشاہ کے کولھوں کا ایک ٹکڑا گھوڑے کی پشت کے ایک ٹکڑے سے پھر بھی جدا نہ ہوا۔ شہسواری ہو تو ایسی ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ن م راشد دلی ریڈیو سے چھٹی لے کر وار پبلسٹی کے محکمہ میں شامل ہو گئے۔ وردی پہنی اور ایک اجنبی کی حیثیت سے تہران جا پہنچے۔ رضا شاہی دور کے مجسّمے دیکھے اور بہت متاثر ہوئے۔ ایک دن ایک مجسمہ کے پیل پایہ کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر رضا خاں سے یوں مخاطب ہوئے۔ نظم کا یہ بند جناب والا کی توجہ چاہتا ہے۔

عرض کیا ہے۔

سنا ہے کہ اس انتہائی عقیدت کی خاطر
جو بخشی گئی تھی تجھے اپنی ذات گرامی سے
تو نے یہ بت
اپنی فرمانروائی میں
یورپ کے مشہور ہیکل تراشوں سے بنوا کے
اسی چوک میں نصب کروا دیا تھا!
اسی سے ہویدا ہے یہ بھی
کہ ملت کی احساں شناسی پہ کتنا بھروسہ تھا تجھ کو

ایک دن میں چوک میں ان گول سیڑھیوں پر بیٹھ گیا جن کے وسط میں چند روز پہلے ایک پختہ بنیاد ستون اور اس کے اوپر ایک گھڑ سوار کا مجسمہ ہوا کرتا تھا۔ وہاں اب ستون ہے نہ سوار۔ بس ایک کھنڈر ہے اور وہ بھی فقط چند دن کے لئے اس کے بعد یہ جگہ یوں صاف اور ہموار کر دی جائے گی جیسے گھاس یہاں ہمیشہ اگتی رہی ہے۔ شاید یہ وہی سیڑھیاں ہیں جن پر کھڑے ہو کر آزاد شاعری کی سب سے مستند آواز نے ایران کے بادشاہ سے اردو میں خطاب کیا تھا۔ میں ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر آسکر وائلڈ کی وہ مختصر اور دل گداز کہانی یاد کرتا ہوں جس کا عنوان ہے، شہزادۂ مسرت۔

شہر کے وسط میں ایک بلند و بالا ستون کے اوپر خوشدل اور شاد کام شہزادہ کا سنہری بت نصب تھا جس میں زر و جواہر جڑے ہوئے تھے۔ ایک چڑیا شام کو اس بت کے قدموں میں آکر اتری۔ سوچا رات یہیں بسر کر لی جائے۔ ستون اونچا ہے۔ ہوا تازہ ہے۔ گھونسلا سنہری ہے۔ چڑیا سونے ہی والی تھی کہ پانی کی ایک بوند اس پر گری۔ مطلع صاف تھا۔ بادل کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر یہ پانی کا قطرہ چہ معنی۔ دو قطرے اور گرے تو اسے پتہ چلا کہ اس بلندی پر نصب خوشیوں کے شہزادہ کے بت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ چڑیا نے وجہ پوچھی۔ جواب ملا۔ جب میں زندہ تھا اور ایک انسان کا دل اپنے سینہ میں رکھتا تھا ان دنوں مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ تمام آسائشیں محل میں موجود تھیں۔ رنج و غم کا محل میں داخلہ ممنوع تھا۔ اور میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ

فصیل کے دوسری طرف کیا ہے۔ مجھے سب لوگ مسرت کا خوش نصیب شہزادہ کہتے تھے اور میں نے زندگی اسی طور بسر کی۔ مرنے کے بعد لوگوں نے مجھے اس بلندی پر ایک بت کے طور پر نصب کر دیا۔ یہاں سے مجھے زندگی کی ساری مکروہ اور بدنما صورتیں نظر آ رہی ہیں اور اس کے باوجود کہ میرا دل سیسہ کا ہے لوگوں کا دکھ اور تکلیف دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔

چڑیا اور سنہرے بت میں دوستی ہو جاتی ہے اور دونوں مل کر غریبوں اور ناداروں کی امداد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شہزادہ کی خواہش کے مطابق چڑیا پہلے تلوار میں لگے ہوئے جواہرات اتارتی ہے اور چونچ میں رکھ کر مستحق افراد کے سامنے ڈال آتی ہے۔ ایک ایک کر کے ہیرے موتی غریبوں میں تقسیم ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک دن شہزادہ اپنی دونوں آنکھوں میں جڑے ہوئے جواہرات بھی خیرات کر دیتا ہے اور خود اندھا ہو جاتا ہے۔ شہزادہ کے اصرار پر چڑیا بت کے اوپر مڑھے ہوئے سونے کے پرت کے ٹکڑے چونچ سے کھرچ کر بھوک اور سردی سے نڈھال فقیروں اور بچوں کے سامنے ڈال آتی ہے۔ بالآخر چڑیا خود تھکن اور سردی سے مر جاتی ہے اور بدنما بت کے اندر سیسہ کا دل شق ہو جاتا ہے۔

شہر کے کونسلر فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ بدصورت بت جو شہر کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے اسے اتار کر بھٹی میں ڈال دیا جائے۔ سیسہ کا دل بھٹی میں نہ پگھلا تو فاؤنڈری والوں نے دھات کا یہ حقیر ٹکڑا کوڑے میں پھینک دیا جہاں پہلے ہی ایک مردہ چڑیا پڑی ہوئی تھی۔ خدا نے ایک فرشتہ کو حکم دیا کہ اس شہر میں جو دو سب سے قیمتی چیزیں ہیں وہ لے آؤ۔ فرشتہ کوڑے کے ڈھیر سے دھات کا دل اور مردہ چڑیا اٹھا لایا۔ خدا نے کہا۔ تمہارا انتخاب درست ہے۔ یہ چڑیا جنت کے باغوں میں ہمیشہ چہکتی رہے گی اور یہ مسرتوں کا شہزادہ شہر زریں میں ہمیشہ ہماری ثنا کرتا رہے گا۔

فرشتہ نے کہا ہو گا کہ میں نے سارا تہران چھان مارا۔ خانہ بہ خانہ، دربدر، کوچہ بکوچہ، کو بکو مگر شہنشاہ کے حواریوں اور درباریوں، وزیروں اور امیروں میں مجھے ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس کے دل میں بے غرضی اور رحم کا اتنا سا مادّہ ہو جتنا ایک چڑیا کے دل میں ہوتا ہے۔ اور وہ سارے مجسّمے جو تہران میں جابجا نصب تھے آگ کا ایندھن ثابت ہوئے۔

دھات کا ذرا سا ٹکڑا بھی ایسا نہ نکلا جو انقلاب کی حرارت کو برداشت کر سکتا اور سلامت رہتا۔

(5)

میں تہران میں تعینات ہوا۔ میرے ابتدائی فرائض کی فہرست میں رضا خاں کے مقبرہ پر پھول چڑھانے کی رسم شامل تھی۔ جب میں رے کی نواحی بستی میں شاہ عظیم کے مزار کے متصل پتھر کی بھاری بھرکم سلوں سے بنی ہوئی پائدار، سفید اور خوبصورت عمارت کے اندر پہنچا تو مجھے اس کی نگہداشت کے معیار نے بہت متاثر کیا۔ ہر شے چمکدار اور شفاف تھی۔ نہ کوئی داغ دھبہ نہ مٹی کا ذرہ۔ ہر چیز نئی نویلی لگتی تھی حالانکہ مقبرے کو بنے ہوئے اٹھائیس برس ہو چکے تھے۔ دیوار پر دو قالین آویزاں تھے۔ دونوں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ہمراہی نے بتایا کہ جو تصویر خچر پر سوار سفید ریش بزرگ کی ہے وہ خاتم النبینؐ کی شبیہ مبارک ہے۔ دوسری تصویر جس میں ایک سیاہ ریش مرد قوی نظر آرہا ہے۔ وہ حضرت علیؓ سے منسوب ہے۔ اس نے کہا آپ غور سے ان تصاویر کو دیکھ لیں اور ان کے فرق کو ذہن نشین کر لیں تاکہ ان شبیہوں کو جو آئندہ چند دنوں میں آپ کو کئی مقامات پر نظر آئیں گی پہچاننے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں نے یہ سنا اور نظریں جھکالیں۔

انقلاب کے بعد جتنی مدت، جتنی رقم اور جتنی محنت رضا خاں کے مقبرہ کے گرانے میں صرف ہوئی اتنی کسی اور شاہی یادگار کے مٹانے میں کاہے کو صرف ہوئی ہوگی۔ مقبرہ کو تھوڑا بہت نقصان پہنچانے کے بعد اور آخری ضرب لگانے سے پہلے اسے لوگوں کے لئے کھول دیا گیا۔ قبر کے پاس گتہ پر ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ عبارت آویزاں تھی۔ "از خواہران و برادران مسلمان تقاضا می شود از انداختن آب دہن بہ مقبرہ رضا شاہ خائن خود داری فرمائید"۔ مسلمان بہنوں اور بھائیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ رضا شاہ خائن کی قبر پر تھوکنے سے پرہیز کریں۔ لوگ اس نوٹس کو پڑھتے اور سرہانہ پہنچ کر سارا غصہ اور ساری بلغم سنگ لحد پر نکال دیتے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں بڑے مبالغہ سے کام لیتے اور تھوک

کا اتنا بڑا گولہ پھینکتے کہ دیکھنے والے کو تعجب ہوتا کہ رخساروں کے درمیان جو ذرا سی جگہ ہے وہاں فاسد مواد اتنی مقدار میں جمع ہو سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ کی مرمریں قبر لعاب دہن کے سیلاب میں بہ گئی۔

انقلابِ روس کے ابتدائی دن تھے۔ زار کی شاہی فوج کے ایک کرنل کا جنازہ گرجا میں لایا گیا۔ ابھی رسومات شروع بھی نہیں ہوئی تھیں کہ سرخ فوج کے جیالوں کا ایک دستہ وہاں آپہنچا۔ انہوں نے تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ پھر قطار بنا کر Eye's Right کے انداز سے مارچ کرتے ہوئے تابوت کے پاس سے گزرنے لگے۔ ہر سپاہی لاش کے چہرہ پر تھوکنے کے بعد Eye's Front کا انداز اختیار کر لیتا۔ سیاہ ماتمی لباس میں کرنل کی بیوہ اس رومال کے ساتھ جو آنسو پونچھنے کے لئے مٹھی میں دبایا ہوا تھا اپنے مرحوم شوہر کا چہرہ صاف کرتی رہی۔ یہاں تک کہ دستہ کا آخری سپاہی آیا۔ اس نے لات ماری اور تابوت الٹ دیا۔ انتقام کی آگ دشمن کی موت کے بعد بھی بھڑکتی رہتی ہے۔ لاشوں کا مثلہ ہوتا ہے۔ کلیجہ چبایا جاتا ہے۔ کاسہ سر میں شراب ڈال کر پیتے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ مرنے والے کو ہزار بار زندہ کریں اور صد ہزار بار مار ڈالیں۔

ایک زمانہ میں اتاترک کی اصلاحات کا بڑا شہرہ تھا۔ رضا خاں ان سے متاثر ہوئے اور چھوٹے اتاترک بننے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ بہت سی اصلاحات نافذ کیں جن میں سے دو چار کا تعلق خواتین کے حقوق اور پردہ کے مسئلہ سے تھا۔ ایک مشہور خاندان کی خاتون نے پہل کی۔ نقاب اتارا اور گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر سرِ شام ہوا خوری کے لئے خیابان فردوسی پر جانکلیں۔ اس بات کا خوب چرچا ہوا۔ پرانے خیال والوں نے برا منایا۔ نئے خیال والوں نے اشارہ سمجھا اور نقاب الٹ دیئے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس خاتون کو وزیر بنا دیا۔ اس سے پہلے کسی خاتون کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ موت کے بعد یہ اعزاز ملا کہ ایک باغ کے کونے میں اس خاتون کا مزار بنایا گیا۔ انقلاب کے بعد اس باغ میں ایک بار نماز ہوئی۔ غالباً عید الفطر کی نماز تھی۔ امام نے نہ جانے مقتدیوں پر کیا پڑھ کر پھونکا کہ نماز کے بعد گلے ملنے، گھر جانے اور عید منانے کے بجائے ساری جماعت ایران کی پہلی ماڈرن بے پردہ خاتون وزیر کی قبر پر جمع ہو گئی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

اخبار میں خبر چھپی ہے کہ فرخ رو پرسا جو سابق وزیر تعلیم تھیں انہیں انقلابی عدالت

کے فیصلہ کے مطابق گولی مار دی گئی ہے۔ فرخ رو کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے وزیر کی حیثیت سے سرکاری روپیہ پیسہ بڑی دیدہ دلیری سے غبن کیا ہے۔ فرخ رو کا انجام دیکھ کر دفتر کی ایک طرار اور شوخ زبان خاتون نے کہا۔ سر، اب عورتوں کی باری آگئی ہے۔ میں کل سے احتیاطاً ایک چادر کے بجائے دو سیاہ چادریں اوڑھ کر دفتر آیا کروں گی۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔ میں نے کہا۔ اعتراض کا حق انقلابی کمیٹہ کو اور فیصلہ کا حق داد گاہ اسلامی کو حاصل ہے۔ میں کون ہوتا ہوں۔ مشورہ در کار ہے تو وہ حاضر ہے۔ ایک سیاہ چادر آپ کے حال کو ڈھانپنے اور چھپانے کے لئے کافی ہو گی۔ مگر آپ کے ماضی کی ستر پوشی کے لئے دوسری چادر شاید ناکافی ہو۔

(6)

گلشن کا کاروبار تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں سے جو خبر بھی آتی ہے وہ پریشانی میں اضافہ کرتی ہے۔

تبریز میں حالات بہت خراب ہیں۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ ریڈیو نے بالاخر کمک کا اعلان نشر کر دیا۔ شہر میں جگہ جگہ دیواروں پر لکھا ہے کہ تبریز رقیب ندارد۔ تبریز میں آیت اللہ کا کوئی حریف نہیں ہے۔ آقای شریعت مداری کا بیان بھی اس نسبت سے اہم کہ وہ تبریزی ہیں۔ چند دن گزرے اور اسی قسم کی خبریں کردستان سے آنے لگیں۔ چند دن اور گزرے اور گنبد کاؤس میں لڑائی چھڑ گئی۔ خرابی کی خبروں میں ہر چند دن کے بعد اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ خبر خوزستان سے آئی ہے۔ وہاں بے چینی پائی جاتی ہے۔ وفد تہران آیا ہوا ہے اور پینتیس لاکھ عربوں کی خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے پس منظر میں تیل ہی تیل نظر آتا ہے۔ اگر تیل کی دولت خوزستان کو مل جائے تو باقی اہل ایران کی نیند اڑ جائے گی۔ بھوکے پیاسے رات بھر قالینوں پر کروٹیں لیتے رہیں گے۔

ایک آواز ان تمام علاقائی جنگوں پر بھاری ہے۔ برای ما مرز بندی میان ترک و فارس، کرد و عرب، بلوچ و ترکمان ہیچ اعتباری ندارد۔ ہمارے لئے ترک اور فارس، کرد اور

عرب، بلوچ اور ترکمان کی حد بندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ توانا آواز طالقانی کی ہے۔ وہ ان جھگڑوں کو نبٹانے کے لئے موقع پر جانا چاہتے ہیں مگر کچھ طاقتیں ایسی بھی ہیں جو یہ نہیں چاہتیں۔

اخبارات کہتے ہیں کہ ایک طرف شورش پسندوں کے منصوبے ہیں، دوسری طرف انقلابیوں کی جلد بازی اور تیسری طرف حکومت کی ناتجربہ کاری۔ رہ گئی چوتھی طرف، وہاں ان حالات میں انارکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سفارت کاروں کے ایک غیر رسمی ڈنر پر مہمان اپنے تجربات اور خیالات کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ ایک ملٹری اتاشی نے کہا، ایران میں دائیں اور بائیں بازو والے مسلح گروہوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ جو اس خانہ جنگی میں جیت گیا وہی مستقبل کا وارث ہو گا۔ شروع میں ہمیں یقین تھا کہ تجربہ کار اور تربیت یافتہ اشتراکی بہت جلد غالب آ جائیں گے۔ مگر یہ خیال غلط نکلا۔ دائیں بازو والے موت سے نہیں ڈرتے۔ عوام ان کے ساتھ ہیں۔ رہنما غیر معمولی کرشمہ کا مالک ہے۔ دوسرے سفارت کار نے گرہ لگائی سال بھر پہلے جہاں کہیں بارلیش نوجوانوں کی سرخ پرچم والے نوجوانوں سے جھڑپ ہوئی وہاں مرنے والے سارے بارلیش ہوا کرتے تھے۔ اب انہوں نے بھی جنگ کی تربیت حاصل کر لی ہے۔ دونوں طرف سے مرنے والوں کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ پچھلے ہفتہ میرے گھر کے پاس دونوں گروہوں میں لڑائی ہوئی۔ دو لڑکیوں نے میرے گھر میں پناہ لی۔ کچھ دیر کے بعد پاسدار آ گئے۔ کہنے لگے۔ اگر آپ نے پانچ منٹ میں لڑکیاں ہمارے حوالہ نہ کیں تو ہم اس کمرے کو آگ لگا دیں گے جس میں وہ بند ہیں۔ کسی نے ان کو بتایا کہ یہ ایک سفارت کار کا گھر ہے۔ جواب ملا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میر صاحب کہنے لگے، وہ جو سفارت کاروں کا ناقابل خلاف ورزی استحقاق ہوتا ہے اسے کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ پچھلے ہفتہ کچھ مسلح افراد میرے گھر آ گئے اور کہا کہ ہم اس سڑک پر واقع تمام گھروں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ میں نے کہا میں نائب سفیر ہوں۔ جواب ملا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ سفیر کبیر ہوں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

مشرقی افریقہ کے ایک سفیر نے کہا۔ ایک دوپہر وزارت خارجہ کے باہر دس پندرہ لڑکے لڑکیاں جنگلہ کے ساتھ سرخ انقلاب کے بینر لٹکا رہے تھے۔ پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

پرچم اتار کر اسی کپڑے کے ساتھ ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ ٹرک میں ڈالا اور چل دیئے۔
چلتے چلتے ایک شخص نے کہا، ان میں میری لڑکی شامل ہے میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں۔
جواب ملا شام کو ایون جیل آجایئے اور اس کی لاش وصول کر لیجئے۔

ایک اور سفارت کار نے کہا۔ انقلابیوں کے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ اگر وہ اتنی سختی نہ کریں تو ان کے بے رحم مخالف ہر ڈاڑھی والے شخص کو نزدیک ترین کھمبے سے لٹکا کر پھانسی دے دیں گے۔ وہ یہ کام بڑے پیمانہ پر خیوہ اور سمرقند میں کر چکے ہیں۔ یہاں بھی وہ تاریخ کو دہراتے مگر مجبور ہیں۔ ان کے ہتھکنڈے انہی پر آزمائے جا رہے ہیں۔ پہلی بار انہیں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جو ان کی زبان جانتے اور اسی میں گفتگو کرتے ہیں۔

ایک ہمسایہ ملک کے سفارت کار نے کہا کہ یہ فوری فیصلہ اور اس پر عمل کرنے والی عدالت ہر انقلاب کا سب سے موثر اور مہلک ہتھیار ہوتا ہے۔ انقلاب بے حد تیز رفتار ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں ضابطہ کی ہر زنجیر اور اس کے ہاتھ قواعد کے ہر سرخ فیتہ سے آزاد ہوتے ہیں۔ تیز رفتاری کی وجہ سے گاہے حادثہ ہو جاتا ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ چند دن ہوئے تہران میں ایک معمولی درجہ کے ہوٹل پر منشیات کے سلسلہ میں چھاپہ پڑا۔ یہ ایک طرح سے ان چارپائی ہوٹلوں کی طرح تھا جو سڑک کے کنارے بسوں اور ٹرکوں کے لئے بنے ہوتے ہیں۔ ہوٹل والوں کے ساتھ انسداد منشیات والے پاسدار ان تمام مہمانوں کو پکڑ کر لے گئے جو شب باشی کے لئے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساری رات متعلقہ سفارت کار وزارت خارجہ اور داد گاہ اور پاسداروں کے دفتروں کے چکر لگاتا اور فون کرتا رہا مگر کسی اعلیٰ اختیارات والے افسر یا انقلابی سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جب رابطہ ہوا تو پتہ چلا کہ فیصلہ راتوں رات ہو گیا تھا اور اس پر عمل بھی ہو چکا ہے۔ لاشیں موجود ہیں اور لوٹائی جا سکتی ہیں۔

سفارتی نمائندہ نے کہا، اس میں چند بے خبر اور بے گناہ مسافر بھی شامل تھے جو محض رات بھر کے لئے اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا جرم کیا تھا۔ جواب ملا، منشیات فروشوں کے یہاں قیام کرنا ہی ان کا سب سے بڑا جرم تھا۔ سفارت کار نے احتجاج کیا اور کہا کہ اگر یہ جرم تھا تو اس کی اتنی بڑی سزا کا کیا جواز ہے۔ جواب ملا، جناب والا اس دنیا میں

اگر کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی جائے تو وہ دوسرے جہان میں اس کے لئے باعث رحمت ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کی سزا کی بلا جواز مقدار اس کی نیکیوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس کی نسبت سے مرحوم کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ جس سفار تکار نے یہ داستان سنائی اس کا کہنا تھا کہ یہ منطق سننے کے بعد میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ اگر بھرا ہوا پستول ہو تو مخاطب پر داغ دوں تاکہ اس کے اگلے پچھلے سارے گناہ دھل جائیں۔ افسوس صد افسوس کہ جیب خالی نکلی۔

میری باری آئی۔ میں نے کہا۔ چشم دید واقعات کا کوئی شمار نہیں۔ روز کچھ نہ کچھ دیکھتے ہیں اور یہ سلسلہ ایک عرصہ سے چل رہا ہے۔ سات آٹھ ہفتے ہوئے میں نے خیابان جردن پر ایک پاسدار کا خون ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے تنور سے روٹیاں خرید کر لے جا رہا تھا۔ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اس کی فوکس ویگن کار پر حملہ کیا۔ کار فٹ پاتھ پر چڑھ کر رک گئی۔ لوگ جمع ہوئے۔ قاتل فرار ہو گئے۔ چھوٹی سی فوکس ویگن کی اگلی سیٹ خون سے بھری ہوئی تھی۔ خون بہ کر فٹ پاتھ پر گر رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر نان بربری کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک طرف گرم نان تھا اور دوسری طرف گرم خون۔ اب کبھی ادھر سے گزر ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے فٹ پاتھ کا وہ حصہ تنور کی طرح گرم ہے اور گہری شفق کی طرح سرخ۔ میں وہاں پہنچ کر احتراماً فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔

یہ بات میں نے اس دعوت میں جمع مہمانوں کو نہیں بتائی کہ آج جب میں اس فٹ پاتھ سے نیچے اترا تو وہاں ایک اور فوکس ویگن کھڑی تھی۔ پچھلی نشست پر ایک ہائی اسکول کی طالبہ اپنے اسکول یونیفارم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو اس سے دگنی عمر کا ہو گا۔ مرد نے ہمراہی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے دل کے اوپر رکھا۔ گول مٹول گوری چٹی لڑکی کا چہرہ یکدم سفید سے سرخ ہو گیا۔ کل میں نے یہاں فٹ پاتھ پر بہتا ہوا خون دیکھا تھا۔ آج رخساروں کی جلد کے نیچے اسی خون کو دوڑتا ہوا دیکھا ہے۔ نوجوان خون واقعی بہت گرم اور بہت سرخ ہوتا ہے۔

(7)

فجر کی نماز کے بعد دائیں جانب منہ پھیر کر السلام علیکم و رحمت اللہ کہا۔ ادھر سے گولیوں کی آواز آئی۔ پھر بائیں طرف سلام پھیرا۔ ادھر سے بھی گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ دو ڈھائی -سال گزرنے کے باوجود دائیں اور بائیں بازو کی خانہ جنگی ابھی تک جاری ہے۔ اگرچہ اس میں اب وہ تیزی نہیں رہی جو پہلے چھ سات ماہ میں دیکھنے میں آئی تھی لیکن سلامتی اور رحمت آج بھی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس کی دعا مانگنی چاہئے۔ صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے بلکہ اپنے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ کرتے ہوئے۔

میں خوابگاہ سے نکل کر ٹیریس پر آتا ہوں۔ میرا گھر پہاڑی کے اوپر واقع ہے اور لڑائی نیچے وادی میں ہو رہی ہے۔ میں کرسی کو دیوار کی آڑ میں رکھ کر اس لڑائی کا نظارہ کرتا ہوں۔ حملہ آوروں نے ایک چہار منزلہ عمارت کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اس کی تیسری منزل کے ایک فلیٹ پر چند گولیاں چلاتے ہیں اور رک جاتے ہیں۔ اس وقفہ میں وہاں سے جوابی فائر ہوتا ہے۔ حملہ آور پندرہ بیس منٹ کے بعد چاروں طرف سے گولیاں چلاتے ہیں۔ فلیٹ والوں کو اندازہ ہو گیا کہ فرار کے سارے راستے بند ہیں۔ وہ جوابی کارروائی بند کر دیتے ہیں اور اس تاک میں رہتے ہیں کہ جونہی کوئی حملہ آور ان کے فلیٹ کی طرف بڑھتا ہوا نظر آئے وہ اس کو نشانہ پر بٹھالیں۔ ان کا مقصد ظاہر ہے۔ ہتھیار ڈالنے ہیں نہ فرار کی کوشش کرنی ہے۔ البتہ جان دینے سے پہلے دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچانا ہے۔ حملہ شروع ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ یکایک درختوں کی اوٹ سے آگ کا ایک شعلہ سا لپکا اور فلیٹ پر جا گرا۔ دھماکہ ہوا۔ دھواں سا پھیل گیا اور آگ لگ گئی۔ حملہ آوروں نے راکٹ استعمال کیا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہو گئی۔ میں ٹیریس کی نرم صوفہ کرسی سے اس طرح اٹھا جیسے کوئی کھیل ختم ہونے کے بعد گرینڈ سٹینڈ کے وی آئی پی انکلوژر سے نکلتا ہے۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔

منصور الٰہی کے خوش نما ذیلی بنگلہ کی تنگ اور مار پیچ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک نسبتاً کھلے ٹیریس پر جا نکلے۔ ٹیریس کی بتیاں بند ہیں۔ کمروں کے دروازوں اور کھڑکیوں

سے روشنی چھن کر آ رہی ہے۔ تاروں بھرے آسمان اور افق پر درختوں کی سیاہ نقاشی نے مل کر سماں باندھ دیا ہے۔ سڑک کے دوسری جانب ایک قلعہ نما مکان کی سپاٹ دیوار میں شیشہ کی پٹی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہے۔ یہ ایک لمبی کھڑکی ہے جسے اخبار کا کاغذ چپکا کر اندھا کر دیا ہے۔ کافی کا دور چلا اور میں نے اس لڑائی کا حال سنایا جو دو دن پہلے اپنے گھر کے ٹیریس سے دیکھی تھی۔ منصور کہنے لگے۔ جو منظر میں نے اس ٹیریس سے دیکھا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے الجھن اور خجالت ہوتی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب باضابطہ محلّہ کمیٹی نہیں بنا تھا اور ایک مسلح گروہ خود ہی اس علاقہ کا نگران بن بیٹھا تھا۔ وہ عمارت جو آپ کو سڑک کے اس پار نظر آ رہی ہے اس میں ان کا دفتر تھا۔ ان دنوں سامنے والی لمبی افقی کھڑکی پر کوئی پردہ تھا نہ اس کے شیشوں پر کاغذ چپکایا ہوا تھا۔ میں یہاں فیملی کے ساتھ ٹیریس پر بیٹھا ہوا تھا۔ دیکھا کہ ایک لڑکے اور لڑکی کو ایک شخص کے سامنے پیش کیا گیا۔ لڑکے کی ٹھکائی ہوئی اور پھر اسے گھسیٹ کر لے گئے۔ دوسرے لوگوں کے کمرے سے چلے جانے کے بعد وہ شخص اپنی کرسی سے اٹھا۔ لڑکی نے بڑی مدافعت کی۔ کپڑے تار تار ہو گئے پھر بھی لڑتی رہی۔ یہاں تک وہ دونوں کھڑکی سے پرے ہو جانے کی وجہ سے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس منظر کو دیکھنے والوں میں میرے دو کم سن بچے بھی شامل تھے۔ ایک آٹھ نو سال کا ہے، دوسرا دس گیارہ برس کا۔ بات ختم ہوئی۔ سب کی نظریں سامنے والے گھر کی لمبی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ خواتین جو مردوں سے ذرا فاصلہ پر پرا جمائے بیٹھی تھیں ان کی نظریں کھڑکی کی طرف اور کان ہماری طرف لگے ہوئے تھے۔

(8)

جب بھی کوئی نئی حکومت آتی ہے افسروں کی شامت آجاتی ہے۔ میرا اشارہ شامت زدگی کی ان صورتوں کی طرف نہیں ہے جنہیں سکریننگ، تبادلہ، انکوائری اور بے دفتری کہتے ہیں۔ میں تو نصیبوں کی اس برائی کا ذکر کر رہا ہوں جس کی بنا پر ذمہ دار اور

تجربہ کار افسروں کو خاموش اور مجبور سامعین کی حیثیت سے نااہل اور غیر ذمہ دار اشخاص کی تقریریں اور نصیحتیں اس لئے سننی پڑتی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہر نئی حکومت کہتی ہے کہ پیشرو بہت خراب تھے۔ نوکر شاہی بہت خراب ہے۔ ہم ملک کی تقدیر بدل دیں گے۔ دودھ اور شہد کی نہریں نکالیں گے۔ ہتھیلی پہ سرسوں جمائیں گے۔ نوکر شاہی اپنا قبلہ درست کر لے وگرنہ ہم سے برا کوئی اور نہ ہو گا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس عہد کو صرف اس حد تک نبھاتے ہیں کہ لوگ یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ واقعی ان سے برا کوئی اور نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ پردہ گرتا ہے، لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ وہی منظر، وہی الفاظ، وہی نصیحتیں ، وہی وعدے۔ اور بسا اوقات وہی پرانے فنکار۔

ایک سال ایسا چڑھا کہ نصیحتی فضیحتی تقریروں کا طوفان آ گیا۔ طبقاتی ناہمواری کی تشخیص، جدلیاتی مادیّت کے جائزے۔ دھمکیاں ہی دھمکیاں۔ کوئی بھی ان کی زد سے نہ بچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ فکس اپ کر دیئے گئے۔ نئی حکومت نے کہا کہ ہم موجودہ عمارت کو ڈھا کر ایک نئی عمارت تعمیر کریں گے۔ وہ عمارت ڈھانے میں اتنے مصروف ہوئے کہ نئی تعمیر کا نقشہ بھی نہ بنا سکے۔ ان کے وزیر خزانہ نے کہا۔ یہ کیا بے حس معاشرہ ہے کہ جب آپ رات کے ایک بجے سینما کا سیکنڈ شو دیکھ کر موٹر میں بیٹھتے ہیں تو سردی میں ٹھٹھرتا ہوا ایک ننھا سا ہاتھ بھیک مانگنے کے لئے آپ کے سامنے کھل جاتا ہے۔ یہ بات ناقابل برداشت ہے۔ ہم اس صورت حال کو بدل دیں گے۔ ہمارا ایک پروگرام ہے، بڑی بڑی تبدیلیوں کا۔ اور ہماری ایک ٹیم ہے۔ ہم سب مل کر اس پروگرام کے مطابق کام کریں گے۔ ہم ضابطوں اور محکموں میں بٹے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر میں وزیر خزانہ ہوں مگر آپ مجھے پنجاب کا گورنر بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری طرف پنجاب کا گورنر اپنے آپ کو حکومت پاکستان کا وزیر خزانہ بھی کہہ سکتا ہے۔ ہم سب یک جان ہیں۔ اس لئے کہ ہم حکومت کرنے نہیں آئے بلکہ معاشرہ کو بدلنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ محض ایک نئی حکومت نہیں بلکہ ایک انقلاب ہے۔

اس تقریر کے دو تین سال بعد میں نے وزیر موصوف سے سوال کیا۔ وہ جو آپ نے شروع دنوں میں ایک ٹیم اور یکجان ہونے کا دعویٰ کیا تھا وہ کہاں تک درست تھا۔ مجھے یہ

بتانے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ گورنر پنجاب نکالے گئے، مخالف ہو گئے، صلح کر لی، وزیر اعلیٰ ہو گئے۔ پھر نکالے گئے، دوبارہ مخالف ہو گئے، جیل ہو گئی، پھر صلح ہو گئی۔ ہر مرحلہ پر ان کے اوسان بجا رہے۔ شوق برقرار رہا۔ وہ اپنے سیاسی سفر کے ہر سنگ میل پر لحہ بھر کے لئے رک کر اپنا نکاح پڑھواتے رہے۔ پنجاب کے ایک اور وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ بھی مسند سے اتارے اور جیل میں ڈالے گئے۔ ان دنوں میں آواز دوست کے نئے ایڈیشن کے سلسلہ میں موری گیٹ والے دفتری خانہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے مالک کو پولیس پوچھ گچھ کے لئے پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس نے سابق وزیر اعلیٰ کے خلاف گواہی دینے سے انکار کیا۔ اتنی مرمت ہوئی کہ گلے کے صوتی تار ٹوٹ گئے۔ آواز پھٹ گئی۔ گلا بیٹھ گیا۔ محمد بشیر کی باقی زندگی اس طرح گزری کہ بات گلے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ عوام کی آواز کو دبانا ایک فن ہے۔ حکومت وقت ہمیشہ سے اس فن کی قدر دان اور سرپرست رہی ہے۔

میرا سوال حکومت وقت کے ایک اہم وزیر سے تھا۔ وہ بات مارنے کے ہنر میں طاق تھے۔ انگریزی میں ایک جملہ کہا اور خاموش ہو گئے۔ جملہ یہ تھا کہ انقلاب اپنی اولاد کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ میں اس جملہ کے پس منظر سے واقف نہ تھا۔ خاموش ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ نام نہاد انقلاب اس وزیر خزانہ کو بھی نگل گیا۔

انقلاب فرانس کے رہنما ایک مرحلہ پر دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک نرم رو اور علاقائی خود مختاری کا حامی۔ دوسرا تند رفتار، بے رحم اور پیرس کی مرکزیت کا قائل۔ پہلے گروہ میں ایک بڑا اچھا مقرر تھا جس نے چرچ کے مدرسہ میں مذہبی علوم پڑھے، قانون کے کالج سے ڈگری حاصل کی، بوردو میں وکالت کی، تین مرتبہ قانون ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور ہر بار اس کا صدر مقرر ہوا۔ ایک دن اس کی خدمات اور خطابت کو نظر انداز کرتے ہوئے انقلابی ٹریبونل نے اسے موت کی سزا سنا دی۔ اس موقع پر پیرورگنی آد (Pierre Vergniaud) نے صرف اتنا کہا۔

The Revolution is like Saturn, it is devouring its own children.

انقلاب کے اس دور کو جب انقلابیوں میں اختلافات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ انقلاب پلٹ کر اپنے ہی ساتھیوں اور حامیوں پر حملہ آور ہوتا ہے، فارسی میں فرزند خوری کا دور کہتے

ہیں۔ انقلاب ایران کے احتجاجی دور میں اندرون خانہ جو اختلافات تھے ان کے بارے میں افواہیں سننے میں آتی تھیں مگر احتجاج کی رفتار اتنی تیز اور اتحاد کا مظاہرہ اتنا بھرپور تھا کہ افواہ اور خبر کے فرق کو واضح کرنے کے لئے کسی کے پاس فرصت نہ تھی۔ انقلاب کامیاب ہوا۔ پہلا اختلاف اسی وقت سامنے آگیا۔ حکومت سے محروم رہ جانے والے اشتراکی علی الاعلان کہتے پھرتے تھے کہ انقلاب ہم نے برپا کیا۔ مولویوں نے اسے ہائی جیک کر لیا ہے۔ ہم اسے ان سے واپس لیں گے خواہ اس میں خون خرابا کیوں نہ ہو۔

انقلاب کی کامیابی کو صرف ایک ہفتہ گزرا تھا کہ روحانیان کے آپس کے اختلافات کا ایک نظارہ ٹی وی پر دیکھنے میں آیا۔ اسرائیل کے سابق سفارت خانہ کی عمارت میں فلسطین کی تنظیم آزادی کے دفتر کا افتتاح ہوا۔ ٹی وی پر تقریب افتتاح دکھائی گئی۔ اتنا شور اور ایسی بدنظمی کہ جس نے دیکھا وہ بے مزہ اور فکرمند ہوا۔ اس کے بعد چند دن افواہیں گشت کرتی رہیں۔ پھر ایک دن روزنامہ آیندگان نے سرخی جمائی کہ سب سے زیادہ بااثر اور بااختیار روحانی شخصیت یعنی آیت اللہ طالقانی نے اپنا دفتر بند اور گھر خالی کر دیا ہے۔ وہ تہران چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس کی وجہ وہ حادثہ ہے جو پی ایل او کے دفتر میں ہوا تھا۔

طالقانی کے دو بیٹے اور ایک بہو جب پی ایل او کے دفتر سے باہر نکلے تو مسلح افراد نے انہیں دن دہاڑے زدوکوب کیا اور اغوا کر لیا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ جہاں طالقانی کی فیملی محفوظ نہ ہو وہاں کوئی اور کیسے حفظ و امان میں رہ سکتا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ انقلاب میں افراد کی حفاظت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ سب غیر محفوظ ہوتے ہیں۔ انقلاب کے رہنما دوسروں سے کہیں زیادہ غیر محفوظ ہوتے ہیں۔

انقلاب کا نیاپن اور تازہ پن اپنی بہار دے رہا تھا کہ یکایک ایک گولی چلی اور ایک اہم انقلابی رہنما کے سر میں پیوست ہو گئی۔ اس رہنما کا نام آیت اللہ استاد سید مرتضیٰ مطہری تھا۔ انقلاب کی عمر اس وقت دس بارہ ہفتہ کی ہو گی۔ بااختیار، خودمختار اور کامیابی کے نشے سے سرشار۔ بس ایک گولی چلی اور انقلاب پرانا ہو گیا۔ جو بیماری لگی وہ بھی پرانی تھی۔ اس بیماری میں پرندے اپنے انڈے توڑ کر پی جاتے ہیں اور رینگنے والے جانور اپنے نوزائیدہ بچے کھا جاتے ہیں۔ انقلاب نے بہ یک وقت انڈے پینے اور بچے کھانے شروع کر دیئے۔ استاد مطہری کو گولی مارنے کی ذمہ داری جس دہشت پسند گروہ نے قبول کی ہے اس کا نام فرقان

ہے۔ پچھلے ہفتہ بھی فرقان نے ایک گولی چلائی تھی۔ وہ بھی نشانہ پر ٹھیک بیٹھی۔ مرنے والے کا نام جنرل قرنی تھا۔ پہلوی فوج سے جوانی میں نکالے گئے اور بڑھاپے میں انقلابی فوج کے سربراہ بنے تھے۔

گولی پہ گولی چل رہی ہے مگر ان کے درمیان اتنا وقفہ ہوتا ہے جو منصوبہ بندی اور احتیاط کے لئے ضروری ہو۔ استاد مطہری پر گولی چلانے کے تین ہفتہ کے بعد حجت الاسلام ہاشمی رفسنجانی پر گولی چلی۔ وہ زخمی ہوئے اور ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ وہ ابھی ہسپتال میں زیر علاج تھے کہ تہران کی قبا مسجد کے بانی محمد تقی حاج ترکھانی پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی اور وہ جاں بحق ہوگئے۔ اگلے مہینہ تبریز کے امام جمعہ کے ساتھ یہی حادثہ پیش آیا۔ سال کا اختتام مدرسہ الٰہیات کے رئیس ڈاکٹر محمد مفتح کے خون سے ہوا۔ اس قتل کی ذمہ داری بھی فرقان نے قبول کر لی۔ صوبائی شہروں میں بھی انقلاب دوست مارے جارہے ہیں۔ اخباروں میں ان کے نام گاہ بہ گاہ چھپتے رہتے ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ مارنے والے کب تک شاہ کے خلاف دوش بدوش لڑتے رہے اور کب سے دوبدو ہوگئے۔

ایک دن مسجد ابوذر میں تہران کے امام جمعہ خامنہ ای تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ ایک نوجوان نے ان کے سامنے تقریر محفوظ کرنے کے لئے صوت بندی کی مشین رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد مشین میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا۔ کچھ لوگ مارے گئے۔ خامنہ ای کی جان بچ گئی۔ مگر دایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔ اس سے اگلے روز ایک بہت بڑا حادثہ ہوا جس میں وہ شخص جاں بحق ہوگیا جسے آیت اللہ خمینی کا دست راست کہتے تھے۔

(9)

شام کے وقت حزب جمہوری اسلامی کے صدر دفتر میں جلسہ ہورہا تھا۔ کوئی ضروری بات ہوگی کہ تقریباً سو اہم افراد اس میں شریک تھے۔ وزیر، اسمبلی کے ممبر، پارٹی کے عہدہ دار۔ صدارت آیت اللہ ڈاکٹر بہشتی کررہے تھے۔ جلسہ چار منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر ہورہا تھا۔ رات کے نو بجے ہوں گے کہ ہال میں اچانک ایک بم پھٹا۔ چھت سامعین پر آن

گری۔ دھماکہ اور ملبہ کے بوجھ سے ساری عمارت زمیں بوس ہو گئی۔ دوسری منزل کے اجتماع میں شریک ہونے والے چار منزلوں کے ملبہ کے بیچ پھنس گئے۔ مرنے والوں میں چار وزیر اور اٹھارہ بیس پارلیمینٹ کے ممبر شامل ہیں۔

ٹی وی پر قطار اندر قطار لاشیں دکھائی جا رہی ہیں۔ ان میں ایک لاش ڈاکٹر بہشتی کی ہے۔ کہاں وہ ہفتہ بھر پہلے ٹی وی پر نظر آنے والا بارعب اور پر اعتماد خوبصورت چہرہ اور کہاں یہ خون میں تر بے عمامہ اور بے قمیص لاشہ جسے ٹی وی کا آدمی اٹھا کر کیمرہ کے رخ پر رکھنے میں مصروف ہے۔ کیمرہ ایک اور لاش کی طرف رخ کرتا اور ذرا دیر کے لئے وہاں ٹھہر جاتا ہے۔ یہ نوجوان منتظری کی لاش ہے۔ امام خمینی کے نامزد جانشین آیت اللہ منتظری کے صاحب زادے۔ ان دنوں یہ نوجوان مجلس کا رکن تھا اور خاموشی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ انقلاب کے شروع دنوں میں اس کا نام بار بار اخبارات میں چھپا کرتا تھا۔ مسلح افراد کا ایک دستہ ان کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق انقلابی فیصلہ کیا کرتے تھے۔ سرکش اور ہنگامہ پسند تھے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو ناپسند تھی۔ ان لوگوں میں آیت اللہ منتظری بھی شامل تھے۔ ایک بار انہوں نے فلسطین جا کر جہاد میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ ہوائی اڈا پر چار سو باوردی مسلح افراد کے ساتھ پہنچ گئے۔ ٹکٹ، پاسپورٹ اور ویزا ندارد۔ انہوں نے ہوائی اڈا کے ایک ہال پر قبضہ کر لیا۔ دو تین ہفتہ تک وہاں ڈیرہ ڈالے رکھا۔ اسی جگہ ورزش، نماز، کھانا اور سونا۔ وہ جب چاہتے بیرونی ممالک کے ہوائی جہاز روک لیتے۔ جہاز بھرا ہونے کے باوجود دو ایک آدمیوں کو سوار کرا دیتے۔ ایک بار پی آئی اے کا ہوائی جہاز بھی روک لیا تھا۔ کیمرہ منتظری جونیر کو خاک بسر اور لہولہان چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ اناؤنسر مرحومین کے نام پڑھتا جا رہا ہے۔ پاک نژاد، دانش، دہقانی، طباطبائی، لاوسانی، زمانی، اسلامی، رواقی، سرحدی، مجیدی وغیرہ وغیرہ۔

میں صبح سویرے ایک راہ شناس کو ساتھ لے کر مجلس کی عمارت کے قریب جا پہنچا۔ جنازہ اٹھنے کا وقت آٹھ بجے صبح تھا۔ بہتر تابوت مجلس کے احاطہ میں کھڑی ہوئی ایمبولنس گاڑیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ عمارت کی بالکنی سے سپیکر ہاشمی رفسنجانی نے جنازہ میں شریک ہونے والوں سے خطاب کیا۔ نوحہ خوانی کا انداز نہ ذاکر والی کیفیت۔ لہجہ میں ٹھہراؤ تاکہ پریشان خاطر لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھ سکیں۔

ٹی وی کے اعلانات، خبریں اور جائزے، رہنماؤں کے تعزیتی بیانات اور تقریریں، اخباروں کی خبریں، اداریئے اور مضامین سب کے سب اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ فارسی زبان کو ٹریجڈی کے بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ بس ایک نمونہ کافی ہو گا۔ "آنچہ در گلو داریم کوہی است از بغض و آنچہ در سینہ داریم دریای است از خشم۔ آیا قلم و زبان را انصافا، توان آن ہست کہ عظمت فاجعہ را ترسیم کند؟" وہ جو ہمارے گلے میں ہے وہ ایک پہاڑ ہے کینہ اور دشمنی کا۔ اور وہ جو ہمارے سینہ میں ہے وہ ایک دریا ہے قہر اور غضب کا۔ انصاف کیجئے کہ کیا قلم اور زبان کو یہ تاب اور مجال ہے کہ اس مصیبت بزرگ کی عظمت کا نقشہ کھینچ سکے؟

ٹی وی پر کابینہ کا اجلاس دکھایا گیا۔ مرحومین کی پھولوں سے لدی ہوئی تصاویر ان کی کرسیوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے جانشین حلف اٹھا چکے ہیں۔ موت اپنی جگہ اور معمولات اپنی جگہ۔ ٹی وی پر اسمبلی کا جلسہ دکھایا گیا۔ خالی نشستیں، پھول اور تصویریں۔ زخمی ہو جانے والے ممبر پٹیاں باندھے پہیہ دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ممبر سٹریچر پر لایا گیا۔ جانے والے اپنی جگہ، قانون سازی کے تقاضے اپنی جگہ۔ ٹی وی نے ایک منظر جلوس کا دکھایا۔ ماتم، سینہ کوبی، زنجیر زنی۔ جو بیہوش ہو جاتا ہے اسے ہاتھوں پر لے کر سروں سے اوپر اٹھا لیتے پھر دست بدست سڑک کے کنارے پہنچا دیتے۔ غم خواری اپنی جگہ، نگاہبانی اپنی جگہ۔

صمد صوفی کہنے لگے کہ جب ٹی وی پر ملبہ کے نیچے سے نکلنے والی لاشیں دکھا رہے تھے تو ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ دو آدمی ایک مردہ دھڑ اٹھا کر لا رہے تھے کہ جھٹکا لگنے سے لاش کے پاؤں سے ایک موزہ اتر کر زمین پر گر پڑا۔ شام کو جلسہ میں جانے سے پہلے جب وہ شخص موزے پہن رہا تھا تو اس کے فرشتوں کو خبر نہ ہو گی کہ اسے جوتا اتارنے کی فرصت بھی نہیں ملے گی۔ مگر اس کا موزہ ٹی وی کیمرہ اور لاکھوں ناظرین کی آنکھوں کے سامنے خود بخود اتر جائے گا۔ صمد کہنے لگے، آج کل ٹی وی دیکھنے کے لئے بڑا حوصلہ درکار ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کسی مقتول کے دفن کا منظر دکھا رہے تھے۔ لوگ بے قابو ہو گئے۔ قبر میں اتارنے والے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔ لاش ان کے ہاتھ سے چھٹ گئی۔ صرف اس کا ایک بازو ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ صوفی صاحب کچھ کہے بغیر سراپا سوال بنے ہوئے

تھے کہ آیا ایسا منظر ٹی وی پر دکھایا جانا چاہئے۔

سفارت کاروں نے ایک بار وزارت خارجہ سے گلہ کیا کہ ہم لوگ سفارتی آداب کے مطابق انقلاب اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے جنازوں میں شریک ہونے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں مگر ہجوم کی وجہ سے کبھی جنازہ اٹھنے کے مقام تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ بہشت زہرا کے قبرستان تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ آئیں تو آداب کی خلاف ورزی اور اگر آئیں تو خواری و خستگی۔ جواب ملا کہ جب کبھی ایسا موقع آئے آپ ہدایات کے لئے دفتر تشریفات سے رابطہ قائم کریں۔ اس فیصلہ کے بعد موقع کا انتظار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اگلے ہفتہ محکمہ تشریفات سے پوچھنے کی نوبت آگئی۔ انہوں نے کہا کہ سفارت کار یادبود کے جلسہ میں شرکت کریں گے۔ تین بجے سہ پہر ہم لوگ وزارت خارجہ پہنچ گئے۔ موٹریں وہاں پارک کیں اور بس میں سوار ہو کر تہران یونیورسٹی پہنچے۔ ایلز بتھ بلوار کی طرف جو دروازہ تھا وہاں سے اندر داخل ہوئے اور سٹیج کے سامنے دری پر بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے ایک جنگلہ تھا اور اس کے پیچھے کوئی چالیس پچاس ہزار افراد۔ تقریریں ہوئیں۔ مرحومین کے حق میں اچھی اچھی باتیں کی گئیں۔ بری باتیں ساری کی ساری امریکہ کے حصہ میں آئیں۔ دو گھنٹہ کے بعد بس ہمیں واپس لے آئی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ حادثات ہوتے رہے۔ وزارت خارجہ اور دانش گاہ کے درمیان سفارت کاروں کی خصوصی بس بڑی باقاعدگی سے چلتی رہی۔

گیلان کے گورنر جنرل، اصفہان، مشرقی فارس اور جہروم کی اسلامی عدالتوں کے سربراہ، ارک کے سرکاری وکیل، کرمان کے امام جمعہ اور مشہور رہنما حسن آیات کے نام قاتلانہ حملوں میں مارے جانے والوں کی طویل فہرست میں شامل ہیں۔ جگہ جگہ بم پھٹ رہے ہیں۔ بے خبر اور بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔ قم کار یلوے اسٹیشن، کرمان شاہ کا بازار، تہران میں چوک انقلاب، پاسچر انسٹیٹیوٹ، دفتر پارس نیوز ایجنسی سب بموں کی زد میں آچکے ہیں۔ یہ بم باری کیا گل کھلائے گی۔ آگ لگنے کے ایک واقعہ میں سرکاری خزانہ کے چالیس لاکھ ریال جل کر خاک ہو گئے۔ اس آگ کا دھواں میں نے دفتر میں کرسی پر بیٹھے ہوئے جنوب شہر سے اٹھتے دیکھا۔ اس سمت میرے دفتر میں فرش سے چھت تک شیشہ کی دیوار بنی ہوئی ہے۔ شہنشاہ رضا شاہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کی ساری

کھڑکیاں تہران کے شمال کی طرف کھلتی تھیں۔ میرے دفتر کی عمارت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کھڑکیاں جنوب شہر اور تہران یونیورسٹی کی جانب کھلتی ہیں۔

ترکی کے سفارت خانہ میں عصرانہ تھا۔ لوگ لان میں جمع تھے اور مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک ٹولی میں شامل تھا۔ ایک سفار تکار کہنے لگے، یہ لوگ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ناقابل برداشت صدمہ بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ زمین پھٹ پڑے، آسمان گر جائے، تارے ٹوٹ جائیں، چاند سیاہ ہو جائے یہ اپنے معمول میں فرق نہیں آنے دیتے۔ ہمراہی مارے جارہے ہوں، جنازہ پر جنازہ اٹھ رہا ہو، چہلم پہ چہلم منایا جارہا ہو، یہ لوگ ایک طرف بھرپور سوگ منائیں گے اور دوسری طرف آئین سازی، قانون سازی، الیکشن اور ہمہ پرسی میں مصروف نظر آئیں گے۔ بلکہ حیرت ہے کہ اور کئی چھوٹے بڑے کاموں کے لئے وقت نکال لیں گے مثلاً سپر پاور کے یرغمالیوں کا معاملہ اور امریکی سفارت کی پرزہ پرزہ دستاویزات کو جوڑنے کا مسئلہ۔ ہمسایہ سے جنگ اس کے علاوہ ہے۔

فرزند خوری کچھ ان کا بگاڑ سکی نہ آپس کے اختلافات۔ وزیراعظم بازرگان ساتھ چھوڑ گئے۔ وزیر خارجہ یزدی علیحدہ کر دیئے گئے۔ سرکاری ترجمان امیر انتظام جیل میں سڑ رہے ہیں۔ منتظری جن کو آیت اللہ خمینی نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا ان کی نامزدگی منسوخ ہو چکی ہے۔ بنی صدر جنہیں صدارت کے عہدہ کے لئے گیارہ ملین ووٹ ملے تھے وہ بھی عورتوں کے کپڑے پہن کر فرار ہو گئے ہیں۔ آیت اللہ العظمی شریعت مداری عضو معطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک طرح سے وہ حالت حراست میں ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود انقلاب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا گراف ہر روز بلندی کی جانب بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس سے بڑھ کر حیرت کی اور کیا بات ہو گی۔

بات یہاں تک پہنچی تو ایک شخص نے آکر ہماری ٹولی کو تازہ ترین خبر سنائی۔ حیرت سے سب کی آنکھیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پتہ چلا کہ کوئی ایک گھنٹہ پہلے وزیراعظم کے دفتر میں ایک میٹنگ کے دوران بم پھٹا ہے۔ صدر باہنر اور وزیراعظم رجائی دونوں اس حادثہ میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ مہمانوں نے فوراً مشروبات کے گلاس، چائے کی بڑی اور کافی کی چھوٹی پیالیاں میز پر رکھ دیں اور کار پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔

صدر باہنر اور وزیر اعظم رجائی کا جنازہ مجلس کی عمارت سے اٹھا۔ کوئی دس بج کر پچاس منٹ ہوں گے۔ پوسٹر، ہجوم، ماتم، تین ایمبولنس گاڑیاں۔ عمارت میں آگ لگنے کی وجہ سے لاشوں کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ وزیر اعظم کی لاش ان کی بیوی نے دانتوں کی مدد سے شناخت کی۔ تیسری لاش کو وزیر اعظم کے دفتر کے ایک اہم اہل کار مسعود کشمیری شہید کی لاش کے طور پر شناخت کیا گیا۔ مجلس کی عمارت میں جمع ہونے والا ہجوم میں نے خود دیکھا۔ میں اس میں شامل تھا۔ آگے جانے کی جگہ نہ ملی اور میں وہاں سے واپس گھر آ گیا۔ پتہ چلا کہ وزیر اعظم اور صدر کو دفنانے کا کام سہ پہر کے پونے تین بجے ختم ہوا تھا۔ لوگ اپنے رہنماؤں کو دفناتے دفناتے تھک گئے ہیں۔ اب اس کام میں دیر نہیں لگاتے۔

کفن دفن سے فارغ ہوئے کوئی چار پانچ دن گزرے ہوں گے تو پتہ چلا کہ جس لاش کو مسعود کشمیری شہید، سمجھ کر بڑے احترام سے دفن کیا تھا وہ کسی اور کی لاش تھی۔ مسعود کشمیری دراصل ایک جاسوس تھا جس نے انقلاب اسلامی کے ان تھک کارکن کی حیثیت سے سب کا اعتماد حاصل کیا اور ایک دن موقع پاکر وزیر اعظم کے کمرے میں بم والا بیگ رکھ دیا۔ بم پھٹنے سے ذرا پہلے وہ خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ کل جو لوگ اس پر درود بھیجنے میں مصروف تھے آج مرگ بر مسعود کشمیری کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ کل اسے اعزاز کے ساتھ خاک کے سپرد کیا تھا آج اسے تلاش کرنے اور زندہ گرفتار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

(10)

ایک دن صبح دس بجے جرمن سفیر اپنی موٹر میں دو رویہ بزرگ راہ پر عباس آباد کے بارونق اور آباد علاقہ کے قریب پہنچا تو آگے چلنے والی سست رفتار پیکان کار یکایک کھڑی ہو گئی۔ سفیر کے ڈرائیور نے بریک لگائی۔ دو موٹر سائیکل سفیر کی موٹر کے دائیں بائیں آ گئے۔ ان کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے مسلح نوجوانوں نے دونوں جانب سے فائر کھول دیا۔ سفیر کے ایرانی ڈرائیور نے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے بلٹ پروف مرسڈیز کو تیز کیا اور پیکان

کو ٹکر ماری۔ وہ ہلکی سی گاڑی اچھل کر فٹ پاتھ پر جا چڑھی۔ راستہ صاف ہو گیا۔ ڈرائیور موٹر بھگا کر سفارت خانہ جا پہنچا۔ حملہ آوروں کا منصوبہ تھا کہ جرمن سفیر کسی طرح بچ کر نہ جانے پائے۔ وہ صرف اس لئے بچ گیا کہ سفارت خانہ کی موٹر بلٹ پروٹ ہونے کی وجہ سے اتنی وزنی ہے کہ پیکان جیسی سبک موٹر اس کا راستہ کاٹ تو سکتی ہے مگر اسے روک نہیں سکتی۔ اس حادثہ کے بعد بہت سے سفراء جرمن سفیر سے ملنے کے لئے گئے۔ حملہ میں اسے خراش تک نہ آئی مگر اس کی حالت غیر تھی۔ صدمہ سے اس کے اعصاب متاثر ہو چکے تھے۔ ایسے مریض کا ایک ہی علاج ہوتا ہے جس کا انتظام جرمنی کی حکومت نے اس تیزی سے کیا کہ شام ہونے تک سفیر موصوف خصوصی جہاز پر چڑھ کر وطن واپس چلے گئے۔ ایک سفارت کار نے کہا، خوش نصیب تھا، بچ گیا۔ دوسرے نے کہا، بہت خوش نصیب ہے، ٹرانسفر پر گھر چلا گیا ہے۔

گیارہ بجے دن کا وقت تھا۔ میں سفارتی نمبر پلیٹ والی سرکاری مرسڈیز میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری ساتھ والی نشست پر اخبار رکھا ہوا تھا جس میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔ آر سی. ڈی مردود شد۔ علاقائی اقتصادی تعاون کا منصوبہ رد کر دیا گیا۔ موٹر بزرگ راہ سے ہوتی ہوئی جب امیر آباد کے بارونق علاقہ میں پہنچی تو ایک سست رفتار پیکان اچانک سامنے آ گئی۔ پھر دائیں اور بائیں دونوں جانب سے دو موٹر سائیکل سوار آ گئے۔ ان کی پچھلی سیٹوں پر مسلح نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ موٹر سائیکل سوار قریب آئے۔ شیشہ میں سے اندر جھانکا اور تھوڑی دور تک موٹر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ سامنے والی موٹر نے راستہ چھوڑ دیا۔ موٹر سائیکل نے رخ بدلا۔ جیسے اچانک نمودار ہوئے تھے اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے۔

سبز کوہی نے جو سرکاری موٹر چلا رہے تھے خشک گلے کو تر کیا اور آہستہ سے کہا، آقای۔ اور پھر خاموش ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ان کی آواز آئی۔ آہستہ لیکن صاف۔ آقای، الحمدللہ۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے جواب میں کیا کہا۔ البتہ وہ جواب مجھے یاد ہے جو میں نے تہران میں اپنے قیام کے آخری دنوں میں ایک سفارت کار کو دیا تھا۔ اس نے کہا، الحمدللہ کہ آپ بخیریت گھر واپس جا رہے ہیں آپ نے ایران میں کم و بیش تین ساڑھے تین خون آلود سال عجب حالت خوف و خطر

میں بسر کیے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ میں نے چار سال کے قیام میں ہولناکی اور وحشت کے صرف تیس سیکنڈ بسر کیے ہیں۔ یہ وہ تیس سیکنڈ تھے جب میری موٹر امیر آباد کے علاقہ سے گزر رہی تھی۔ سامنے ایک پیکان تھی۔ دائیں بائیں دو موٹر سائیکل۔ اور ان کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو رائفل بردار انقلابی۔

(11)

گولی چل رہی ہے۔ آگ لگ رہی ہے۔ بم پھٹ رہے ہیں۔ جنازے اٹھ رہے ہیں۔ قبرستان زندہ ہو گئے ہیں۔ تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ بستیاں سونی ہو گئی ہیں۔ محل خالی پڑے ہیں۔ کوچہ و بازار مورچے بن گئے ہیں۔ انقلاب اور ضد انقلاب میں دست بدست لڑائی ہو رہی ہے۔ انقلاب اگرچہ کئی محاذوں پر مصروف ہے مگر فرزند خوری کے لئے کچھ وقت نکال لیتا ہے۔ شط العرب کی سرحد پر دو مسلمان ملک لڑائی میں مصروف ہیں۔ تہران میں نوجوان نظر نہیں آتے۔ محاذ جنگ پر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے لاشوں اور زندہ لاشوں کی آمد باقاعدہ اور بدستور ہے۔ اس قاعدہ اور دستور کو تقریباً تین سال ہونے کو آئے ہیں۔ اے جواناںِ عجم، جانِ من و جانِ شما، تمہیں کس کی نظر لگ گئی ہے۔

باب دواز دہم

فردِ جرم

جب تک وہ تخت نشین تھا۔ اس کے نام کے ساتھ طرح طرح کی باتیں، افواہیں اور کہانیاں وابستہ تھیں۔ جب وہ تخت اور ملک چھوڑ کر چلا گیا تو اس کے بارے میں صرف ایک کہانی باقی بچی۔ آج کل اہل قلم اس کہانی کو جوڑنے، کہنے اور لکھنے میں مصروف ہیں۔ یہ کہانی تخت کا تختہ ہونے کے بارے میں ہے اور لوگ اسے بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ دو کم چالیس برس بادشاہی کرنے والا پختہ کار اور چوتھائی صدی پہلے ملک سے فرار ہونے اور ہفتہ بھر میں دوبارہ تخت نشین ہونے والا تجربہ کار شخص آخری دنوں میں کیوں اس قدر خراب و خوار ہوا۔ زمین کا نہ آسمان کا۔

ہر قصہ گو اپنی افتاد کے مطابق اسباب اور الزامات کی فہرست بنا رہا ہے۔ میں نے بھی بہت سے بیان جمع کئے۔ تین اسباب ان سب روایات میں مشترک پائے۔ پہلا، مغرب زدگی دوسرا، عیش و عشرت اور تیسرا، ظلم و ستم۔ مغرب زدگی میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ایک زندگی بسر کرنے کا مغربی انداز اور دوسرا ایک مغربی سپر پاور کا حد سے بڑھا ہوا اثر و رسوخ۔ مغرب بالخصوص امریکہ کے بارے میں ایرانی عوام کا ردعمل سڑکوں پر جلوس کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جلوس سب کو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نعرے سب کو سنائی دیتے ہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ اس لئے میں دوسرے دو اسباب کی چھان پھٹک میں لگ جاتا ہوں۔

ٹی وی پر دستاویزی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ معلوم نہیں عام ایرانی باشندہ پر ان کا کیا اثر ہوا۔ کم از کم میرے جیسے لوگ زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ ایک فلم محل میں کسی بچے کی سالگرہ کے بارے میں ہے۔ صرف اہل خانہ جمع ہیں۔ نہ زرق برق کپڑوں والے مہمان، نہ بچوں کا فینسی ڈریس، نہ تحائف کا میز پر لگا ہوا ڈھیر، نہ کوئی بازی گر، نہ کہیں بینڈ باجا۔ بس مادر ملکہ ہیں کہ اتراتی اور اٹھلاتی پھر رہی ہیں۔ ہر دادی اپنے پوتوں کو دیکھ کر اسی طرح نہال ہوتی ہے۔ بچوں سے محبت اگر عیش و عشرت ہے تو لوگوں کو دل بھر کر عیاشی کرنی چاہئے۔ ایک ٹی وی فلم شاہی بجرے کے بارے میں ہے۔ بار بار دکھائی جا رہی ہے۔ جیسے یہ کشتی کوئی عجوبہ روزگار ہے۔ نرم صوفہ، نرم بستر اور صاف ستھرا غسلخانہ دکھانے سے کہیں شاہانہ فضول خرچی کا مضمون گھڑا جاتا ہے۔ کیمرے کو پورا منظر دکھانے کے لئے جس فاصلہ کی ضرورت ہے وہ یہاں میسر نہیں۔ تصویریں ایسی ہیں جن سے کمرے کے چھوٹے ہونے اور گیلری کے تنگ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں امیر صنعت کاروں اور تاجروں کے ہوائی جہازوں، بجروں اور موٹروں کی تصویریں رنگین مصور اخبارات میں روز چھپتی رہتی ہیں، اور ٹی وی پر ان کے طرز زندگی کی دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، وہاں اس کشتی کو کون خاطر میں لائے گا۔ ایک بجرا یونانی جہاز راں اوناسس کا ہوا کرتا تھا۔ جس میں وہ مشاہیر کو سیر کے لئے لے جاتا تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا اور شاندار تھا۔ بنکاک میں شاہی بجرا سنہری رنگ کا ہے۔ نہ اس پہ نظر جمتی ہے اور نہ ان سنہری لمبوتری ٹوپی اور سلک کے بغیر آستین کے چست فراک پہننے والی خواتین پر جو اس کشتی پر پرا جمائے ہوتی ہیں۔

ٹی وی نے بہت سا وقت محل دکھانے پر صرف کیا۔ کچھ حصہ قصر سعد آباد کا اور کئی حصے کاخ نیاوران کے۔ ان میں بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ خاص بات دیکھنی ہو تو فرانس میں ورسائی، فاؤنٹین بلیو اور لوور کا چکر لگانا چاہئے۔ ویانا کا امپیریل پیلس، ماسکو کا اوستن کینو پیلس سینٹ پیٹرز برگ کے ماربل پیلس اور ونٹر پیلس دیکھنے کے بعد سعد آباد اور نیاوران بالکل نہیں جچتے۔ بکنگھم پیلس جیسا کم حیثیت محل بھی ان سے کہیں بہتر ہے۔ دستاویزی فلم کا پیغام یہ ہے کہ اگر اسراف شیطان کا کام ہے تو محلات کے یہ مناظر دیکھنے کے بعد ناظرین خود طے کریں کہ رضا شاہ کتنا بڑا شیطان تھا۔ ایک ناظر اس فلم کو دو

تین بار دیکھنے کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ یہ شیطان ہرگز اتنا بڑا نہیں ہے جتنا نئی انتظامیہ سمجھتی ہے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں بڑے بڑے شیطان آباد ہیں پبلسٹی کرنے والوں نے دنیا دیکھی اور نہ اسراف کی مثالیں۔ قومی دولت ضائع کرنے والے شیطانوں میں یہ شیطان چھوٹا اور کنجوس لگتا ہے۔

قصر سعد آباد کے احاطہ میں دو چار گھر بنے ہوئے ہیں۔ مادر ملکہ کے ولا کے خلاف اعتراض یہ ہے کہ اس گھر کے اندر ایک سینما گھر واقع ہے۔ ایک ہال کمرا ہے۔ چالیس پچاس صوفہ کرسیاں رکھی ہوئی ہیں اور چھوٹی سکرین لگی ہوئی ہے۔ جن دنوں ہمارے وزیراعظم کا دفتر راولپنڈی میں جو کا خمیر اٹھانے اور شراب بنانے والے کارخانہ کے جنرل منیجر کے گھر میں واقع تھا ان دنوں وہاں دہرے کام کے لئے ایک چھوٹا سا ہال بنایا گیا۔ دو سو کے قریب نشستیں تھیں۔ نام آڈیٹوریم یعنی سماعت گھر رکھا گیا۔ ابھی دیواریں گیلی تھیں کہ اس خصوصی سینما گھر میں ہفتہ وار فلم شو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ باری باری چند سول اور فوجی افسر بھی وزیراعظم کے ہمراہ فلم دیکھنے کے لئے بلائے جاتے۔ یوسف بچ فلم کا تعارف کراتے۔ ایک دن فلم کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔ یہ نپولین کے بارے میں ہے۔ مگر وہ نپولین نہیں جسے ہالی وڈ نے چارلس بوائر اور وی وین لے کی اداکاری کے سہارے ایک عاشق مزاج فوجی جینئس ثابت کیا ہے۔ یہ فلم نپولین کی نفسیاتی کیفیت کا سائنٹفک اور گہرا مطالعہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بڑے فیصلے، بڑی فتوحات، بڑی حرص اور بڑی الجھنیں کس طرح ایک جینئس کو نفسیاتی اور ذہنی مریض بنا دیتی ہیں۔ اس روز اتفاقاً آڈیٹوریم میں فوجی افسر اور ان کی بیگمات کی تعداد دیگر حاضرین سے کچھ زیادہ تھی۔ لیکن جس شخص کو یہ پیغام پہنچنا چاہئے تھا کہ بوناپارٹ ازم میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی، وہ ان دنوں اردن میں بریگیڈیئر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اس لئے فلم دیکھ سکا نہ بچ صاحب کی تقریر سن سکا۔ یوسف بچ کی پانچ منٹ کی تعارفی تقریر ہمیشہ خاصہ کی چیز ہوتی تھی۔ ایک دن عزیز احمد کے حکم سے یہ تقریر بند ہو گئی۔ چند دن بعد افسروں کو اس سینما گھر میں بلانے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ خودپسندی اور امارت پرستی سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ایک کو خوش کلامی گوارا نہ تھی، دوسرے کو شائستہ ساتھی ناپسند تھے۔

شاہزادی اشرف کا ولا چھوٹا سا ہے۔ جس کمرے میں وہ پروجیکٹر یا وی سی آر پر

فلمیں دیکھتی تھی وہ بھی چھوٹا سا ہے۔ البتہ اس کمرے میں رسالوں اور فلموں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ رسالے باتصویر اور فحش۔ فلمیں بھی ساری کی ساری فحش۔ اسلامی انقلابی ٹی وی پریشان ہے کہ ناظرین کو کیونکر بتائے کہ اس ذخیرہ میں کیا کیا مال ہے۔ جو کچھ ہے وہ ٹی وی پر دکھائے جانے کے لائق نہیں ہے۔ نقل کفر کفر ہو یا نہ ہو مگر بے حیائی کی نقل بڑی بے حیائی کی بات ہوتی ہے۔ برا کام ایک حد سے گزر جائے تو اس کی اصلاح کرنے والے مخمصہ میں پھنس جاتے ہیں۔ تفصیلات پیش نہیں کر سکتے۔ برائی کو اچھائی پر یہ کتنی بڑی فوقیت حاصل ہے کہ اس کے عیب جاننے والے اس کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ شہزادی کی لائبریری میں جو تصویریں سیدھی رکھی ہوئی تھیں وہ کیمرے کی آنکھ سے دور تھیں۔ آؤٹ آف فوکس۔ جو بالکل سامنے تھیں انہیں کسی نے الٹ دیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے کراچی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شاعر افسر نے خودکشی کرلی۔ بعد مرنے کے اس کے گھر سے جو سامان نکلا اس میں چند تصویریں بھی تھیں۔ چیف سیکرٹری اور گورنر کو ملاحظہ کے لئے پیش کی گئیں۔ چیف سیکرٹری پہلی تصویر پر لاحول پڑھ کر پرے ہو گئے۔ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔ نیک دل حوصلہ مند گورنر نے ساری تصویریں غور سے دیکھیں اور ہر ایک پر باری باری بآواز بلند لاحول بھیجی۔ چیف سیکرٹری نے بار بار لاحول پڑھنے اور بھلائی حاصل کرنے کا موقع کھو دیا۔ گورنر سارا ثواب اور ساری تصویریں سمیٹ کر لے گئے۔

شہزادی اشرف پہلوی کی رسوائی اور ان کے مشاغل کے بارے میں حرف آخر ایک کارٹون ہے۔ یہ ساری فلموں اور تصویروں پر بھاری اور ان سے کہیں زیادہ گویا ہے۔ کارٹون میں ساری جگہ شہزادی کے خاکہ نے گھیری ہوئی ہے۔ وہ بڑے طمطراق مگر مضحکہ خیز انداز میں کھڑی ہے۔ اس نے ایک طرف سے اپنے سکرٹ کو چٹکی میں پکڑ کر ٹخنوں تک اٹھایا ہوا ہے۔ سکرٹ کے نیچے درجنوں کے حساب سے یار لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ کارٹون پر لکھا ہے، بے عنوان۔ ایک پاکستانی نے کارٹون کا تراشا دوستوں کو دکھانے کے لئے سنبھال لیا اور عنوان کی جگہ یہ شعر لکھ دیا۔ تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے۔

قمار بازی کا ایک بہت بڑا مرکز شہنشاہ کی نگرانی میں زیر تعمیر تھا۔ خلوت پسند خواص

کے لئے۔ عوام کی نظروں سے دور۔ امیر آدمیوں کی دسترس سے باہر۔ صرف امیر الامراء اور امیرامیراں کے لئے۔ جزیرۂ کیش کو اس مرکز کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس پانچ سو ملین ڈالر کے شہر عشرت کی منصوبہ بندی کے لئے سٹینلے منصف کا انتخاب ہوا۔ میر عمارت کا کام بھی اس کی فرم کو مل گیا۔ نقشہ منظور ہونے کے بعد عمارت سازی کا ٹھیکہ بھی اسے دے دیا گیا۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ جب منصف نے انتظامیہ کی شکایت کی تو شہنشاہ نے اسے جزیرہ کیش کا گورنر بنا دیا۔ گورنر صاحب نے ہزاروں پودے ہوائی جہاز سے منگائے۔ گھاس برطانیہ سے آئی۔ مہماندار خواتین فرانس سے در آمد کی گئیں۔ ٹی وی کا انتظام امریکہ نے کیا۔ ہوائی اڈا اتنا بڑا بنایا کہ آواز کی رفتار سے تیز تر کنکارڈ نے پیرس سے کیش تک پرواز شروع کر دی۔ کیش میں پانچ دس ہزار افراد کے لئے جو نیا بجلی گھر بنایا گیا اس کی پیداوار تہران کے ستر لاکھ افراد کے لئے مہیا کی جانے والی بجلی کا نصف ہے۔ تہران میں بجلی کی بندش کا یہ عالم ہے کہ انقلاب کے بارے میں میری یادداشت کا بیشتر حصہ گیس کے سفری لیمپ اور موم بتی کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اگر میں ان دنوں کیش میں ہوتا تو بے شک وہاں بجلی کی روشنی میسر آتی مگر لکھنے کے لئے واقعات اور تجربات کہاں سے لاتا۔ جزیرہ سنسان ہے۔ عمارتیں ویران۔ شبستان میں کوئی شب باش نہیں۔ عشرت کدہ کی آغوش خالی ہے۔

کیش کی عیش گاہ نو تعمیر کھنڈرات پر مشتمل ہے۔ فتح پور سیکری کی طرح اس شہر کی تعمیر کو شہرت ملی مگر آباد ہونا نصیب نہ ہوا۔ کیش کے معمار نے جزیرے کی عمارتوں کے لئے ایک نشان امتیاز منتخب کیا اور اس کا نام محراب کیش رکھا۔ ہندسی انداز کی دو لکیریں زمین سے اٹھتی ہیں اور بلندی پر جہاں انہیں مل کر محراب مکمل کرنی ہے وہاں ایک دوسرے کے قریب آکر رک جاتی ہیں۔ ان کے درمیان ذرا سا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ جیسے کسی ارادہ کی تکمیل ہوتے ہوتے رہ جائے۔ یہ شگاف ایک برا شگون ثابت ہوا۔ کام ختم ہونے کے قریب آیا اور منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ عمارتیں نئی نویلی ہیں مگر آسیب زدہ۔ بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب۔ وہ نحوست جو کبھی شاہ افراسیاب کے محل کے گنبد پر برستی تھی آج کل محراب کیش پر برس رہی ہے۔ گنبد پرانا مگر پائدار تھا۔ محراب نئی ہونے کے باوجود بے حد پرانی لگتی ہے۔ ولی عہد کا ولا بھی خالی ہے۔ اس کے لئے فرنیچر فرانس سے در آمد کیا گیا تھا۔ دو

ملین فرینک خرچ اٹھا۔ ولا خالی، فرنیچر بے کار۔ خانۂ خالی را دیو می گیرید۔ مگر دیو اس فرانسیسی فرنیچر کا کیا کرے گا جو اس کے قد کاٹھ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ کھڑکی کھولے گا اور سارا فرنیچر سمندر میں پھینک دے گا۔ شہنشاہ کا ولا بھی خالی ہے۔ اس میں اب کون ٹھہرے گا۔ جس نے شوق سے بنوایا تھا اس پر اس کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ زمین پر جنت تعمیر کرنے والوں کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے۔ قوم عاد کے بادشاہ شداد نے بھی ایک فردوس بنایا تھا۔ طرح طرح کی عمارتیں، قسم قسم کے درخت۔ باغ بہشت کی تکمیل ہوئی۔ شداد دیکھنے کے لئے گیا۔ دروازے تک پہنچا۔ وہاں ملک الموت سے ملاقات ہو گئی۔ جسے اپنی بنائی ہوئی زمینی بہشت میں داخلہ نہ ملا اسے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی آسمانی بہشت میں کون داخل ہونے دے گا۔

ونگ کمانڈر افضل کہتے ہیں کہ جو بات شداد کے بارے میں صرف موت کے فرشتہ کو معلوم تھی وہ شہنشاہ کے بارے میں صرف امریکہ کو معلوم تھی۔ وہ ایک امریکی کو لے کر کیش گئے تھے۔ سیر کرتے ہوئے اس امریکی مہمان نے ایرانی طیارہ کے پاکستانی ہوا باز سے کہا۔ شہنشاہ کے اس محل کو دل بھر کر آج دیکھ لو۔ ایک سال کے بعد کیش میں کوئی محل باقی نہیں رہے گا۔ افضل کا خیال ہے کہ ایرانی انقلاب کا آغاز امریکہ کی رضامندی سے ہوا۔ بادشاہ کی تابعداری میں کمی آ رہی تھی۔ تیل کی عالمی سیاست کا تقاضا تھا کہ تیل بر آمد کرنے والے ممالک کی انجمن کو کمزور کیا جائے۔ ایران اقتصادی ترقی کر رہا تھا۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ حالت ماتحتی سے نکل کر خود انحصاری کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اٹل اصول یہ ہے کہ جہاں کوئی ترقی پذیر ملک خود انحصاری سے ایک نسل کے فاصلہ پر رہ جائے اس کا راستہ روک لو اور اسے سو پچاس سال پیچھے دھکیل دو۔ افضل نے کہا، جس ملک میں چڑیا پر مارنے سے پہلے امریکی اجازت نامہ حاصل کرے وہاں یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ مہینوں سڑکوں پر انقلاب کی دھوپ میں مارے مارے پھریں اور ان کے سروں پر امریکہ کی نیک خواہشات کے سائبان کا سایہ نہ ہو۔

جزیرۂ کیش کا نام میرے حافظہ میں تین حوالوں سے محفوظ ہے۔ قناعت، اسراف اور کالا پانی۔ اسراف کا ذکر ہو چکا۔ قناعت کا قصہ سنئے۔ ایک شب سعدی کو جزیرۂ کیش میں ایک بڑے سوداگر کے گھر ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ساری رات وہ سوداگر سعدی سے اپنی

تجارت اور دولت کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ تجارت کون کون سے ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ مال تجارت کے ذخائر میں کیا کچھ ہے۔ جائداد میں کتنی عمارتیں اور زمینیں شامل ہیں۔ سوداگر نے سعدی سے کہا کہ ایک تجارتی سفر درپیش ہے۔ یہ پھیرا خیریت سے تمام ہو جائے تو میں باقی ماندہ عمر کسی گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گا۔ سعدی نے پوچھا، یہ کون سا سفر ہے۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ جواب ملا، ایران سے چقماق لے کر چین جاؤں گا، وہاں سے چینی کے برتن لے کر روم۔ روم سے سلک لے کر ہندوستان، اور ہندوستان کا فولاد لے کر حلب۔ حلب کا شیشہ لے کر یمن، اور یمن سے کپڑا لے کر فارس۔ بس اس کے بعد تجارت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ سعدی نے یہ سنا تو دو شعر پڑھے۔ مطلب یہ تھا کہ دنیا دوست کی حریص آنکھوں کو یا قناعت پر کند یا خاک گور۔ قناعت انسان کو غنی بنا دیتی ہے۔ حرص قبر تک پیچھا کرتی ہے۔

کیش کا آخری حوالہ ایک طرفہ تجویز سے متعلق ہے۔ امریکہ اس جزیرہ سے وہی کام لینا چاہتا تھا جو برٹش انڈیا کی حکومت نے جزائر انڈیمان سے اور برطانوی حکومت نے سینٹ ہلینا کے جزیرہ سے لیا تھا۔ جب ایران نے امریکی سفارت کاروں کو یرغمالی بنا لیا اور مہینوں ان کی رہائی کی صورت نہ بنی تو امریکہ میں مختلف تجاویز پر غور کیا گیا۔ ایک تجویز یہ تھی کہ کمانڈو بھیجے جائیں جو آیت اللہ خمینی کو اغوا کر لیں۔ اغوا کے بعد آیت اللہ کو جزیرہ کیش میں نظر بند کر دیا جائے۔ تجویز پیش کرنے والا بڑا ستم ظریف تھا۔ مسجد کے حجرہ میں رہنے والے کو ایک ایسی عیش گاہ میں نظر بند کرنا چاہتا تھا جہاں توبہ بھول جائے اور وضو ٹھنڈے ہو جائیں۔

ٹی وی پر پہلوی خاندان کی پر تعیش زندگی کے مناظر دکھانے کے فوراً بعد عوام کی غربت کے مناظر دکھائے جاتے ہیں تاکہ فرق زیادہ نمایاں ہو۔ گاہے ٹی وی والے کسی خستہ حال سے شہنشاہ کے بارے میں اس کی رائے پوچھ لیتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان کے ایک آدمی نے جسے غربت نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا فارسی میں شہنشاہ کو برا بھلا کہا اور اسی روانی سے دم لئے بغیر اردو میں اسے ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ یہ پروگرام تین چار بار ٹی وی پر دکھایا گیا تب جا کر کسی نے ان کو بتایا کہ اس شخص کی اردو کتنی غیر فصیح ہے۔

جہاں ایران میں مغرب زدگی اور بے راہ روی کا ذکر ہو وہاں ایک شادی کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے۔ 1968ء میں جنرل خسروانی اور جنرل جہاں بانی کے لڑکوں کی آپس میں شادی کھلم کھلا اور بڑی دھوم دھام سے کموڈور ہوٹل میں منعقد ہوئی تھی۔ جنرل خسرو کا بیٹا کیواں، معلوم نہیں وہ دولہا تھا کہ دلہن، ملکہ فرح کی پوشاک کے ڈیزائن تیار کرتا تھا۔ سمدھیوں کے عہدوں اور زوجین میں سے ایک فرد کی محل میں آمدورفت کے پیش نظر لوگوں کا یہ الزام درست معلوم ہوتا ہے کہ اس بے حیائی کا حاکم وقت کو نہ صرف علم تھا بلکہ اس کی سرپرستی اور تائید بھی حاصل تھی۔ گمراہی کو علانیہ جائز قرار دینے کے اس واقعہ اور اس پر مسرت کا اظہار کرنے کے لئے منعقد ہونے والی تقریب نے لوگوں کو بہت آزردہ کیا۔ کئی ایسے روحانیان جو سیاست سے بے تعلق تھے اس بے ہودہ اور نامعقول تقریب کے بعد شاہ کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ مغرب زدہ لوگوں نے اسے قدیم و جدید کی ہمیشہ جاری رہنے والی آویزش کا نام دیا اور گمراہی کے راستہ پر اپنا سفر تیز تر کر دیا۔ شاہ کے آخری دنوں میں بے حیائی اور مے نوشی کے عام ہونے کا شماریاتی جائزہ ایک دن مجلس میں پیش ہوا۔ شراب بنانے کے چالیس کارخانے۔ دو سو مے خانے۔ چھ سو ایسی طعام گاہیں جہاں کھانے کے ساتھ پینے پلانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بیئر کی روزانہ کھپت چار لاکھ بوتلیں۔ جسم فروشی کے ایک سو ساٹھ بڑے مراکز اور ایک ہزار سے زائد چھوٹے اڈے۔ بڑے مراکز کو کلب اور کیسینو کا نام دیا جاتا، چھوٹے مراکز مہمان سرائے کہلاتے۔ ایک مرکز کے ریکارڈ کے مطابق صرف اس عشرت کدہ سے چودہ ہزار افراد فیض یاب ہوئے تھے۔ یہ سارے اعداد و شمار محض ایک شہر کے ہیں جو پہلوی بادشاہت کا پایہ تخت ہے۔ باقی ملک کا عالم کیا ہو گا۔ قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا۔

(2)

1967ء کی بات ہے۔ محمد رضا شاہ کے سر میں نہ جانے کیا سودا سمایا کہ اس نے تخت نشینی اور تاجپوشی کا جشن منانے کا اعلان کر دیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ڈاکٹر مصدق

کے عہد میں اسے رسید دے کر بنک مرکزی سے تاج شاہی حاصل کرنا پڑتا اور استعمال کے بعد فوراً محافظ خانہ میں جمع کرانا ہوتا۔ جہاں بادشاہ سے اس کا تاج واپس لینے والے سر پر سوار ہوں وہاں تاج پوشی کے جشن کا کیا فائدہ۔ شاید وہ یہ بھول گیا کہ اسے تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے چھبیس برس گزر چکے ہیں۔ اتنی طویل مدت کے بعد تخت نشینی کی رسم ادا کرنے کے کیا معنی۔ تخت نشینی کی باقی مدت بہرحال گزرے ہوئے دنوں سے کم ہوگی۔ پھر اس تکلف کی کیا ضرورت۔

جشنِ تاجپوشی کا تماشا سب نے دیکھا۔ اس تماشے کے لئے ایران کے آئین میں ترمیم کی گئی۔ بادشاہ کے ساتھ ملکہ فرح کی تاجپوشی بھی ہوئی۔ ایران نے اس سے پہلے جس ملکہ کی تاجپوشی کی تھی اسے انتقال کئے ہوئے کوئی تیرہ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اتنی پرانی روایت کو توڑنے کا فیصلہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن وہ بادشاہی کیا جس میں بادشاہ کی اور لوگوں کی عقل نہ ماری جائے۔ لوگوں کی سمجھ میں وہ اعلان بھی نہیں آیا جو بادشاہ نے جشن تاجپوشی کے موقع پر کیا تھا۔ منکہ مسمّی محمد رضا ولد رضا شاہ، ذات پہلوی، پیشہ بادشاہت، بہ قائمی ہوش و حواس اہل ایران کو بتانا چاہتا ہوں کہ عرصہ ہوا میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں گداگروں اور لاچاروں کا شہنشاہ کہلانا پسند نہیں کروں گا۔ اس عہد کی پاسداری کرتے ہوئے میں نے ربع صدی تک اس تقریب کو التوا میں ڈالے رکھا۔ اب چونکہ ملک اور لوگ خوش حال ہو گئے ہیں اور فلاں ترقیاتی منصوبہ مکمل ہو گیا ہے اور فلاں شروع ہو گیا ہے چنانچہ تاجپوشی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں یہ پہلوی تاج جس میں تین ہزار تین سو ہیرے جڑے ہیں اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنے سر عزیز پر رکھ لیتا ہوں بالکل اسی طرح جیسے نپولین نے اپنے ہاتھ سے اپنی تاجپوشی کی تھی اور پاس کھڑا ہوا پوپ ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔ چونکہ میں فرح کا ان معنوں میں سرتاج ہوں جن میں فوزیہ مصری اور ثریا اسفندیاری کا نہ بن سکا تھا لہٰذا میں ایک چھوٹا سا تاج زوجہ محترمہ اور والدہ ولی عہد کے سر پر بھی سجا دیتا ہوں۔ جس وقت میں نے اپنے سر پر تاج رکھا اس لمحہ مجھے بے اختیار وہ انگریزی مقولہ یاد آیا کہ جس سر پر تاج رکھا ہوا ہو وہ ہمیشہ بے آرام رہتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ تاج پہنتے ہی اس کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ یہ تاج جو میں نے پہنا ہوا ہے اس کا وزن دو کلو گرام ہے۔ جس سر پر اتنا بوجھ لدا ہو گا اسے سوچنے کا یارا ہو گا اور نہ دماغ۔ نہ جانے

ہمارے پیشرو قاچار خاندان کے بادشاہ تاج کیانی سر پر سجا کر حکومت کا کام کیسے سرانجام دیتے تھے۔ اس کا وزن ساڑھے چار کلو گرام تھا۔

ایران میں شاہی شان و شوکت کا مظاہرہ فرِّکیانی کہلاتا ہے۔ کیانی خاندان کے کمالات اور اس کے کروفر کے قصے بیشتر شعر اور افسانہ کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ رضائیے تو خیر نئے نئے پہلوی بنے تھے اور قاچار نقلی کیانی تھے مگر ساسانی جو ظہور اسلام کے وقت ایران کے حکمران تھے وہ بھی فرِّکیانی کی پرفریب روایت کا شکار ہو گئے۔ ان کا خدائی کا دعویٰ جتنا بے وزن تھا تاج شاہی اسی قدر وزن دار تھا۔ یہ ایسا گردن توڑ اور بھاری بھرکم تاج تھا کہ اگر بادشاہ کے سر پر رکھ دیا جاتا تو اس کا منکا ڈھلک جاتا۔ سیرۃ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ کسریٰ کا سونے چاندی اور لعل و زمرد کا تاج اتنا وزنی سرپوش تھا کہ اسے سونے کی زنجیر کے ساتھ دیوان خانہ کی ایک محراب سے باندھ کر تخت کے اوپر لٹکایا ہوا تھا۔ بادشاہؒ تخت پر بیٹھ کر اپنا سر اس تاج میں اڑس لیتا۔ پھر اس کے سامنے لگے ہوئے پردے ہٹا دیئے جاتے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتیں۔ لوگ بے اختیار سجدہ میں گر جاتے۔ لوگوں کو زیر کرنے کے لئے بے چارے بادشاہوں کو طبیعت پر کتنا جبر کرنا پڑتا ہے۔ سر پر کیا کیا بوجھ اٹھانے ہوتے ہیں۔ پسِ پردہ کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ خداوندا، خدائی دردِ سر ہے۔

فرِّکیانی ایرانی تاریخ اور ایرانی مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ سن عیسوی کی آٹھویں دہائی میں تین بار اس کا مظاہرہ اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ ساری دنیا نے اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے کے لئے وقت نکالا۔ 1971ء میں ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا جشن۔ 78-1973ء میں تیل کی بے پناہ دولت کے بے جا خرچ کا پنج سالہ جشن۔ 79-1978ء میں انقلاب ایران کا جشن۔

قیام بادشاہت کی ڈھائی ہزارویں سالگرہ اس انداز سے منائی گئی جیسے چار سال قبل منعقد ہونے والا جشن تاجپوشی اس فلم کا ایک ٹریلر تھا۔ نوعیت، مہمان داری اور اخراجات کے اعتبار سے یہ جشن شاہانہ تھا۔ کارروائی اور برنامہ کی رعایت سے یہ تقریب فلم، ڈرامہ، ثقافتی شو اور سرکس پر مشتمل تھی۔ سائرس کی قبر کے سرہانے ہیلی کاپٹر سے اتر کر سائرس کو خطاب کرنا ڈرامہ کا حصہ تھا۔ تختِ جمشید پر بیٹھ کر مختلف ادوار کے سپاہیوں کے پہناوے اور

متروک اسلحہ کے ساتھ فوج کے دستوں کی سلامی لینا ایک فلمی منظر تھا۔ ثقافت اور مہمان نوازی کے نام پر زندہ ناچ گانا ہوتا رہا۔ ریاست اور حکومت کے سربراہان کی رہائش کے لئے جو خیمہ بستی بسائی گئی تھی اس کا مرکزی شامیانہ دیکھ کر ایسے لگتا جیسے پاسار گاد کے کھنڈرات میں کسی سرکس نے پڑاؤ ڈالا ہو۔ یہ خیمہ بستی جو کسی یورپی کمپنی کی تجرباتی اپچ کا ایک مہنگا اور بے نتیجہ شاہکار تھی صرف تین دن کے استعمال کے بعد بیکار اور بے مصرف ہو گئی۔ جس دن میں اجازت لے کر اس عظیم الشان ویرانہ کو دیکھنے گیا اسے بند پڑے ہوئے سات سال ہو چکے تھے۔ میں نے ایک رہائشی خیمہ دیکھا جس میں شاید مارشل ٹیٹو ٹھہرے تھے۔ باہر سے گول دھاری دار خیمہ جس کی تکونی چھت یک رنگی تھی۔ اندر سے وہ کسی محل کا سجا سجایا کمرہ لگتا تھا۔ آرائش خانہ کے سند یافتہ ماہرین کے کتابی علم کا نچوڑ اور ان کے عملی کمالات کا نمونہ۔ میں نے اس رہائشی خیمہ میں صرف چند لمحے گزارے۔ بس ایک بار نظر بھر کر دیکھا اور دل بھر گیا۔ میں الٹے پاؤں واپس آ گیا۔ گائیڈ کو بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی۔ وہ زمانی فرنیچر کی تاریخ، شیشے کی عکسی تابانی کے معیار اور غسلخانہ کے برتنوں کی بناوٹ کے بارے میں جو لکچر یاد کئے بیٹھا تھا وہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ میں نے اسے دلاسا دیا کہ یہ رہائشی خیمہ بہت خوبصورت ہے۔ کسی کی دولت اسے شوق سے بنوانے میں پہلے ہی ضائع ہو چکی ہے اور اب یہ خیمہ اہتمام کے ساتھ دیکھنے والوں کا وقت ضائع کرنے کے کام آتا ہے۔ میں نے اس سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ ایک نظر میں حاصل کر لیا ہے۔ آرائش اور نمائش کا لطف، نصیحت اور عبرت کا سبق، سیاہ و سفید کا اندازہ۔ منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست۔ ہر جا کہ رفت خیمہ زد و خوابگاہ ساخت۔ سعدی نے ٹھیک کہا تھا۔ دولتمند کسی ویرانے میں بھی مسافرت کی مسکینی سے دو چار نہیں ہوتا۔ خیمہ لگاتا ہے۔ شبستان تیار، حرم حاضر، عیش جاری۔

بڑا شامیانہ اسی احاطہ میں ہے۔ ہم پانچ منٹ میں ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچ گئے۔ اس پانچ منٹ میں میرا خیال پاسار گاد اور شیراز سے بہت دور احمد پور شرقیہ کے قصبہ میں صادق گڑھ پیلس پہنچ گیا۔ ایک ایسی تقریب تھی جس کی خاطر رات بھر کے لئے بریگیڈئر محمد افضل ڈپٹی مارشل لا ایڈ منسٹریٹر، منظور الٰہی کمشنر بہاولپور، مسعود محمود ڈی آئی جی پولیس اور مجھے

ایک سنگ مرمر کے مہمان خانہ میں ٹھہرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا محل تھا جس میں دالان کے چاروں کونوں پر چار آپار تمان بنے ہوئے تھے۔ نواب بہاولپور کا مہمان خانہ تھا۔ راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہر شے پرانی، قیمتی اور ضرورت سے ذرا زیادہ آرام دہ تھی۔ کروٹ لو تو سنہری پلنگ جھولے کی طرح جھولتا تھا۔ گدا اتنا نرم کہ سونے والا اس میں دھنس جائے۔ دلائی اور تکیہ میں مرغابی کے پر بھرے ہوئے تھے۔ پردے مخملیں یا بنارسی۔ قالین کلاں اور دبیز۔ مجھے اس بات سے سرسری دلچسپی تھی کہ نوابوں کے مہمان خانے کیسے ہوتے تھے اس لئے وقت ضائع کئے بغیر قالین پر چادر بچھائی اور سو گیا۔

صبح ہوئی۔ ہم چاروں ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ منظور الٰہی اور میں خاموش رہے۔ مسعود محمود کا رویہ ایسا تھا جیسے انتظامات ان کے معیار زندگی کے عین مطابق ہوں۔ بریگیڈیئر افضل بار بار پہلو بدل رہے تھے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ منظور الٰہی نے انجان بنتے ہوئے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا، رات کیسی گزری۔ بریگیڈیئر افضل موقع کی تلاش میں بے چین تھے۔ بے ساختہ بولے۔ اس رات کا کیا پوچھتے ہو۔ زندگی میں اس شان و شوکت سے رات بسر کرنے کا میں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ سونے والے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ فوراً سجدے میں گرا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دل سے کہا دیکھ کہاں تیرہ کے غاروں اور کچے گھروندوں سے نکلا ہوا محمد افضل اور کہاں یہ سنگ مرمر کا مہمان خانہ۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ وزیر حضوری کرنل ہاشمی کمرے میں داخل ہوئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔ آج جگر میں ٹھنڈک پہنچی ہے۔ ان آنکھوں نے بالآخر وہ منظر دیکھ لیا جس کا عمر بھر سے انتظار تھا۔ اب کوئی حسرت باقی نہیں رہی۔ اللہ جب چاہے مجھے اٹھا لے۔ وہ مجھے راضی اور تیار پائے گا۔ سالہا سال سے اس مہمان خانے میں بڑے بڑے راجوں مہاراجوں، انگریز گورنر اور گورنر جنرل کو ٹھہراتے اور ان کی خدمت کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ آج جب میں اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو یہاں ٹھہرے ہوئے دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے غیروں کی خدمت گزاری کا کفارہ ادا ہو گیا۔ زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ آج آپ کی تواضع سے جو طمانیت حاصل ہوئی ہے یہی حاصل عمر ہے۔ یہی متاع فقیر ہے۔ شادم از زندگی خویش کہ کارے کر دم۔ یہ باتیں سن کر وزیر حضوری کے لئے

نواب بہاولپور کے انتخاب کی داد دینا پڑی۔ جی چاہا کہ تالی بجاؤں اور کسی کورنش بجالانے والے حاضرباش سے کہوں۔ جواہرات کا تھال حاضر کرو۔ ہم ہاشمی صاحب کا منہ موتیوں سے بھرنا چاہتے ہیں۔

بڑے شامیانہ کے صدر دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے جائزہ لیا۔ اس وسیع شامیانہ کا پہلا حصہ استقبال کے لئے تھا اور دوسرا ضیافت کے لئے۔ بن سنور کر بیٹھنے، آرام اور سکون سے کھانا کھانے اور ڈٹ کر پینے کا مکمل انتظام تھا۔ عیش کے لئے جس قدر آسائش اور عشرت کے لئے جس قدر آرائش کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی پورا پورا انتظام تھا۔ اس دو روزہ زندگی میں ایک سہ روزہ تقریب کے لئے اتنے انتظامات کئے گئے تھے کہ سات سال گزارنے کے بعد بھی دیکھنے والا دنگ رہ گیا۔ جو لوگ شاہی ضیافت میں شرکت کے لئے جمع ہوئے تھے ان میں دو چار بادشاہ، پانچ دس صدر، دس بیس وزیراعظم، سو پچاس وی وی آئی پی اور بے شمار وی آئی پی تھے۔ مہمانوں میں شامل ایک صدر کا نام یحییٰ خاں تھا اور ایک شہزادی کا نام گریس تھا۔ استقبالیہ میں یہ دونوں ایک ہی صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہزادی صاحبہ کا شاہی لباس اوپر سے کھلا تھا۔ شانہ نظر آتا تھا۔ صدر یحییٰ نے کاندھے پر ہاتھ پھیر کر یہ دیکھنا چاہا کہ ہالی وڈ کی سابق فلم سٹار گریس کیلی کی جلد واقعی اتنی شفاف اور ملائم ہے جتنی نظر آتی ہے یا نشے کی وجہ سے ان کی آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں۔ بھلے وقتوں میں آغا جان نسوانی جلد کی پرکھ کے نامور ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بڑی ہو گئی۔ عہدہ بہت بڑا ہو گیا۔ بری عادت نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ انہوں نے ہم نشیں کے جسم کو چھو لیا۔ یہ تجسّس ماہرانہ بےاختیاری کا نمونہ تھا مگر گریس صاحبہ کو ہمارے صدر کی یہ معصوم اور بے ضرر حرکت ناگوار گزری۔ وہ فلم ہائی سوسائٹی کی ہیروئن تھی اور پچھلے پندرہ برس سے مناکو کے شہزادہ رینئر کی ملکہ کی حیثیت سے ہائی سوسائٹی کے تمام آداب سے واقف تھی۔ اس نے غصہ بھری نگاہ ڈالی۔ پہلو بدلا اور ہم نشین کی طرف پشت کر لی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اسے طول دیتے ہوئے محترمہ نے اپنی شال منگائی اور کاندھوں پر ڈال لی۔ یہ ظاہر کرنے لگیں کہ وہ اس صوفہ سے اٹھ کر کہیں اور جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میرے احباب میں ایک صاحب سفارتی آداب کے ماہر ہیں۔ ان کے مطابق شہزادی گریس کا رویہ انتہائی توہین آمیز تھا۔ سابق فلم ایکٹریس نے پاکستان، صدر پاکستان اور یحییٰ خاں تینوں کی

توہین کی تھی۔ کہاں وہ چھ مربع میل کی نام نہاد ریاست۔ کہاں وہ علاقہ زیر حمایت فرانس۔ اور کہاں مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت۔ پاکستان میں اس واقعہ کی اطلاع سے غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ رنج و غم مغربی پاکستان کے حصہ میں آیا اور غصہ و غضب مشرقی پاکستان کے۔ غصہ میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ مشرقی پاکستان والے کہنے لگے کہ جس ملک اور اس کے صدر کا یہ حال ہو کہ مناکو کی ریاست کے آگے ہتھیار ڈال دے اس میں شامل رہنے سے خود کشی کر لینی بہتر ہے۔ بس یہ کہا اور مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش رکھ دیا۔

میں ریشمی خر گاہ کے دروازہ کے نزدیک ایک صوفہ پر بیٹھ گیا اور دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ جب یہاں جشن منایا گیا تھا ان دنوں خزاں کا موسم تھا۔ اس سال پاکستان میں خزاں بڑے زوروں پر تھی۔ آدھا چمن جل کر خاک ہو گیا۔ صدر پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر جناب یحییٰ خاں تھے۔ ان کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑا۔ وہ تاریخ کی طرف پشت کئے کھڑے بلکہ لیٹے رہے۔ ان کے یہاں ہر روز روزِ عید تھا اور ہر شب شبِ برات۔ وہ اس خیمہ بستی میں جو شہرت چھوڑ گئے ہیں اسے یاد کر کے وحشت ہوتی ہے۔ یہاں کئی ایسے سربراہان ریاست اور حکومت موجود تھے جو مشرقی پاکستان کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال کے بارے میں صدر پاکستان کو مشورہ دینا چاہتے تھے۔ ادھر صدر یحییٰ خاں کی حالت بالکل غیر تھی۔ نہ دماغ ساتھ دے رہا تھا اور نہ ان کا مثانہ۔ میزبان نے بات کرنی چاہی تو اسے جھڑک دیا۔ روس کے صدر پودگارنی نے دھمکی دی تو اسے پی گئے۔ یوگوسلاویہ کے صدر اور غیر وابستہ اقوام کے رئیس سے ملاقات کے لئے وقت پر لباس پہن کر تیار نہ ہو سکے۔ سچی بات یہ ہے کہ تیار ہو گئے تھے مگر مثانہ کی کمزوری کی وجہ سے عین وقت پر پتلون گیلی ہو گئی۔ جتنی دیر یحییٰ خاں نے نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں لگائی اتنی دیر میں مارشل ٹیٹو نے مشرقی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی۔

بحریہ کے ایک افسر جو موقع کے گواہ ہیں جشن کے قصے سنا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ جب بات لوگوں کی زبان پر چڑھ جائے تو سچائی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور روایت پر سب ایمان لے آتے ہیں۔ مثلاً یہ مشہور ہو گیا ہے کہ شاہی ضیافت کے دوران صدر پاکستان کا

پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ لوگ مارشل ٹیٹو سے ملاقات اور ضیافت والے واقعہ کا فرق نہیں جانتے۔ میں آپ کو تفصیل سناتا اور جائے واردات کی نشاندہی کرتا ہوں۔ شامیانہ کے صدر دروازہ کے ساتھ جہاں مہمانوں کی موٹریں آکر رکتی تھیں وہاں گھاس کا ذرا سا قطعہ ہے جس میں پام کے چھوٹے چھوٹے چند پودے لگے ہوئے ہیں۔ شب بھر کی بلانوشی کے بعد ضیافت ختم ہوئی۔ صدر پاکستان دروازے پر مہمانوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالے اپنی موٹر کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے جب انہیں اندازہ ہوا کو موٹروں کی قطار بہت طویل اور رفتار بہت سست ہے اور انہیں دیر تک انتظار کرنا ہو گا تو وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ادھر روشنی اور ادھر بھی روشنی۔ ادھر کیمرے کی آنکھ ادھر مہمانوں کی نظریں۔ گھاس کے قطعہ میں صرف دو چار پودے اور ہر ایک کے پیچھے حفاظتی عملہ کا کارکن چھپا ہوا۔ یحییٰ خاں کو داد دینا چاہئے۔ اس کا مثانہ لاکھ کمزور سہی مگر اس کے اعصاب بڑے مضبوط تھے۔ جونہی بات برداشت کی حد تک پہنچی اور اسے پار کرنا چاہا وہ بڑے وقار اور سکون کے ساتھ ٹہلتے ہوئے گھاس کے قطعہ میں داخل ہوئے۔ ایک پام کی طرف منہ کر کے پتلون کے بٹن کھولے اور اس کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔ ایسی آبپاشی سے سوائے نہال غم اور کون سا پودا ہے جو سرسبز ہو سکتا ہے۔ ہکّا بکّا شاہی مہمانوں نے منہ پھیر لیا۔ پاکستانی عملہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور یہ پانی ناصاف اور ناپاک تھا۔

(3)

وزیراعظم بازرگان نے مسلمان سفراء کو افطار کی دعوت دی۔ عام سا کارڈ، سائز درمیانہ، چھپائی سادہ، عبارت اس سے بھی سادہ۔ صرف تین سطریں تھیں۔ مہدی بازرگان نخست وزیر از جناب آقای مختار مسعود خواہشمند است......، تشریف لائیے اور ممنون فرمائیے۔ پاکستان میں صدر، وزیراعظم اور گورنر کے یہاں سے ہمیشہ چار صفحے کا دعوت نامہ جاری ہوتا ہے۔ دبیز اور چکنا کارڈ، برجستہ حروف، غیر ملکی زبان اور آداب کے

ساتھ۔ وزیراعظم بازر گان کا کارڈ ملا تو میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ پاکستان پر جتنا غیر ملکی قرضہ چڑھا ہوا ہے اس سے کئی گنا آمدنی تیل کی فروخت سے ہر سال ایران کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکام کے دعوت نامہ کی لاگت اسلامی اور انقلابی ایران کے وزیراعظم کے دعوت نامہ سے پندرہ بیس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ امارت اور سادگی، غربت اور فضول خرچی۔ قرض کی مے غالب پیتے تھے۔ قرض کے کھانے ہم کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ فاقہ مستی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ لوگ بے حمیت اور حکومتیں ناپائیدار ہو جاتی ہیں۔ ملک اور مستقبل کو گروی رکھنا پڑتا ہے۔ نام کو ملک آزاد ہوتا ہے مگر اسے غلامی کی ساری شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں۔ یہ محض ایک رعایت ہے کہ غلام ملکوں کی فہرست میں شامل ہونے کے باوجود اسے غلام نہیں کہا جاتا۔

افطاری کا انتظام وزارت خارجہ کے کلب میں کیا گیا ہے۔ کل تک اس کلب کی شہرت مے نوشی اور خوش باشی، ناچ اور گانے، تیراکی اور بے باکی کی وجہ سے تھی۔ اب اس کی قسمت ایسی پلٹی ہے کہ آج یہاں سفیروں کی روزہ کشائی ہوگی، مغرب کی اذان گونجے گی اور نماز با جماعت ادا ہوگی۔ وقت مقررہ پر میں سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس کلب کے صدر دروازہ پر پہنچ گیا۔ سیاہ رنگ مرسڈیز موٹروں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ ان میں سے اترنے والے بھی بیشتر گہرے سانولے یا سیاہ پوست ہیں۔ سفید فام سفارت کار گنے چنے ہیں۔ اسلام دل کے اجلے پن پر اتنا زور دیتا ہے کہ کھال کا رنگ اس کے لئے بے معنی ہوتا ہے۔ عالم گیر مذہب ہے۔ سارے لوگوں اور سارے زمانوں کے لئے۔ تاہم بیسویں صدی کے اواخر میں جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے یہ ایک مشرقی اور سانولے رنگ کا مذہب ہے۔

صومالیہ کے سفیر اور نائیجیریا کے قائم مقام سفیر نے قومی لباس پہنا ہوا ہے۔ ہم تین اشخاص کے سوا باقی تمام سفیر سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ فرانسیسی بولنے والے سفارت کاروں نے وزیراعظم بازر گان کو گھیر لیا۔ جو فارسی اور فرانسیسی سے ناواقف تھے وہ کٹ گئے اور ذرا ہٹ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کل پچیس تیس سفارت کار ہوں گے۔ اسی قدر تعداد ایرانی وزراء اور وزارت خارجہ کے افسروں کی ہوگی۔ جبہ و دستار میں صرف ایک شخص ہے اور وہ بھی بے ریش۔ کسی نے بتایا کہ بہت اہم روحانی ہیں۔ ضد انقلاب نے انہیں گولی

ماری تھی۔ ہسپتال میں داخل تھے۔ آج ہی صحت یاب ہو کر واپس آئے ہیں۔ نام، ہاشمی رفسنجانی۔

روزہ کھلنے میں چند منٹ کی تاخیر کی وجہ سب سفیروں کو معلوم تھی۔ ٹی وی پر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اذان کے طویل ہونے کی وجہ سے بھی سب باخبر تھے۔ بارے وہ ختم ہوئی۔ اس کے بعد بیرے جو کے سوپ کا پیالہ اور ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر آ گئے۔ یہ تاخیر ان روزہ داروں کو ذرا عجیب لگی جو اللہ کا نام سنتے ہی کھجور منہ میں ڈال لیتے ہیں اور اللہ اکبر کے دہرائے جانے تک آدھی درجن گٹھلیاں پلیٹ میں جمع کر لیتے ہیں۔ ان روزہ داروں کو اول وقت افطار کی فضیلت کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ اذان کے ختم ہونے تک وہ اپنے حصہ کی افطاری کھا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ادھر ابھی سوپ بھی ختم نہیں ہوا کہ لوگ ساتھ والے کمرے کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں کبھی تاش کی بازی لگتی تھی وہاں نماز با جماعت کے لئے قالین پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ بازرگان نے ہاشمی رفسنجانی سے کہا، نماز پڑھایئے۔ انہوں نے جواب دیا، یہ کام وزیراعظم کرتا ہے۔ وہ قوم کا امام ہوتا ہے۔ بازرگان یہ سنتے ہی مصلیٰ پر کھڑے ہو گئے۔ جتنی دیر میں مقتدیوں نے تسمے کھولے اور جوتے اتارے، اتنی دیر میں امام نے بٹن کھولے اور پتلون اتار دی۔ وزیراعظم نے پتلون کے نیچے نیلی دھاری والا پاجامہ پہنا ہوا ہے اور اس کی تنگ موری جرابوں کے اندر اڑسی ہوئی ہے۔ امام کا لباس پیچھے کھڑے ہونے والوں کو ذرا عجیب لگا۔ سوٹ کا کوٹ، کوٹ کے نیچے لٹکی ہوئی قمیص کا شکن دار دامن، دامن کے بعد دھاری دار پاجامہ کی ذرا سی جھلک، اس کے بعد پاجامہ پر چڑھی ہوئی جرابیں۔ جس شخص نے یہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ چھوٹے قد اور ہلکے جسم کا آدمی ہے۔ عمر رسیدہ، بے داغ کردار، ڈاکٹر مصدق کا ساتھی، آبادان ریفائنری کو قومی ملکیت میں لینے والے ادارہ کا سربراہ، انجینئر، مفسر قرآن، انقلابی، اور اسلامی انقلاب کے بعد ایران کا پہلا وزیراعظم۔ اس نے عبا پہنی اور اس کے بعد وہ صرف نماز مغرب کا امام ہے اور کچھ بھی نہیں۔

میں نے دائیں بائیں نمازیوں پر نظر ڈالی۔ پہلی صف میں نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر تمام اسلامی ممالک کے سفیر یا نائب سفیر شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ دوسری دو صفوں میں ایران کی وزارت خارجہ کے افسر، کچھ انقلاب کے نمائندے اور مسلمان روزہ

دار موٹر ڈرائیور شامل ہیں۔ اس جماعت میں کہیں جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال بھی کھڑے ہوں گے وگرنہ میں نیت باندھنے تک جذبات سے اس قدر مغلوب نہ ہو جاتا۔ سفارتی نمائندے عالم اسلام کی وحدت اور اتحاد کا ایک ایسا منظر پیش کر رہے ہیں جس کا ہم صرف خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ منظر صرف تین رکعات تک برقرار رہے گا اور اس کے بعد عالم اسلام حسب معمول انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ جی چاہا کہ یہ تین رکعتیں بڑی طویل ہو جائیں اور یہ نماز ایک نیت اور ایک وضو کے ساتھ سحری تک کھنچ جائے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کسی نمازی نے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور کسی نے کھلے چھوڑے ہوئے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ دونوں دوش بدوش کھڑے ہیں۔ اس گڈمڈ کے باوجود کہ قیام کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھنے کے وقت سفیر ہاتھ چھوڑے خاموش کھڑے رہے اور نماز ختم ہونے کا بھی کسی مقتدی کو بروقت پتہ چلا اور کسی کو چند لمحہ بعد، ان تین رکعتوں کا کیف و سرور اور ان کی سرشاری کا عالم بڑا منفرد ہے۔ دل نے کہا تم کتنے عجیب و غریب تجربہ سے دوچار ہوئے ہو۔ ایک بار تمہیں عالم اسلام کے ایک مختصر مگر نمائندہ گروہ کے ساتھ رکوع و سجود اور قیام و قعدہ کی یک جہتی نصیب ہوئی ہے۔ رہی مسلک کے اختلاف کی بات تو یہ بتاؤ تمہیں نماز میں اس کا خیال کیسے آیا۔ تم نماز پڑھ رہے تھے کہ دوسروں کی نماز کا حساب لگا رہے تھے۔ تمہاری نماز ہر وقت مسائل میں کیوں گھری رہتی ہے۔ ضاد کا تلفظ، آمین کا اخفا، ہاتھوں کا باندھنا، چھوڑنا اور اٹھانا، نماز سے نکلنے کا طریقہ، دعا میں امام کی مفرد ضمیروں کی کراہت۔ تمہارا دھیان بٹ جاتا ہے۔ تم فروعات میں گم ہو جاتے ہو۔ خرافات میں کھو جاتے ہو۔ ایسے میں حضوری کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ ایک زمانہ میں تم مولانا روم کے چند اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے جن میں وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہیں نماز میں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ ایک تم ہو کہ نماز کے وقت تمہیں سب فضول اور بیکار باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ تمہاری نماز فاسد ہوئی۔ جاؤ، جا کر دوبارہ ادا کرو۔

بڑے ہال میں داخل ہوئے۔ لمبی میز پر کھانا رکھا ہوا ہے اور پانچ پانچ چھ چھ مہمانوں کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ جس میز پہ مجھے جگہ ملی اس پر وزیر تجارت رضا صدر، وزیر معاشی منصوبہ بندی معین فر، گبون کے سفیر اور نائیجریا کے نائب سفیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کھانا اقسام کے لحاظ سے بہت مختصر ہے۔ چاول، زعفرانی اور کشمشی۔ ایک

سالن اور وہ بھی بینگن کا۔ اس کے علاوہ صرف سلاد اور پھل۔ روزہ داروں کو بھوک لگی ہوئی ہے۔ کھانا لذیذ ہے۔ حد یہ ہے کہ بینگن بھی لذیذ ہیں۔ مہمانوں نے کھانا خوب ڈٹ کر کھایا۔ اور پھر پھل اس طرح کھائے جیسے کھانے میں کچھ بھی نہ کھایا ہو۔ کھانے کے بعد سفیروں نے شاہ ایران کی گراں مایہ مہمان پروری کو یاد کیا۔ بازر گانی کھانے اور شاہی دسترخوان کا موازنہ اور مقابلہ کیا۔ ایک دعوت سمرقندی اور دوسری دعوتِ شیراز۔ نیشنل آئل کی سالانہ ضیافت کو یاد کیا جس کے لئے ماکولات سے لدا ہوا بوئنگ سات چار سات پیرس سے اس اہتمام کے ساتھ تہران آتا تھا کہ کھانے کی لذت اور گرماہٹ میں فرق نہ آنے پائے۔ اسراف اور اتلاف کی مثالوں کا تبادلہ ہوا۔ بازر گان کے افطار ڈنر کی وجہ سے شہنشاہ کی فردِ جرم میں ایک الزام کا اضافہ ہو گیا۔

وزیراعظم کی دعوت سے فارغ ہو کر میں اور علی ارشد اکٹھے محمود اور شمیم کے گھر گئے۔ راستہ میں علی ارشد نے وزیر خارجہ سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ یزدی کا کہنا تھا کہ جس معاملہ کی چھان بین کرتے ہیں اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ایران میں امریکہ کی عملداری اتنی مکمل اور ہمہ گیر تھی جتنی ایک سامراج میں غالب سلطنت کی مغلوب نو آبادیوں اور ماتحت ملکوں میں ہوا کرتی ہے۔ امریکہ اپنے اس قبضہ و اختیار کا استعمال کرنے میں بڑا بے لحاظ، بےباک اور نامعقول تھا۔ مثال کے طور پر ایران نے امریکہ کی وزارت دفاع کے نام ایک بلین ڈالر کا چالو کھاتہ کھولا ہوا تھا۔ یہ سرمایہ گرداں تھا۔ جتنا خرچ ہوتا اسی قدر رقم اس حساب میں ایران سے منتقل ہو جاتی تاکہ پیشگی کی سطح برقرار رہے۔ اس کھاتہ پر امریکہ کا کنٹرول مکمل تھا۔ جو دفاعی سامان وہ چاہتے بھیج دیتے۔ مال کی قیمت جو وہ چاہتے لگا لیتے۔ علی الحساب مزید رقوم مانگتے۔ حساب کبھی مانگا گیا نہ کبھی دیا گیا۔ ایران میں کسی سرکاری ادارہ کو یہ معلوم نہیں کہ اس مد میں اب تک کل خرچ کتنا ہوا ہے اور کن چیزوں پر ہوا ہے۔ دزدی اور دلیری کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ چار تباہ کن بحری جہازوں کی قیمت دو بلین ڈالر لگائی گئی ہے یعنی پانچ سو ملین ڈالر فی بحری جہاز۔ چہ دلاور است دزدے کہ اس نے ایک ہزار ملین ڈالر کا کھاتہ اپنے نام سے کھول رکھا ہے۔ میں یہ سب کچھ سن کر چپ رہا۔ علی ارشد کہنے لگے، کیا بات ہے۔ میں نے کہا کچھ نہیں۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر اسلامی ممالک اپنے معاملات میں اس یک جہتی کا اظہار کریں جس کا مظاہرہ آج مغرب کی

نماز میں ہوا تھا اور اپنے اخراجات میں اس کفایت اور سادگی سے کام لیں جس کا نمونہ ہم نے وزیراعظم بازرگان کی دعوت افطار میں دیکھا تھا تو پھر نہ سرمایہ گرداں کے کھاتے کھلیں گے اور نہ یہ ممالک گردشِ ایّام کی شکایت کریں گے۔

بازرگانی کھانے کا ذکر سن کر بی اے قریشی اچھے دنوں کو یاد کرنے لگے۔ انڈین سول سروس کے کل ہند مقابلہ کے امتحان میں مقامی باشندوں کو حصہ لینے کی اجازت ملنے کے وقت سے لے کر قیام پاکستان تک صرف دو مسلمان امیدوار اول آئے تھے۔ ایک حافظ عبدالمجید اور دوسرے بی اے قریشی۔ قریشی صاحب کہنے لگے ہم نے آزادی کے فوراً بعد بڑا کٹھن وقت گزارا ہے۔ عام آدمی نے بڑی قربانی دی، رہنما بااصول اور ثابت قدم رہے، افسر اور عملہ قومی دولت کی حفاظت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ پاکستان چند دن بھی نہ چل سکے گا انہیں بڑا تعجب اور بڑی مایوسی ہوئی۔ تحریک پاکستان کے وہ مخالف جو اعداد و شمار کی بنا پر پاکستان کو بے اساس معاشی اکائی سمجھتے تھے انہیں اس جذبہ اور ولولہ کا اندازہ ہی نہ تھا جو اس ملک کے حصول اور پہلے چند سالوں کے تمام مسائل اور مشکلات پر حاوی ہونے کا باعث بنا۔ آپ نے ایرانی وزیراعظم کی دعوت شیراز کا ذکر کیا ہے میں بھی آپ کو ایک دعوت کا حال سناتا ہوں۔ یہ 1955ء کی بات ہے۔ چودھری محمد علی وزیراعظم تھے۔ کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ میں بھی اس میں شامل ہوا۔ میٹنگ کے بعد وزیراعظم نے چار پانچ افسروں سے کہا کہ وہ رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ ہم پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں عام سے صوفہ قالین اور چند چھوٹی میزوں کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ دیواروں پر کوئی تصویر نہ تھی۔ میزوں پر آرائش کا کوئی سامان نہ تھا۔ شیشہ کا ایک شوکیس کونے میں رکھا ہوا تھا مگر بالکل خالی۔ سجاوٹ کی خاطر نہ کوئی چیز وہاں موجود تھی نہ کسی کو اس کا خیال یا فکر تھی۔ وزیراعظم ان باتوں سے بے خبر اور بے نیاز تھے۔ اس زمانہ کی ترجیحات ہی کچھ اور تھیں۔ دیر تک ملکی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے میں تاخیر ہوگئی۔ وزیراعظم گفتگو کے دوران دو ایک بار اٹھ کر اندر گئے مگر دیر تھی کہ ہوتی چلی گئی۔ ایک بار وہ باورچی خانہ کا چکر لگا کر آئے اور کہنے لگے۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ کو کھانے کے لئے کچھ انتظار اور کرنا پڑے گا۔ رضیہ بیگم کا خیال ہے کہ وہ ایک ماہر کک ہیں۔ میری دانست میں وہ اتنی ماہر بھی نہیں جتنا ان کا خیال ہے۔ ایک سرکاری باورچی

ہے مگر وہ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کرتیں۔ سارا کام خود کرنا چاہتی ہیں۔ اتنے میں بیگم محمد علی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ الجھے ہوئے بالوں کو پلو سے ڈھکتے ہوئے اور اٹے ہوئے ہاتھوں کو صاف کرتے۔ آؤ بھراؤ، کھانا تیار ہے۔ شوق اور محنت سے بنایا ہوا گھریلو کھانا تھا۔

اس واقعہ کو کوئی پندرہ سولہ سال ہوئے ہوں گے کہ ایک متمول دوست نے کھانے کے لئے بلایا۔ کھانا چنا گیا۔ اس نے کہا، قریشی صاحب، پلاؤ کے سلسلہ میں آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ بتایئے کیسا ہے۔ میں نے پلاؤ پکانے کے لئے پرائم منسٹر ہاؤس کے ماہر باورچی کو بلایا ہے۔ بھلا میں کونسا ایسا ذائقہ شناس تھا کہ کوئی ماہرانہ رائے دیتا۔ میزبان کا دل رکھنے کو کہہ دیا کہ واقعی بہت اچھا ہے۔ دعوت کے بعد اس باورچی کو داد و تحسین وصول کرنے کے لئے مہمانوں سے متعارف کرایا گیا۔ باتوں باتوں میں وزیر اعظم ہاؤس کے کچن کا ذکر آیا۔ اس نے کہا، چار ہیڈ کک ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ ہم سب کی اپنی اپنی تخصیص ہے۔ میں مغلئی کھانوں کا ماہر ہوں۔ ہمارے ساتھ کچن میں بتیس افراد کا عملہ ہے۔ اس کے علاوہ چار ڈاکٹر ہیں۔ چوبیس گھنٹہ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ نہ جانے صاحب رات کے کونسے پہر کھانے کے لئے کچھ مانگ لیں۔ ڈاکٹر پہلے چکھتا ہے پھر کھانا صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ صاحب جن برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں انہیں اچھی طرح دھونے اور جراثیم سے پاک کرنے کے بعد سیلوفین کے مہر بند لفافوں میں رکھا جاتا ہے۔ ایک آدمی اس کام پر مامور ہے کہ وہ صاحب پر کھانا کھاتے ہوئے نظر رکھے اور یہ بتائے کہ انہیں کون سا کھانا مرغوب یا نامرغوب ہے۔ جو ڈش صاحب دوسری بار منگالیں اس کا اندراج ریکارڈ میں ہو جاتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریکارڈ کے مطابق ہمارے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو وطن واپس آئے ہوئے چار چھ ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

بی اے قریشی نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کہنے لگے۔ وقت دیکھتے ہی دیکھتے کتنا بدل گیا ہے۔ جو ناخوب تھا وہ خوب ٹھہرا۔ خوب متروک ہو گیا۔ احتیاط اور دور اندیشی کو دیس نکالا ملا۔ بصیرت اور دردمندی نے ہجرت کرنے میں عافیت سمجھی۔ رشوت نے ہنر کا درجہ حاصل کر لیا۔ ہنروروں میں بڑے بڑوں کے نام آتے ہیں۔ اب ایسے زمانہ میں کون کس کو یاد دلائے کہ کبھی وزیر اعظم کے یہاں صرف ایک سرکاری باورچی ہوتا تھا اور خاتون اول

مہمانوں کے لئے خود روٹیاں پکاتی تھیں۔ آج کل ان دو بڑے گھروں میں جو اسلام آباد میں پہاڑی پر بنے ہوئے ہیں کم و بیش چار سو خدمت گار ان کی ناز برداری میں لگے ہوئے ہیں جو اپنے آپ کو ملک، قوم اور عوام کا خادم کہتے ہیں۔

بازر گانی کھانے اور بی اے قریشی کے مشاہدات کا ذکر سن کر مجید مفتی نے کہا۔ ایک کھانا اور اس کے انتظامات مجھے بھی یاد ہیں۔ ہمارے وزیراعظم نے واشنگٹن میں ہنری کسنجر کو کھانے پر بلایا۔ ان کی خواہش تھی کہ فہرست خوراک میں کم از کم ایک لاجواب اور عجیب و غریب کھانا شامل ہونا چاہیئے۔ ایک ایسی ڈش جو نادر، طرفہ، کمیاب، بیگانہ اور لذیذ ہو۔ مہمان بھی کیا یاد کرے کس میزبان سے پالا پڑا تھا۔ بازار سے پتہ چلا کہ مرغ زریں مل سکتا ہے لیکن بہت مہنگا۔ میزبان نے اسے قابل التفات نہ سمجھا اور فیصلہ صادر کیا کہ مینو میں بھنا ہوا کالا تیتر شامل کیا جائے۔ پاکستان سے کالے تیتر منگانے کے لئے حکم نامہ جاری ہوا۔ پھر یہ سوال اٹھا کہ اگر تیتر پاکستان سے آرہے ہیں تو کیوں نہ پکانے والا بھی وہاں سے منگایا جائے۔ اس سوال کا جواب وہی تھا جو ہونا چاہیئے تھا۔ کالے تیتر اور مہارت خصوصی کا باورچی دونوں ہوائی جہاز سے سات سمندر پار اس شہر میں پہنچے جو دنیا کے سب سے طاقتور، ترقی یافتہ اور دولتمند ملک کا دارالسلطنت ہے۔ ایک ایسا ملک جس کے باشندے طاقت، ترقی اور دولت کے باوجود کمال لاپروائی سے جین اور جوگر پہنتے اور بڑے شوق سے فاسٹ فوڈ کھاتے ہیں۔ پاکستانی سفیر کے گھر دعوت ہوئی۔ عینی گواہ کا بیان ہے کہ ہنری کسنجر نے اس بات پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی کہ فہرست خوراک میں کیا رقم ہے۔ دسترخوان پر سلسلہ وار کون سی ڈش آئی اور کون سی سمیٹی گئی۔ کالے تیتر کی باری ترتیب کے مطابق آئی اور گزر گئی۔ مہمان خصوصی کی بے توجہی اور بے تعلقی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کی ساری توجہ گفتگو پر رہی۔ وہ اس دعویٰ کی صداقت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو اہل پاکستان گھاس کھا کر گزارا کرلیں گے مگر ایٹم بم بنانے کی کوشش جاری رکھیں گے۔

غفور مرزا نے جب کالا تیتر پکانے والے پاکستانی باورچی کی امریکہ یاترا کا حال سنا تو کہنے لگے، باورچی کا ایک قصہ میں بھی سناتا ہوں۔ یہ میرے تجربہ یا مشاہدہ کی بات نہیں۔ میں نے یہ واقعہ ان سرکاری کاغذات میں پڑھا ہے جو مجھے چھانٹی اور درجہ بندی کے لئے دیئے گئے تھے۔ میں اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس نے قائداعظم کو نہیں دیکھا۔ وہ گئے

اور ہم آئے۔ جب میں نے باورچی والی فائل پڑھی تو اپنی محرومی کا احساس بہت بڑھ گیا۔ کاش کچھ پہلے اس دنیا میں آجاتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ عظیم اور بااصول انسان کیسا ہوتا ہے۔ ہم نے جو زمانہ دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں اس میں اتنے دیانت دار سربراہ حکومت اور ریاست کا تصور بالکل افسانوی لگتا ہے۔

قائداعظم کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو دو باورچی کپور تھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائداعظم کو مرغوب ہے، کپور تھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی۔ وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔ لائل پور سے زیارت پہنچے۔ کھانا پکایا۔ اس روز قائداعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی۔ وہ ناخوش ہوئے۔ چیک بک منگائی۔ باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا۔ اس رقم کا چیک کاٹا۔ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کئے اور کہا۔ یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ پر) فراہم کرے۔

کہاں قائداعظم۔ سچے، کھرے، بااصول اور امانت دار۔ کہاں جھوٹے، منافق، بےاصول اور خائن حکمرانوں کی کھیپ کی کھیپ۔ کہاں وہ باورچیوں کا سفر خرچ حکومت کو واپس کرنے والا شخص۔ کہاں یہ کھاؤ اڑاؤ اشخاص۔ یہ مسرف اور متلف حکومتیں۔ یہ فضول خرچیاں، یہ ضیافتیں، یہ خیانتیں، یہ حرام کاریاں۔ جیسے ملک کی دولت کو کھانا اور ویران کرنا حکمرانوں کے سرکاری فرائض میں شامل ہو اور اس کا مینڈیٹ انہیں اس جعلی دماکرسی سے ملا ہو جو مارشل لا کے درمیانی وقفوں میں عوام پر مسلط ہو جاتی ہے۔ یہ حکمران کیا کچھ نہیں کھا گئے۔ پلاٹ اور پرمٹ، ادارے اور بنک، انصاف اور اصول، دماکرسی اور مساوات، عہد اور نظریہ، روایات اور ماضی۔ اس رفتار سے یہ حکمران مملکت خداداد کو اور یہ حکومتیں ہمارے مستقبل کو کھا جائیں گی۔ نعوذ باللہ۔

(4)

شاہ کی غلط کاریوں کی طویل فہرست میں یہ الزام بھی شامل ہے کہ اس نے تھیٹر کے ایک ناکارہ اور بے حمیت ایکٹر کو اپنا اے ڈی سی بنا لیا۔ وہ ایکٹر بہت خوبصورت تھا۔ سنا ہے کہ اس کی حیثیت اس چارہ کی تھی جو مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹے میں لگایا جاتا ہے۔ میں نے ایک ایرانی دوست سے کہا کہ شہزادی اشرف کی شوقینی کے قصے ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ تاریخ، وقت اور مقام کا نشان اور یار دوستوں کا اتا پتا بڑے وثوق سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں شہنشاہ کے بارے میں اس قسم کے الزامات غیر واضح اور مبہم سے ہیں۔ یہ بتاؤ اس کا جرم کتنا سنگین تھا۔ کیا اس کو پسند آنے والی لڑکیاں اور خواتین زبردستی اغوا کر لی جاتی تھیں۔ جواب ملا۔ مجھے حرم اور شاہ کی پسند کا کوئی علم نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کا جیل خانہ بہت بڑا تھا اور جو لوگ اسے ناگوار اور ناپسند تھے یا اس کے مخالف تھے وہ زبردستی اٹھا لئے جاتے تھے۔

مخالفت کو کچلنے، مخالفین کو اغوا کرنے اور انہیں اذیت دینے کا کام سائنسی اصولوں کے تحت ایک ادارہ سرانجام دیتا تھا۔ خفیہ کارروائی کے اس ادارہ کے بنانے اور سنوارنے میں اسرائیل اور امریکہ کی فنی امداد اور مہارت بھی شامل تھی۔ اس کا نام سازمان امنیت و اطلاعات کشور تھا مگر اس نام کا مخفف ساواک اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام متروک ہو گیا۔ ساواک بیسویں صدی کی تاریخ ایران کے سیاہ ترین باب کا خون آلود عنوان ہے۔ بیس برس تک اس نام کی جو دہشت تھی وہ انقلاب کے بعد اسی قدر شدید نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ تیمور بختیار اس ادارہ کا بانی سربراہ تھا۔ اس نے ساواک کو ایک خودسر اور خودمختار ادارہ بنا دیا اور خود وزیراعظم کا نائب بن گیا۔ ہوس مندی اور جاہ طلبی بڑھتی چلی گئی۔ شاہ کو خطرہ محسوس ہوا۔ تیمور بختیار نکالے گئے۔ عراق میں بیٹھ کر انہوں نے شاہ کی مخالفت شروع کی۔ جس ادارہ کی بنا رکھی تھی اسی نے انہیں قتل کروا دیا۔ دوسرے سربراہ جنرل پاکروان تھے۔ آیت اللہ خمینی کی جلاوطنی کا واقعہ انہی کے دور میں پیش آیا۔ یہ ایک عرصہ

تک پاکستان میں ایران کے سفیر ہوا کرتے تھے۔ مزاج بظاہر ٹھنڈا اور دھیما تھا۔ تیسرا سربراہ کوئی تیرہ برس تک ساواک کے سفید و سیاہ کا مالک رہا۔ اس عرصہ میں ادارہ کی سیاہ کاریوں سے ہر شے تاریک ہو گئی۔ لوگوں کا نصیب، ایران کا حال، شاہ کا مستقبل۔

پہلوی دور کے آخری دنوں میں جنرل نصیری کو پاکستان میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا۔ واپس بلائے گئے۔ جیل میں جگہ ملی۔ لوگ آئے اور جیل توڑ کر انہیں ساتھ لے گئے۔ انقلابی عدالت نے فیصلہ دیا اور انہیں گولی مار دی گئی۔ کیا اس ایک گولی سے ان تمام جرائم کی ذرا سی بھی تلافی ہو سکتی ہے جو ساواک نے نصیری عہد میں کیے تھے۔

راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں ایک ملاقات فیض احمد فیض سے ہوئی۔ میرے علاوہ صرف زیڈ اے بخاری موجود تھے۔ فیض صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا اور وہ کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے، میر انیس کا دعویٰ ہے کہ اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ بھئی ہم سے تو یہ نہیں ہوتا۔ ہم تو جس پھول کا مضمون ہو اسی رنگ میں اسے باندھتے ہیں۔ بخاری اچھل پڑے۔ اپنے پہلو پر ہاتھ مارتے جاتے اور واہ کیا بات کہی ہے کی تکرار کرتے جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر کو زور زور سے دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولے، واللہ واللہ، یہ آپ ہی کا حق ہے کہ ایسی بات کہہ سکیں۔ دست صبا اور زنداں نامہ اس دعویٰ کی دلیل ہیں کہ جس رنگ کا مضمون تھا اسی رنگ میں باندھا گیا۔ گفتگو کا سلسلہ نہ جانے کیسے راولپنڈی سازش کیس اور فیض صاحب کی گرفتاری تک پہنچ گیا۔ فیض صاحب کہنے لگے، تفتیش کے دوران ایک بار آدھی رات کو مجھے جگایا، آنکھوں پر پٹی باندھی، موٹر میں ڈالا اور چل دیئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب یہ تشدد کریں گے۔ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس آزمائش کے لئے تیار کر لیا۔ ہمیں اس سلسلہ میں یہ گر بتایا گیا تھا کہ جب تم پر تشدد کیا جائے تو جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دو تاکہ جلد از جلد بے ہوش ہو جاؤ۔ اگر جسم میں کھچاؤ اور تناؤ ہو یا مضروب برداشت اور بہادری کا مظاہرہ کرے تو بے ہوش ہونے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ میں سفر کے دوران اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑنے کی مشق کرتا رہا۔ آدھی رات کی چلی ہوئی موٹر صبح سویرے کہیں جا کر رکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لاہور سے راولپنڈی لے آئے ہیں۔ حالانکہ سارا سفر لاہور سے لاہور تک تھا۔ ایک تفتیشی مرکز سے

برڈووڈ بیرک وارث روڈ تک۔ ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئے کرسی پر بٹھا کر میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر سب باہر چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ لمبی سی میز کے دونوں سروں پر دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پر میں بیٹھا ہوا تھا دوسری خالی تھی۔ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد دروازہ کھلا۔ میں نے سر اٹھا کر یہ دیکھنا چاہا کہ اندر آنے والے کے ہاتھ میں کونسا آلۂ ضرب ہے۔ ڈنڈا کہ دُرّہ۔ بخاری صاحب نے یہاں تک بات سنی تو پہلو پر ہاتھ مارا اور ہائے ہائے کرنے لگے۔ فیض صاحب کا بیان جاری تھا۔ کہنے لگے کہ دروازہ سے بڑی بڑی موچھوں والا لم تڑنگا اینگلوانڈین ڈی آئی جی پولیس داخل ہوا۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں پی سی ایلم ۔ اس نے کہا، گڈ مارننگ سر، ناشتہ کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ انڈے کیسے پسند فرمائیں گے۔ فرائی یا آملیٹ۔ فیض صاحب کہنے لگے۔ میرا جواب تھا، لاحول ولاقوۃ۔ رات بھر کی ٹینشن کے بعد اور کیا کہہ سکتا تھا۔

ساواک کے کارکن تکلف اور بناوٹ کے قائل نہ تھے۔ کیسا ناشتہ، کہاں کا انڈہ، کیسی آملیٹ۔ لگی لپٹی رکھنے کی انہیں عادت نہ تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے۔ لوہے کی سلاخوں سے قیدی کی ہڈیاں توڑتے۔ چابک سے اچھی طرح چھینٹتے اور پھر نیم بے ہوشی کے عالم میں جسم کو بڑے سے چولھے کی گرم سلاخوں پر لٹا دیتے۔ انہیں آملیٹ بنانے کا صرف یہی طریقہ سکھایا گیا تھا۔ وہ سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح اس پر عمل کرتے تھے۔ ان کارکنوں اور ان جنگلی درندوں میں کوئی فرق نہ تھا جو ساواک نے قیدیوں کی چیر پھاڑ کرنے کے لئے پالے ہوئے تھے۔ ان میں ایک خونخوار ریچھ اتنا مشہور تھا کہ اسے بعض بین الاقوامی تحریروں میں بھی جگہ ملی ہے۔ اہل پاکستان آج تک کراچی کی تفتیشی پولیس کے ان چوہوں کو نہیں بھولے جو سن پچاس کے آغاز میں ایک خوش شکل نوجوان پولیس افسر کے حکم سے کسی کی شلوار میں چھوڑے گئے تھے۔ کراچی کے چوہوں کو وہی یاد رکھتے ہیں جنہیں تہران کے ریچھ کے ساتھ واسطہ نہ پڑا ہو۔ کراچی والے واقعہ کے تقریباً پچیس برس کے بعد وہی پولیس افسر ایک وزیراعظم کے خلاف وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ اس مرتبہ چوہے کا کام وہ خود کر رہے تھے۔

ساواک کو اذیت دہی اور شکنجہ گری کے جانے پہچانے سارے طریقے ازبر تھے۔

ناخن اکھاڑ لینا۔ جسم اور مزاج کی شکنیں درست کرنے کے لئے گرم استری پھیرنا۔ چودہ طبق روشن کرنے کے لئے بجلی کے جھٹکے دینا۔ سخت جانی کا مظاہرہ کرنے والے قیدیوں کے جسم کے نازک حصوں کو کچل دینا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ملزم تیرنا جانتا ہے یا نہیں اسے گرم تیل کے کڑاہ میں پھینک دینا۔ یہ پتہ چلانے کے لئے کہ اس کے دماغ میں کون سا کیڑا ہے ڈرلنگ مشین سے شاعر اور ادیب کی کھوپڑی میں سوراخ کر دینا۔ جس نے شاہ کے خلاف زندگی میں کبھی ایک قدم بھی اٹھایا ہو اس قیدی کی کوٹھری میں فرش پر شیشہ کے ٹکڑے پھیلا دینا۔ کہ لو اب قدم اٹھا کر دکھاؤ تو مانیں۔ قریبی رشتہ دار خواتین کو جیل میں لا کر قیدیوں کے سامنے ان کی بے حرمتی کرنا۔ جو یہ منظر دیکھ کر آنکھیں بند کر لے اس کی پلکیں اور پپوٹے جلانا تاکہ وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جائے۔

ساواک ایک جدید اور جدت پسند ادارہ تھا۔ اس نے اذیت کے نئے طریقے بھی ایجاد کئے اور جانے پہچانے طریقوں کو نئے سازو سامان کے ساتھ آزمانے کا تجربہ بھی کیا۔ اذیت کے لاتعداد طریقوں میں سے تین نے بڑی شہرت پائی۔ گرم خانہ، گھڑسواری اور کُلاہِ خلاباز۔ گرم خانہ ایک ایسا کمرہ تھا جس کی پوری ایک دیوار ہیٹر کی جالی کی طرح بجلی سے گرم اور سرخ ہو جاتی۔ اس گرم، تنگ اور طویل کمرے میں داخل ہونے والے دروازہ سے لے کر دیوار آتشیں تک ایک چھوٹی سی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ دروازہ کے پاس ایک پہیہ دار کرسی تھی جس پر قیدی کو بٹھا کر باندھ دیتے تھے۔ خود کار کرسی ہر چند منٹ کے بعد آگ کی دیوار کی جانب دو تین فٹ چلنے کے بعد رک جاتی۔ راز اگل دو یا بھسم ہو جاؤ۔ گھڑسواری کی صورت یہ تھی کہ پرانے زمانے کے تولیہ سٹینڈ کی طرح کا ایک سٹینڈ ہوتا تھا جس کا اوپر والا ڈنڈا لوہے کا ہوتا۔ ذرا چوڑا مگر تیز دھار والا۔ ہاتھ پیر باندھ کر قیدی کو اس گھوڑے پر سوار کرا دیتے تھے۔ آدمی کا دھڑ اپنے ہی بوجھ سے آہستہ آہستہ ٹانگوں کے دوشاخہ سے لے کر گردن تک چر جاتا۔ کلاہ خلاباز ایک بڑی سی آہنی کلاہ تھی جو قیدی کے سر اور چہرے کو گردن تک ڈھانپ لیتی۔ اس میں مائیکرو فون اور لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے۔ اذیت کا مارا شخص چیختا چلاتا۔ آلۂ تقویت کنندۂ صوت از سہ جہت اپنا کام دکھاتا۔ اس کی چیخیں کئی گنا اونچی آواز کے ساتھ اس خود کے اندر گونجتی رہتیں۔ آدمی اپنی استرو فونیک چیخوں کا شور سن کر پاگل ہو جاتا۔

وہ قیدی جن پر یہ حربے آزمائے جاتے کوئی خوفناک بین الاقوامی دہشت پسند نہیں تھے۔ ان میں بیشتر عام بے گناہ شہری تھے۔ انقلاب کے دوران ان کی تعداد شہنشاہ کے مطابق دو ہزار تھی جبکہ بیرونی ذرائع کا اندازہ پچیس ہزار سے ایک لاکھ افراد تک تھا۔ ان میں بیشتر نوجوان طالب علم تھے۔ ساواک کو علم اور جوانی دونوں سے سخت نفرت تھی۔ علم برے بھلے کی تمیز سکھاتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ میں کتنا بگاڑ ہے۔ کون اس بگاڑ کا ذمہ دار ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے وہ بگاڑ کے ذمہ دار کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ بھی خاطر میں نہیں لاتی کہ اس کا مقابلہ ساواک سے ہوگا یا شاہی فوج سے۔ اور نہ اسے اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اس پر ٹارچر کا جدید طریقہ آزمایا جائے گا یا گولی مار دینے کا پرانا حربہ۔

ایک پاکستانی طالب علم نے مجھے بتایا کو چھٹیوں کے بعد ہمارے تین ایرانی ہم جماعت واپس نہیں آئے۔ جس سے پوچھیں وہ ٹال جاتا۔ مہینہ کے بعد ایک واپس آیا۔ اس کو پہچاننا مشکل تھا۔ خستہ اور نزار۔ کہتا تھا بیمار ہو گیا ہوں۔ ہسپتال سے آرہا ہوں۔ دوسرے دو طالب علم واپس نہیں آئے۔ انقلاب آیا اور بات کھل کر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ساواک اس لئے پکڑ کر لے گئی کہ یہ جماعت میں ایسے سوال پوچھتے تھے جن سے آزاد خیالی کی بو آتی تھی۔

ساواک اپنا رعب جمانے کے لئے بعض اوقات کھلے عام کسی ایسی جگہ پر جہاں لوگ جمع ہوں ہجوم میں سے ایک شخص کو سب کے سامنے اٹھا کر لے جاتی تھی۔ وہ بے خبر اور بے گناہ مارا جاتا تاکہ دوسرے سہم جائیں۔ ہر شخص پریشاں رہتا کہ کہیں اتفاقاً گرفتار ہونے اور مثال کے طور پر قربانی کا بکرا بنائے جانے کے اصول کے تحت اس کی باری نہ آجائے۔ سنا ہے ساواک کے کوئی پونے دو لاکھ مخبر تھے۔ عملہ کے بارے میں شاہ کا کہنا ہے کہ صرف تین چار ہزار افراد تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد تیس ہزار سے ساٹھ ہزار تک تھی۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ ساواک کا مخبر ہر وقت ہر جگہ موجود ہوتا تھا۔ تہران کے ایک بس سٹینڈ پر لوگ کھڑے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ بس کے انتظار میں قطار باندھ کر کھڑے ہونے والے پانچ سات افراد نے آپس میں گفتگو شروع کر دی۔ ایک نے صرف اتنا کہا کہ آج کل بڑا حبس ہے۔ قطار سے ایک ساواکی ایجنٹ نکلا اور اس نے یہ جملہ کہنے والے کو

گرفتار کر لیا۔ کہیں سے فوراً ایک موٹر آگئی۔ قیدی کو اس میں ڈالا اور یہ جا وہ جا۔ جرم یہ تھا کہ اس شخص نے جان کر ذو معنی جملہ کہا تھا۔ موسم کی بات محض بہانہ تھی۔ اس کی مراد یہ تھی کہ شہنشاہی دور بڑی گھٹن اور قید و بند کا دور ہے۔ ہم ساواک والے اتنے کم علم بھی نہیں کہ ہمیں یہ پتہ نہ ہو کہ حبس کے معنی ہوا کے بند ہونے کے علاوہ قید خانہ، جیل خانہ اور گرفتاری کے بھی ہیں۔ یہ قصہ سن کر ایک پاکستانی نے شاعر انقلاب کا مصرع پڑھا۔ وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ۔ دعا قبول ہوئی اور وہ لو چلی جسے انقلاب کہتے ہیں۔

ساواک کی دہشت اور ہر جگہ موجودگی کے بارے میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مرد ایرانی کا انتقال ہو گیا۔ قبر میں منکر اور نکیر نے سوال پوچھنے شروع کئے۔ نام، ولدیت، عمر، پتہ، پیشہ وغیرہ وغیرہ۔ جواب درست ملے۔ اس کے بعد سوال ہوا کہ اپنے دین، مقدس کتاب اور برگزیدہ پیغمبر کا نام بتاؤ۔ اس شخص نے جواب دیا، میرا دین پہلوی، کتاب سفید انقلاب میری مقدس کتاب، پیغمبر عالیشان کا نام شہنشاہ محمد رضا شاہ آریامہر ہے۔ منکر نکیر سن کر حیران ہوئے۔ ایک آسمانی فرشتہ کے پاس لے گئے اس نے سوال دہرایا۔ مردہ نے اپنا جواب دہرایا۔ فرشتہ نے کہا، اس بے ہودہ اور بناوٹی جواب کا مطلب اور سبب کیا ہے۔ مرد ایرانی نے ہاتھ جوڑے، جان کی امان چاہی اور کہا۔ میں ساواک کی آسمانی شاخ کے ڈر کے مارے یہ جواب دینے پر مجبور ہوں۔ امید ہے آپ میری مجبوری کا خیال کریں گے۔

(5)

دعوت ختم ہوئی۔ مہمانوں کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ کھانوں اور قصہ کہانیوں سے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس چھوٹے سے بے اختیار بے فکر گروہ نے عوامی عالمی عدالت کی حیثیت سے شاہ ایران کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ عدالت، کے خود ساختہ صدر نے اعلان کیا۔ اس عدالت نے بدقت نظر اس مقدمہ کے تمام بے ثبوت الزامات پر غور کیا۔ تمام افسانوں، افواہوں اور تہمتوں کا جائزہ لیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچی ہے۔ الزام نمبر ایک

کا پہلا جزو کہ مشرقی کلچر کو در آمد شدہ لچر ثقافت سے تبدیل کیا گیا بالکل درست ہے۔ الزام نمبر ایک کا جزو نمبر دو کہ ملک کو امریکہ کے پاس گروی رکھا گیا اس لئے بے فیصلہ رہنے دیا ہے کہ امریکہ کی طرف سے مقدمہ میں کوئی وکیل یا گواہ پیش نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں عدالت کی رائے ہے کہ یہ معاملہ اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اس پر فیصلہ صادر کرنے کا اختیار صرف ایران کے عوام کے پاس ہے۔

الزام نمبر دو کو بھی عدالت نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ الزام عیش و عشرت اور فضول خرچی کے بارے میں ہے۔ عیش و عشرت اور قومی دولت کے ذاتی استعمال کے سلسلہ میں شاہ کو شک کا فائدہ دے کر بری کیا جاتا ہے۔ جہاں تک جشن تاجپوشی، ڈھائی ہزار سالہ جشن بادشاہت اور عیش و نشاط کی دوسری مجالس کا تعلق ہے یہ الزام ثابت ہوتا ہے کہ ان تقریبات کو ذاتی شہرت کے لئے منعقد کیا گیا تھا اور قومی دولت بے دریغ ضائع کی گئی تھی۔ مجرم کو اس سلسلہ میں جلاوطنی اور جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کی وہ تمام دولت جو امریکہ اور سوئٹزرلینڈ میں جمع ہے بحق عوام ضبط کی جاتی ہے۔

تیسرا الزام ساواک کے ظلم و ستم کے بارے میں ہے۔ تین ملزم اس میں ملوث ہیں۔ شاہ اور اس کی انتظامیہ، عالمی حقوقِ بشر کے ادارے اور ایرانی عوام۔ شاہ اور اس کی انتظامیہ کے خلاف یہ جرم پوری طرح ثابت ہو گیا ہے۔ عدالت نے اس جرم کو اس سے کہیں زیادہ سنگین پایا جیسا کہ چالان میں درج ہے۔ شاہ کو اس سلسلہ میں دربدر خاک بسر پھرنے کی سزا دی جاتی ہے۔ یہ سزا جلاوطنی کے علاوہ ہے۔ جہاں تک سابق انتظامیہ کا تعلق ہے اس کی سزا ایک خونین انقلاب ہے۔ سزا کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس دور کو جاری رکھنے یا ختم کرنے کا فیصلہ نئی انتظامیہ کرے گی۔ عالمی حقوقِ بشر کی انجمنوں کی منافقت بھی ثابت ہو گئی ہے۔ ان کو کبھی تنکا نظر آ جاتا ہے اور کبھی شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔ یہ جس کو چاہیں بدنام کریں اور جہاں مصلحت دیکھیں وہاں خاموش ہو جائیں۔ ان کو منافق قرار دیا جاتا ہے۔ بے اعتباری کی مہر ان کے چہرے پر لگائی جاتی ہے۔ اعتبار بحال ہونے تک یہ کالک ان کی پیشانی پر لگی رہے گی۔

تیسرے ملزم کے خلاف یہ شکایت ہے کہ اس نے اتنا عرصہ اتنا بے رحمانہ سلوک چپ چاپ کیوں برداشت کیا۔ ایرانی عوام کی جن نسلوں نے یہ ظلم برداشت کیا تھا وہ انتقال

کر چکی ہیں۔ مرحومین کے لئے یہ سزا ہی کافی ہے کہ انہوں نے رضا خاں اور رضا شاہ کے عہد میں زندگی بسر کی اور انہی کے عہد میں جان سے گزر گئے۔ موجودہ نسل نے نظام حکومت کو تبدیل کرنے کا عہد کیا اور اس کی خاطر جان کی اتنی قربانیاں دی ہیں کہ بہشت زہرا کے قبرستان کا چپہ چپہ اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اس لئے انہیں نہ صرف باعزت بری کیا جاتا ہے بلکہ شاہ کے تخت کا وارث قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ بات زیر سماعت مقدمہ میں شامل نہیں لیکن عالم اسلام کی بھلائی اور بہتری کے لئے یہ عدالت اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے پاکستان کے عوام اور اہل نظر کو ان کی تاریخ اور ان کا فرض یاد دلاتی ہے۔ آج تک پاکستان میں قوم اور ملک کے کسی مجرم کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی۔ وڈیرے ہی کیا کم تھے کہ لٹیرے بھی ان کے ساتھ اقتدار میں شامل ہو گئے ہیں۔ سمت بدلتی جا رہی ہے۔ جدھر منہ ہونا چاہئے ادھر پشت ہے۔ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ جنہیں حل کیا جانا چاہئے انہیں ہوا دی جا رہی ہے۔ آگ لگی ہوئی ہے۔ بجھاتا کوئی نہیں۔ تاریخ سے جو عہد برعظیم کے مسلمانوں نے کیا تھا اسے حکومتیں توڑ رہی ہیں۔ نئی نسلیں اس عہد سے ناآشنا اور بے تعلق ہیں۔ محبتیں عنقا ہو گئی ہیں۔ حرام عام ہو گیا ہے۔ مسجد کی عمارت میں شگاف پڑ گیا ہے۔ زندگی کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ گدھ منڈیروں پر آن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اے پاکستانیو، تمہاری غیرت، جرأت اور دور اندیشی کو کیا ہو گیا ہے۔ فرشتوں کا انتظار کر رہے ہو۔ جب تک تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو وہ نہیں آئیں گے۔ اٹھو۔ قربانی دو۔ وہ شہیدوں کے لہو کی خوشبو سونگھ کر آجائیں گے۔ یاد رہے کہ وہ خود نہیں آتے انہیں کوئی بھیجا کرتا ہے۔ تم اس کی اطاعت کرو۔ وہ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے۔ اب بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کم ہمتی کیسی۔ ناامیدی کس لئے۔ امیدِ مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں۔

منظر نامہ

باب سیزدہم

فنکار

مغربی موسیقی کے ایک ساز کی فریاد سن کر مجھے اچانک فنون لطیفہ کی فہرست بنانے اور اپنی ترجیحات طے کرنے کا خیال آیا۔ یہ ساز ایک گٹار تھا۔ بلند، بھاری اور گونج دار آواز والا برقی گٹار جو پارک شہنشاہی میں جھیل کے کنارے چبوترہ پر رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک نوٹس بورڈ پر یہ اعلان لکھا ہوا تھا۔ فریاد، فریاد، فریاد۔ میری آزادی چھین لی ہے۔ لب سی دیئے ہیں۔ گلا گھونٹ دیا ہے۔ آواز خاموش کر دی ہے۔ میں اپنے لئے جینے کا حق مانگتا ہوں۔ میں تمام فنون لطیفہ کے لئے جینے کا حق مانگتا ہوں۔ لوگ اعلان کو دلچسپی سے پڑھتے اور خاموشی سے چادر پر چند ریال رکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ ٹھہرنے کا کوئی روادار نہ تھا۔ ہر ایک کو کمیتہ اور پاسداران کا ڈر تھا۔

فنون لطیفہ کی فہرست کو مختصر کر رہا ہوں۔ تعمیرات! خارج از بحث۔ ان کے دیکھنے کے لئے ایران کے دور دراز علاقوں میں جانا پڑے گا۔ ایران اور عراق کی سرحد پر لڑائی ہو رہی ہے۔ سرحدوں کے اندر بھی جابجا جھگڑے کھڑے ہیں۔ ان حالات میں کھنڈر دیکھنے کے لئے شوقیہ سفر ناممکن۔ تعمیرات کے ساتھ پہاڑوں، چٹانوں اور پتھروں کو تراشنے کا فن بھی خود بخود فہرست سے خارج ہو گیا۔ موسیقی! اسے بھی جانے دیں۔ اتنی شیریں زبان اور اتنی لفظ بگاڑ، گلا پھاڑ، مغرب زدہ موسیقی۔ گانے والا لفظ میں ہوا بھرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ غبارہ پھٹ جاتا ہے۔ موسیقار دم لئے بغیر اگلے لفظ کے غبارہ میں ہوا بھرنا شروع کر

دیتا ہے۔ مجھے معاف رکھئے۔ یہ روگ میرے بس کا نہیں۔ مصوری! جی چاہتا ہے کہ اسے سرفہرست رکھا جائے مگر مجبور ہوں۔ نہ کوئی نیا دبستان مصوری، نہ کوئی نیا نامور مصور۔ عرصہ ہوا یہ کھیل ایران میں دو آدمیوں نے کھیلا تھا۔ مانی اور بہزاد۔ ایک پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھا اور دوسرے کو لوگوں نے مصوری کا حرف آخر قرار دیا۔ اس طرح ایران میں پیغمبری کا باب کھل گیا اور مصوری کا بند ہو گیا۔ میناتور نقاشی یا مختصر تصویروں کے فن کو بھی فہرست سے نکال دیا۔ مجھے یہ تصویریں پسند ہیں۔ میں نے چند اچھے نمونے خریدنے کے لئے وقت اور رقم کو بے دریغ خرچ کیا ہے۔ یہ فن مجھے لبھاتا ہے مگر صرف تصویر دیکھنے کی حد تک۔ میناتور ساز کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ پارچہ بافی! استغفراللہ۔ جہاں دستی کھڈی کی کھٹ کھٹ کھٹاک کا شور ہو یا برقی کھڈی کی گڑگڑاہٹ اور تھرتھراہٹ اس کارگاہ کا فنون لطیفہ سے کیا تعلق۔ کوزہ گری! اس پر بھی لکیر پھیر دیں۔ مجھے اس نام سے وحشت ہوتی ہے۔ پچھلی چار دہائیوں میں میں دنیا کے کتنے ہی مشہور عجائب گھروں میں مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں اور ٹھیکروں سے بھری ہوئی میلوں لمبی الماریوں کے سامنے گھنٹوں بیزاری اور اکتاہٹ کی حالت میں قدم بقدم چلتا رہا ہوں۔ پیروں، پنڈلیوں، رانوں اور کمر کے اکڑاؤ، کھنچاؤ، کساؤ اور تناؤ کے ساتھ۔ لوور (پیرس)، ہرمیٹاج (لینن گراڈ)، میٹرو پالیٹن (نیویارک)، برٹش (لندن) اور مصری عجائب گھروں کے ساتھ میری ایک تلخ یاد بھی وابستہ ہے اور اس کا تعلق جام سفال سے ہے۔ یہاں تک مجھے شاعر کے ساتھ اتفاق ہے کہ اور لے آئے اگر ٹوٹ گیا مگر اس بات پر سخت اعتراض ہے کہ بازار سے مٹی کا نیا آب خورہ لانے کے بعد وہ پہلے ٹوٹے ہوئے آب خورہ کے ٹکڑوں کی دور ونزدیک کے عجائب گھروں میں نمائش لگا دیں اور ہماری مشکلات میں اضافہ کریں۔

ہنرہای زیبا کی فہرست میں اب فنون اکبر کا ایک آدھ نام اور فنون اصغر کے دو چار نام رہ گئے ہیں۔ میں نے دو نام چھوڑ کر باقی سب کے آگے کانٹا بنا دیا۔ اس کے بعد قالین بافی کے آگے بریکٹ میں "انشاء اللہ سال آئندہ" لکھ دیا۔ صرف ایک اکلوتی مد باقی بچی۔ یہی کل فہرست ٹھہری۔ اس نام کے گرد سرخ پنسل سے دائرہ بنایا اور اس کے نیچے دو سرخ لکیریں کھینچ دیں۔ دائرہ کے اندر اور لکیروں کے اوپر دو لفظ جگمگا رہے تھے۔ فنِ خطاطی۔

میرے ساتھ جو ایرانی باغ کی سیر میں شامل تھا اس نے کہا۔ موسیقی کا سالانہ بین الاقوامی میلہ جو شیراز فیسٹیول کہلاتا تھا بند ہو گیا ہے۔ رودکی ہال بند لہٰذا تھیٹر اور اوپرا ختم۔ گوگوش جس ہوٹل میں گاتی تھی وہ ہوٹل بند۔ ٹی وی پر گانا بجانا بند۔ ملک میں سیرو تفریح کے لئے مسافروں کا آنا بند۔ وہ دکانیں جہاں سے مسافر مقامی آرٹ کے نمونے خریدتے تھے۔ وہ بھی بند، فنکار بیکار۔ دستکار بے روزگار۔ مختصر تصویر بنانے والے کا یا پلٹ مصور کا یہ حال ہے کہ نسل در نسل لمبے تڑنگے، جھکی کمر، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں اور ہوا میں لہراتی لمبی سفید ڈاڑھی والے جام بدست بوالہوس بڈھے اور اس کی نوجوان مینا بدوش خاتون ہمراہی کی تصویریں بنانے کے بعد وہ یکایک اس موضوع سے تائب ہو گیا ہے۔ اس کی مختصر تصویروں میں اب بھی سرسبز اور پر درخت وادی نظر آتی ہے۔ دریا بھی ہوتا ہے۔ کنار دریا ایک بڈھا بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بڑے میاں عصا، کتاب، جانماز، تسبیح اور کشکول کے ساتھ نظر آتے ہیں اور ان کے ارد گرد درویشوں نے حلقہ باندھا ہوتا ہے۔ بس لے دے کے ایک فن ہے جو دستبرد انقلاب سے بچ رہا ہے اور وہ خطاطی ہے۔ اس فن کو توجہ کی کمی نہیں بلکہ زیادتی سے خطرہ ہے۔ ہر کس و ناکس اب حرف کی صورت بدلنے اور لفظ میں رنگ بھرنے کو اپنا انقلابی اور اسلامی فریضہ سمجھتا ہے۔

جب میں ایران آیا تو یہاں تین جھنڈے ہوا کرتے تھے۔ قومی، سرکاری اور شاہی۔ دولت ایران کے سرکاری جھنڈے میں سبز، سفید اور سرخ رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ درمیانی، سفید پٹی میں ایک شیر دائیں پنجہ میں تلوار لئے ہوئے کھڑا تھا اور اس کی پشت پر سورج چمک رہا تھا۔ شیر و خورشید کے اس پرچم میں ببر شیر کی صورت اور سورج کی جگہ مختلف بادشاہتوں میں بدلتی رہی۔ آخری تبدیلی محمد شاہ قاچار کے زمانہ میں ہوئی جب اس نے ایک تھکے اور بیٹھے ہوئے شیر کی جگہ ایک چست و چالاک شیر کو کھڑا کر دیا۔ دم کو دو بل دے کر ایسی اکڑنت دی کہ ببر شیر تیغ بدست ہونے کے باوجود پشت کی جانب سے زیادہ جنگجو اور تیار نظر آتا ہے۔ انقلاب کے بعد شیر کا پتہ چلا نہ خورشید کا۔ دونوں یکایک غائب ہو گئے۔ پرچم پر خالی رنگدار لکیریں رہ گئیں۔ سنا ہے شیر بیمار ہو کر وسطی امریکہ کی ریاست پانامہ کے کسی اسپتال میں داخل ہو گیا اور خورشید حسب معمول کہیں مغرب میں جا کر ڈوب گیا۔ چند ماہ گزرے تھے کہ پرچم کے وسط میں ان دونوں کی خالی کی ہوئی جگہ پر جدید

طغرائی خطاطی کا ایک پھول کھل اٹھا۔ غور کیا۔ "اللہ" لکھا ہوا تھا۔ مزید غور کیا تو انہی پنکھڑیوں میں لاالہ الا اللہ بھی چھپا ہوا پایا۔ طغرے عام طور پر بہت گنجلک ہوتے ہیں۔ گاہے ان کو طوطا مینا کی شکل دے کر اور پیچ دار بنا دیتے ہیں۔ یہ طغرا بہت سادہ ہے اور اسے تحریر کرنا بہت آسان ہے۔ ضرب قلم سے پانچ قوس بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نشست و ترتیب اور ان کے توازن و پیوند سے پُرکاری اور فنکاری کا ایک خوبصورت نمونہ وجود میں آتا ہے۔

ایک دبلا پتلا اور نرم آواز تیس سالہ نوجوان میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لئے مجھے ایرانی وزارت خارجہ کے شعبہ تشریفات کی مدد لینی پڑی۔ اسلامی جمہوریہ ایران کا نیا نشان دولت جو سرکاری پرچم کے وسط میں بنا ہوا ہے اسی نوجوان کی تخلیق ہے۔ وہ بتا رہا ہے کہ وزیراعظم بازرگان نے نشان دولت کے لئے کھلا مقابلہ منعقد کرایا۔ سینکڑوں فنکاروں نے اس میں حصہ لیا۔ ہزاروں نمونے موصول ہوئے۔ پہلے مرحلہ میں کوئی دو سو نمونے منتخب ہوئے۔ دوسرے مرحلہ میں ان کی تعداد گھٹ کر بارہ تیرہ رہ گئی۔ کمیٹی نے فنکاروں کا انٹرویو لیا۔ چوتھے مرحلہ میں وہ اکیلا رہ گیا۔ اسے کچھ ہدایات ملیں۔ پانچویں مرحلہ میں نیا نشان منظور ہو گیا۔ یہ فنکار بچوں کے لئے کتابیں شائع کرنے والے کسی سرکاری محکمہ سے وابستہ ہے۔ کہتا ہے کہ میں انقلابی ہوں۔ اسلامی ذہن رکھتا ہوں۔ رہنمائی ڈاکٹر شریعتی کی ہے۔ نشان دولت کا بنیادی خیال شریعتی کے اس لکچر سے لیا ہے جس میں انہوں نے سورہ الحدید کی انقلابی تفسیر کی تھی۔ یہ ایک فکری مملکت ہے۔ اس میں کتاب (فکر اور نظریہ)، میزان (انصاف اور توازن) اور آہن (قدرت اور نظم و ضبط) کی حکمرانی ہوگی۔ یہ نیا نشان ان تینوں چیزوں کو ذہن میں رکھ کر بنایا گیا ہے۔ چار کشش ہلال کی صورت ہیں۔ پانچواں خنجر کا پھل ہے۔ یہ آہن ہے۔ میں نے جو کشش استعمال کیا ہے اس کا ماخذ وہ نقش ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار چھڑی کی نوک سے ریت پر بنایا تھا۔

اس نوجوان کے مشورہ کے مطابق میں ایک کتب خانہ اور ایک انجمن کے دفتر کا چکر لگاتا ہوں۔ کتب خانہ میں خطاطی کے نایاب نمونے موجود ہیں۔ عام طور پر دیدار اور تحقیق کرنے والوں کو صرف عکس پر گزارہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ عکس کو بڑا کرنے والی مشینوں کے

سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ میرے پاس خصوصی اجازت نامہ ہے۔ تالے اور دروازے کھلے، کمرے اور صندوق امانت کھلے۔ قرآن مجید کے نادر و نایاب قلمی نسخے اور خوشنویسان بزرگ کی وصلیاں اور قطعات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خطاط ایک سے ایک بڑھ کر۔ سلطان علی مشہدی اور میر علی ہروی۔ شاہ محمود نیشاپوری اور میر عمادالحسنی ۔ یعقوت مستعصمی اور یعقوت ثانی۔ خطاطی ایک سے ایک اعلیٰ۔ کسے منفرد کہیں اور کسے لاثانی۔ ان آثار ہنر کی نمائش نے ایک سماں باندھ دیا۔ آنکھیں روشن، دل شاد، کلیجے ٹھنڈک۔ اگر ان فن پاروں کو ایک بار اور دیکھنے کا موقع مل جاتا تو شاید پچھلے بیس برس سے لگائی ہوئی عینک اتر جاتی۔

میں کتب خانہ سے نکلا اور انجمن خوشنویساں کے دفتر جا پہنچا۔ تین چار افراد موجود تھے۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ادارہ کے سربراہ کا نام یاد نہیں۔ شاید استاد غلام حسین تھے۔ کہنے لگے۔ کسی قوم کی روایات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ زندہ اور مردہ۔ ان میں فرق یہ ہے کہ مردہ روایات کی محض پرستش کی جاتی ہے مگر زندہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ جس فن کے پرستار موجود ہوں اور فنکار ناموجود، وہ مردہ ہے۔ جس شغل کے شاغل، اور قدر دان دونوں سرگرم ہوں وہ زندہ و تابندہ۔ مردہ فن کو صرف مجاور میسر آتے ہیں جو سال میں ایک بار عرس مناتے ہیں۔ حکومت سے چڑھاوا وصول کرتے ہیں۔ سمپوزیم اور سیمینار منعقد کراتے ہیں۔ اخباروں میں چرچا ہوتا اور ٹی وی پر تماشا۔ منتظمین اور بیرونی مہمان اعلیٰ ہوٹلوں میں کھانے کھاتے ہیں۔ لوگ صرف فریب کھاتے ہیں۔ الحمدللہ کہ خطاطی ایران کی ایک زندہ روایت ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ انجمن خوشنویساں ہے۔ میں نے بات کاٹی۔ جناب من، فارسی کے سارے اخبار اور ساری کتابیں آج کل ٹائپ میں چھپ رہی ہیں۔ اس تیز رفتار مشینی دور نے دیوار سے ٹیک لگائے، سیاہی کی چھینٹوں سے داغدار چوکی کے سامنے اکڑوں بیٹھے ہوئے خوش نویس کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ خوش نویس غیر مطلوب ہے۔ خوش نویسی بے رواج ہے۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ خطاطی ایک زندہ روایت ہے۔ کیا انجمن بنا لینے سے انجام بدل جائے گا۔ استاد کہنے لگے، میں نے کب کہا ہے کہ کتابت کا پیشہ زندہ ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ آپ کتابت کو خطاطی سے علیٰحدہ کر دیں۔ ایک پیشہ ہے دوسرا فن۔ ہاتھ سے لکھ کر کتابیں، رسالے، اور اخبار چھاپنے کا زمانہ بے شک ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک انسان کا ذوق جمال زندہ ہے خطاطی زندہ رہے گی۔ جب تک

تحریر باقی ہے حسن خط بھی باقی رہے گا۔ جب تک خدا کا کلام لکھا جائے گا اس وقت تک لفظ کا حسن کیسے ماند پڑ سکتا ہے۔ ہر مسلمان کی زندگی کو آراستہ کرنے اور زینت بخشنے کے لئے اسلام نے قرآن کی شکل میں صوت و صورت حرف کا ایک الہامی تحفہ اور موقع عطا کیا ہے۔

انجمن خطاطی ایک جزوقتی چار سالہ تربیتی کورس شام کے وقت منعقد کرتی ہے۔ ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ، ممتاز۔ کوئی چھ سو افراد اس کورس میں شامل ہیں۔ ان میں ہر عمر، ہر پیشہ اور ہر درجہ کے لوگ شامل ہیں۔ وکیل، استاد، ملازم سرکار، کاروباری، خانہ دار، اور بیکار۔ کتابت کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے افراد مشکل سے بیس پچیس ہوں گے۔ ہم خطاطی کی تاریخ پڑھاتے ہیں، اصول سمجھاتے ہیں اور مشق کراتے ہیں۔ لوگ اپنے فارغ وقت میں اس علم کو حاصل کرنے اور اس فن کی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کے لئے ہمارے پاس آتے ہیں تاکہ ان کی زندگی میں وہ قرینہ، توازن، ترتیب، تناسب اور موزونیت پیدا ہو جسے مجموعی طور پر شائستگی کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگ سال دو سال کے لئے ہمارے کورس میں شریک ہوتے ہیں اور پھر ہمیں چھوڑ جاتے ہیں مگر اس قیام کا اثر ان پر عمر بھر رہتا ہے۔ رہا پیشہ کا سوال تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں اور پیکجنگ انڈسٹری ہمیشہ اچھے خطاط کی تلاش میں رہتی ہیں۔ چھاپے خانہ والے بھی دیباچہ، ٹائٹل اور روئے جلد خطاطی کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ خطاط کا لکھا ہوا لفظ مصور کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح ہوتا ہے۔ پسند آجائے تو منہ مانگے دام ملتے ہیں۔ اس وقت ایران میں چالیس پچاس خطاط بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ یہ کھیپ پچھلی نسل کے چند اساتذہ نے تیار کی ہے۔ استاد حسین میرخانی، استاد حسن میرخانی، استاد علی اکبر کاوہ، استاد عمادالکتاب اور استاد امیر خانی۔

انجمن نے فن خطاطی کے بارے میں جو کچھ چھاپا ہے وہ ہم آپ کو پیش کریں گے۔ کچھ مطبوعات ابھی دیں گے، کچھ بعد میں بھیجیں گے۔ بازار میں خطاطی پر جو لندن اور پیرس کی چھپی ہوئی کتابیں ملتی ہیں وہ آپ کے کام کی نہیں ہیں۔ خوش نما جلد اور نفیس چھپائی۔ کاغذ دبیز، سفید اور اتنا چکنا کہ نظر پھسل جائے۔ قیمت اتنی زیادہ کہ جیب میں سوراخ ہو جائے۔ علم صرف اتنا جو راتوں رات امتحان پاس کرانے والے خلاصہ میں ہوتا ہے۔ جو مقامی کتابیں آسانی سے مل جاتی ہیں وہ بھی آپ کے کام کی نہیں ہیں۔ وہ خطاطی کی مشق

کرنے والوں کے لئے ہوتی ہیں۔ آپ حبیب اللہ فضائلی کی اطلس خط حاصل کریں۔ یہ کتاب اصفہان سے انجمن آثار ملی نے شہنشاہئی ایران کی دو ہزار پانصد میں سالگرہ کے موقع پر شائع کی تھی۔ کم یاب ہے مگر بڑے کام کی ہے۔ آپ جدید مصوّرانہ خطاطی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایران میں اسے خطِ نقّاشی کہتے ہیں۔ ابھی اس خط پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آپ احصائی، مافی اور رسولی سے ضرور ملیں۔ احصائی اور مافی مصور ہیں جو خطاطی کر رہے ہیں۔ رسولی خطاط ہیں جو مصوری کی طرف مائل ہیں۔

رخصت کی اجازت مل چکی تھی۔ رسمی شکریہ ادا ہو چکا تھا۔ چلتے چلتے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں نے میز پر پھیلے ہوئے نمونوں میں سے خط شکستہ کا وہ نمونہ اٹھایا جو ترسُّل کہلاتا ہے اور استاد سے درخواست کی کہ وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔ میں نے اپنی الجھن اور کمزوری کا ذکر کیا کہ خط شکستہ کی ایک سطر میں کبھی ایک آدھ سے زیادہ لفظ پڑھنے یا پہچاننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ استاد نے نمونہ ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔ سطر آدھی بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے ساتھی کو لقمہ دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ چند الفاظ کی باہم دریافت کے بعد ان کی روانی میں فرق آگیا بلکہ ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ لفظ کی ایک صورت اور وہ بھی نامکمل مگر پڑھنے والوں کو اس پر تین چار لفظوں کا دھوکہ ہونے لگا۔ شاید یہ لکھا ہے یا شاید وہ لکھا ہے۔ نہیں نہیں جو آپ کہہ رہے وہ لفظ اس طرح نہیں لکھا جاتا۔ استاد کہنے لگے جس شخص نے یہ سات آٹھ سطریں لکھی ہیں وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔ اسے بلاتے ہیں۔ وہ آئے۔ ایک آدھ سطر انہوں نے کسی قدر اعتماد کے ساتھ پڑھی اور پانچ چھ لفظ جھجک اور جھٹکے کے ساتھ۔ اس کے بعد وہ بھی خاموش ہو گئے۔ لفظ نے کاتب کی طرف دیکھا اور کہا۔ خود را شکستہ ہر کہ دلِ ما شکستہ است۔ جس نے میرے دل کو توڑا وہ گویا خود ٹوٹ کر رہ گیا۔

(2)

میں احصائی سے ملنے کے لئے گیا۔ رہنمائی کے لئے ایک ایرانی خاتون میرے ہمراہ

تھیں۔ خوش نما رہائشی علاقہ میں فلیٹ کی گھنٹی بجانے کے بعد تاریک بغلی سیڑھیوں میں کھڑے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اتنے وسیع و عریض ملک میں جہاں صحرا، پہاڑیاں، وادیاں اور بنجر زمین بے حد و حساب ہے وہاں لوگوں کا فلیٹ میں رہنا قدرت کے فیصلہ کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ قدرت کی خواہش تھی کہ یہ مرد کہستانی یا مرد صحرائی بن کر کھلی فضا میں آزاد پھرتا رہے مگر اس نے اپنے لئے عمر قید کی سزا تجویز کی اور قفس میں قفل بند ہو کر بیٹھ گیا۔

گھریلو فون پر بات ہوئی۔ خود کار قفل کھل گیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ احصائی ہمیں لینے کے لئے نیچے آچکے تھے۔ درمیانہ قد، درمیانی عمر۔ پس پا ہوتے ہوئے بال، وقت کے ساتھ کشادہ ہو جانے والی پیشانی۔ چہرہ مسکراتا ہوا، آنکھیں روشن۔ ہم دونوں کو گول کمرے میں بٹھا کر احصائی اندر گئے تو میں نے در و دیوار پر نظر ڈالی۔ ہر شے نے سلیقہ، سجاوٹ اور خوشحالی کی گواہی دی۔ یہ ان گول کمروں سے بہت مختلف تھا جو نوادرات کے مال گودام ہوتے ہیں۔ جہاں حسن انبار کے نیچے دب جاتا ہے۔ ایک فن پارہ کو نمائش کے لئے جتنی جگہ درکار ہے اس کا چوتھا حصہ بھی اسے میسر نہیں آتا۔ فن پارے ایک دوسرے کے اتنے قریب رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ مقابلہ سب کو ماند کر دیتا ہے۔ وہ خاتون جو میرے ہمراہ تھیں انہوں نے بھی کمرے کا جائزہ لیا اور پھر نزدیک آکر آہستہ سے بولیں۔ آپ نے دیکھا، یہ سجاوٹ زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ایک خوش مذاق فن کار کا گھر ہے۔ لیکن سجاوٹ کا انداز سراسر مردانہ ہے۔ اس میں نسوانیت کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ اس گھر میں فن کا حسن ہے مگر زن کا حسن نظر نہیں آتا۔ خاموشی اتنی گہری ہے کہ یہ فلیٹ بے اولاد لگتا ہے۔

احصائی ایک ٹرے میں کافی کی تین پیالیاں لے کر آئے اور انہیں میز پر سجایا۔ ہمراہی نے کہا۔ آپ کو ہماری وجہ سے جو زحمت ہو رہی ہے ہم اس کے لئے آپ سے اور خانم سے معذرت خواہ ہیں۔ جواب ملا۔ مجھے ذاتی طور پر معذرت خواہی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جہاں تک خانم کا تعلق ہے انہیں ایسی کوئی وجہ نظر ہی نہیں آسکتی کیونکہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ یہ اعلان کرنے کے بعد وہ مسکرائے اور بولے، ایک بار پھر دو چار منٹ کی غیر

حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ جونہی وہ اندر گئے خاتون نے کہا، میری ایک بھانجی ہے۔ مصورہ ہے۔ ایک مدت تک شادی سے انکاری رہی اب جا کر تیار ہوئی ہے۔ شاید کسی کا انتظار تھا جس نے اس کا انتظار نہیں کیا۔ اس فنکار کے لئے اس لڑکی کا رشتہ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔

احصائی سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ مصور ہیں۔ خطاط بھی ہیں۔ مصوری اور خطاطی کے باہم امتزاج سے کینوس پر نقش و نگار بناتے ہیں۔ کتابوں کے تزئین کار ہیں۔ رنگین روغنی اینٹ سے عمارت کے رخ پر برجستہ خطاطی کرتے ہیں۔ سنگ تراشی سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہو گی مگر سنگ چینی کے ماہر ہیں۔ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے دیواروں پر نقش بناتے ہیں۔ زیورات اور سجاوٹ کے فلزاتی سامان کے نقشے اور خاکے تیار کرتے ہیں۔ میں ایک شخص اور ایک فنکار سے ملنے آیا تھا، یہاں کئی اشخاص اور کتنے ہی فنکاروں سے ملاقات ہو گئی۔ گھنٹہ بھر کے بعد میں نے رخصت کے لئے اجازت چاہی۔ وہی سیڑھیاں تھیں جن سے گزر کر ہم احصائی کے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے مگر واپس جاتے ہوئے وہاں چور راستہ کی پراسرار تاریکی کا کوئی نشان نہ ملا۔ دل روشن ہو تو تاریک راہیں بھی جگمگا اٹھتی ہیں۔ اس وقت میرا دل اور میری آنکھیں بہت روشن ہیں۔ احصائی کے گول کمرے کی شمالی دیوار پر لگی ہوئی آب رنگ نقاشی میرے دل اور آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ سفید چکنے کاغذ کو سیاہ رنگ کیا ہوا ہے۔ تصویر کے درمیانی حصہ میں دو سطریں ہیں۔ پہلی سطر میں ایک لفظ کی تکرار ہے۔ ماہرانہ بے اختیاری کے ساتھ لکھا ہوا لفظ۔ الف کی طرح کھڑی نوکدار لکیریں۔ سفید اور سیاہی مائل سبز رنگ۔ دوسری سطر میں اسی لفظ کی تکرار ہے۔ وہی رنگ ہیں۔ مگر لفظ الٹا ہے۔ خط معکوس۔ مجموعی تاثر اندھیرے میں روشنی کی چند کرنوں کا ہوتا ہے۔ تجریدی نقاشی ہے۔ پڑھنے والے کو پہلی بار حرف یا لفظ کی تکرار نظر آتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو کبھی لا نظر آتا ہے اور کبھی اله۔ ممکن ہے لا اله لکھا ہوا ہو۔ نامکمل الفاظ سیاہ رنگ کے پس منظر سے اجاگر ہوتے ہیں اور اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ عبارت سیاہ رنگ کے پردہ میں پوشیدہ ہے۔ اندھیرے کے دوسری جانب کہیں نور ہی نور ہو گا۔ مگر نظر اس حجاب کے پار دیکھنے سے قاصر ہے۔ قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی۔ تو عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔ ارشاد ہوا

کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہر گز نہیں دیکھ سکتے۔

دو ہفتہ کے بعد وہ سہ رنگی تجریدی نقاشی احصائی کے گول کمرے کی شمالی دیوار سے اتر گئی۔ کسی نے اسے خریدا، بنڈل بنایا، جہاز پر چڑھایا اور پاکستان بھیج دیا۔

میں احصائی کے ساتھ مدرسۃ الٰہیات کے ہال میں داخل ہوا۔ بجلی حسب دستور بند تھی۔ ہال کے سارے دروازے کھولے گئے مگر پھر بھی وہ پوری طرح روشن نہ ہو سکا۔ ہم لوگ ہال کے وسط میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ موہوم سی امید بجلی کے آنے کی تھی جو پوری نہیں ہوئی۔ البتہ آدھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھے ہوئے باتیں کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ جہاں پہلے صرف اندھیرا تھا وہاں اب گہرے بادلوں میں سائے اڑتے ہوئے نظر آنے لگے۔ احصائی کہنے لگے کہ جب مدرسہ الٰہیات کے اس ہال کی تزئین کا کام میرے سپرد کیا گیا تو میں نے میورل کے موضوع اور ہیئت پر بہت غور کیا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ موضوع وحدت الوجود ہونا چاہئے جو الٰہیات کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اس کا اظہار سنگ چینی میں کیا جائے۔ اس ہال کی دونوں بڑی دیواروں پر میں نے انگل برابر مرمر کے تراشے ہوئے ٹکڑوں سے یہ برجستہ میورل بنایا ہے۔

میورل کا مرکزی خیال احصائی نے فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر سے مستعار لیا ہے۔ پرندوں کو بادشاہ کی تلاش ہے۔ ہدایت یافتہ ہدہد نے سیمرغ کا نام پیش کیا۔ عذر سنے۔ اوصاف بیان کئے۔ اعتراضات دور ہوئے۔ تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر گنتی کے چند پرندے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں وہ ہستی مطلق میں گم ہو گئے۔ احصائی کہنے لگے یہ جو ہال کی دائیں دیوار والا میورل ہے اس کا عنوان جستجو ہے اور اس کے سامنے والی دیوار کے میورل کا عنوان یافت ہے۔ پہلے میورل میں مرغان جہاں کا اجتماع دکھایا ہے۔ بلبل، قمری، طوطی، فاختہ، چرخ، کبک، تَدَرْو، دُرّاج، باز، طاؤس، مرغِ زرّیں۔ یہ سب ہدہد کی رہنمائی میں اپنے بادشاہ کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ دوسرے میورل میں دکھایا ہے کہ ازہزاراں کس یکے آنجا رسید۔ ہزاروں میں کوئی ایک آدھ خوش قسمت ہوتا ہے جسے منزل پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے جھرمٹ میں سے صرف تیس پرندے اس مقام تک پہنچے ہیں جہاں انہیں سیمرغ نظر آتا ہے۔ وہ فنا اور وصال کا عجیب و غریب مقام ہے۔ متلاشی وہاں پہنچے تو خود اپنے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ ان تیس عدد پرندوں یعنی سی مرغانِ جہان کا عکس ہی سیمرغ

نکلا۔ وہ کبھی سیمرغ کو دیکھتے کبھی اپنی طرف نگاہ کرتے۔ دونوں جگہ سیمرغ نظر آتا۔ دونوں کو بہ یک وقت دیکھتے تو صرف ایک سیمرغ نظر آتا۔ دریافت، حیرت اور خودشناسی کی اس کیفیت کو میں نے زیبائشی پتھر کی زبان خاموش سے بیان کیا ہے۔

میں نے خیال اور اظہار خیال کی داد دی اور عطار کو یاد کیا۔ پاکستان میں عطار کا نام زندہ ہے مگر ایک مخصوص اور مختصر حلقہ میں۔ عام آدمی کا ذکر کیا۔ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ بھی فارسی سے ناواقف ہے۔ مجھے ایک بار فرینک فرٹ سے کسی پاکستانی نے لکھا کہ ہمارا اردو پہ یہ احسان کیا کم ہے کہ ان ممالک میں رہنے کے باوجود جہاں ہمارے بچے اردو کو تیسری یا چوتھی زبان کے طور پر سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں ہم لوگ پاکستان سے اردو کی کتابیں منگاتے اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ جہاں اردو کا مستقبل اتنا مخدوش ہو وہاں آپ لوگ خواہ مخواہ فارسی اشعار استعمال کر کے اس زبان کو ناقابل فہم اور نامقبول کیوں بنارہے ہیں۔ فارسی ضروری ہے تو اس کا ترجمہ اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ خط لکھنے والے کی شکایت میں وزن ہے۔ فارسی شعر شعبۂ زبانِ فارسی اور ایرانی تصوف شعبۂ فلسفہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

ہمارے یہاں لوگ عطار کو دو شعر اور ایک مصرع کے حوالہ سے سرسری طور پر جانتے ہیں۔ مصرع عطار کا ہے اور ضرب المثل بن چکا ہے۔ شعر دونوں مولانا روم کے ہیں۔ ان میں عطار کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ عطار روح بود و سنائی دو چشمِ او۔ ما در پس سنائی و عطار آمدیم۔ عطار روح تھا اور سنائی اس کی دو آنکھیں، ہم ان دونوں کی تقلید کرنے والے لوگ ہیں۔ دوسرا شعر زیادہ مشہور ہے۔ ہفت شہر عشق را عطار گشت۔ ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم۔ عطار نے عشق کے کتنے ہی شہروں کی سیر کی ہے، اور ایک ہم ہیں کہ عشق کی ایک گلی کے گھماؤ سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکے۔

عطار کا ایک مصرع رائج الوقت ہے۔ ہر کس و ناکس پرانے دنوں کو یاد کرنے اور آہ بھرنے کے بعد اسے پڑھتا ہے۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ پیالہ بھر بھر کر دینے والا محبوب بھی نہیں رہا۔ سب کچھ لٹ گیا۔ باقی کچھ بھی نہیں بچا۔ عطار کو شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ اس کا یہ مصرع اردو زبان کا محاورہ بن جائے گا اور اس کثرت سے استعمال ہو گا کہ لوگ پورا شعر اور کنیز کے عشق سے چھٹکارا حاصل کرنے

والی تدبیر فراموش کر دیں گے۔

عطار نے ایک نوجوان کا قصہ بیان کیا ہے۔ ہونہار اور لائق فائق تھا۔ تحصیل علم کے سوا اسے دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ استاد کی ایک کنیز بہت خوبصورت تھی۔ شاگرد کی اس پر نظر پڑی اور وہ کنیز کے عشق میں دیوانہ ہو گیا۔ تعلیم دھری کی دھری رہ گئی۔ عشق نے اسے ناکارہ اور نکما کر دیا۔ استاد نے عشق حقیقی اور مجازی کا فرق سمجھانے کے لئے تدبیر سے کام لیا۔ کنیز کی فصد کھلوائی اور بہت سا خون نکال لیا۔ مسہل دیا۔ جو کچھ جسم میں تھا سب باہر آگیا۔ رہی سہی کسر ہیضہ نے پوری کر دی۔ وہ خوبصورت کنیز جو کبھی نیک چشم، دلبر، آرام جاں، عالم آرا، شگفتہ پیکر اور سر سے پاؤں تک نزاکت ہی نزاکت اور مسرت ہی مسرت ہوا کرتی تھی سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ رنگ سیاہ پڑ گیا۔ دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ اس کیفیت کو عطار نے شعر میں یوں ادا کیا ہے۔ از جمالش ذرّہ باقی نماند۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ ذرہ بھر حسن بھی اس کا باقی نہ رہا۔ وہ پیالہ ہی ٹوٹ گیا ہے۔ استاد نے شاگرد سے کہا، تم جو اس کا دم بھرتے تھے اب بیزار نظر آتے ہو۔ آخر اس محبوبہ میں کونسی کمی ہے۔ جو کچھ اس کے جسم سے کم ہوا ہے وہ بھی میں پیش کر دیتا ہوں۔ اس طشت کو دیکھو اس میں وہ ساری نجاست اور غلاظت جمع ہے جو فصد، مسہل اور ہیضہ کی وجہ سے اس محبوبہ کے جسم سے تفریق ہوئی تھی۔ باقی سب وہی ہے جو پہلے تھا۔ تو نے جس رنگ و روپ سے عشق کیا تھا اس کی اصل یہ نجاست ہے۔ صورت پرستی کی بس یہی اوقات ہے۔ اچھی صورت تمہاری اپنی ہوس کا نام ہے۔ صورت کا عشق چھوڑو۔ یہ نظر کا دھوکہ ہے۔ صفات سے عشق کرو۔ تاکہ معرفت کا سورج تمہارے دل و جان کو روشن کر دے۔

عطار کی مثنوی میں آٹھ دس اشعار کی ایک چھوٹی سی سبق آموز حکایت درج ہے جسے میں ایک عرصہ تک دوستوں کو بڑے شوق سے سنایا کرتا تھا۔ پچھلے چند برس سے میری داستان گوئی کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔ حکایت بیان کرتے ہوئے حجاب آتا ہے۔ یہ قصہ حضرت عیسیٰؑ کا ہے۔ ایک بار وہ سر کے نیچے تکیہ کے طور پر ایک اینٹ رکھ کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ شیطان ان کے سرہانہ کھڑا ہے۔ اس سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ شیطان نے جواب دیا کہ یہ دنیا میری جاگیر ہے۔ یہ اینٹ جس کا آپ نے تکیہ بنایا ہوا ہے وہ بھی میری ملکیت ہے۔ آپ نے میری چیز استعمال میں لا کر اپنے آپ کو میرے حلقہ میں شامل

کر لیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے سر کے نیچے سے اینٹ نکال دی۔ شیطان وہاں سے چلا گیا۔ عطار کہتا ہے کہ جب آخر کار لحد کا کچا فرش ہی تمہارا مستقل ٹھکانہ ہے تو اینٹ کی چنائی پہ چنائی کرنے اور رَدے پہ ردا جمانے کا کیا فائدہ۔

آزادی کے چند سال بعد پاکستان میں ایک ایسا دور آیا جب نئی بستیاں بسانے اور نئے مکان بنانے کے شوق نے جنون کی صورت اختیار کر لی۔ مکان سر چھپانے کا وسیلہ نہ رہا بلکہ فاضل دولت کی نمائش اور اسے کھپانے کا ذریعہ بن گیا۔ پی ای سی ایچ ایس، کے ڈی اے، گلبرگ، شالیمار، رمنا، ڈیفنس۔ لوگ چنائی پہ چنائی کرتے رہے یہاں تک کہ پانچواں گلبرگ اور آٹھواں ڈیفنس وجود میں آگیا۔ اس دور سنگ و خشت میں میں نے کئی بار احباب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان کی ہر رہائشی اور نمائشی بستی کے صدر دروازہ پر عطار کا یہ شعر کندہ کیا جائے۔ چوں پسِ پشتِ لحد خواہی فتاد۔ خشت بر خشتے چرا خواہی نہاد۔ جب میں کام سے فارغ ہو کر لاہور آیا تو میں نے بھی اینٹ پر اینٹ رکھی اور تہ پر تہ جمائی۔ مکان میں توسیع ہوئی۔ رہائش آرام دہ ہو گئی۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ اب میں حضرت عیسیٰؑ اور ابلیس والی حکایت کسی کو سنانا چاہوں تو سنانے کی ہمت نہیں ہوتی اور میں بہت بے کل اور بے آرام ہوتا ہوں۔

میں اور محمد احصائی مدرسہ الٰہیات کے ہال سے باہر نکلے اور بر آمدہ سے ہوتے ہوئے طبقۂ زیر زمین کی طرف روانہ ہوئے جہاں کاشی کاری میں آیات لکھی ہوئی ہیں۔ بات دنیا کی بے ثباتی کی ہو رہی تھی اور مثال عطار کے شعر کی بجائے اس کی زندگی کے آخری لمحات سے دی جا رہی تھی۔ یورش تاتار میں گرفتار ہونے والوں میں ایک پیر مرد شیخ فریدالدین عطار بھی تھا۔ جس اجڈ اور سفاک تاتاری سپاہی نے انہیں گرفتار کیا تھا اسے ایک شخص نے شیخ کی رہائی کے عوض دس ہزار اشرفیوں کی پیشکش کی۔ عطار نے سودا بگاڑ دیا۔ کہنے لگے، اس قیمت پر مجھے ہرگز فروخت نہ کرنا۔ یہ بہت کم ہے۔ پھر ایک گاہک اور ملا جس نے کہا کہ یہ گھاس کا گٹھر لے لو اور غلام میرے حوالہ کر دو۔ عطار نے کہا، فوراً سودا چکا لو۔ میری قیمت پرِ کاہ سے بھی کم ہے۔ سپاہی کو غصہ آیا۔ اس نے تلوار نکالی اور شیخ فریدالدین عطار کو قتل کر دیا۔ بات جب عطار کے قتل تک پہنچی تو احصائی چلتے چلتے رک گئے۔ کہنے لگے، اس وقت ہم بر آمدہ میں جس جگہ کھڑے ہیں یہ وہ جگہ ہے جہاں مدرسہ الٰہیات کے رئیس ڈاکٹر

مفتح شہید ہوئے تھے۔ ایک روز ساڑھے نو بجے صبح وہ اپنے دو محافظوں کے ساتھ مدرسہ کے دروازہ پر سواری سے اترے۔ وہاں تین باریش نوجوان کھڑے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر مفتح اور ان کے محافظوں پر گولی چلا دی اور ایک یاماہا موٹر سائیکل پر فرار ہو گئے۔ ڈاکٹر مفتح زخموں سے چور دروازہ سے بر آمدہ تک بھاگتے ہوئے آئے اور اس جگہ نڈھال ہو کر گر گئے۔ انہوں نے آخری سانس بر آمدہ کے فرش پر اسی جگہ لی تھی۔

(3)

ایک دن میں احصائی کے ہمراہ رضا مافی کے گھر جا پہنچا۔ یہ اونچی عمارتوں اور رہائشی فلیٹوں کا خوش حال علاقہ ہے۔ رضا مافی ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ عمارت خوش نما ہے۔ طرح اور طرز جدید ہے۔ استقبالی حصہ میں شیشہ کی دیوار، سیاہ پتھر کا فرش، مہماندار کی کلف لگی ہوئی وردی اور لفٹ کا بے آواز کھلنا، بند ہونا اور چلنا بتا رہا ہے کہ رضا مافی ایک لگژری فلیٹ میں رہتے ہیں۔ فلیٹ چھوٹا سا ہے اس لئے یہ بات بھی طے ہو گئی کہ یہ مصور اور خطاط بھی غیر شادی شدہ ہے۔ میرے ساتھ اگر شعبۂ تشریفات کی وہ خاتون ہوتی جو احصائی کے گھر لے کر گئی تھی تو اس کو یہاں اپنی تیس سال نا کتخدا مصورہ بھانجی کی یاد کچھ زیادہ ہی ستاتی۔ رضا مافی ادھیڑ عمر کے سمارٹ آدمی ہیں۔ گھنے، پھولے ہوئے، کسی قدر گھنگھریالے، کھچڑی بال۔ لیوائی کی رنگ بے رنگ نیلگوں پتلون پہنے ہوئے۔ قمیص کے کف کھلے اور آستیں ایک دو تہ اوپر اٹھائی ہوئی۔ صوفہ افرنگی، قالین ایرانی، الترونک کا سامان جاپانی، فرنیچر دنمارکی۔ ایک دیوار پر بڑی سی تصویر اور باقی تمام دیواروں پر چھوٹی چھوٹی تصویریں۔ گفتگو کا آغاز اتفاقاً گھوڑوں سے ہوا۔ عربی اور ایرانی، اصیل اور دو نسلی، یک رنگ اور چتکبرے۔ رضا مافی کو گھڑ سواری کا بہت شوق ہے۔ کسی زمانہ میں مجھے بھی گھڑ سواری بلکہ شہسواری کا شوق تھا۔ اب صرف اس کی یاد باقی ہے جو اس شوق کا ذکر بڑے مبالغہ کے ساتھ کرتی ہے۔ گفتگو میں تین گھوڑوں کا ذکر خاص طور پر آیا۔ رخش جو رستم کا گھوڑا تھا۔ پیگاسس جو یونانی اساطیر کا پر دار گھوڑا ہے جس کی ٹاپوں سے وہ چشمہ پھوٹا جہاں سے

شاعر اور ادیب فیضان حاصل کرتے ہیں۔ تیسرا وہ سرکش گھوڑا تھا جسے توسنِ فکر کہتے ہیں۔

رضا باورچی خانہ میں چلے گئے اور وہاں سے مکسر مشین کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ احصائی نے کسی سے فون پر باتیں شروع کر دیں میں نے موقع غنیمت جانا اور توسنِ فکر کو ایڑ لگائی۔ وہ مجھے لے کر بہت دور نکل گیا۔ یہ وہ دن تھے جب بہاولپور آرٹ کونسل کے زیر اہتمام نگار خانۂ خطاطی کے نام سے ایک نمائش ہوئی تھی۔ خطبہ استقبالیہ کے لئے چند کتابی حوالوں سے رجوع کیا۔ ان سے متاثر ہو کر میں نے خطاطی کے بارے میں باقاعدہ تحقیق شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں مجھے سن ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کے بہت سے کاتبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ گھر، بیٹھک، چوبارا، دکان، کھوکھا، چھاپہ خانہ، ورک شاپ۔ میں جگہ جگہ ان کی تلاش میں پھرتا رہا۔ کہاں احصائی اور رضا مانی کے خوش نما فلیٹ اور اسٹوڈیو اور کہاں لاہوری دروازہ کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں اور پھٹی ہوئی دیواروں والی خستہ حال بیٹھک کاتباں۔ میں کراچی میں یوسف دہلوی سے ملنے گیا۔ وہ کپڑے کے تھوک بیوپاریوں کے درمیان ایک چھوٹی سی دکان پر بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔ یہ وہی یوسف دہلوی ہیں جن کی خطاطی نئی دلی کی تعمیرات میں استعمال ہوئی۔ پاکستان کے پہلے کرنسی نوٹ پر عبارت تحریر کرنے کے لئے منتخب کی گئی۔ اور ریڈیو پاکستان کے طغرے کی صورت میں آج بھی آنکھوں میں بسی ہوئی ہے۔ میں لاہور میں حافظ یوسف سدیدی سے ملاقات کے لئے رات کے ایک بجے روزنامہ امروز کے دفتر پہنچا۔ وہ راہرو میں تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس گزرگاہ میں خلل ڈالنے اور خلفشار پیدا کرنے کے سارے اسباب موجود تھے۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ سکون اور ماحول تھا جو خوش خطی اور خطاطی کے لئے درکار ہے۔ حافظ صاحب کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ جب تک سرخی نہیں لگی انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کون آیا کون گیا اور کون دیر سے ان کے پاس کھڑا ہے۔ جمیل رقم مغلپورہ ورکشاپ میں ریل گاڑی کے ڈبوں پر رنگ کیا کرتے تھے۔ الماس رقم کبیر سٹریٹ کے ایک تاریک چوبارے میں کام کرتے تھے۔ قریب ہی میونسپل کمیٹی نے کوڑا ڈالنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی جہاں ہمیشہ ایک بدبودار انبار لگا رہتا۔

رضا مانی ٹرے میں مشروبات لے کر آئے۔ ان کے کپڑوں سے فرانسیسی پرفیوم کی

بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ سب خیال چراغ پا ہو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور خیال نے ایران کے معدنی تیل اور قدرتی گیس کے سارے کنوئیں اور ذخائر پاکستان منتقل کر دیئے اور پاکستان کی نصف آبادی کو اٹھا کر ایران پہنچا دیا۔ اس تبادلہ کے بعد رضا مافی کو دیکھا کہ وہ رے کی نواحی بستی کے ایک کچے مکان میں رہتے ہیں۔ پانی مشک میں آتا ہے اور کھلی نالیوں سے گزر کر ایک جوہڑ میں جمع ہو جاتا ہے۔ مافی تہران کے لنڈے بازار سے خریدی ہوئی یورپ اور امریکہ کی اترن پہنے ہوئے ہیں۔ قمیص ایک سائز چھوٹی ہے۔ کوٹ دو سائز بڑا ہے۔ اوور کوٹ زنانہ ہے۔ مافی کا رنگ گندمی ہے۔ سر گنجا ہے۔ شیو بڑھا ہوا ہے۔ اور وہ طشت میں نان بربری کا سوکھا ہوا ٹکڑا اور پنیر کا ڈلا سبز پتوں کے ساتھ لے کر آتے ہیں اور مہمان کے سامنے فرش پر رکھ دیتے۔ منظر بدلتا ہے۔ ادھر پاکستان میں دو نوجوان نظر آتے۔ ایک پنجاب کلب میں ٹینس کھیل کر اپنی سپورٹس کار میں بیٹھ رہا ہے۔ یہ ابن پرویں رقم ہے۔ علامہ اقبال کے کاتب کا فرزند۔ دوسرا نوجوان تھری پیس سوٹ کا کوٹ ہینگر پر لٹکا کر جم خانہ میں بلیرڈ کی میز پر کیو لے کر جھکا ہوا ہے۔ اس کا ساتھی کھلاڑی جو اپنی باری کے انتظار میں کیو کی نوک پر نیلا چاک مل رہا ہے میاں چنوں کے حلقہ سے کامیاب ہونے والا ایک سیاست دان ہے۔ سوٹ والا نوجوان شاٹ لگانے کے بعد سر اٹھاتا ہے۔ سب اسے پہچان لیتے ہیں۔ یہ سلیم ابن زریں رقم ہے۔ اس کے ساتھی کا نام غلام حیدر وائیں ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ تیل کی دولت واپس ایران جا چکی تھی اور آبادی کا ہجوم اپنی غربت سمیت واپس پاکستان پہنچ چکا تھا۔

استاد تاج الدین خطاط کا لقب زرّیں رقم تھا۔ گویا وہ لکھتے نہیں زر نگاری کرتے تھے۔ مجھے رضا مافی اس لقب کے صحیح حقدار نظر آتے ہیں۔ رضا مافی نے مصوری، خطاطی اور ٹیکنالوجی کے امتزاج سے ایک منفرد تجربہ کیا ہے۔ وہ دہرے موٹے کاغذ پر پہلے کیمیائی مواد لگاتے ہیں اور پھر اس پر سونے کے ورق بیلنے کے بعد گھریلو برقی تنور میں اسے حرارت پہنچاتے ہیں۔ جب کاغذ اور ورق یک جان ہو جائیں تو وہ حنائی روشنائی اور ایک خاص قلم سے سونے کے پرت پر خطاطی کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر کیمیاوی عمل کی باری آتی ہے مگر اس مرتبہ وہ وصلی کو سایہ میں رکھ کر سکھاتے ہیں۔

رضا مافی نے بتایا کہ مصوری اور خطاطی کے امتزاج کا تجربہ سن تیس کی دہائی میں ایک

امریکی مصور نے کیا تھا۔ اس کے بعد اس فن پر مختلف اسلامی ممالک میں توجہ دی گئی۔ اسلام پسندی کے رجحان کے ساتھ ہی یہ فن عام ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے۔ مصور، خطاط بن سکتا ہے۔ مگر خطاط مصور نہیں بن سکتا۔ اور وہ فنکار جسے کمرشل آرٹسٹ کہتے ہیں وہ مصور ہوتا ہے نہ خطاط۔ ان دنوں مصورانہ خطاطی کے تین طرح کے نمونے ملتے ہیں۔ مصور کے بنائے ہوئے، خطاط کے بنائے ہوئے اور کمرشل آرٹسٹ کے بنائے ہوئے۔ توجہ کے لائق صرف وہ فن پارے ہوتے ہیں جنہیں مصور تیار کرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ بالخصوص عراق میں چند مصور اس طرح کی مصوری کے بڑے ماہر ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پیرس میں جا بسے ہیں۔ مجھے بھی کئی بار موقع ملا مگر میں نے تہران میں رہنا پسند کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اہل یورپ مصورانہ خطاطی کے نمونے مشرق وسطیٰ بر آمد کرتے اور دولت کماتے ہیں۔ بیروت، دمشق، قاہرہ اور رباط میں جو مصورانہ خطاطی پانچ سو ڈالر میں بمشکل فروخت ہوتی ہے وہ پیرس میں بآسانی پانچ ہزار ڈالر میں فروخت ہو جاتی ہے۔

رضا مافی کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا مگر کم کم۔ اس طرح دونوں طرف اشتیاق قائم رہا۔ ایک دن ان کے گھر میں بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ابن حسن برنی کی محبتوں کا جواب کیوں نہ ایک زریں نعتیہ شعر کی صورت میں دیا جائے۔ مہینہ بھر کے بعد میں تہران سے لندن گیا۔ میرے دستی بیگ میں رضا مافی کا سونے کے ورق پر سعدی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔ بلغ العلی بکمالہ کشف الدجی بجمالہ۔ حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ و آلہ۔ شعر کو خطاط نے چار مصرعوں میں تقسیم کر دیا اور مروجہ انداز میں ایک قطعہ کے طور پر لکھا۔ برنی نے بڑے شوق سے اسے فریم کرایا اور سٹنمور میں اپنے اس ڈرائنگ روم میں آویزاں کیا جس کی شیشہ کی دیوار سے ان کا کینوس سے ڈھکا ہوا سوئمنگ پول اور اس سے پرے ان کے یہودی ہم سایہ کا بنگلہ نظر آتا ہے۔ زریں خطاطی کی اس وصلی کے ایک کونے میں خطاط کا نام، ہدیہ پیش کرنے والے کا نام اور جس کو پیش کیا ہے اس کا نام درج ہے۔ سن اور تاریخ اس کے علاوہ ہے۔

میں نے رضا مافی سے فرمائش کی کہ وہ مجھے زریں وصلی پر اقبال کے چند اردو شعر لکھ دے۔ معذرت خواہ ہوئے کہ اردو نہیں آتی۔ میں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے۔ رسم الخط

نستعلیق ہے۔ بہت سے الفاظ فارسی کے ہیں اور ردیف عربی میں ہے۔ ابھی تک آپ صرف فارسی کے خطاط ہیں۔ یہ غزل لکھ کر آپ کا شمار اردو اور عربی کے خطاطین میں ہونے لگے گا۔ مسکرائے اور بولے، آپ اشعار لکھوا دیں اور معنی بتا دیں۔ میں کوشش کروں گا۔ میں نے ضرب کلیم اٹھائی۔ خودی کا سر نہاں لاالہ الا اللہ سے شروع کیا اور مجھے ہے حکم اذاں لاالہ الااللہ پر ختم ہونے والے ساتوں اشعار انہیں لکھا دیئے۔ جب میں نے معنی بیان کرنے شروع کئے تو رضا مافی کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا۔ مگر یہ کیفیت خوف کے مارے نہیں حیرت کی وجہ سے تھی۔ غزل ختم ہوئی اور اس نے کہا۔ آج مجھے اقبال کی عظمت کا احساس ہوا ہے۔ فلسفہ کتنا عمیق، فکر کتنی بلند اور شعر کتنا شیریں۔ ان اشعار میں اسلام کی روح اور اسلام کا مینی فسٹو دونوں موجود ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب کا جواز اور اس کی توجیہ جس وضاحت اور صراحت کے ساتھ اقبال کے ان اشعار میں ملتی ہے وہ ہمیں معاصر شعراء ایران کے یہاں نہیں ملتی۔ میرے لئے ان اشعار کا لکھنا باعث فخر ہو گا۔ رضا نے یہ وصلی فخر کے ساتھ لکھی اور میں اسے بڑے فخر کے ساتھ ایران سے پاکستان لے کر آیا۔

تہران سے رخصت کے وقت آر سی ڈی کے عملہ نے دفتر میں جمع ہو کر چائے پلائی اور مجھے الوداع کہا۔ میری طرف سے عائد کی ہوئی شرط پر عمل ہوا۔ یہ ایک خاموش تقریب تھی۔ نہ ادھر سے تقریر میں تعریف کا پل باندھا گیا، نہ ادھر سے جوابی تقریر میں دوسرا پل تعمیر کیا گیا۔ سب لوگوں سے ہاتھ ملا کر میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ رخصت کرنے والوں نے خبر دی کہ ایران ترک اور پاکستانی عملہ کی طرف سے ایک مشترکہ الوداعی تحفہ موٹر کی اگلی سیٹ پر رکھا ہوا ہے۔ یہ آپ کو ہماری یاد دلاتا رہے گا۔ میں نے آگے جھک کر دیکھا تو سیٹ پر تحائف کی بستہ بندی کے لئے مخصوص خوش نما چکنے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک فریم رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے جو چند افسر تبدیل ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک کو ہم کار ساتھیوں نے مل کر میناتوری تصویر کا تحفہ دیا تھا۔ اس روایت کی پیروی میں کیا حرج ہے۔ موقع انکار کا نہیں شکریئے کا ہے۔ تاہم میں نے رسماً کہا، اس کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ جواب میں کسی نے کہا، سر، ہم نے اس کی ضرورت محسوس کی اس لئے یہ تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ ہم سے اتفاق کریں گے۔ موٹر گھر پہنچی۔ میں نے فریم کو ایک طرف

رکھ دیا اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ جن کی فہرست چار سالہ قیام کے بعد مستقل واپسی کی وجہ سے بہت طویل تھی۔ شام کو فرصت ملی۔ میں نے رنگین چکنا کاغذ اتارا۔ اس میں فریم تو تھا مگر میناتوری مصوری کا نمونہ نہیں تھا۔ اس کی بجائے سونے کے ورق پر رضامافی کے قلم سے سعدی کا بیت لکھا ہوا تھا۔ بلغ العلی بکمالہ۔ اس کے نیچے خفی قلم میں یہ عبارت درج تھی۔ تقدیم بہ جناب آقای مختار مسعود از طرف ہمکاراں در آر سی دی۔

مڈل سیکس کاؤنٹی میں برنی کے گھر سعدی کے نعتیہ شعر بخط رضامافی کو سنہری فریم میں جڑے اور مغربی دیوار پر لگے ہوئے سال دو سال گزرے ہوں گے کہ اس پر ایران کے بنک مرکزی کے نائب رئیس کی نظر پڑ گئی۔ کہنے لگے، آپ کے پاس ایرانی خطاطی کا ایک بیش بہا اور بے بدل نمونہ موجود ہے۔ رضامافی دور حاضر کے مشہور مصور اور خطاط تھے۔ پچھلے دنوں وہ کرج کے تفریحی مقام پر سواری کرتے ہوئے گھوڑے سے گرے اور جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

باب چہار دہم

الفاظ

مجھے ایران آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اہل ایران انقلاب برپا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جلسہ، جلوس، ہڑتال، ہنگامہ، تیربارانی، شہادت، بہشت زہرا اور چہلم۔ محنت بار آور ہوئی۔ انقلاب آ گیا۔ اہل ایران کی مصروفیات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ فرار، پکڑ دھکڑ، داد گاہ اور سزائے موت۔ عارضی انقلابی حکومت، رفرندم، اسلامی آئین، انتخاب اور ضد انقلاب۔ کسی ایرانی سے دوستی کرتے تو کیسے کرتے۔ بھاگنے والوں سے دوستی ہو سکتی ہے نہ ان کا پیچھا کرنے والوں سے۔ دونوں آپس میں اتنے الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی تیسرا دکھائی نہیں دیتا۔ بالفرض دکھائی بھی دے تو یہ دیکھ کر کہ دوستی کا ہاتھ بڑھانے والا غیر ملکی ہے وہ ان جان بن جاتے ہیں۔

غیر ملکی کو یہاں بیگانہ، اجنبی یا خارجی کہتے ہیں۔ یہ نام ایک دیوار ہے جو اندر اور باہر کو جدا کرتی ہے۔ انقلاب نے اس دیوار کو اَور اونچا کر دیا ہے۔ لوگ محتاط ہو گئے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ خارجیوں سے تعلقات ان کو کسی مشکل میں نہ ڈال دیں۔ ان حالات میں کسی بیگانے کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ دوستداری کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو عبور کرے اور آشنائی اور یاری کی اس منزل تک پہنچے جہاں جدائی کی صورت شراب کے دو پیالے بھرے جاتے ہیں۔ ایک پیالہ دوست کی یاد میں زمین پر الٹ دیتے ہیں، پھر کہیں دوسرے کو ہونٹوں تک لاتے ہیں۔ وہ جو میری سرسری سرکاری شناسائیاں، ادھ گلے تعلقات اور کچی

پکی دوستیاں تھیں انہیں بھی کسی کی نظر کھا گئی۔ وہی دمشق والی قحط سالی تھی کہ یاران فراموش کردند عشق۔ میں نے طے کیا کہ ان دنوں کسی ایرانی سے دوستی کرنے کی یک طرفہ کوشش کے بجائے یہ کہیں بہتر ہو گا کہ میں کچھ عرصہ کے لئے انسانوں کو چھوڑ کر الفاظ سے دوستی کروں۔ میں لفظ دوستی کے مختصر سفر پر نکلا تھا مگر وہ اتنا دلچسپ لگا کہ دیر تک واپسی کی ہر صدا کا جواب میں نے دائیں سے بائیں سر ہلا کر نفی میں دیا۔

ایک استقبالی دعوت میں کسی دوست نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ڈیڑھ دو سو افراد کے ہجوم میں انہیں ڈھونڈ لیا۔ کبھی ایسی دعوتوں میں مہمان ہزاروں کی تعداد میں آیا کرتے تھے۔ اب اگر دو سو مہمان جمع ہو جائیں تو استقبالیہ کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش نظر آئے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ آپ واقعی سچ کہتے تھے۔ یہ قوم بڑی خوش مذاق ہے اور فارسی بڑی شیریں زبان ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہائی اسکول میں ہمارے اردو کے استاد نے اپنا سارا زور بیان اس پر صرف کر دیا تھا کہ شاعری میں مجاز کے پردے میں حقیقت کی بات کی جاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے کچے ذہن اردو غزل کے عشقیہ اشعار سے گمراہ ہو سکتے ہیں اس لئے ہمارے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ قیس اور لیلیٰ کے پردہ میں خدا اور اس کے چاہنے والے چھپے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تصوف کے نام پر ہمیں کئی ایسی غزلیں پڑھا دیں جنہیں ہم ان دنوں معاملہ بندی اور سوقیانہ جذبات کی ترجمانی سے زیادہ کوئی اور حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ آج میں نے تہران میں مجاز اور حقیقت کا ایک ایسا پہلو دیکھا جو ہمارے اسکول ماسٹر کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ طبیعت نہال ہو گئی اور بے اختیار اہل ایران کی جدت اظہار کی داد دینے کو جی چاہا۔ مجھے معلوم ہے کہ آج کل آپ نئے الفاظ کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو اپنی دریافت اور خوشی میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی مرسڈیز کار ٹھیک کرانے کے لئے ایک ورکشاپ میں گیا۔ اس کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا، تعمیر گاہِ مجاز۔ گویا جرمنی کے جس کارخانہ میں مرسڈیز موٹر کار بنائی جائے وہ تعمیر گاہ حقیقی اور ایران میں جہاں موٹر کی مرمت کی جائے وہ تعمیر گاہ مجازی۔ مجاز اور حقیقت کا یہ رشتہ ہمارے شاعر اور ادیب کے خیال میں کیسے آتا۔ اس کے لئے ایک ترقی یافتہ صنعتی معاشرہ درکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے توقف کیا۔ ان کی نگاہیں داد طلب ہیں۔ میں نے

عرض کیا کہ بس زبر اور پیش کے فرق نے آپ کو مغالطہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ تعمیر گاہ کا مجاز پیش کے ساتھ ہے یعنی مرسڈیز کمپنی کی طرف سے اختیار اور اجازت حاصل کرنے والی ورکشاپ۔ وہ ہمارے اسکول ماسٹر والا اور علامہ اقبال کی فرمائش والا مجاز زبر کے ساتھ ہے۔ کبھی اے حقیقتِ منتظَر نظر آ لباس مجاز میں۔ الفاظ کی ساری جامہ زیبی اِعراب سے ہے۔ اگر آپ زیر زبر پیش کا لحاظ نہیں رکھیں گے تو فارسی کی لطافت ایک طرف رہی آپ اردو کو بھی بے لباس کر دیں گے۔ میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی کہ مخاطب استقبالیہ کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئے۔

ہم دونوں افضل جوزف کے گھر پہنچے۔ وہ سفارت خانہ میں فضائیہ کے نمائندہ ہیں۔ موٹر پارک کرنے میں حسب معمول زحمت ہوئی۔ پانچ چھ گھر چھوڑ کر ذرا سی جگہ ملی۔ میں نے موٹر پارک کر کے دروازہ پر لگی ہوئی نام کی تختی پڑھی۔ لیڈی ڈاکٹر ماہ گرفتہ۔ نام پسند آیا۔ میرے لئے بالکل نیا ہے۔ برعظیم میں چاند کے نام پر لڑکیوں کے نام رکھنے کا رواج بہت پرانا ہے۔ سولھویں صدی کے احمد نگر کے شاہی خاندان سے لے کر موجودہ کراچی کے ایک ماہر امراض چشم کی نور چشم تک چاند بی بیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ پنجاب میں سو برس پہلے کی طرح آج بھی ہر قصبہ میں دو چار مہتاب بی بیاں مل جائیں گی جنھیں ان کے گھر والے حسب عادت متاب بی بی کہہ کر بلاتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں بے شمار ایسی بچیاں ہیں جنھیں چاند کے حسن کی رعایت سے ماہرو، ماہرخ، مہوش اور ماہپارہ کہتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے طول و عرض میں کسی ماہ گرفتہ کا سراغ نہیں ملتا۔ میں اس نئے نام کے معنی پر غور کرتا ہوں۔ ماہ کو اپنی گرفت میں لینے سے شاید یہ مراد ہے کہ چاند بھی اس کے حسن کا غلام ہے۔ اگر یہ معنی ہیں تو خوب ہیں۔ اس کے بعد میں وہ جیبی ڈکشنری کھولتا ہوں جو لفظ دوستی کے آغاز سے ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ماہ گرفتہ کا مطلب چاند گرہن ہے۔ یہ کیا نام ہوا۔ اونچی دکان جو پکوان پھیکا ہونے کے علاوہ تیرہ و تار بھی ہے۔ ہمارے یہاں جو کوئی امید سے ہو اسے کسوف اور خسوف دونوں سے بچا کر رکھتے ہیں۔ جو سورج اور چاند کا عیب ہے وہ انسانوں کے لئے کیسے خوب اور درست ہو سکتا ہے۔ پیدائش سے پہلے ڈاکٹر جس صورت حال سے بچ کر رہنے کا مشورہ دیتا ہے، پیدائش کے بعد اس کیفیت کو لیڈی ڈاکٹر کے نام کے طور پر استعمال کرنا چہ معنی

دارد۔

یہاں لوگ جدت پسند ہیں۔ نومولود بچی کو چاند گرہن کے نام سے پکارتے ہیں۔ جدت کی حد یہ ہے کہ نومولود کو یہاں جدید الورود کہتے ہیں۔ نو میں جو تازگی کے علاوہ توقعات کی دنیا آباد ہے وہ جدید میں کہاں۔ جدید محض قدیم کی ضد ہے۔ آج کل یہ لفظ کم درجہ چیزوں کے درجات کی بلندی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو تحریر، تصویر، یا عمل نفس مضمون کے لحاظ سے کلاسیک کا مقابلہ نہ کر سکے اسے جدیدیت کا لیبل لگا کر فضیلت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ادھر نو کا یہ عالم ہے کہ جس لفظ کے ساتھ لگا دیجئے اس کی تازگی اور توانائی میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا خواہ وہ جوانی ہو، بہار ہو، مولود ہو کہ مسلم۔

نومسلم کو فارسی میں جدیدالاسلام کہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کسی یتیم خانہ یا مدرسہ کا نام ہے جسے قربانی کی کھالیں دے کر ثواب دارین حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی کو نومسلم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے ایمان کی پختگی اور عبادات میں شدیدالعمل ہونے کی گواہی دی جا رہی ہے۔ مسٹر جدیدالاسلام کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ فیشن کے طور پر اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ جونہی فیشن بدلا یہ اسلام سے باہر یا بیزار ہو جائیں گے۔ جدید ہونے کی وجہ سے ان کے بنیاد پرست یا جہاد پسند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اندریں حالات مغرب کی خواہش ہو گی کہ جو لوگ یورپ اور امریکہ میں اسلام قبول کریں وہ جدیدالاسلام ہوں نہ کہ نومسلم۔

اردو میں فیشن کے بہت سے تراجم اور مترادف ہیں مگر اس انگریزی لفظ کا استعمال ایک فیشن بن چکا ہے۔ آؤٹ آف فیشن کا ترجمہ انجمن ترقی اردو ڈکشنری (1985ء ایڈیشن) میں کچھ یوں درج ہے، مروجہ وضع قطع کے خلاف۔ اس میں نہ اختصار ہے نہ لطف۔ اس کیفیت کو فارسی میں بے رواج ہونا کہتے ہیں۔ بات مختصر اور مکمل، آسان اور شیریں۔ جان شیکسپیئر نے اپنی ڈکشنری (1834ء ایڈیشن) میں فیشن کو رواج کہا ہے۔ ہم اس کے ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی رواج کے ساتھ بے رواج کو رائج نہیں کر سکے۔ شاید اس کی وجہ محض کاہلی ہو۔ ہم عقل کو خرچ کرنے اور علم کو استعمال کرنے کے معاملہ میں کاہل ہو گئے ہیں۔ ساری مستعدی دنیا داری کے لئے وقف ہو گئی ہے۔ اردو میں پیسفک اوشن کا ترجمہ بحرالکاہل ہے۔ معلوم نہیں۔ یہ ترجمہ کس کاہل، بے خبر اور غیر ذمہ دار

شخص نے کیا تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے (اڑسٹھ ملین مربع میل) اور سب سے گہرے سمندر (تیس ہزار فٹ) سے یہ کہنا کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں لہٰذا تم بحرالکاہل ہو ایک بےوزن بات لگتی ہے۔ اہل ایران اس سمندر کو اوقیانوس آرام یا اوقیانوس سکون کہتے ہیں۔

اس جستجو میں بہت سے الفاظ جانے پہچانے نکلے۔ دفتری گھس گھس جسے ہم پاکستان میں حقارت سے کاغذی کارروائی کہتے ہیں ایران میں کاغذ بازی کہلاتی ہے۔ کارروائی سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی نے کوئی نہ کوئی کام سرانجام دیا ہے۔ بازی زیادہ موزوں ہے کیونکہ جو کچھ کاغذات میں ہوا وہ ایک کھیل تھا جو نالائق عملہ بڑی مہارت سے کھیلتا ہے۔ جو کام اردو ہاتھوں ہاتھ کرتی ہے وہ کام فارسی دستادست کرتی ہے۔ جو کام مقررہ وقت سے زائد وقت میں کیا جائے اس کے لئے اردو کی اپنی کوئی اصطلاح نہیں ہے لہٰذا انگریزی لفظ اوورٹائم سے کام چلاتے ہیں۔ فارسی میں اسے اضافہ کاری کہتے ہیں۔ کام کرنے کے لئے یہاں بھی کمر باندھی (کمرِ مردانگی را بستہ) اور آستین چڑھائی جاتی ہے (آستین ہمت را بالا زدہ)۔ کام کے ہر مرحلہ کے لئے فارسی کے دامن میں ایک نہ ایک موتی موجود ہے۔ کام نہ ملے تو بیکار، کام ملے مگر تنخواہ نہ ملے تو بیگار، محض ضابطہ کی پیروی ہو تو کاغذ بازی، کام مستعدی سے ہو جائے تو کارگزاری، مقررہ وقت سے زیادہ عرصہ میں ہو تو اضافہ کاری۔ کام کرنے والا سیکھ رہا ہو تو کار آموز، تجربہ کر رہا ہو تو کار آزما، چالاک ہو تو کاری گر، ماہر ہو تو کارشناس۔ کام کرے اور کوئی نہ پوچھے تو کارکن، کام نہ کرے اور نائب وزیر ہو جائے تو کاردار۔ وزارت میں آکر اصل پر جائے تو خراب کار۔ فارسی بھی کیا شائستہ اور کار آمد زبان ہے۔

انسانی جسم میں ہاتھ ایک اتنا اہم اور کار آمد عضو ہے کہ کسی اچھی اردو ڈکشنری کو اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ہاتھ سے متعلق کم و بیش پانچ سو محاورے اور مرکبات مل جائیں گے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ فرہنگ نویس ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ فارسی کی طرف دست طلب دراز کرتے ہیں۔ فارسی لفظ دست کا اردو کے ساتھ نکاح اس شرط پر کرتے ہیں کہ وہ ایک سو دست پرور محاورے جہیز میں لے کر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک میں نے لفظ دست کے جتنے مرکبات تہران میں سنے وہ سب مانوس اور آشنا

لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ پتہ چلا کہ ہم بعض فارسی الفاظ کو ان معنی میں استعمال نہیں کرتے جن میں اہل ایران کرتے ہیں۔ دست بند دونوں زبانوں میں زیور ہے مگر فارسی میں اس کے علاوہ ہتھکڑی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی فلموں میں ہتھکڑی کو مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ یہ معنی انہوں نے ایران سے براہ راست حاصل کئے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ پنجابی فلمیں بنانے والے ان پڑھ اور کور ذوق ہوتے ہیں۔ جو چار گرہ کپڑا پاکستان میں رومال ہے وہ ایران میں دستمال ہے۔ فرق کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہم پسینا پونچھتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ دستک ایران میں اس خوش آواز تالی کو کہتے ہیں جو گانے والے وزن اور سر قائم رکھنے کے لئے بجاتے ہیں۔ پاکستان میں ہم اس کثیر المعانی لفظ کو صرف دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مدت سے ہم نے عربی اور فارسی کا دروازہ کھٹکھٹانا چھوڑ دیا ہے۔ اور بھی کئی دروازے ہم نے بند کر لئے ہیں۔ نعمتوں کا نزول ہو تو کیونکر ہو۔

فارسی میں میٹھی نیند کو شکر خواب کہتے ہیں اور جس پلنگ پر آئے وہ تخت خواب کہلاتا ہے۔ اردو اور فارسی دونوں میں ایک تخت طاؤس موجود ہے۔ اردو والا تخت شاہ جہاں کے زمانہ میں بنا اور اورنگ زیب کے زمانہ میں اس کی آرائش میں اضافہ کیا گیا۔ نادر شاہ دلی آیا۔ اسے صرف چار چیزیں پسند آئیں۔ قتل عام، گلقند، ایک مغنیہ اور تخت طاؤس۔ قتل عام اس نے جی بھر کے کیا۔ یہاں تک کہ کسی نے پگڑی کھول کر گلے میں ڈالی، ہاتھ جوڑے اور عرض کیا، اے رحم دل بادشاہ۔ اب کوئی بھی نہیں بچا جسے تو اپنی تیغ ناز سے قتل کر سکے۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ تو پہلے مقتولین کو زندہ کرے اور پھر دوبارہ قتل عام کا حکم فرمائے۔ گلقند اس نے جی بھر کر کھائی۔ دسترخوان پر بار بار فرمائش کر کے منگائی۔ وہ اسے شیرینی سمجھا تھا۔ طبیب نے بھی ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ تاریخ خاموش ہے کہ جب طب نے اپنا اثر دکھایا تو خراسان کے چرواہے، ازبکوں کے غلام، افشار کے داماد، مشہد کے ڈاکو، شاہ طہماسپ کے سپہ سالار اور بالآخر چھیالیس سال کی عمر میں خود بادشاہ بن بیٹھنے والے پر کیا گزری۔ مغنیہ سمجھدار تھی۔ دلی کے کوئی دو ماہ کے قیام میں نادر شاہ کا دل اپنے کمال فن سے بہلاتی رہی۔ جب اس نے چاہا کہ ہمراہ لے جائے تو گا کر عرض کیا۔ نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی۔ رحم دل بادشاہ نے کہا۔ اگر تم ہمراہ جانا نہیں چاہتی تو نہ جاؤ۔ ہم

نے طے کیا ہے کہ کم از کم کوہ نور ہیرا اور تخت طاؤس اپنے ہمراہ لے جائیں۔

آغا محمد خاں قاچار کی باری آئی۔ انہوں نے تخت طاؤس کے تمام جواہرات اکھاڑ کر امیروں اور جوہریوں اور غیر ملکی قرض خواہوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ خالی لکڑی کے تخت کی کون حفاظت کرتا۔ نوکروں نے ردی اخباروں، خالی ڈبے اور بوتلوں کے ساتھ اسے بھی کباڑ میں بیچ دیا۔ اردو کا تخت طاؤس یوں اپنے انجام کو پہنچا۔ فارسی والا تخت طاؤس فتح علی شاہ قاچار کے حکم سے بنایا گیا۔ اس تخت کا اصلی نام تخت خورشید تھا کیوں کہ اس کے اوپر سونے اور الماس کا سورج بنا ہوا ہے۔ ایک دن بادشاہ کو بیٹھے بٹھائے بڑی دور کی سوجھی اور انہوں نے طاؤس نامی اصفہانی محبوبہ کے نام پر اس تخت کا نام تخت طاؤس رکھ دیا۔ یہ تخت آج بھی کاخ گلستاں میں رکھا ہوا ہے۔ دیکھنے والے بہت ہیں، بیٹھنے والا کوئی بھی نہیں۔ یہ تخت وراثت کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا اب عوام کی ملک بن چکا ہے۔ عوام تخت پر بیٹھا نہیں کرتے۔ خواہ وہ تخت طاؤس ہو یا تخت خورشید۔ وہ ان کو صرف الٹا کرتے ہیں۔

افضل جوزف کے گھر کے قریب ڈاکٹر ماہ گرفتہ کا گھر ہے۔ سیٹھی کے فلیٹ کی سیڑھیوں کے ساتھ لقمۂ لذیذ نام کا ایک چھوٹا سا ریستوران واقع ہے۔ خواجہ نعیم کے گھر جاتے ہوئے جوتوں کی دکان کے بورڈ پر نظر پڑی۔ نام ہے برہنہ پاہا۔ ننگے پاؤں۔ مرزا صاحب کے گھر کے راستہ میں بجلی کے لیمپ اور فانوس بیچنے والے نے دکان کا نام چراغ و نور رکھا ہوا ہے۔ محمود اور شمیم کے گھر کے پاس زمین دانش گاہ یعنی یونیورسٹی کیمپس واقع ہے جہاں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ دانش جو، دانش پرور، دانش پرست، دانشور، دانشی اور دانش دوست۔ یہاں علم و دانش کے مراکز کو دانش گاہ، دانش کدہ، دانش سرا، دانش پناہ اور دانش آباد کہتے ہیں۔ یہ اہل دانش ٹھہرے۔ اگر ہماری طرح انگریز کے یرغمالی ہوتے تو یہاں بھی قدم قدم پر یونیورسٹی، کالج، اسکول، انسٹیٹیوٹ، فیکلٹی، ڈپارٹمنٹ اور بیورو کا جال پھیلا ہوتا۔ یہاں اس قسم کی بدمذاقی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دفتر سے میرے گھر کا ایک راستہ ایسا بھی ہے جسے میں بہت کم استعمال کرتا ہوں۔ اس راستہ میں لڑکیوں کا ایک اسکول واقع ہے جس کے سامنے والی دیوار پر کاشی کاری کی ہوئی ہے۔ ایک نیلی روغنی ٹائل پر اسکول کا نام لکھا ہے۔ میں ہر مرتبہ اس نام کو ایسے پڑھتا

ہوں جیسے پہلی بار پڑھ رہا ہوں اور عش عش کرتا ہوں۔ نوجوان لڑکیوں کے اس اسکول کا نام محبوبۂ دانش ہے۔ بے شک اہل ایران علم و دانش، زبان فارسی اور دختران عجم کو بہت عزیز جانتے ہیں۔ میں نے اس مدرسہ کے نام کا ذکر لاہور میں ایک نامور خادم قرآن سے کیا۔ ان کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک پیدا ہوئی۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انہیں بتایا کہ ایران میں ذہین بچوں کو تیز ہوش کہتے ہیں۔ تہران میں ایک تعلیمی ادارہ ایسا بھی ہے جس میں داخلہ کے لئے مقابلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ اس کا نام مدرسہ تیزھوشاں ہے۔ کہنے لگے یہ نام بے لطف ہے۔ تیزہوش تک بات درست تھی۔ جمع بنائی اور بات بگڑ گئی۔ ہوشاں ایک بھدا لفظ ہے اسے ذہانت کے لئے استعمال کرنا مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس کا نام مدرسہ ہشیاراں ہونا چاہئے تھا۔ لاہور کے ایک پرانے فارسی شاعر کا شعر ہے۔ خیرہ اندر کرشمۂ چشمش ۔ ذوقِ مستان و ہوشِ ہشیاراں۔ اس کی آنکھوں کا کرشمہ ہے کہ مستوں کو مستی یاد رہتی ہے نہ ہوشمندوں کو ہوش۔

اسلام آباد میں "سلسلہ" کی نشست اصغر اور نثار بٹ کے گھر پر تھی۔ میں کہ چند دن کے لئے تہران سے آیا ہوا تھا اس ادبی نشست اور سانجھی ضیافت میں شامل ہوا۔ اس نشست میں قدرت اللہ شہاب نے اپنی زیر تصنیف کتاب شہاب نامہ کا ایک باب پڑھ کر سنایا۔ کھانے کے دوران شہاب صاحب نے مجھ سے ایران کا حال احوال پوچھا۔ بات شہنشاہ، آیت اللہ خمینی، پاک ایران تعلقات اور آر سی ڈی سے ہوتی ہوئی جدید فارسی تک جا پہنچی۔ میں نے کہا آپ کو یاد ہو گا کہ چند ماہ ہوئے انقلابی حکومت نے ایک رفرندم کرایا تھا کہ ایران کو اسلامی جمہوری مملکت بنایا جائے۔ کئی دن تک اخبارات کی شہ سرخیاں اس رفرندم کے لئے وقف رہیں۔ وہ رفرندم کو رفرندوم لکھتے تھے۔ میں نے ایک ایرانی سے تلفظ کے اس فرق کی بات کی۔ اس نے کہا، آپ نے لفظ انگریزی سے لیا اور اس کی اردو بنالی۔ ہم نے لفظ فرانسیسی سے لے کر اس کی تفریس کی۔ جس زبان سے لفظ مستعار لیا جائے اس کا اثر تلفظ پر ہوتا ہے۔ لیکن فارسی کوئی ایسی تہی دامن زبان نہیں ہے۔ اس میں رفرندوم کے لئے لفظ موجود ہے۔ علمی ادبی تحریروں میں اسی مقامی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔ جب اس ایرانی نے مجھے رفرندوم کی ہم معنی فارسی ترکیب بتائی تو میں دنگ رہ گیا۔ شہاب صاحب نے بڑے اشتیاق سے پوچھا وہ اصطلاح کیا ہے۔ میں نے کہا، اگر آپ

مجھ سے ایران کا حال پوچھیں تو احوال پرسی۔ کسی صحت مند سے اس کا حال پوچھیں تو مزاج پرسی۔ اگر بیمار سے جا کر اس کا حال دریافت کریں تو بیمار پرسی۔ کوئی بھی پوچھنے کے لئے نہ آئے تو کس مپرسی۔ لہٰذا کسی مسئلہ پر سب کی رائے حاصل کریں تو اسے کہیں گے، ہمہ پرسی۔ شہاب صاحب کو یہ فارسی لفظ بہت پسند آیا۔ وہ دیر تک اس ترکیب پر سر دھنتے رہے۔ کھانا ختم ہوا۔ وہ میرے پاس آئے اور اس معصومیت کے ساتھ جوان کے بشرہ کا مستقل حصہ بن چکی تھی کہنے لگے، آپ کی اجازت ہو تو میں اس لفظ کو شہاب نامہ میں شامل کر لوں۔ میں نے ان کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ قیافہ شناسی نے معصومیت کو چہرہ کا محض ایک پرت سمجھ کر اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ وہاں ایک اتھاہ سمندر ملا۔ قیافہ شناسی اس میں ڈوب گئی۔ شعور نے بہت غوطے لگائے مگر لاش کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بزرگوں کے منہ آنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔

دوسرے دن ممتاز مفتی کے یہاں چائے پر بہت سے ادیب جمع تھے۔ ان میں ضمیر جعفری بھی شامل تھے۔ ضمیر جعفری سے میری پہلی ملاقات ملتان میں دسمبر 1958ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں جس جعفری کا سورج ظرافت کے نصف النہار پر تھا اس کا نام سید محمد تھا۔ کپتان ضمیر کی حیثیت ایک ابھرتے ہوئے سورج کی تھی۔ یہ بات ہمیں ان دونوں جعفریوں سے مل کر پتہ چلی کہ ظرافت کے نظام شمسی میں ایک سورج سے زیادہ کی گنجائش موجود ہے۔ ضمیر جعفری کی ہنروری، صلاحیت اور قلب و نظر کی وسعت کا جو تاثر پہلی ملاقات میں قائم ہوا اسے اب میں اپنے امتیاز کے طور پر یاد رکھتا ہوں۔ خوش ہوتا ہوں کہ اس مرد شعر افگن اور نثر شکار کو پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ضمیر جعفری کی ایک بہو ایرانی ہے۔ ممتاز مفتی کے یہاں ضمیر جعفری نے دو چار شعر سنائے جو انہوں نے اپنی بدیسی بہو کے بارے میں کہے تھے۔ ایک مصرع میں کہتے ہیں۔ گھر میں چھوٹی سی آر سی ڈی ہے۔ مجھے ان اشعار نے اس لئے مزہ دیا کہ تہران میں اس خاتون کے خانوادہ کے بارے میں کچھ تحقیق و تفتیش میری معرفت بھی ہوئی تھی۔ باپ کو لڑکے کی پسند کے بارے میں ہمیشہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی لے آیا ہے۔ اور جب یہ پتہ چلے کہ وہ اچھے گھرانہ کی ہے تو یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتا ہے کہ آخر اس لڑکی نے میرے بیٹے میں کیا دیکھا کہ اس کے ساتھ بندھی چلی آئی۔

شیمران میں رہنے والے ایک دوست نے بتایا کہ ان کا مالک مکان بھروسہ کے دو راج مزدور لے کر آیا۔ کمرا بند کر کے دن بھر اندر کام ہوتا رہا۔ شام کو وہ لوگ باہر نکلے۔ تازہ پلستر سے پتہ چلتا تھا کہ ایک جگہ سے دیوار توڑ کر دوبارہ بنائی گئی ہے۔ جاتے ہوئے کہنے لگے، میں نے اس دیوار میں شراب کی ایک بوتل چن دی ہے۔ جس دن یہ ملا رخصت ہوں گے اس دن میں جشن مناؤں گا کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش۔ ان کا یہ بیان کرایہ دار کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس کا خیال ہے کہ دیوار میں سونا اور جواہرات چھپائے ہوئے تھے جو حالات کے پیش نظر وہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اس طرح چھپائے ہوئے خزانے کو فارسی میں گنج دیوار بست کہتے ہیں۔ دولت کو محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ بہت پرانا ہے۔ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا قصہ درج ہے۔ وہ ایک خوشحال بستی سے گزرے مگر کسی نے ان کی خاطر تواضع نہ کی۔ جب وہ ایک ایسے مکان کے پاس سے گزرے جس کی دیوار کچھ جھکی ہوئی تھی تو حضرت خضرؑ نے از خود اور بغیر اجرت اس دیوار کی مرمت کر دی۔ لوگ بے التفات ہوں اور آپ ان کے لئے بیگار و کام میں جت جائیں۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے۔ یہ بات حضرت موسیٰؑ کے علم میں نہ تھی کہ کان تحتہ کنز۔ علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش۔ ”اور وہ دیوار جو درست کر دی گئی تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ پس تمہارے پروردگار نے چاہا دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ محفوظ پا کر نکال لیں“۔ پس ثابت ہوا کہ باپ نیک ہو اور بچہ باپ پر ہو تو ساری زندگی جو دیوار بھی اس کی راہ میں حائل ہو گی اس کے نیچے خزانہ گڑا ہوا ملے گا۔ دیواریں اس لئے نہیں ہوتیں کہ مسافر رک جائے یا راستہ بدل لے۔ وہ مرمت کرنے یا ڈھانے کے لئے ہوتی ہیں تاکہ گنج دیوار بست جائز ورثہ تک پہنچ سکے۔

Archive اردو میں بھی آر کائیو ہے۔ جو زیادہ قدامت پسند ہیں وہ اسے محافظ خانہ کہتے ہیں۔ فارسی میں یہ اوراق بایگانی ہے۔ استنبول میں جہاں زبان یار من کے عربی سے ترکی میں تبدیل ہو جانے کی وجہ سے آر کائیو کا کوئی اچھا سا نام سننے کی توقع نہ تھی وہاں اسے خزینۂ اوراق کہتے ہیں۔ معتمد وزارت ثقافت نے یہ نام سنا تو کہنے لگے میں اسے پاکستان میں سرکاری طور پر رائج کروں گا۔ سرکار نے انہیں موقع ہی نہیں دیا۔ کلچر سے فیملی پلاننگ

کی طرف بھیج دیا۔ دفتر میں اصلاحات اور نئی اصطلاحات رائج کرنے کے بجائے عوام میں جو پرانی عادت رائج ہے اسے روک کر دکھاؤ۔

سائیکل کا پیڈل ہم نے انگریزی سے لیا ہے اس لئے اردو میں بھی پیڈل ہے۔ بلکہ اردو نے تو پوری سائیکل ہی انگریزی سے لے لی ہے۔ فارسی میں پیڈل فرانسیسی سے آیا ہے اس لئے پدال بن گیا ہے۔ سائیکل معلوم نہیں کون سے راستہ سے ایران پہنچی ہے اور کون اس پر سوار تھا کہ وہ دوچرخہ بھی ہے اور بیسیکلت بھی۔ Crocodile Tears کو آج کل صحافی بلا تکلف مگرمچھ کے آنسو لکھ دیتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کا رونا اور ٹسوے بہانا صرف نولکشور کی کتابوں میں ملتا ہے۔ فارسی میں ان بناوٹی آنسوؤں کو اشک دروغی کہتے ہیں۔ کریم کو خمیر کہتے ہیں۔ چہرے کے لئے خمیر رخسار، شیو بنانے کے لئے خمیر ریش اور دانت مانجھنے کے لئے خمیر دنداں۔ وہ بلند و بالا عمارتیں جنہیں ہم فلک بوس لکھتے ہیں یہاں آسمان خراش کہلاتی ہیں۔ ہمارے سکائی سکریپر نیلی چھتری کو چومتے ہیں اور ان کے اسے رگڑتے اور چھیلتے ہیں۔ انگریزی میں جو تقریب کینسل اور اردو میں منسوخ ہوتی ہے وہ فارسی میں لغو قرار دی جاتی ہے۔ اردو زبان میں تجویز نامنظور ہوتی ہے مگر فارسی میں نوبت مردود شد تک جا پہنچتی ہے۔ روٹی کا کنارا یہاں لب نان ہے۔ پستہ اتنا بڑا ہو کہ غلاف شق ہو جائے اور دانہ اندر سے جھانکنے لگے تو وہ پستہ خنداں۔

آوارہ مویشی جسے اردو بولنے والے کانجی ہاؤس میں داخل کرا دیتے ہیں ایران میں جانور بے صاحب کہلاتا ہے۔ جو پاکستان میں بے آواز ہے وہ ایران میں بے صدا ہے۔ اردو میں جو شیش محل ہے وہ فارسی میں آئینہ خانہ یا جام خانہ ہے۔ جام طرح طرح کے ہوتے ہیں اور دونوں ملکوں میں پائے جاتے ہیں مگر جام فرعونی صرف ایران میں ہوتا ہے۔ جام بسیار بزرگ پُراز بادہ۔ پینے والے کے ظرف کی بات ہے۔ سوّیاں یہاں رشتۂ فرنگی کہلاتی ہیں۔ حالانکہ ہماری سوّیوں کی فرنگی میکرونی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ وہ بھدی اور بے مزہ۔ یہ نرم ونازک۔ ان میں مہک، مٹھاس اور مزہ۔ کچھ امراض خبیثہ ایسے ہیں جن کے نام اردو نے خود رکھ لئے ہیں۔ اہل ایران نے ایسے ہی ایک مرض کا نام آبلۂ فرنگ رکھ دیا ہے۔ مرض جہاں سے آیا ہے اس علاقہ سے اسے منسوب کر دیا۔ کال گرل اردو افسانہ میں کال گرل ہی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ فارسی میں اسے فاحشۂ تلفونی کہتے

ہیں۔ شادی کی جس رسم کو برعظیم میں آرسی مصحف کہتے ہیں وہ ایران میں آئینہ بخت کہلاتی ہے۔ بن دیکھے کی شادی قسمت آزمائی ہوتی ہے۔ آئینہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ بخت بلند ہے یا کم، سبز ہے یا سیاہ، سیدھا ہے یا الٹا۔

مکان یا دکان لیتے وقت جو رقم کرائے سے زائد دینی پڑتی ہے اسے ہم لوگ نہ جانے کس رعایت سے پگڑی کہتے ہیں۔ ایران میں یہ رقم زرکلید کے طور پر دی جاتی ہے۔ کلیدی اختیارات ہمیشہ زر کے عوض ملا کرتے ہیں خواہ وہ مکان ہو یا دکان سیاست۔

اردو میں جو سارس ہے وہ فارسی میں لک لک اور عربی میں لق لق ہے۔ انگریزی میں اسے Stork کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اس پرندے کے ذمہ یہ کام لگایا ہوا ہے کہ وہ جدید الورود یعنی نومولود کو ایک گٹھڑی میں ڈال کر اس کی گرہ اپنی لمبی چونچ میں پرولے اور پھر اڑتا ہوا اس گھر تک پہنچ جائے جہاں اس گٹھڑی والے بچہ نے پیدا ہونا ہے۔ یہ آبی جانور نہ جانے کون سے بحرنا پیدا کنار سے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر لا رہا ہے کہ دنیا میں بہبود آبادی کے سارے نسخے اور طریقے آزمانے کے باوجود آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ فارسی میں ایک حاجی لک لک بھی پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر سال لک لک کچھ مدت کے لئے اپنے ٹھکانہ سے کہیں دور چلا جاتا ہے۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ مکہ گیا ہوا ہے اس لئے اس کا نام حاجی لک لک رکھ دیا۔ اردو صحافت میں بھی ایک حاجی لق لق ہوا کرتے تھے۔ سارس کے عربی نام اور فارسی روایت والے۔ فکاہیہ تحریر لکھا کرتے تھے۔ لوگ انہیں شوق سے پڑھتے اور فرحت و سرور حاصل کرتے۔ ایک دن ان کا ذکر آیا تو جسٹس عطاءاللہ سجاد نے کہا۔ بے شک ان کی تحریر میں سرور تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ اکثر کالم عالم سرشاری میں لکھے جاتے تھے۔ اس معاملہ میں حاجی صاحب بہت بے صبر آدمی تھے۔ اگر جلدی میں ہوں اور دفتر میں گلاس دستیاب نہ ہو تو وہ سیاہی انڈھیل کر شیشہ کی دوات کو جام بنا لیتے تھے۔ رند جو ظرف اٹھالیں وہی پیمانہ بنے۔ جس شخص کی دوات میں روشنائی اور شراب دونوں یکجان ہو جائیں اس کی تحریر پڑھنے سے اگر سرور آئے تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے۔

سول سروس کے ایک ساتھی جو میرے شوق اور مشاغل سے واقف تھے فرمانے لگے، تہران کے قیام میں آپ کی لفظ دوستی خوب رنگ لائی ہوگی۔ آپ کو لفظ گنجور کہوں یا

خزانہ دار الفاظ۔ میں نے جواب دیا، ہم کار اور ہم چشم ہمیشہ اس عنوان سے یاد کرتے ہیں جس میں قدرے بے قدری کا پہلو ہو۔ آپ کوئی ایسی ترکیب وضع کیجئے جس سے پتہ چلے کہ چار سال ایران میں رہنے والا اور لفظ دوستی کا دم بھرنے والا صرف ایک لفظ کی سوغات ہمراہ لایا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ ایک لفظ بذات خود کسی خزانہ سے کم نہیں۔ وہ لفظ ہے، انقلاب۔

میری مراد یہ نہیں کہ انقلاب کا لفظ میں نے پہلے پہل ایران میں سنا تھا۔ میں اس لفظ سے اس وقت سے واقف ہوں جب برعظیم پر انگریزوں کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ مگر وہ واقفیت بالکل سرسری اور سطحی تھی۔ پھر میں نے انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے بارے میں پڑھا اور اس مغالطہ میں گرفتار ہو گیا کہ میں اس لفظ کے تاریخ جغرافیہ سے بخوبی واقف ہوں۔ مگر یہ واقفیت سراسر کتابی اور خیالی تھی۔ نوجوانی نے اس لفظ میں تخیل پرستی اور رومانیت کا رنگ بھر دیا تھا۔ میں نے ایران میں انقلاب کو بچشم خود دیکھا ہے۔ قدم بقدم دیکھا ہے۔ بہ تمام و کمال دیکھا ہے۔ تفصیل اور تصریح کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں نے ایران میں انقلاب کے معنی پڑھے اور سنے نہیں بلکہ دیکھے ہیں۔ اب میں لفظ اور معنی، خیال اور عمل، مجاز اور حقیقت کا فرق جانتا ہوں۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

میرے لئے انقلاب پہلے صرف ایک لفظ تھا۔ لفظ مضمون بن گیا۔ مضمون علم میں ڈھل گیا۔ علم کا عمل سے واسطہ پڑا۔ بات جم گئی۔ وہ جو محض لفظ تھا اب ایک بیش بہا تجربہ ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ تجربہ ہی نہیں بلکہ ایک امید بھی ہے۔ جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی۔ روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب۔

باب پانزدہم

افکار

جس کسی سے سوال کیا اس نے ایک ہی جواب دیا۔ اور اس تیزی سے دیا جیسے اس سوال کا کوئی دوسرا جواب نہیں ہو سکتا۔ میں دوسرا سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ اس نام کے علاوہ کچھ اور نام بھی لے سکتے ہیں۔ انقلاب فرانس میں والٹیر اور روسو کے علاوہ بہت سے دانشور شامل تھے۔ انسائیکلو پیڈیا والے، دانش سراؤں والے۔ آپ ایک ہی نام پر ٹھہر گئے ہیں۔ ایران میں انقلاب کے لئے ذہن سازی اور زمین ہموار کرنے کا کام کیا ایک ہی دانشور نے کیا تھا۔ جواب دینے والے سوچ میں پڑ جاتے۔ وہ جو پہلے نام پر صد در صد متفق تھے، دوسرے کسی نام پر اتفاق نہیں کرتے۔ رک رک کر مختلف نام لیتے اور مختلف سمتوں میں نکل جاتے۔

میں نے وزارت خارجہ کے ایک ڈائریکٹر جنرل سے پوچھا کہ انقلاب ایران کا مفکر اور فلسفی کون تھا۔ اس نے جواب دیا، شریعتی۔ میں نے بازار بزرگ کے ایک سوداگر سے سوال کیا۔ اس نے کہا، علی شریعتی۔ میں نے تہران یونیورسٹی کے ایک استاد سے پوچھا۔ اس نے کہا، ڈاکٹر علی شریعتی۔ میں خیابان شاہ رضا پر تہران یونیورسٹی کے صدر دروازہ کے بالکل سامنے کتابوں کی ایک دکان میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی لکھی ہوئی کتابوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اسلام شناسی، سیمای محمد، امت و امامت، انسان و تاریخ، روش بررسی قرآن، قرآن و کا...... تر، فاطمہ فاطمہ است، زن مسلمان، جبر تاریخ، تشیع علوی تشیع صفوی، نامہ ای بہ

دفاع از علامہ اقبال و مسلم لیگ۔ میں اس وقت شریعتی کی لکھی ہوئی کتابوں کے بجائے کسی
ایسی کتاب کی تلاش میں ہوں جو شریعتی پر لکھی گئی ہو۔ چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود۔
کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کیا کہتا تھا، کس سے مخاطب تھا۔ ایک مختصر سی کتاب نظر آئی
عنوان کا ترجمہ ہے۔ سپرمین دکتر علی شریعتی۔ دو چار صفحات پر نظر ڈالی۔ ہر صفحہ پر
دریائے عقیدت ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور اس پر جابجا تعریفوں کے پل باندھے ہوئے تھے۔
شریعتی ابوذر زمان است، ابوذر، شریعتی صدر اسلام۔ شریعتی دور حاضر کے ابوذر غفاری
تھے۔ ابوذر (عالم، درویش، امراء کے مخالف صحابی) آغاز اسلام کے شریعتی تھے۔ یک
عالم انقلابی و بت شکن۔ گوئی مبعوث بہ انقلاب و بت شکنی شدہ است۔ تم کہہ سکتے ہو کہ
شریعتی انقلاب اور بت شکنی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ عقیدہ ساز، فلسفہ باف، کوہ وقار، خشم
طوفاں، شمشیر حق۔ میں نے کتاب بند کر دی اور شیلف پر واپس رکھ دی۔ میں جس طرح
کے جائزے اور سوانح کی تلاش میں ہوں یہ کتاب اس زمرہ میں نہیں آتی۔

میں نے سنی سنائی باتوں کے بل بوتا پر ڈاکٹر شریعتی کا ایک خاکہ تیار کیا۔ پچیّس تیس
برس تہران یونیورسٹی میں پڑھایا ہو گا اور جب ایک مستند سینئر دانشور کی حیثیت حاصل ہو گئی
تو انہوں نے بادشاہت کو قدیمی اور منسوخ ٹھہرایا ہو گا۔ اپنی بات ثابت کرنے کے لئے
تاریخ سے واقعات کے حوالے اور مفکران علم سیاسیات کے اقوال پیش کئے ہوں گے۔
شہنشاہ نے وزارت کی پیشکش کی ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب نے جشن انکار وزارت منایا ہو گا۔
شاہ نے پیغام بھیجا ہو گا کہ اب بھی ٹھیک ہو جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ پروفیسر
صاحب نے دھمکیوں سے مرعوب ہونے کے بجائے اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں
فلسفہ کی آڑ لینے کی بجائے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا ہو گا کہ سفید انقلاب محض
ایک سراب اور فریب ہے۔ ایران کو اسلامی انقلاب کی ضرورت ہے۔ شاہ نے عمر اور معلّمی
کے پیشہ کا لحاظ کیا ہو گا اور ڈاکٹر صاحب سے کہا ہو گا کہ خیریت اسی میں ہے کہ تم ملک چھوڑ
کر چلے جاؤ۔ وہ ملک چھوڑ گئے مگر خیریت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب طویل
جدوجہد سے تھک کر ایک دن انگلستان میں خاموشی سے راہئ ملک عدم ہو گئے۔ اتنی بھرپور
زندگی بسر کرنے والے باثر دانشور اور ان گنت کتابوں کے مصنف کی عمر انتقال کے وقت

ستر سال سے متجاوز ہونی چاہئے۔ غالباً وہ اسی برس کے ہوں گے۔ میں خیال بافی میں کھو جاتا ہوں۔

انتقال کے وقت شریعتی کی عمر صرف چوالیس برس تھی۔ اس میں سے پانچ سال انہوں نے فرانس میں اور مجموعی طور پر کوئی سوا دو سال شاہ کی جیل میں گزارے۔ چھتیس سینتیس برس باقی بچے۔ ان میں آدھے اسکول کی تعلیم اور پرائمری اسکول ٹیچر کی تربیت حاصل کرنے میں صرف ہو گئے۔ اس کے بعد کئی سال تک وہ اسکول ماسٹر کی حیثیت سے مشہد کے آس پاس دیہات میں خراب و خوار ہوتے رہے۔ ان سالوں کو ان کی عمر سے منہا کریں تو کیا بچتا ہے۔ چند سال جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ عمر کے ان چند گنے چنے سالوں نے وہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے کیسے کفایت کی ہو گی جس پر ڈاکٹر علی شریعتی آج فائز ہیں۔

دور شہنشاہی میں قدر شناسی اور مرتبہ دانی کا یہ عالم تھا کہ جب پیرس سے شریعتی ایک ڈاکٹریٹ سوشیالوجی میں اور دوسری ڈاکٹریٹ تاریخ اسلام میں حاصل کرنے کے بعد ایران پہنچے تو انہیں فردوس نامی قصبہ کے ہائی اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے تعینات کر دیا گیا۔ شور مچا۔ محکمہ نے تنگ آکر مشہد یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا۔ یہاں انہوں نے دو چار برس میں ایک نظریہ ساز دانشور کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ 1970ء میں وہ تہران آگئے اور ایک غیر سرکاری ادارۂ حسینہ ارشاد میں تاریخ شناسی، انسان شناسی اور جامعہ (سوسائٹی) شناسی کی نظریاتی اور تصوراتی تعلیم دینے لگے۔ لوگ ان کی تقاریر سننے کے لئے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ تقریر سنتے اور فریفتہ ہو جاتے۔ ملک کا کوئی حصہ اور کوئی کونا ایسا نہ تھا جہاں وہ لوگوں کی دعوت پر تقریر کے لئے نہ پہنچے ہوں۔ لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تین برس میں کوئی دو سو تقریریں کی ہوں گی۔ تقریریں کتابی صورت میں چھپتی رہیں۔ کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکتی رہیں۔ میں نے ان کی جتنی تحریریں اور تقریریں پڑھی ہیں کسی میں شہنشاہ ایران یا خاندان پہلوی کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بہت زیرک انسان تھے۔ سب کچھ فلسفہ تاریخ، انسان شدن، جامعہ شناسی دینی اور تشیع علوی کے حوالہ سے کہتے رہے۔ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں۔ بظاہر گرفت کا موقع نہ دیا۔ 1958ء میں وہ

پرجوش نوجوان اسکول ماسٹر کی حیثیت سے طالقانی کی تحریک میں شامل تھے۔ انہیں دوسرے قیدیوں کے ساتھ مشہد سے فوجی ہوائی جہاز میں تہران لے گئے تھے اور ساواک کی ایک انتہائی بدنام جیل میں آٹھ ماہ تک ان پر سخت تشدد ہوتا رہا۔ وہ اس تجربہ کی روشنی میں اب نئی حکمت عملی سے کام لے رہے تھے۔

تین سال کی مختصر مدت میں ڈاکٹر شریعتی نے اپنے فلسفہ اور تقریر سے قوم کا مزاج بدل ڈالا اور گرفتار بھی نہیں ہوئے۔ اب جو گورنمنٹ نے ان کو گرفتار کرنا چاہا تو اسے اندازہ تھا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ شریعتی زیرزمین چلے گئے۔ پکڑنے والوں نے پسر کی جگہ پدر کو پکڑ لیا۔ استاد محمد تقی شریعتی کے ساتھ علی شریعتی کے کئی رشتے تھے۔ فرزندی، شاگردی، مریدی، عاشقی۔ وہ اپنی ایک تحریر میں استاد محمد تقی کو "پدرم و مرادم" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ بیٹے نے باپ کی خاطر فوراً اپنی گرفتاری دے دی۔ ڈیڑھ سال تک ساواکی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد وہ رہا ہوئے۔ ان کے بولنے اور لکھنے پر پابندی لگ گئی۔ کیا رہائی ہے۔ وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے اور چند ہفتوں کے بعد مشکوک حالات میں انتقال کر گئے۔ خراسان میں دشت کاویر کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہونے والا غریب لڑکا جب چوالیس برس کی عمر میں لندن میں انتقال کرتا ہے تو لوگ اسے نظریہ ساز اور عہد ساز شخصیت قرار دیتے ہیں۔ ایک قبیلۂ جاویداں ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جو بعداز مرگ بھی اس دنیا کے کام سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی کا تعلق اسی قبیلہ سے ہے۔

حسینہ ارشاد کی عمارت کے پاس سے میرا گزر اس وقت ہوتا ہے جب مجھے گل فروش کی دکان سے پھول خریدنے ہوں۔ شاہ کے زمانہ میں شمالی تہران کی ہر سڑک پر پھول بیچنے والوں کی دکانیں ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں بات بات پر ایک دوسرے کو دستہ گل پیش کرنے کا رواج تھا۔ اس کی اصل وجہ تو گل و گلزار سے وہ محبت ہے جو ایرانیوں کی سرشت میں شامل ہے۔ بقول کسے لق و دق صحرا میں جب کوئی ایرانی اپنے خیمہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس کا پردہ گرا کر قالین پر بیٹھ جاتا ہے۔ صحرا پردے کے دوسری طرف خیمہ کے باہر رہ جاتا ہے اور قالین پر بنے ہوئے گل بوٹوں سے خیمہ کے اندر ایک باغیچہ کھل اٹھتا

ہے۔ خیمہ والا سمجھتا ہے کہ وہ کسی باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی میں قالین پر بنی ہوئی پھلواری کو باغ قالین کہتے ہیں۔ ایران میں خانہ بدوش اپنا خیمہ، اپنے دکھ اور اپنا باغ کاندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔

تیل کی بے حساب دولت نے تحفوں کے تبادلہ کو روزمرہ بنا دیا ہے۔ دوست داری اور محبت پر کیا موقوف، صنعت، تجارت، زراعت اور سفارت سبھی پھولوں کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ فرد ہو یا ادارہ دونوں رنگ و بو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں۔ ہڑتالوں اور ہنگاموں کی وجہ سے بہت سے کاروبار مندے پڑ گئے۔ گل فروشی بھی اس کی زد میں آگئی۔ کئی دکانوں پر تالا پڑ گیا۔ خزاں نہ جانے کدھر سے ان بند دکانوں میں داخل ہو گئی۔ پھول مرجھا گئے۔ پودے سوکھ گئے۔ جو شاخیں ہری ہیں اور جو پتے اب بھی ترو تازہ نظر آرہے ہیں وہ نقلی ہیں۔ پلاسٹک یا اسی قسم کی کسی چیز سے بنائے گئے ہیں۔ تاہم وہ مغازۂ گل فروش جہاں سے میں پھول خریدتا ہوں ابھی تک کھلا ہے۔ کاروان بہار وہاں خیمہ زن ہے۔ پھول، پودے، رونق اور گاہک کم مگر یہ کیا کم ہے کہ دکان بند نہیں ہوئی۔ میں پہلے ہفتہ میں دو ایک بار وہاں جاتا تھا اب مہینہ میں دو ایک بار جانا ہوتا ہے۔ ہر بار میں اس دکان کے شیشہ والے دروازہ میں داخل ہونے سے پہلے دائیں جانب حسینہ ارشاد کی عمارت کو دیکھتا ہوں۔ مسجد کی طرز پر بنی ہوئی عمارت۔ کاشی کاری سے مزیّن۔ دروازہ دکھائی نہیں دیتا۔ سنا ہے اسے اینٹوں سے چن دیا ہے۔ یہاں جو مقرر تقریر کیا کرتا تھا اس کو خاموش کرنے کے لئے شاہ پرست انتظامیہ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ مگر سارے حربے ناکام ہو گئے۔ وہ شخص انتقال کر چکا ہے لیکن اس کے باوجود خاموش نہیں ہوا۔ حسینہ ارشاد کی عمارت سے اٹھنے والی آواز آج بھی البرز کی چوٹیوں سے ٹکرا کر صدائے کوہ کی طرح پورے ایران میں گونج رہی ہے۔ میں دکان گل فروش کے چبوترہ پر کھڑا اس آواز کو بڑے دھیان اور توجہ سے سن رہا ہوں۔

اے دوستو، ساتھیو، ہم وطنو، مسلمانو، خبردار، ہشیار۔ میں علی شریعتی ولد محمد تقی شریعتی تم سے مخاطب ہوں۔ کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم کیسے مسلمان ہو اور جس روایت کی تم پیروی کرتے ہو وہ کون سا اسلام ہے۔ تم اصل اسلام سے ہٹ کر جس راہ پر چل رہے

ہو وہ کعبہ کو نہیں جاتی ترکستان جاتی ہے۔ بلکہ ترکستان بھی نہیں جاتی۔ وہ کہیں بھی نہیں جاتی۔ روایات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس میں تم گم ہو گئے ہو۔ آؤ میں تمہیں راستہ دکھاؤں۔ اسلام سے تمہارا تعارف کراؤں۔

قرآن کا آغاز خدا کے نام (بسم اللہ) سے ہوتا ہے اور اختتام لوگوں کے نام پر (الناس)۔ قرآن میں جہاں کہیں اجتماعی زندگی کا ذکر آتا ہے وہاں اللہ اور الناس ہم معنی ہیں۔ لوگ (الناس) خدا کے نمائندہ اور اس کے خانوادہ کا حصہ ہیں (الناس عیال اللہ)۔ کعبہ خانہ خدا ہے مگر قرآن اس کو خانہ مردم اور خانہ آزاد (بیت عتیق) کا نام دیتا ہے۔ اللہ قرآن کی رو سے رب الناس (لوگوں کا پروردگار)، ملک الناس (لوگوں کے بادشاہ) اور الہ الناس (لوگوں کا حقیقی معبود) ہے۔ گویا اللہ ان تینوں جہتوں کے اعتبار سے لوگوں کا اللہ ہے۔ کسی خاص گروہ کا اس پر کوئی اجارہ نہیں۔

معاشرہ میں دو طبقے ہوتے ہیں۔ ایک ہابیل کی طرح صاحب ایمان، فداکار اور صلح دوست۔ دوسرا قابیل کی طرح برادرکش، پست، بے ایمان اور مادی۔ قرآن میں فرعون سیاسی قوت کا سمبل ہے۔ قارون اقتصادی قدرت کا سمبل ہے۔ بلعم باعور رسمی روحانیت کا سمبل ہے۔ یہ تینوں قابیلی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ روحانی ایک مسیحی اصطلاح ہے۔ اسلام میں روحانی نہیں بلکہ عالم دین ہوتے ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن میں موضوع کے اعتبار سے پہلا درجہ عبادات کا ہے، دوسرا اخلاقیات کا اور تیسرا معاشرہ کا۔ حالانکہ اگر قرآن مجید کی سورتوں کے عنوانات کی درجہ بندی موضوع کے اعتبار سے کی جائے۔ تو یہ عام خیال بالکل غلط ثابت ہو گا۔ ساٹھ فی صد سے زیادہ سورتوں کے عنوانات کا تعلق اس دنیا سے ہے جو انسان نے مسخر کرنی ہے، اس معاشرہ سے ہے جو انسان نے تعمیر کرنا ہے اور اس فلسفہ تاریخ سے ہے جو اس کام میں انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ تفصیل اس درجہ بندی کی کچھ یوں ہے۔

موضوع	تعداد سورۃ	فیصد
مادی و طبیعی	32	26.66
عقیدہ و مکتب فکر	29	24.14

معاشرہ اور سیاست	27	22.5
تاریخ و فلسفہ تاریخ	17	14.14
اخلاق و رفتار	4	3.3
مسائل مالی	4	3.3
عبادات	2	1.7

قرآن ایک World View یعنی جہاں بینی کی اساس فراہم کرتا ہے۔ یہ اساس توحید ہے۔ اس بنیاد پر فلسفہ، تاریخ، انسان شناسی اور جامعہ شناسی مل کر ایک ایدیالوجی کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ ایدیالوجی پر عمل کرنے سے ایک مثالی معاشرہ بنتا ہے جس میں مثالی انسان پیدا ہوتے ہیں۔ توحیدی نقطۂ نظر کے چار پہلو ہیں۔ دنیا کس بنیاد پر استوار ہے۔ فلسفہ تاریخ کیا ہے۔ معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے۔ انسان کی پہچان کیا ہے۔ توحیدی جہاں بینی کے مقابلہ میں بے شمار نظریات ہیں۔ ماتریالیسم رآلیسم ، شکاکیت، تاؤئیسم ، شرک، ثنویت، ایدہ آلیسم ، بے خدائی، اگزیستانسیالیسم وغیرہ وغیرہ۔

فلسفہ تاریخ یہ ہے کہ ازل سے دو عناصر متضاد اور متصادم چلے آرہے ہیں۔ توحید کی رو سے یہ تصادم توحید اور شرک میں ہے۔ اس تصادم کی وجہ سے معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ طبقہ ہابیلی اور قابیلی۔ اس طرح معاشرہ میں تیغ (ملک) اور طلا (مالک) اور تسبیح (ملا) ایک طرف ہوتے ہیں اور خدا اور مردم دوسری طرف۔

بہترین معاشرہ کا نام امت ہے۔ امت افراد کا ایسا گروہ ہے جس کا ایمان ایک اور ہدف مشترک ہے۔ ہدف یہ ہے کہ معاشرہ وہ ساز گار حالات پیدا کرے جس میں آئیڈیل انسان جنم لیتا ہے۔ ایسی امت کے تین امتیازات ہوتے ہیں۔ کتاب، ترازو، آہن۔ کتاب سے مراد تمدن، معرفت اور علم ہے۔ ترازو سے مراد برابری، انصاف اور عدالت ہے۔ آہن ایک سمبل ہے مضبوط معیشت و صنعت اور فوجی طاقت اور قوت کا۔ وہ معاشرہ جس میں یہ تینوں امتیازات نہ ہوں ناپائدار ہوتا ہے۔

ان امتیازات میں پہلا درجہ کتاب کا ہے۔ دوسرا ترازو کا اور تیسرا آہن کا۔ کتاب انسانیت کی بنیاد ہے۔ اگر صرف کتاب اور آہن ہوں تو آہن کتاب کو پارہ پارہ کر دے گا۔

اگر سازش کی جائے تو کتاب کو آہن کا نوکر اور ماتحت بنا سکتے ہیں۔ معاشرہ کی اس سے زیادہ وحشت ناک کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔ دو عالمی جنگیں اسی سازش کا نتیجہ ہیں۔ کتاب اور آہن کے درمیان ترازو کو اسی لئے جگہ دی ہے کہ وہ آہن کو کتاب اور انسان پر حاوی نہ ہونے دے اور اسے مقررہ حدود کی خلاف ورزی نہ کرنے دے۔ اگر کسی معاشرہ میں کتاب اور ترازو دونوں ہیں مگر آہن نہیں ہے تو ضعیف و ناکام رہتا ہے۔ عصانہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔ سورۃ الحدید میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو کتاب اور ترازو دیا تاکہ انصاف قائم کیا جائے اور لوہا پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور طرح طرح کے فائدے ہیں۔

انسان اور اس کی روح چار قسم کے قید خانوں میں بند ہے۔ اول، زندان طبیعت یا نیچر۔ دوم، زندان تاریخ۔ سوم، زندان معاشرہ۔ اور چہارم زندان ذات۔ پہلے تین قید خانوں سے وہ عقل و علم کے سہارے باہر نکل آتا ہے۔ چوتھے قید خانہ سے سوائے دین کے کوئی اور رہائی نہیں دلا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نئی نظر سے جو رواں شناسی، جامعہ شناسی اور تاریخ شناسی سے پیدا ہوئی ہے از سر نو دریافت کرنے اور شناخت کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم پیام بروں کو سامی اور غیر سامی (آریائی و زرد) میں تقسیم کریں تو یہ عجیب و غریب بات سامنے آتی ہے کہ غیر سامی پیامبر سبھی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بر خلاف سامی پیامبر عوام میں سے پیدا ہوئے تھے۔ مہاویر، گوتم بدھ، اشوک، ماہیندر!، مینگ تی، سوگا، گورونانک، لاؤ تزو، کنفیوشس، زرتشت۔ راجکمار، راجا، بادشاہ، شاہزادہ، خاقان، خانوادۂ وزیراعظم، خاندان سلطنتی، منصب دار، وزیراعلیٰ، فیوڈل لارڈ۔ حد تو یہ ہے کہ مزدک جیسا عوامی رہنما اور مساوات اور اشتمالیت کا دعویدار بھی بادشاہ قباد کے حواریوں میں شامل تھا۔ ادھر یہ عالم ہے کہ ایک گرہ دار لکڑی اور اپنے بھائی کو لے کر ایک چرواہا صحرا سے نکلتا ہے اور فرعون اور قارون سے مقابلہ کرتا ہے۔ ایک جوان بے کس و کار اور بحر احمر کا گمنام ماہی گیر روم کی وحشی امپیریلزم کے خلاف ڈٹ جاتا ہے۔ داؤد، جالوت و طالوت سے جنگ کرتا ہے۔ یحییٰ، ہیرودیس سے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چند قیراط پر مکہ کے

لوگوں کی بکریاں چراتے تھے غار حرا سے باہر آتے ہیں اور تاجران قریش، بردہ داران مکہ، غداران طائف، خسرو ایران اور سیزر روم کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ایسے پیغمبر ہیں جنہوں نے بذات خود ایک نیا معاشرہ ترتیب دیا اور اس کی رہبری اور رہنمائی بھی کی۔ مدینہ کے دس سالہ قیام میں پینسٹھ مرتبہ انہیں لشکرکشی کی ضرورت پیش آئی۔ مسجد نبوی میں ان کے گوشہ خلوت کا نام محراب یعنی رزم گاہ ہے۔

اسلام ایک ایدیالوجی ہے۔ مگر کونسا اسلام۔ بات نازک ہے اس لئے اصطلاحات کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ اسلام جو آزادی و آگاہی اور حرکت کا اسلام ہے نہ کہ اسلام اسارت و خواب و سکون۔ اسلام عدالت و رہبری نہ کہ اسلام خلافت و طبقہ و اشرافیت۔ اسلام ابوذر نہ کہ اسلام کعب الاحبار۔ اسلام مجاہد نہ کہ اسلام روحانی۔ اسلام جہاد اعتقادی و اجتماعی و اجتہاد علمی و عقلی نہ کہ اسلام تقلید و تعصب و تسلیم۔ اسلام قرآن نہ کہ اسلام مفتاح الجناں۔ تشیع علوی نہ کہ تشیع صفوی۔ تشیع تقویٰ و مسئولیت و اعتراض نہ کہ تشیع تقیہ و شفاعت و انتظار۔ حسینِ خون نہ کہ حسینِ اشک۔ کربلای فریاد خواہ اور انصاف طلب نہ کہ کربلای نوحہ گری اور سینہ زنی۔

مقرر بحث کو سمیٹتا ہے اور کہتا ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ ہم اسلام کو ایک ایدیالوجی تسلیم کرتے ہوئے اس دین کی طرف واپس لوٹ آئیں جو یک حرکت انسانی تاریخی فکری است۔ اس وقت جو اسلام عوام اور عوام کو فریب دینے والوں اور مذہبی، جدی اور علمی اجتماعات میں رائج ہے وہ فقط ایک فرہنگ ہے۔ میری جستجو اس اسلام کے لئے ہے جو ایک ایدیالوجی کے طور پر کسی روشن فکر اور دانشور کے ذہن میں ہے۔ میرے لئے وہ اسلام کفایت نہیں کر سکتا جو ایک عالم کے ذہن میں علوم قدیمہ مذہبی کے سرمایہ کے طور پر جمع ہے۔

مقرر اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہے۔ خدایا آرزو میری یہی ہے۔ میرا نورِ بصیرت عام کر دے۔ شریعتی کی دعا قبول ہوئی۔ ایران میں انقلاب آگیا۔

یہ بات پہلی بار مجھے فصیح الدین نے بتائی کہ علما اور دینی مدرسوں کے اساتذہ نے ڈاکٹر

علی شریعتی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو کچھ عرصہ تک برداشت کیا لیکن جب سامعین انہیں چھوڑ کر شریعتی کے درس میں شامل ہونے لگے اور شریعتی نے مذہب کے نام پر چندہ اور حصہ لینے والوں کی سوچ کو قدیم اور بے جان قرار دیا تو انہوں نے بھی کھلم کھلا اس کی فکر اور تفسیر پر اعتراض کرنے شروع کئے۔ ساواک پہلے ہی ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ نیا محاذ کھلا اور شریعتی پر دباؤ بہت بڑھ گیا۔ میں نے شریعتی کی چند کتابیں پڑھیں مگر اس دباؤ کا کہیں شائبہ نہ ملا۔ پھر ایک ایسی کتاب پڑھنے کو ملی جس کے متن اور پاورقی میں شریعتی نے اپنے دفاع میں بہت کچھ لکھا ہے۔ شریعتی لکھتے ہیں کہ علما کا ایک طبقہ میری سوچ اور فہم پر اعتراض کرتا ہے۔ گریبان میں نہیں جھانکتا۔ بس مجھے برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ ہم نے تنقید کو علمی بحث کی سطح سے بہت نیچے گرا کر عیب جوئی کے فن میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے ایک علمی بحث میں یہ کہا تھا کہ بات بے سند ہے اس لئے ناقابل قبول ہے۔ ایک واعظ نے بر سر منبر کہا۔ تو کہ می گوئی بچہ پدرت ہستی، آیا سند داری؟ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ فلاں شخص تمہارا باپ ہے، کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی تحریری ثبوت موجود ہے۔ وہ لوگ جو مجھے عقل اور استنباط کے ذریعہ قرآن کے متن میں تازہ معنی تلاش کرنے کا حق نہیں دیتے وہ خود بے دھڑک ہر طرح کی بے سروپا تاویلات کرتے رہتے ہیں۔ بسم اللہ کی صرف ''ب'' میں عجیب و غریب جہان معنی دریافت کر لیتے ہیں۔ ایٹم بم اور خلائی جہاز اپالو نمبر 13 کو قرآن میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں سورہَ والشّمس میں شمس سے مراد پیغمبر ہے، قمر سے مراد حضرت علیؓ اور شب سے مراد حکومت بنی امیہ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں چیزوں کی قسم کھا رہا ہے۔ وہ خود یہاں تک تجاوز کر جاتے ہیں لیکن مجھے حق نہیں دیتے کہ قرآن مجید کے روشن ترین اور سالم ترین مفہوم کو بیان کروں۔ آزادی فکر کے بارے میں ان اندھی تقلید کرنے والوں کا رویہ یہ ہے کہ جو روشن خیال شاگرد ان سے چبھتا ہوا سا سوال پوچھ لے وہ اسے مدرسہ سے بہشتِ زہرا بھیج دیتے ہیں۔

میں ترکی کے دورے سے واپس آیا۔ آر سی ڈی کے ایک پاکستانی ڈائریکٹر نے بتایا کہ میری غیر موجودگی میں ایرانی اسلامی انقلابی حکومت کی وزارت خارجہ کے ایک ڈائریکٹر جنرل آر سی ڈی سیکرٹریٹ دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایران میں

پرانے سفارت کار گروہ در گروہ نکالے جا رہے تھے اور ان کی جگہ انقلابی نوجوان عہدہ دار جن کا کوئی سفارتی تجربہ نہ تھا تعینات کئے جا رہے تھے۔ ڈائریکٹر جنرل نے ایک کمرے پر نماز خانہ کا بورڈ لگا ہوا دیکھا تو اپنی خوشنودی کا اظہار کیا کہ اس ادارہ نے ایرانی انقلاب کا مثبت اثر قبول کیا ہے۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ دفتر میں نماز پڑھنے کا یہ اہتمام زمانہ ماقبل انقلاب یعنی شہنشاہ کے زمانہ سے ہے تو ان کی حیرت اور خاموشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پاکستانی افسروں سے گفتگو کے دوران علامہ اقبال کا ذکر آیا۔ ڈائریکٹر جنرل کہنے لگے، چونکہ ڈاکٹر شریعتی نے اقبال کی تعریف کی ہے اس لئے یقیناً وہ ایک اچھا شاعر ہو گا۔

انقلاب کے بعد شریعتی کے یوم وفات کی سالگرہ تھی۔ یہ خیال کہ دھوم دھام سے منائی جائے گی غلط نکلا۔ بس ایک آدھ بیان، دو چار مضامین تین چار بار ٹیلی وژن پر ذکر۔ گرم جوشی کی کمی صاف نظر آ رہی تھی۔ اگلے سال پھر یہ موقع آیا۔ اس مرتبہ مخالفت کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر شریعتی کے والد کے فلیٹ کے باہر پچھلے سال بھی لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے اس سال پھر جمع ہوئے۔ پچھلے سال بھی جمع ہونے والوں نے جلسہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سال بھی ان کا یہی ارادہ تھا۔ لوگ ابھی جم کر بیٹھے نہ تھے کہ چند ایمولینس گاڑیاں آئیں اور سڑک کا اگلا اور پچھلا حصہ بند کر دیا۔ ایمولنسوں کے عقبی دروازے کھلے۔ ان میں سے مسلح افراد نکل آئے اور ہجوم پر پل پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم منتشر ہو گیا۔ سنا ہے زخمی ہونے والوں میں شریعتی کے بوڑھے والد بھی شامل تھے۔ یہ سارا ہنگامہ ان چند دوستوں نے خود دیکھا جو قریب ہی ایک فلیٹ میں دوپہر کے کھانے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

شریعتی نے ایک بار کہا تھا۔ موت ہر لحظہ گھات میں لگی ہوئی ہے۔ میں نے موت کے ہمراہ زندگی بسر کرنا سیکھ لیا ہے۔ مگر اس وقت مرنا مجھے منظور نہیں۔ ابھی بہت سا کام باقی پڑا ہے۔ لوگوں کی آنکھیں جو مجھے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ عزیز ہیں، میرا انتظار کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر شریعتی نے جو عمر، فرصت اور موقع مانگا تھا وہ انہیں نہیں ملا۔ عمر یہی کوئی چوالیس سال۔ فرصت زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال۔ جب سارا ایران ان کی سخن رانی پر کان لگائے ہوئے تھا۔ موقع البتہ زندگی میں کم ملا اور مرنے کے بعد زیادہ۔ مرحوم کی

کتابوں کی اشاعت اور مانگ بڑھ گئی۔ پڑھنے اور سمجھنے والوں میں اضافہ ہوا۔ نفوذ بڑھتا گیا۔ باعمل شیدائیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ وہ جو بہت سا کام ادھورا پڑا تھا اسے آج کل شریعتی کے چاہنے والے اور ماننے والے پورا کرنے میں مصروف ہیں۔

شاعر شریعتی کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے۔

ای ہرگز بزرگ

بالهایت را شکستند. اما پروازت را ہرگز

دستانت را بستند اما داستانت را ہرگز

پاهایت را بریدند، اما راهت را ہرگز

لبانت را دوختند. اما پیامت را ہرگز.....

ای رعد در سکوت

ای انفجار فجر

ظلمت شگاف شب ......

ای مصلح مسلح بیدار، تا آخریں نفس به خلق وفادار

ای شاعر حماسه انسان

ای شعرِ ناتمام۔

اے بزرگ ابدی۔ انہوں نے تیرے بال و پر توڑ دیئے مگر تیری پرواز میں کوئی کوتاہی نہ آئی۔ ہاتھ قلم کر دیئے گئے مگر پھر بھی تم لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں۔ پیر کاٹ دیئے گئے مگر تمہارا راستہ کون روک سکتا ہے۔ تمہارے لبوں کو انہوں نے سی دیا مگر تمہارے پیغام کو خاموش نہ کر سکے۔ اے خاموشی کو توڑنے والی بجلی کی کڑک۔ اے فجر کے پیام بر۔ اے شب کی تاریکی کو دور کرنے والے۔ اے بیدار اور اسلحہ بردار، اے حالات کی اصلاح کرنے والے۔ اے وہ جو آخری دم تک خلق کا وفادار رہا۔ ای انسان کی دلاوری اور شجاعت کے گیت گانے والے۔ اے شعرِ ناتمام۔

(2)

میں نے ذہن ساز اور خیال اندیش ایرانی انقلابی دانش وروں کی فہرست بنائی۔ عالم، روحانی، فلسفی، ادیب، شاعر، استاد۔ تیس چالیس افراد۔ فہرست مختصر کی۔ بیس پچیس نام۔ بار بار اسے مختصر کیا۔ بڑی مشکل سے فکر اور تصور کے دس اہم ترین رہنماؤں کی فہرست بنی۔ سرسری شناسائی حاصل کرنے کے بعد میں نے مصلحت کے تحت فہرست کو اور مختصر کیا۔ صرف چار دانشور۔ پہلا یورپ کا پڑھا ہوا معلم انقلاب۔ دوسرا، دینی مدارس کا ذہین ترین فلسفہ باف۔ تیسرا، سب سے بڑا اشتراکی ناول نگار۔ چوتھا، ایک مشہور ادیب جو پہلے اشتراکی تھا اور پھر اسلامی ہو گیا۔ شریعتی، مطہری، صادق ہدایت، جلال آل احمد۔ فہرست کو مختصر کرنے کی بڑی وجہ ایران کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی صورت حال ہے جو کسی ایک طرف جم کر توجہ نہیں کرنے دیتی۔ دوسری یہ کہ جب میں نے شریعتی کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ سو پچاس کتابیں ان کے نام سے چھپی ہوئی ہیں۔ انتخاب کیا اور تیزی سے ورق گردانی شروع کی۔ چند دنوں لغت ساتھ رکھی۔ رفتار سست ہو گئی۔ پھر میں نے مشکل الفاظ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ افکار سے مطلب رکھو نہ کہ الفاظ سے۔ اگر مفہوم سمجھ میں آ رہا ہے تو بس پڑھتے چلے جاؤ۔

مطہری کو پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ کتابوں کی دکان میں داخل ہوا۔ ہمت جواب دے گئی۔ پتہ چلا کہ مطہری نے بھی سو پچاس کتابیں لکھی ہیں۔ کیا پڑھیں اور کیا چھوڑیں۔ شہنشاہ کے سنسر کے باوجود یہ لوگ اتنا بہت کچھ لکھ سکے ہیں۔ اگر انہیں پوری چھوٹ دی جاتی تو نہ جانے یہ مضامین نو کا کتنا بڑا انبار لگا دیتے۔ شریعتی اور مطہری میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں خراسانی ہیں۔ دونوں انقلابی ہیں۔ دین، فلسفہ اور تاریخ سے واقف۔ خطابت کے فن میں طاق۔ ایک حسینۂ ارشاد میں تقریریں کرتا تھا۔ دوسرا مسجد جواد میں۔ دونوں گرفتار ہوئے۔ زباں بندی کا حکم دونوں کو سنایا گیا۔ دونوں کی کتابوں سے دکانیں بھری ہوئی ہیں۔ میں ایک دکان میں کھڑا مطہری کی لکھی ہوئی کتابوں کے عنوانات اور ان کی فہرست پر غور کرتا ہوں۔ دکان سے باہر نکلا تو میرے پاس ان کی آٹھ

کتابیں تھیں۔ **عدل الٰہی، ختم نبوت، مقالات فلسفی، دہ گفتار، بیست گفتار، مسئلہ حجاب، نہضتہای اسلامی، پیرامون انقلاب اسلامی۔**

میں نے دہ گفتار میں درج مطہری کی دس تقریروں میں سے ایک تقریر لفظ بہ لفظ پڑھی اور دوسری تقریر پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک کتاب ساری پڑھ ڈالی تو پھر دوسری خود بخود اٹھالی۔ اس کے بعد تیسری اور پھر سلسلہ چل نکلا۔ دین کا علم وسیع، فکر نادر، فلسفہ پر حاوی، بیان کا سلیقہ۔ یہ کیسا کھلے دل کا عالم دین ہے کہ جب حوالہ دیتا ہے تو ہیگل، نیوٹن، برتراند رسل، سارتر، دکارت، شوپنہاور، ول دورنٹ، اقبال اور نہرو کے ساتھ ساتھ ملا نصرالدین اور ہالی وڈ کی ڈراونی فلموں کے مشہور ڈائریکٹر ایلفریڈ ہچکاک کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے کہ علمی سطح کی بلندی میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔

استاد مطہری نے ملا نصرالدین کا ذکر مغربی جمہوریت کے سلسلہ میں کیا ہے۔ ملا خچر پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ کہنے لگے جہاں یہ خچر لے جائے۔ مغربی جمہوریت ملا نصرالدین کا خچر ہے۔ اکثریت معاشرہ کو جہاں چاہے لے جائے۔ کوئی اسے روکنے یا ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ اکثریت چاہے تو جائز کو ناجائز قرار دے دے اور معقول کو نامعقول۔ حرام کو حلال کا مرتبہ بخش دے۔ گناہ کو ثواب کا درجہ عطا کر دے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ جس جمہوری نظام میں اکثریت کو حسن قرار دیا جائے اور قانون سازی اور کرشمہ سازی میں فرق جاتا رہے اس میں حیوانیت آزاد اور انسانیت اسیر ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں اللہ ان کو فراموش کر دیتا ہے اور اکثریت کے گمان فاسق پر چلنے دیتا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کو پہنچیں۔

مغربی دماکراسی کے بارے میں مطہری اور اقبال کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ایک نے خچر کی مثال دی ہے اور دوسرے نے گدھے کی۔ کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید۔ گدھے خواہ دو سو ہی کیوں نہ ہوں وہ انسان کی طرح سوچنے سے معذور ہیں۔ اس واضح فرق کے باوجود پاکستان نے مغربی دماکراسی کے خچر پر سواری کی ہے اور بنیادی جمہوریت کے گدھے پر بھی۔ تین چار بار اس بے بس سوار کو رسالہ کا تیز گام گھوڑا لے کر بھاگ گیا۔ منزل ہر بار کھوٹی ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب لوگ گھوڑے، گدھے اور خچر

کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ سارا الزام سواری کے جانور پر رکھتے ہیں۔ اپنا قصور کسی کو نظر نہیں آتا۔

مغربی دماکراسی کے بارے میں ایک نظریہ نواب کالا باغ کا بھی تھا۔ برطانیہ کے سفیر ان سے ملنے کے لئے آئے۔ مغربی پاکستان کے گورنر کو احساس ہوا کہ سفیر ان کو دماکراسی کے فوائد پر لیکچر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہنے لگے میں سنتا رہا۔ جب وہ رکے کہ میرا عندیہ لیں تو میں نے کہا۔ سفیر محترم، کیا آپ نے اس تاریخی حقیقت پر کبھی غور کیا ہے کہ جن دنوں انگلستان میں غیر جمہوری حکومتیں ہوا کرتی تھیں اس ذرا سے خطے نے ساری دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ چھوٹا سا جزیرہ گریٹ بربطین کہلانے لگا۔ سائنس، ٹیکنالوجی، آرٹ، ادب، ایجادات اور تجارت میں برتری ایک طرف اور آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک پھیلی ہوئی نو آبادیاں دوسری طرف۔ دنیا میں صرف ایک سپر پاور تھی اور اس کا نام برطانیہ تھا۔ آپ جمہوریت کی طرف قدم بقدم بڑھتے چلے گئے اور اسی رفتار سے آپ کے ملک کی عظمت اور اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ نو آبادیاں ہاتھ سے نکلتی چلی گئیں۔ دوسرے ملک تجارت اور ایجادات میں آپ سے آگے نکل گئے۔ آپ کا ملک جو سب کو قرضے فراہم کرتا تھا خود مقروض بلکہ دیوالیہ ہو گیا۔ آپ نے بےشک دماکراسی کو مثالی بنا لیا ہے مگر دنیا میں اب آپ کا وقار ہے نہ وقعت۔ برطانیہ آج ایک معمولی اور غیر اہم جزیرہ ہے۔

مطہری اور نواب کالا باغ کی نکتہ دانی میں بہت فرق ہے۔ مطہری بعض مقامات اور معاملات کی اشارتی تفسیر کے قائل ہیں۔ کوئی ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے مگر ان کے خیال کی تازگی اور توانائی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ روایت ہے کہ امام مہدی کی آمد پر سورج مغرب سے طلوع ہو گا۔ بقول مطہری اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین جس محور کے گرد اور جس مدار میں گردش کر رہی ہے وہ ان دونوں کو چھوڑ کر مخالف سمت میں گھومنا شروع کر دے گی۔ یہ محض ایک استعارہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان دنوں مغرب پر اسلام کا غلبہ ہو گا۔ کفر کی رات وہاں تمام ہو جائے گی اور اسلام کا سورج طلوع ہو گا۔ پل صراط کی باریکی کے بارے میں بھی مطہری نے بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ زندگی میں افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہیئے۔ اعتدال کی راہ ایک باریک راہ ہے۔ ذرا سی بےتوجہی

ہو تو آدمی اس راہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ ادھر یا ادھر۔ اس راہ کے ادھر نافرمانی اور گناہ ہے اور ادھر غفلت اور کوتاہی۔ مومن کو ہر بات میں میانہ روی سے کام لینا چاہئے اور ہر کام میں اعتدال پر رہنا چاہئے۔ لیکن یہ بات سہل ہے نہ یہ کام آسان۔ یہ ایک ایسے پل پر سے گزرنے کے مانند ہے جو بال سے بھی باریک ہو۔

خطابت کے بارے میں استاد مطہری نے ایک ایسی خدا لگتی اور باریک بات کہی ہے کہ اس موضوع پر ویسی پتہ کی بات میں نے کسی اور عالم دین کی تحریر میں آج تک نہیں پڑھی۔ مطہری کے مطابق خطابت ایک فن اور ایک ہنر ہے اور اسلام اس کو دین کی کمک کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسلام نے خطابت کو نہ صرف دین کا مددگار قرار دیا ہے بلکہ اس کو مذہب کے ایک اہم ترین رکن اور جزو کے برابر درجہ بھی دیا ہے۔ نمازوں میں جمعہ کی نماز کو خاص فضیلت حاصل ہے۔ یہ اگرچہ ظہر کی نماز ہے مگر چار کے بجائے صرف دو رکعت نماز ہوتی ہے۔ باقی دو رکعت کی چھوٹ اس شرط پر دی گئی ہے کہ نمازی ان کے بجائے دو عدد تقریریں سنے۔ خطبہ جمعہ کے دو حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ کو ایک رکعت نماز کا متبادل ٹھہرایا ہے۔ خطبہ نماز کا حصہ بھی ہے اور رکعتوں کا ہم پایہ بھی۔ خطاب کے دو حصے اس لئے ہوتے ہیں کہ ایک میں حمد و ثنا اور تقدیس الٰہی بیان ہو اور دوسرے میں لوگوں کے مسائل بیان کئے جائیں۔ جس طرح مختلف حکومتوں، ملکوں اور اداروں کے نمائندے اور وکیل ہوتے ہیں جو ان کا نکتہ نظر بیان کرتے ہیں اسی طرح خطیب اور اہل منبر اسلام کے Spokesman ہوتے ہیں۔ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ وقت کے اہم مسائل پر روشنی ڈالیں۔ گرداگرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کا جائزہ پیش کریں۔ تاکہ سامعین کو پتہ چلے کہ کل جو شہر ایران کا حصہ تھے اور آج ایک کشور کمونیستی کا حصہ ہیں وہاں لوگوں پر کیا گزر رہی ہے۔ فلسطین کے مہاجرین کس حال میں ہیں۔ اسرائیل عالم اسلام کے لئے کتنا بڑا خطرہ ہے۔ کشمیر کے مسلمان کس صورت حال سے دوچار ہیں۔

عالم اسلام کے اہم مسائل کی یہ مثالیں جس تقریر میں بیان کی گئی ہیں وہ استاد مطہری نے 1960ء میں کی تھی۔ آج پینتیس برس کے بعد صورت حال یہ ہے کہ روس کی عظیم اشتراکی سلطنت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ مغرب نے سرد جنگ کا رخ اسلام کی طرف یہ کہہ کر

موڑ دیا ہے کہ۔ مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے۔ وادی کشمیر کے مسلمانوں پر چار سال سے جو ظلم ڈھائے جارہے ہیں ان کی مثال صرف مسلم بوسنیا اور مسلم چیچنیا میں ملتی ہے۔ مسلمانوں کو خطرہ سے آگاہ کرنے اور غیرت دلانے کے لئے خطابت کی جتنی ضرورت اب ہے وہ شاید پہلے کبھی نہ تھی۔

مطہری کہتے ہیں کہ خطابت کی ایک قسم وعظ کہلاتی ہے۔ جس خطاب سے دلوں کی قساوت اور سختی کو نرمی اور رقت میں تبدیل کیا جائے، لوگوں کو گناہوں سے خوف دلایا جائے اور نیکی کی ترغیب دی جائے وہ وعظ ہوتا ہے۔ بعض اوقات واعظ بے سروپا باتیں کرتے ہیں تاکہ لوگوں سے واہ واہ اور شاباش وصول کریں حالانکہ جہالت سے فائدہ اٹھانا جہالت کی حمایت کرنے کے برابر ہے۔ پیغمبروں کی مخالفت اس لئے ہوئی تھی کہ وہ لوگوں کی کمزوریوں کے خلاف جنگ کرتے تھے مگر ہم لوگوں کی کمزوریوں سے کھیلتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں استاد مطہری حاجی نوری کا حوالہ دیتے ہیں جو روضہ خوانی کے لئے خلوص نیت اور راست گوئی کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ حاجی صاحب اپنی کتاب لُولُو و مرجان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک مشہور عالم نے انہیں خط لکھا کہ ہندوستان میں بعض روضہ خواں راست گوئی سے کام نہیں لیتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شکایت ایران کے بعض واعظ حضرات کے خلاف بھی کی جا سکتی ہے۔ حاجی نوری کا خیال ہے کہ یہ خرابی علما کی کمزوری کی وجہ ہے کہ وہ واعظ کو ٹوکتے نہیں اور اس کی غلط بیانی پر کوئی گرفت نہیں کرتے۔

معاشرہ ایک کاروان ہے۔ اسے راہنمائی کی ضرورت ہے۔ راہنمائی کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی راہ دریافت کرے تو اسے راستہ کا صحیح نشان اور پتہ بتایا جائے۔ راہنمائی یہ نہیں ہے کہ ہر جگہ صرف حرام حرام کی رٹ لگائی جائے۔ یہ کام نہ کرو اور وہ کام نہ کرو۔ یہ ممنوع ہے اور وہ بھی ممنوع۔ یہ راہ بند ہے اور وہ راہ بند ہے۔ واعظ کا بس چلے تو تمام راستے بند ہو جائیں۔ حرکت کا روک رکاؤ کہاں کی ہدایت ٹھہری۔ مسٹر واعظ اگر Mr. Brake بن کر رہ جائیں تو موٹر کار کیسے چلے گی۔ روحانیت جو عوام زدہ ہو، مصلحت کوش ہو اور شہرت کی تلاش میں ہو اس کے پاس اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے کہ

خاموشی کو منطق پر، سکون کو حرکت پر، انکار کو اقرار پر اور افسانہ طرازی کو سچ بولنے پر ترجیح دے۔ ملک الشعرا بہار کا ایک مصرع ہے کہ کارِ اسلام زغوغائے عوام است تمام۔ لوگوں کی ہنگامہ پسندی اور فتنہ گری نے اسلام کا کام تمام کر دیا ہے۔

استاد مطہری کی کتاب مقالات فلسفی میں ہر طرح کی فلسفیانہ بحث ملتی ہے۔ روح اور بدن کا تعلق کیا ہے۔ حیات اور شرائط حیات میں انسان کا دخل کتنا ہے۔ یہ آفرنیش کا سفر کس انداز سے طے ہو رہا ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ظہور ہونا ہے وہ خلق ہو چکی ہے یا جو کچھ علم خداوندی میں ہے وہ بتدریج خلق ہو رہا ہے۔ کیا فلک بے وزن ہے۔ میں فلسفہ کا اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا اس لئے عام فہم موضوعات پر استاد کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مطہری کے نزدیک مسئلہ حجاب کا حاصل یہ ہے کہ پردہ کے نام پر عورت کو عمر قید کی سزا مت سناؤ۔ نہ حبس و نہ اختلاط بلکہ حریم۔ نہ یہ کہ اسے زندان میں ڈال دو۔ اور نہ یہ کہ دونوں اجسام کو ایک دوسرے میں جذب ہونے کی کھلی چھٹی مل جائے۔ عورت کو حرمت و عزت دو اور اس کی حمایت اور اس کا دفاع کرو۔

فریضہ علم کی بحث میں مطہری یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ یہ فرض ہر جہت سے مسلم معاشرہ کی ضرورت کے تابع ہے۔ دین اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ مسلمانوں پر کافروں کا تسلط ہو۔ چونکہ اس غلامی اور تسلط کو علم کے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ہر وہ علم جو مسلمانوں کے لئے مفید ہو اور ان کے اجتماعی مسائل حل کرے وہی علم فریضہ دینی ہے۔ علم دینی اور غیر دینی کی تفریق درست نہیں۔ اس طرح علم محدود ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی ضرورت کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ صرف و نحو اور لغت کے علاوہ بے شمار علوم دین ہیں جن سے معاشرہ مستحکم اور خوشحال ہوتا ہے۔ انہیں غیر دینی قرار دینے والے مقابلہ سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ دنیائے اسلام کو غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ختم نبوت کے سلسلہ میں مطہری کا کہنا ہے کہ مسلمانوں میں کسی نئے پیغمبر کے ظہور کا سوال اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا خدا کی وحدت کا انکار۔ ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پر زوال آگیا ہے اور اب انسانیت اس لائق نہیں رہی کہ وہ عالم غیب کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کر سکے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ انسان اب پیام الٰہی اور ہدایت

خداوندی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ خاتمیّت کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ بالغ ہو گیا ہے۔ اپنے دینی ورثہ کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس کی تعلیم و تفسیر کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ختم نبوت اس بات کی بشارت ہے کہ انسان اور معاشرہ درجہ کمال تک پہنچ گیا ہے۔ ہر آنے والے دور میں سوچ اور فکر کا سرمایہ پرانے عہد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا جائے گا۔ فکر کی میراث کے عہد بہ عہد اضافہ کی روشنی میں لوگ قرآن مجید میں ایک نیا جہان معنی دریافت کرتے رہیں گے۔ اس دریافت کو اجتہاد کہتے ہیں۔ یہ دریافت اور اجتہاد خاتمیت کا راز بزرگ ہے۔

انقلاب کے بارے میں استاد مطہری کی دو کتابیں میں نے علیٰحدہ رکھ دی تھیں کہ جب ان کے افکار کا کچھ اتا پتا چلے گا پھر ان کو اطمینان سے پڑھوں گا۔ ایک دن ان کی باری بھی آ گئی لیکن میں نے اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی جو شرط لگائی تھی اسے خود ہی نرم کر دیا۔ حالات بدل جائیں تو شرائط کو بھی بدل دینا چاہیئے۔ انقلاب اگر اپنے پورے جلال اور جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہو تو پھر سکون کی خواہش کے کیا معنی۔ انقلاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو۔ اس کے خطرات کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ اس کی رفتار پر نظر رکھو۔ حساب طلبی اور سخت گیری کا تماشا دیکھو۔ انارکی کا نظارہ کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی استاد میسر آ جائے تو انقلاب کے فلسفہ سے واقفیت بھی حاصل کرو۔ میں اس کوشش میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ شاگرد میں ہوں۔ استاد کا نام مطہری ہے۔ عقیدہ کا فرق شاگردی اور استادی میں حائل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ کمال شاگرد کا بھی ہے۔

استاد شاگرد کو انقلاب کے معنی سمجھاتے ہیں۔ لغت کی رو سے انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ چہرہ اس طرف ہو جائے جدھر پشت تھی اور پشت ادھر ہو جائے جدھر چہرہ تھا۔ قرآن مجید میں انقلاب انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اپنی ایڑیوں پر پھر جانا یا اصل کی طرف لوٹ جانا ایک انقلاب ہوتا ہے۔ فلسفہ کی رو سے کسی شے کی ماہیت کے بدل جانے کو انقلاب کہتے ہیں۔ لیکن انقلاب اب ایک معروف اصطلاح ہے اور یہ اصطلاح آج کل سوشیالوجی، سیاسیات اور تاریخ کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ معاشرہ کی ہر اس بڑی تبدیلی کو جس میں ایک فرسودہ صورت حال آناً فاناً بالکل برعکس تازہ اور توانا صورت حال میں تبدیل ہو جائے،

انقلاب یا ثورہ یا Revolution کہتے ہیں۔

اقبال کا کہنا ہے کہ قرآن دلوں کو یکسر بدل دیتا ہے اور اس طرح دنیا میں انقلاب کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ قرآن کے اثر کے بارے میں اس کا ایک شعر ہے۔ چونکہ در جاں رفت جاں دیگر شود۔ جاں کہ دیگر شد جہاں دیگر شود۔ قرآن جان میں داخل ہوا اور جان وہ پہلے والی جان نہیں رہی۔ نئی جان کے ساتھ ایک نیا جہاں وجود میں آجاتا ہے۔ جان ایک فرد ہے۔ جہاں ایک معاشرہ ہے۔ دونوں انقلاب کی زد میں ہیں۔

استاد مطہری کا کہنا ہے کہ انقلاب فرد اور معاشرہ دونوں کی زندگی میں آتا ہے۔ فرد میں فکر اور عمل کا انقلاب آتا ہے اور معاشرہ میں نظام اور ترجیحات کا۔ فرد کی زندگی میں آنے والا انقلاب اچھا اور انسانی یا برا اور حیوانی ہو سکتا ہے۔ عشق اور توبہ دونوں انقلاب فرد کی مثالیں ہیں۔

پیغمبر معاشرہ کی اصلاح کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے پیغمبروں کو مصلحان کہا ہے۔ وہ جو حضرت شعیبؑ نے کہا تھا کہ اصلاح کے سوا مجھے کچھ اور منظور نہیں ہے۔ اور اس کام کو میں آخر حد توانائی تک کرنا چاہتا ہوں۔ وہی بات سارے پیغمبروں نے کہی تھی۔ اصلاح اور فساد انسانی معاشرہ کی دو مستقل صورتیں ہیں۔ ایک نظم و ترتیب پیدا کرتی اور معاشرہ کو آراستہ کرتی ہے۔ دوسری بدنظمی، افراتفری اور بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ مسلمان ہونے کی رو سے ہر صاحب ایمان، اصلاح طلب ہوتا ہے۔ وہ پیغمبروں کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ معاشرہ کی خدمت اور معاشرہ کی اصلاح میں ایک لطیف فرق ہے۔ کسی بیماری کا علاج دریافت کرنا خدمت ہے۔ کسی معاشرہ کو اس طرح ترتیب دینا کہ علاج سب کو میسر آئے اصلاح اجتماعی ہے۔ دریافت مشکل ہوتی ہے مگر اصلاح اس سے کہیں زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ جہاں گیری سے ہے دشوار تر کار جہاں بانی۔

دنیائے اسلام میں اصلاح کے لئے جو تحریکیں وقتاً فوقتاً اٹھی ہیں وہ کسی دوسرے معاشرہ کی تاریخ میں جگہ پانے والی تحریکوں سے ہرگز کمتر نہیں ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ہر طرح کی تحریک ملتی ہے۔ وہ جو واقعی اصلاحی تھیں یا وہ جن کے لئے اصلاح محض ایک بہانہ تھا۔ وہ جو آغاز میں درست راہ پر چلیں اور انجام کار انحراف کا شکار ہو گئیں۔ وہ جو شاہراہ

اسلامی کو چھوڑ کر بے راہ ہو گئیں اور قوم پرستی اختیار کر لی۔ بابک خرّم کی تحریک شروع سے ہی قابل نفرت تھی۔ شعوبیہ نے صحیح خطوط پر کام شروع کیا مگر کچھ دور چل کر راہ گم کر دی۔ غزالی کی تحریک فکری مگر اجتماعی تھی۔ سربداریاں تحریک عارضی نوعیت کی تھی۔ یہ فقط حکام وقت کے خلاف تھی۔ اخوان الصفا فکری اور اجتماعی تحریک ہے۔ بعض تحریکیں جدیدیت کے خلاف ردعمل کے طور پر پیدا ہوئیں۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری کی اشعری تحریک، دسویں صدی کی شیعہ اخباریگری تحریک اور بارہویں صدی کی وہابی تحریک۔ تیرھویں صدی کے دوسرے نصف میں بہت سے ممالک (ایران، برطانوی ہندوستان، شام، لبنان، مصر، ترکی، افغانستان اور شمالی افریقہ) میں اصلاح کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ یہ مغرب کے سیاسی، اقتصادی اور فرہنگی تسلط کے خلاف ایک احتجاج تھا جو مجموعی طور پر اسلام کے لئے عصر نو میں بیدار سازی اور تجدید حیات Renaissance کا سبب بن گیا۔

دور جدید میں سید جمال الدین اسد آبادی معروف بہ افغانی نے اسلامی دنیا کی بیدار سازی کے کام کا آغاز کیا۔ اس نے اسلامی معاشرہ کے پانچ مسائل کی نشاندہی کی۔ حکومت اور حکام کا جبر۔ جہالت اور بے خبری یعنی کاروان علم و تمدن سے بچھڑ جانا۔ دین میں بدعات اور خرافات کا داخل ہو جانا۔ امت میں نااتفاقی۔ مغرب کی دخل اندازی۔ سید جمال نے ان کا علاج بھی تجویز کیا۔ عوام قوت ایمانی پیدا کریں اور حکومت سے اپنا حق چھین لیں۔ جدید علوم و فنون حاصل کریں۔ حقیقی اسلام کی طرف لوٹ جائیں۔ عقائد کے اتحاد کی کوشش میں وقت ضائع نہ کریں بلکہ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں یک جان ہو جائیں۔ ان سے اپنے سیاسی اور اقتصادی حقوق واپس لیں۔ انہیں ہرگز اس کا موقع نہ دیں کہ ان کی سوچ نوجوان مسلمانوں کو بے اعتقاد اور بے طرف کر دے۔

سرسید بھی مصلح تھے۔ افغانی کے ہم عصر تھے مگر ہم خیال نہ تھے۔ جمال الدین افغانی کے بعد ان کے نامور شاگرد شیخ محمد عبدہ کی باری آتی ہے۔ اس کے بعد شیخ عبدالرحمٰن کوبکی کا نام آتا ہے۔ دنیائے عرب میں اور کئی اصلاح طلب رہنما پیدا ہوئے۔ عبدالحمید بن باویس، طاہرالزہراوی، عبدالقادر مغربی، جمال الدین کاظمی، محمد بشیر ابراہیمی۔ غیر عرب مسلم ممالک میں کئی مصلح پیدا ہوئے جن میں اقبال بلاشبہ ایک بہت بڑا نام ہے۔ اقبال کی خوبی

یہ ہے کہ مغربی علم و دانش کے اکتساب کے باوجود وہ مغربی فکر سے مرعوب نہیں ہوا۔ وہ مغرب کو اخلاق بشریت کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مسلمان اپنے مسائل کا حل خود تلاش کریں اس لئے اس نے اجتہاد اور اجماع جیسے معاملات پر بہت غور کیا۔ وہ اسلامی فکر از سر نو زندہ کرنے اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسلامی دنیا میں فرد اور معاشرہ دونوں اپنی اصل حقیقت اور جوہر کو حاصل کر لیں۔ اس کے لئے انہیں فرہنگ اسلامی کی طرف لوٹنا ہو گا اور یہی فلسفۂ خودی ہے۔ اقبال کا اثر ہمہ گیر ہے۔ کم و بیش سارے جہان اسلام میں پایا جاتا ہے۔

مطہری کہتے ہیں کہ تمام خوبیوں کے باوجود اقبال میں دو چیزوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ فلسفہ اسلامی پر انہیں مکمل عبور حاصل نہیں۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے عالم اسلام کو سید جمال الدین کی طرح خود گھوم پھر کر نہیں دیکھا۔ اس لئے اسلامی ممالک کی بعض شخصیات اور تحریکوں کو سمجھنے میں انہیں غلطی لگی ہے۔ اس نے حجاز کی وہابی تحریک، ایران کی بہائی تحریک اور اتاترک کی جدوجہد کو اصلاحی اور اسلامی قرار دیا ہے اور گھڑ سواری کے فل بوٹ پہننے والے غاصب اور جابر مسلمان حکمرانوں کی تعریف میں شعر بھی کہے ہیں۔

استاد مطہری کا کہنا ہے کہ روحانیت شیعہ نے کئی اصلاحی تحریکوں میں عملی حصہ لیا ہے۔ تمباکو تحریک، مشروطہ تحریک، عراق میں انگلستان کے تسلط کے خلاف تحریک اور وہ انقلابی تحریک جو ان دنوں ایران میں چل رہی ہے۔ یہ ساری کی ساری شیعہ علما کی رہبری میں پروان چڑھی ہیں۔ جہان تسنن میں علما اصلاح اور جنگ کی باتیں تو بہت کرتے رہے مگر عملی حصہ اس طرح نہیں لیا جیسا شیعہ علما نے لیا ہے۔ دراصل روحانیت سُنّی ایک وابستہ روحانیت ہے۔ وہ اس طاقت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتی جس سے وہ وابستہ ہے۔ اس کے برخلاف روحانیت شیعہ ایک ایسا ادارہ ہے جو براہ راست عوام سے قوت حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ علما نے زور مندان تاریخ سے کئی مرتبہ مقابلہ کیا ہے۔ اسلام بالخصوص شیعہ اسلام حرکت، انقلاب، خون، آزادی، جہاد اور شہادت کا

مذہب ہے۔

جب میں نے مطہری کی کتاب نہضتہای اسلامی در صد سالہ اخیر، کے اس حصہ کو پڑھا جس میں اختلاف، احتجاج اور انقلاب کے بارے میں سنی اور شیعہ علما کی کارگزاری کا فرق درج تھا تو مجھے پاکستان کے ایک مشہور صحافی یاد آئے۔ ابھی چند ہفتہ پہلے وہ ایران آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بہشتی کا انٹرویو لینے گئے۔ جب انٹرویو ختم ہونے لگا تو صحافی نے کہا۔ اب میں آپ سے آخری سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ آپ کو خبردار کر دوں کہ یہ ایک نازک سوال ہے۔ اگر آپ جواب نہ دینا چاہیں تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ سوال ذرا غور سے سنئے۔ انقلاب ایران کے بارے میں یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ یہ شیعی اسلامی انقلاب ہے۔ ڈاکٹر بہشتی نے لمحہ بھر دیر نہ لگائی۔ سوال پوچھنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہنے لگے۔ اس سوال کے جواب میں کوئی اشکال ہے نہ دشواری۔ ایران کے اسلامی انقلاب کو ایرانی علما کی قیادت اور رہبری میسر آئی ہے۔ چونکہ یہ علما شیعہ ہیں اس لئے وہ اپنے افکار اور عقیدہ کے سوا اور کون سا انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بہشتی سے ملنے کے بعد وہ صحافی میرے پاس آئے اور انٹرویو کی داستان سنائی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایرانی انقلاب کی قیادت اور پاکستانی سیاست میں حصہ لینے والے علما میں بڑا فرق ہے۔ ایک ہوم ورک کئے بغیر عوامی سطح پر بولنے کا عادی ہو چکا ہے، دوسرا پہلے نظریہ سازی اور منصوبہ بندی کرتا ہے پھر کہیں جا کر منہ کھولتا ہے۔ چند ہفتہ کی بات ہے ایک ایرانی عالم پاکستان کے سرکاری دورہ سے واپس آئے۔ ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے حیرت کا مقام ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل جو آئین کے تحت قائم ہونے والا ادارہ ہے اس کے چیئرمین کو عربی نہیں آتی۔ میں نے عربی میں سوال کیا اور وہ انگریزی میں عذر خواہی کرنے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے دینی مدارس میں علما سے عربی میں سوال کیا۔ جواب اردو میں ملا۔

بقول استاد مطہری ایران کے اسلامی انقلاب کا حاصل یہ ہے کہ ملت خود باختگی (بے یقینی) کی حالت سے خود یابی (یقین) کی منزل پر پہنچ گئی ہے۔ خود باختگی اس کیفیت کا نام ہے جس میں ایک گروہ کا اپنے آپ پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا احترام

کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے تمدن سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی اہلیت اور استعداد کی خبر تک نہیں ہوتی۔ ہر وقت یہ خوف طاری ہوتا ہے کہ ملت کا شیرازہ بکھرنے والا ہے۔ ملک ٹوٹنے والا ہے۔ خودیابی یہ ہے کہ وہ گروہ اپنے اوپر ایمان لے آتا ہے۔ اس میں عزت نفس کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تاریخ اور اپنے تہذیبی ورثہ کا احترام کرتا ہے۔ وہ پُریقین ہوتا ہے۔ وہ کسی دنیاوی قوت کی طرفداری حاصل کرنے کے بجائے توکل سے کام لیتا ہے۔ خواب سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب سے مراد اہل اسلام کی بیداری ہے۔

انقلاب آگیا ہے۔ ایران بیدار ہو گیا ہے۔ کئی سوئے ہوئے فتنے بھی جاگ اٹھے ہیں جو اس انقلاب اور بیداری کی نفی کر رہے ہیں۔ ہنگامی دور ہے۔ گڑبڑ کا دور دورہ ہے۔ توقعات خلا میں معلق ہیں۔ خطرات فضا میں تیر رہے ہیں۔ انقلاب کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ استاد مطہری نے آفات انقلاب کی فہرست بنائی تھی۔ اس میں آفت کی ایک صورت یہ ہے کہ ضد انقلاب، انقلاب کو مضبوط ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ وہ فساد پھیلاتے ہیں تاکہ انقلاب اپنی سمت اور قوت کھو دے۔

صبح سویرے بیٹری والا ریڈیو چلایا۔ معلوم ہوا کہ کل ساڑھے دس بجے شب ضد انقلاب نے آیت اللہ استاد حاج شیخ مرتضٰی مطہری خراسانی کو گولی مار دی۔ وہ رات کے گیارہ بجے ہسپتال میں انتقال کر گئے۔

سارا ملک سوگوار ہے۔ اخبارات استاد کی تصویروں اور تذکرے سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کے پاس جگہ بچی انہوں نے تحریروں کے اقتباس شائع کر دیئے ہیں۔ ٹی وی سے خاص پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔ ریڈیو سے جب ان کے انتقال کی خبر نشر ہوئی تو پس منظر میں کوئی شخص ان کی کتاب داستان راستاں کے کچھ حصے پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اب وہ مختلف اشخاص کے تعزیتی بیانات نشر کر رہا ہے۔ آقای منتظری کہتے ہیں، میں حضرت ولی عصر، دینی حلقوں، علما، انقلاب کے رہنما امام خمینی، شہید کے قابل احترام اہل خانہ، اہل ایران اور مسلمانان عالم کو اس عظیم، تخلیقی اور تعمیری شہادت پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

برطانوی ہند کی ریاست حیدر آباد دکن میں ایک بار انگریز دوست چیف منسٹر کو

ریاستی سیاست سے اختلاف رکھنے والے مسلم قومیت کے نوجوان نمائندوں نے گھیر لیا۔ ایک آدھ تیز مزاج نے ہاتھ چلانا چاہا۔ نکتہ شناس ساتھی چیف منسٹر کے سر کے اوپر جھک گئے اور کہنے لگے۔ کوئی شخص اس سر پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ ایک حافظِ قرآن کا سر ہے۔ یہ سنتے ہی سب نے ہاتھ کھینچ لئے۔ نعرۂ تکبیر بلند کیا اور واپس چلے گئے۔ یہ کون ظالم اور بے رحم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوئے کہ مطہری ایک عالم، فلسفی، دانشور، خطیب اور مصنف ہیں اور زندگی میں جو کچھ انہوں نے حاصل کیا وہ اپنی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور دماغ سوزی سے حاصل کیا، جب اس عالم دین کو گولی مارتے ہیں تو نشانہ پشت سر کا باندھتے ہیں اور مغز کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرد وں تفو۔

(3)

ہر شخص کے دن رات کی مقدار چوبیس گھنٹہ ہے۔ نہ کم، نہ بیش۔ جو لوگ وقت کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں انہیں یہ راز کی بات کون بتائے کہ وہ جسے وقت کی کمی سمجھ رہے وہ دراصل صلاحیت کی کمی ہے۔ وقت پر اپنا قبضہ جمانا اور اسے اپنے تصرف میں لانا بھی ایک صلاحیت ہے۔ پہلے وقت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے۔ اس کے بعد ہر حصہ کو کسی مقصد کے حوالہ کر دینا چاہئے۔ اہم کام کے لئے بڑا حصہ، کم اہم کے لئے چھوٹا۔ غیر اہم کام ہو تو حصہ داری سے خارج۔ یہ نصیحت مجھے والد محترم نے ان دنوں کی تھی جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ پتہ چلا کہ میٹرک کے امتحان سے اس نصیحت کا یونہی سا تعلق تھا۔ یہ نصیحت گری دراصل ایک بڑے اور مسلسل امتحان کی تیاری کے لئے تھی جسے زندگی کہتے ہیں۔

ایران میں ہنگاموں اور افراتفری کے باوجود میں وقت کو ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت بسر کر رہا ہوں۔ اس میں کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں۔ میں نے انقلاب کے فکری اور عقلانی پس منظر سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے وقت کا جو حصہ مقرر کیا تھا وہ بیشتر

ڈاکٹر شریعتی اور استاد مطہری پر صرف ہو گیا ہے۔ یہ جو تھوڑا سا وقت بچا ہے کیا وہ صادق ہدایت اور جلال آل احمد سے تعارف حاصل کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ کیا میں کسی اور دلچسپی یا سرگرمی کو کم کر سکتا ہوں تاکہ ان دو مصنفوں کو پڑھنے کے لئے اضافی وقت مل جائے۔ میں نقشہ اوقات اور فہرست کار پر ایک نظر ڈالتا ہوں۔ ذرا سی گنجائش بھی نظر نہیں آتی۔ میں اپنے آپ کو آمادہ کر لیتا ہوں کہ ان دونوں سے میرا تعارف سرسری ہو گا۔

ایک بار کسی پڑھے لکھے نوجوان ایرانی نے مجھ سے کہا تھا کہ سعدی کے بعد اتنی اچھی نثر صرف صادق ہدایت کے یہاں ملتی ہے۔ جب انہیں سعدی سے میری عقیدت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے میری خاطر بیاں کو ذرا سا بدل دیا۔ کہنے لگے، اگر سعدی اس زمانہ میں ہوتے اور جدید فارسی نثر میں اپنی بات کہنا چاہتے تو ان کی تحریر صادق ہدایت کے اسلوب کا ایک آراستہ اور بہتر نمونہ ہوتی۔ میں خیابان شاہ رضا کی ان تین چار بڑی دکانوں کا چکر لگاتا ہوں۔ جہاں میں گاہے ایک آدھ کتاب خریدنے کے بہانہ بے شمار کتابوں کے دیباچے، فہرست مضامین، اشاریہ اور سرورق کے دامن پر چھپے ہوئے تعارفی کلمات کا تفریحی مطالعہ بے دام اور بے جھجک کرتا ہوں۔ ان دکانوں میں صادق ہدایت کی تقریباً بیس کتابیں موجود ہیں۔ فوائد گیا ہخواری (گھاس کھانے کے فوائد)، زندہ بگور، سگ ولگرد (آوارہ کتا)، سہ قطرہ خوں، سایہ روشن، نوشتہ ہای پراگندہ (متفرقات)۔ میں دو کتابیں خریدتا ہوں۔ بُوفِ کُور (اندھا اُلّو) اور وغ وغ ساہاب۔ وغ وغ بھونکنے کو کہتے ہیں اور ساہاب کے معنی مجھے آج تک پتہ نہیں چلے۔ میرا خیال تھا کہ اندھے الو سے صادق ہدایت کی مراد بادشاہ وقت ہے اور شاید اسی لئے یہ کتاب پہلی بار ایران کے بجائے برطانوی ہند کے شہر بمبئی میں چھپی تھی جہاں ایک زمانہ میں بے شمار ایرانی عافیت اور روزگار کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ بُوفِ کُور خریدتے ہوئے مجھے میوا سکول آف آرٹس کی عباسی اختریاد آئیں جنھوں نے ایک تصویر میں الو کو صدارت کرتے ہوئے اور اس کے ہم جنسوں کو میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دکھایا تھا۔ تصویر کا عنوان تھا۔ کابینہ کا اجلاس۔ ان دنوں پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ہوا کرتے تھے جن کے بھائی بہادر خاں نے مارشل لا سے چند ہفتہ پہلے فیڈرل اسمبلی میں یہ مصرع پڑھا تھا۔ ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے، انجام گلستاں

کیا ہو گا۔

میں نے بُوف کُور اٹھائی۔ ماجرا کچھ اور ہی نکلا۔ مصنف ایک ایسا تجربہ بیان کرتا ہے جو ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی حالت میں اسے حاصل ہوا تھا۔ یہ تجربہ حواس کے احاطہ سے باہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ باور کریں یا نہ کریں میں اس واقعہ کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اپنی ذات کو دریافت کئے بغیر مرجانا مجھے منظور نہیں۔ میں اپنا تعارف اپنے اس سایہ سے کرانا چاہتا ہوں جو میں نے دیوار پر دیکھا تھا۔ پھر اس تجربہ میں کہیں سے ایک بوڑھا اور ایک نوجوان خاتون آکر شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ فریب خیال و نظر کی بدولت بہت کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو خوشۂ انگور کی طرح ہاتھ میں لے کر نچوڑ دے اور اس کے عرق کو قطرہ قطرہ اپنے سائے کے گلے میں ٹپکا دے جو خشک ہو گیا ہے۔ لیکن اس کام سے پہلے وہ لکھنا چاہتا ہے۔ صادق ہدایت کہتا ہے کہ لکھنے کی وجہ سے میں اپنی فکر کو مرتب اور منظّم کر سکوں گا۔ لیکن میں کوئی وصیت نامہ نہیں لکھ رہا۔ میرے پاس کون سا مال ہے جسے بیت المال ہضم کر جائے۔ میرے پاس دین کی دولت بھی نہیں کہ اسے شیطان چھین کر لے جائے۔ وہ جو ذرا سی قیمت میری جان کی تھی وہ میں پہلے ہی تقسیم کر چکا ہوں۔ میں اس بات کا محتاج ہوں کہ اپنی فکر کو عبارت میں منتقل کروں اور اپنے اس سائے سے ربط قائم کروں جو دیوار پر لرز رہا ہے۔

انقلاب کی مار اماری میں یہ خیال و خواب کی پراسرار داستان بڑی عجیب و غریب لگی۔ صادق ہدایت اس لئے لکھتا ہے تاکہ خود اسے پتہ چل سکے کہ آخر وہ کیا سوچتا ہے۔ اپنی ذات کو سمجھنے اور سوچ کو پرکھنے کے بعد وہ اپنا تعارف اپنے سائے سے کرائے گا جو بے یقینی کی دیوار پر لرز رہا ہے۔ لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ بہتا ہوا خون سڑکوں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ایک دن یہ تحریر مکمل ہو گی۔ تاریخ کی دیوار پر شہنشاہیت کا لرزتا ہوا سایہ روشنی میں حل ہو جائے گا۔ لوگ اس دن اپنی گزشتہ تاریخ سے اپنی حالیہ تاریخ کا تعارف بڑے فخر سے کرائیں گے۔

میں نے بوف کور کو بند کیا۔ دوسری کتاب کھولی۔ یہ کتاب صادق ہدایت نے م۔ فرزاد کے ساتھ مل کر لکھی ہے مگر سرورق پر صرف صادق ہدایت کا نام لکھا ہوا اور اس

کی قلمی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ تقلید مسخرہ آمیز (طنزاور پیروڈی) کی کتاب ہے۔ ایک آزاد نظم کا عنوان ہے، قضیہ کن فیکو ن (کن فیکون کا جھگڑا)۔ نظم کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔
اے نوجوان کن فیکو ن کے دو معنی ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ روز ازل خدا نے عدم سے کہا کن فیکون اور جہاں کچھ بھی نہیں تھا وہاں ایک جہان پیدا ہو گیا۔ ایرانیوں کے نزدیک اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ جب ایک ایرانی کہتا ہے کہ میں نے اس کو کن فیکو ن کر دیا تواس کا مطلب ہے کہ وہ شخص عزیز اور محترم تھا میں نے اسے خراب و خوار کر دیا۔ وہ دولتمند اور خوش قسمت تھا، میں نے اسے غریب اور بد نصیب کر دیا۔ عقلمند تھا، پھر بھی اسے بیوقوف بنایا۔ وہ شخص سب کچھ تھا مگر اب کچھ بھی نہ رہا۔ میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایرانیوں نے جو معنی اخذ کئے ہیں وہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ میری تھیوری کے مطابق یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ شروع میں کچھ بھی موجود نہ تھا اور سب کچھ کن سے پیدا ہوا۔ ایک دنیا پہلے سے موجود تھی۔ نعمت ہی نعمت، راحت ہی راحت۔ نہ مٹی نہ دھواں۔ ایک روز خدا کی مار پڑی اور یہ دنیا کن فیکون ہو گئی۔ عمارتوں کی چھتیں ڈھے گئیں، ستون گر پڑے۔ نرم زمین سنگلاخ ہو گئی۔ آدمی جو بھلے اور خوش مزاج تھے وہ کہیں غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک جانور نے لے لی۔ ڈراؤنا اور بد شکل۔ وہ خراب شدہ دنیا یہی اپنی دنیا ہے جس سے آج ہم عاجز اور بیزار ہیں۔ میری یہ تھیوری فلسفہ آفرینش میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اس سال نوبل پرائز مجھے ملنا چاہئے۔

ٹی وی پر ایک پروگرام ہو رہا ہے۔ ایک صاحب جبہ و دستار اپنا دفاع کر رہے ہیں۔
کہتے ہیں لوگ میرے فیصلوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں بے رحم ہوں، بے عقل ہوں، ہر ایک کو موت کی سزا سنا دیتا ہوں۔ انہوں نے یہاں تک مشہور کر دیا ہے کہ میں ذہنی مریض رہ چکا ہوں۔ یہ سب غلط پراپیگنڈا ہے۔ میں صحت مند ہوں۔ ہاں ایک آدھ بار اعصاب کے ماہر کے پاس ضرور گیا تھا۔ یہ جو آج کل منشیات کے خلاف ایک بہت بڑی مہم چلائی جارہی ہے یہ میری نگرانی اور سرپرستی میں جاری ہے۔ منشیات کی لعنت کا علاج سختی کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ جو ہم نے تین ہزار نشہ باز پکڑے اور گھڑ دوڑ کے نئے میدان میں زیر حراست رکھے ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر کا علاج ہو گا۔ اب تک جن

لوگوں کو موت کی سزا دی گئی ہے وہ مخدرات کے نامی گرامی سمگلر اور بڑے تاجر تھے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فیصلے مناسب شہادت کے بغیر کئے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھئے یہ فائل تین سو صفحہ کی ہے۔ یہ دو سو صفحہ کی ہے۔ اور یہ کتنی ضخیم ہے۔ ایسی بے شمار فائلیں ہیں۔ میں نمونہ کے لئے چند ساتھ لے کر آیا ہوں۔ یہ فائلیں پہلے سے بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سارا ثبوت موجود ہے۔ اس لئے فیصلہ کرنے میں مجھے دیر نہیں لگتی۔ میں نے ان لوگوں کو ٹھکانے لگا کر معاشرہ کی خدمت کی ہے مگر آپ ہیں کہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ انسداد منشیات کی اس مہم کی غیر ملکی کتنی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر صاحب موصوف نے تکمہ کھولا، جبہ کے اندر ہاتھ ڈالا اور جیب سے ایک خط نکالا یہ خط سنئے۔ یہ لوس اینجلز سے آیا ہے۔ لکھنے والے کا نام اور پتہ یہ ہے۔ خط میں لکھا ہے کہ آقای محترم آپ منشیات کے استعمال کے خلاف جو جدوجہد کر رہے ہیں میں اس پر آپ کو مبارک باد ہی نہیں دیتا بلکہ آپ کو نوبل پرائز کے لئے نامزد کرتا ہوں۔

نوبل پرائز کے بارے میں ایک دوست نے بہت سے دلچسپ قصے، کچھ غلط کچھ درست، جمع کئے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ ایک زمانہ میں ڈرائنگ روم کی نیم علمی گپ شپ میں سنایا کرتے تھے۔ ہمارے یہ دوست دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کیا کرتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے بہت سا مواد جمع کیا ہوا تھا۔ بہت سے تراشے، بہت سے رسالے، بہت سی کتابیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا، نوبل پرائز کے لئے جوڑ توڑ۔ ایک دن جب انہوں نے اس کتاب میں درج ایک قصہ سنایا تو میں نے کہا، ایک واقعہ میں بھی سناتا ہوں جو آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔ ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے ایک سفر کے دوران مجھے یہ واقعہ سنایا تھا۔ کہنے لگے نوبل پرائز کمیٹی کے صدر اور اراکین سے ملنے اور بحث کرنے کا موقع مجھے کئی بار ملا ہے۔ ایک بار یہ طے ہوا کہ پاکستان کے سفیر جنرل برکی کمیٹی کے صدر کو کھانے پر بلائیں گے اور میں اچانک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ جب میں منصوبہ کے مطابق سفارت خانہ پہنچا تو صدر کمیٹی نے مجھے دیکھتے ہی طنزاً کہا۔ آپ اس مرتبہ پھر تشریف لے آئے ہیں۔ کہنے لگے میں نے ہشیاری سے کام لیا اور جواب دیا۔ جناب والا۔ دنیا گواہ ہے کہ آپ ہمیشہ جسے حقدار سمجھتے ہیں اسے انعام دیتے ہیں۔ کوئی شخص، ادارہ یا ملک اس سلسلہ میں

آپ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ میں اس بات سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی جوڑ توڑ کے لئے یہاں کا سفر کروں۔ میں صرف ایک بات گوش گزار کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ چند سال ہوئے کمیٹی نے ایک امیدوار کو اس لئے انعام نہیں دیا کہ اس نے صرف تھیوری پیش کی تھی جبکہ اسے ثابت کسی اور شخص نے کیا تھا۔ دو ایک برس بعد آپ نے ایک امیدوار کا نام اس لئے خارج کر دیا کہ اس نے جو کچھ ثابت کیا ہے اس کی تھیوری کوئی اور شخص پہلے ہی پیش کر چکا ہے۔ میں یہ مشورہ دینے کی جسارت کروں گا کہ آپ اصول بدلنے کے بجائے تھیوری یا ثبوت دونوں کو انعام کے لائق قرار دیں۔ دونوں میں سے جو کام نسبتاً مہم ترین ہو اسے انعام ملنا چاہئے۔ ڈاکٹر عثمانی کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر مجھے ملاقات کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حق بحقدار رسید۔

صادق ہدایت نے ایک شاعر کی لڑکی کا قصہ بیان کیا ہے جس نے شعر کہنے کی کوشش کی تاکہ باپ کی طرح عزت و شہرت حاصل کرے۔ اس نے کچھ غلط سلط لکھا اور باپ کو دکھایا۔ باپ نے کہا یہ سب لچر اور پوچ ہے۔ نہ وزن، نہ قافیہ، نہ صنائع بدائع۔ تمہیں عربی صرف و نحو بھی نہیں آتی۔ علوم عروض سے تم ناواقف، رسوم بحر و قافیہ سے ناآشنا۔ لڑکی بڑی مایوس ہوئی۔ اس نے شعر گوئی کی ایک کوشش اور کی۔ پہلے سے بدتر۔ باپ خفا ہوا۔ زن ماما نے مشورہ دیا کہ دیوان چھپوا دو بلکہ تراجم بھی چھپوا دو۔ تمہارا باپ تم سے جلتا ہے۔ دیوان چھپا۔ تھو تھو ہوئی۔ لڑکی خجل ہوئی اور روتی رہی۔ چند ماہ کے بعد اسے خط ملا کہ آپ کی کتاب کے جو تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں ہوئے تھے ان سے متاثر ہو کر آپ کو ادبیات کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ لڑکی انعام لینے کے لئے یورپ گئی۔ سات سال ہو گئے ہیں۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ ممکن ہے وہ یورپ میں گم ہو گئی ہو۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ نوبل پرائز والا خط زن بابا نے بھیجا ہو۔

میں صادق ہدایت کے دو مضمون اور پڑھتا ہوں۔ ایک جھگڑا وٹامن کا دوسرا قصہ سیگمنڈ فرائڈ کا۔ وٹامن کا جھگڑا یہ ہے وٹامن روح کی طرح جوہر ہے یا جسم کی طرح مادہ۔ فرائڈ کا قصہ یہ ہے کہ ایک لڑکا جوان ہوا۔ اس کے دل میں محبوبہ کی طلب پیدا ہوئی۔ آخر اسے ایک خوبصورت لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نوجوان کو عشق ہو جائے تو وہ شاعر بن جاتا

ہے۔ محبوب کی شان میں شعر کہتا ہے اور نہر کے کنارے بیٹھ کر انہیں گنگناتا ہے۔ اس نوجوان نے بھی وہی کیا جو دوسرے نوجوان کرتے آئے ہیں۔ اس کا کوئی شعر یاد نہیں۔ بس معمولی سے تھے جیسے بے شمار عشاق نے عمر کے اس دور میں کہے ہوں گے۔ حالات ساز گار ہوئے اور ان دونوں کو باہم زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ چند ماہ کے بعد عاشقانہ جذبات سرد پڑ گئے۔ عاشق نے یہ دریافت کیا اس کی محبوبہ عام سی لڑکی ہے اور اس میں عام لڑکیوں والی ساری کمزوریاں موجود ہیں۔ تعلقات خراب ہو گئے۔ وہ دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ اپنے اصل اور بے عیب محبوب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ بہت گھومے پھرے مگر ان کی مراد پوری نہ ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ اس تلاش کا حاصل صرف اس قدر تھا کہ دونوں کی جوتیاں گھس گئیں۔

(4)

موٹر کے ٹائر گھس گئے ہیں۔ ڈرائیور راستہ میں دو ایک جگہ رک کر نئے ٹائروں کی دستیابی کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ہر دکاندار ٹکا سا جواب دیتا ہے۔ نے، نا، نہ۔ بازار آزاد میں ہر چیز مل جاتی ہے مگر کمیتہ اور پاسداران کا رعب اتنا ہے کہ بازار آزاد کا آسانی سے پتہ نہیں ملتا۔ ٹائر کی تلاش میں موٹر ایک جانی پہچانی سڑک پر کھڑی ہے۔ راتوں رات اس کا نام بدل گیا ہے۔ راہ نما کھمبے پر سڑک کا نیا نام لکھا ہوا ہے۔ خیابان جلال آل احمد۔ دفتر پہنچ کر میں نے ایک ایرانی خاتون سے پوچھا کہ یہ کون سے آیت اللہ ہیں اور انقلاب کے سلسلہ میں ان کی خدمات کیا ہیں۔ جواب ملا، یہ ایک مشہور دانشور اور ادیب کا نام ہے۔ میں نے تصانیف کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس خاتون نے آر سی ڈی سیکرٹریٹ کی کتابدار خاتون کو اپنی کمک کے لے بلالیا۔ کتابدار نے کہا، جلال آل احمد قصہ و داستان لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مقالات بھی لکھے اور تراجم بھی شائع کئے۔ ان کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے جو سوال بھی کیا اس کا تسلی بخش جواب نہ ملا۔ آخر کار میں

نے پوچھ لیا کہ آیا ان دونوں خواتین نے جلال کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ جواب نفی میں تھا۔ میں نے کہا، اگر آپ نے بھی اسے نہیں پڑھا تو پھر مجھے یہ ماننے میں تامل ہو گا کہ وہ ایک آزاد خیال اور ہر دل عزیز دانش ور ہے۔

ان دونوں خواتین میں سے جو عمر میں کم تھی اس نے وضاحت کی۔ سر، آپ ہماری بات پر یقین کریں۔ وہ ایک غیر معمولی روشن فکر اور دانشور تھا۔ اگر ہم نے اسے اب تک نہیں پڑھا تو وہ ہماری مجبوری تھی۔ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہوئے اور بازار عروسی کی گھما گھمی میں گم ہو گئے۔ تلاش و جستجو، تکلّفات و تفریحات، آرائش و زیبائش، پہچان و شناخت، انکار و اقرار۔ امیدواری اور امید براری۔ یہ وہ چند اہم سال تھے جن پر میرے مستقبل کا دارومدار تھا۔ میں ان سالوں میں اپنی طرف دیکھتی کہ صادق ہدایت، جلال آل احمد اور نیمہ یوشیج کو پڑھتی۔ اس دور کے بعد چند سال شادی کو مستحکم کرنے اور اپنا خاندان بنانے میں صرف ہوئے۔ اب ہم تیسرے مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس میں اپنے مشاغل کے لئے وقت نکالنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ میں کل سے جلال کو پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ سنا ہے کہ آپ بھی رائٹر ہیں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ ہمارے جدید رائٹرز کو براہ راست فارسی میں پڑھیں۔ اجازت ہو تو جلال آل احمد کی چند کتابیں آپ کو بھیج دوں۔ میں اس خاتون کی بے جھجک صاف گوئی سے متاثر ہوا۔ اجازت ہی نہیں بلکہ کچھ رقم بھی اسے دے دی۔ دوسرے دن میرے میز پر چند نئی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دید و بازدید (ملاقاتیں)۔ از رنجی کہ میبریم (وہ دکھ جو ہم اٹھائے پھرتے ہیں) ارزیابی شتاب زدہ (فوری تشخیص)۔ خسی در میقات (فضول آدمی اور مقامِ احرام پوشی)۔

جلال آل احمد ایک جدید آزاد خیال ترقی پسند اور دین شناس دانشور تھا۔ وہ مغربی تعلیم سے متاثر ہو کر خواہ مخواہ مذہب سے بیزار نہیں ہوا۔ البتہ وہ ان بہت سے غلط کاموں سے ضرور بیزار تھا جو مذہب کے نام پر کئے جاتے ہیں۔ وہ نئی اور پرانی دنیا دونوں کا باشندہ تھا۔ دونوں کو اہم سمجھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن کے لئے ہر پرانی چیز بے معنی ہوتی ہے خواہ وہ سایہ دار درخت ہی کیوں نہ ہو۔ ایک نئی بستی میں شجر کاری دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ یہاں سارے درخت نوجوان ہیں اس لئے بے سایہ ہیں۔ نئی سوچ رکھنے کے

باوجود وہ نئے زمانہ کی خود غرضی اور مطلب پرستی کے خلاف تھا۔ ایک جنازہ کا حال بیان کرتا ہے۔ کل پندرہ آدمی شامل ہیں اور وہ بھی شاید ان نیکیوں کے صلہ میں جو میت نے زندگی میں کی ہوں گی، جنازہ کو بڑی تیزی کے ساتھ قبرستان کی جانب لے جارہے ہیں۔ لوگ بے حس ہیں۔ ایسے کاموں میں حصہ نہیں لیتے۔ جو لیتے ہیں وہ کم سے کم وقت میں فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ ادیب اس خود غرض رویئے میں مرحوم کی نیکیاں تلاش کر لیتا ہے۔

جلال آل احمد کا زمانہ ایران میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کا زمانہ تھا، حکومت بڑی فراخ دلی سے وظائف دے رہی تھی۔ خوشحال گھرانے کے لڑکے لڑکیوں کو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں داخل کرانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ دانش گاہوں کے اساتذہ کے لئے لازم تھا کہ اپنے مضامین میں ریسرچ کریں، پیشہ ورانہ رسائل میں مقالات شائع کرائیں اور پی. ایچ. ڈی کی سند حاصل کریں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا تھا کہ استاد میں تخلیقی صلاحیت کتنی ہے۔ کیسے پڑھاتا ہے۔ شاگردوں کی کردار سازی میں کتنی دلچسپی لیتا ہے۔ بس اتنا دیکھا جاتا تھا کہ ڈاکٹریٹ کی سند ہے کہ نہیں۔ لوگ دیوانہ وار پی. ایچ. ڈی کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ شاگردوں کا کام اپنے نام سے چھاپنا شروع کر دیا۔ تھیسس دوسروں سے اجرت پر لکھوانے لگے۔ بے حیثیت بیرونی یونیورسٹیوں، گمنام تربیتی اداروں اور غیر معروف رسائل کی تلاش میں لگے رہتے تاکہ ان سے اپنے مستند ہونے کی سند حاصل کریں۔ جلال آل احمد نے جب اس روش کو عام ہوتے ہوئے دیکھا تو پروردگار کا شکر یوں ادا کیا۔ خدا وسوسہ پی. ایچ. ڈی را در دل من کشت تابرای ادبیات زندہ مانم۔ جب میرے دل میں پی. ایچ. ڈی حاصل کرنے کا وسوسہ پیدا ہوا تو خدا نے اس کو غارت کر دیا تاکہ میں اپنی زندگی ادب کے لئے وقف کر سکوں۔

اے پاکستان کے ادیبو، شاعرو صورت گرو افسانہ نویس — "کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ...... (اس سے) جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے"۔ وسوسہ وسوسہ ہوتا ہے خواہ وہ باضابطہ اور باقاعدہ پی. ایچ. ڈی کا ہو یا اعزازی اور افتخاری ڈاکٹریٹ کا۔

جلال کے ایک استاد کا نام عباس اقبال تھا جو دانش کدۂ ادبیات میں تاریخ تمدن پڑھاتے اور انشاء سکھاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کسی واقعہ، شخصیت، تحریر، اور حدیث و خبر پر ایک سو سال نہ بیت جائیں اس پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں دینا چاہیئے۔ استاد چونکہ تاریخ کے حوالے سے بات کرتے ہیں اس لئے ایک صدی تک غور کرنے اور خاموش رہنے کا حکم لگاتے ہیں۔ شاگرد چونکہ اپنے گرد و پیش کے جیتے جاگتے انسان کی بات کرتا ہے اس لئے وہ آج کے حاضر کو کل کے غائب اور پرسوں کے مستقبل سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ شاگرد کہتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو تاریخ سے امید لگائے بیٹھے ہیں یا آرزو کو مشک میں بھر کر کاندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ میں نے اس مشک کو پھاڑ کر چمڑے کے ان ٹکڑوں سے اپنی کتابوں کی جلد سازی کی ہے۔ کل جس کی مرضی جو چاہے کہے اور لکھے۔ آج جو ہماری مرضی ہو گی وہ ہم سوچیں گے اور لکھیں گے۔ ہمارے اب وجد نے اپنے طور پر زندگی بسر کی اور فنا ہو گئے۔ گزشتہ کل ان کی ملکیت تھا۔ آج وہ خود قبروں کی ملکیت ہیں۔ مستقبل بھی اسی طرح ہمارے لئے غیر متعلق ہے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ کوئی حاملہ عورت ایسی نہیں جس کے بندِ ناف سے کسی شخص کو آج کے لئے خوراک حاصل ہو سکے۔ وہ آنے والی کل کو جنم دینے کے کام پر مامور ہے۔ امروز صرف اس شخص کی دسترس میں ہے جو آج سوچتا ہے اور آج کے لئے لکھتا ہے۔

میں اس بے وسواس ادیب امروز کی دو تین کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ دو چار افسانے پڑھتا ہوں اور ایک آدھ مقالہ۔ پوری کتاب میں نے ایک پڑھی ہے اور وہ اس ادیب کا سفرنامہ حج ہے۔ خسی در میقات۔ حج کے سفرنامے پڑھنے کا شوق مجھے لڑکپن میں اس وقت ہوا جب عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر الیاس برنی نے اپنے سفرنامہ کا ایک نسخہ والد محترم کو تحفہ میں دیا۔ الیاس برنی کے سفرنامہ صراطِ حمید سے زبیدہ حیٔ کے زہے نصیب اور خواجہ غفور احمد کے سفرِ فوز و فلاح تک بہت سے سفرنامے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ حج کا سفرنامہ شروع کرتے ہی میں مصنف کی انگلی پکڑ لیتا ہوں اور پھر سایہ بہ سایہ اس کا ساتھ دیتا ہوں۔ وہ جو مناسک ادا کرتا ہے میں انہیں دہراتا ہوں۔ وہ جن مقامات کی زیارت کے لئے جاتا ہے میں وہاں اس کے ہمراہ ہوتا ہوں لیکن جب وہ دکانوں، مکانوں اور کھانوں کا

ذکر کرتا ہے تو میں اتنی دیر کے لئے حرم کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہوں۔ انتظار کرتا ہوں۔
جب مصنف مشاہدات اور واردات کا ذکر کرتا ہے تو میں آنکھیں بند کر کے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ اس بیان کا مجھ پر کتنا اثر ہوا ہے۔ بالآخر کتاب ختم ہوتی ہے۔ مصنف کا حج مکمل ہوتا ہے اور میرا حج بدل۔ میں نے اس طرح بے شمار عوضی حج کئے ہیں۔

جس سفرنامہ حج کا مصنف کتاب کا انتساب قاری کے نام نہیں کرتا اور نہ اس سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر دل لگا کر پڑھو گے تو حج کا ثواب تمہاری نذر کروں گا میں اس کو ایک داستان یا ناول سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ جب میں نے اردو کے ممتاز ادیب اور دیرینہ کرم فرما ممتاز مفتی کا سفرنامہ حج پڑھنا شروع کیا تو اپنا داہنا ہاتھ ان کی طرف اس طرح بڑھایا کہ وہ اپنی اصل لمبائی سے کہیں زیادہ لمبا ہو کر دور تک مصنف کے پیچھے چلا گیا۔ یہ اضافی اور عارضی لمبائی اسے شدت شوق نے عطا کی تھی۔ خیال تھا کہ مصنف ایک انگلی میری طرف بڑھائیں گے۔ کہیں گے لو اسے پکڑ لو۔ اور پھر سفر میں مجھے ساتھ ساتھ رکھیں گے۔ لیکن مصنف نے میری طرف قطعاً کوئی توجہ نہ کی۔ ایک بار اچٹتی نظر بھی نہ ڈالی۔ اتنا کہنہ مشق ادیب اور میرے جیسے دوست اور قاری سے یہ بے اعتنائی۔ لبیک ختم ہوئی۔ بات میری سمجھ میں آگئی۔ مصنف کے ہاتھ خالی نہ تھے۔ وہ مجھے کیا دیتے۔ انہوں نے خود دونوں ہاتھوں سے قدرت اللہ شہاب کا احرام تھاما ہوا تھا۔ اور وہ بھی اتنی مضبوطی سے کہ شہاب صاحب کا احرام کھل کھل جاتا تھا۔

جلال آل احمد نے سفرنامہ بے اختیار اور بے محابا لکھا ہے۔ اور کیا خوب لکھا ہے۔ نہ لکھتے تو زیادتی ہوتی۔ میں اسے واردات اور ادبیات کے حوالہ سے دیکھتا ہوں۔ ایک لطیف اور حساس ذہن اس دینی فریضہ کی ادائیگی میں کون کون سے مقام سے گزرا۔ یقین کی منزل پر پہنچنے سے پہلے اس نے شک کے کون کون سے خار زار طے کئے۔ اپنے آپ کو دریافت کرنے سے پہلے اس نے کہاں کہاں اپنے آپ کو گم کیا۔ لاحاصل سے حاصل تک پہنچ کر اس نے کیا محسوس کیا۔ اس سفرنامہ میں موسم کی درشتی، پانی کی کمی، ہوا کا بگاڑ اور بدبو، رہائشی عمارتوں کی ناقابل رہائش حالت، قربانی کا زیاں، جمرات کا تماشا، معلّموں کی بے رخی، انتظامیہ

کی کوتاہیوں اور انسانوں کی کمزوریوں کا حال اسی طرح ملتا ہے جیسا کسی اور سفرنامہ میں، البتہ اظہار کا ڈھنگ نرالا ہے۔ اس سفرنامہ میں میزبان اور مہمان میں فقہ کے فرق سے پیدا ہونے والی بے کلی اور بے مزگی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مصنف نے دو چار جگہ خواتین کا ذکر کرتے ہوئے احتیاط سے کام بھی نہیں لیا۔ جہاں آنکھوں کو جھک جانا چاہئے تھا وہاں اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ لیکن یہ آدمی اتنا کھرا ہے کہ اس نے جو دیکھا وہ بےلاگ لکھ دیا۔ الزام آتا ہے تو آئے۔ وہ الزام سہنے کے لئے تیار ہے مگر خاموش رہنے کے لئے تیار نہیں۔ ادیب فطرت ہے۔ اظہار کے بغیر دم گھٹتا ہے۔

جلال آل احمد تہران ایئرپورٹ پر آشیانہ حجاج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ آج اس نے سالہا سال کے بعد پہلی بار نماز پڑھی ہے۔ لڑکپن میں نماز پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی کے سال اول میں ترک کر دی۔ بے نمازی ایک پختہ عادت بن گئی۔ اب جو طویل عرصہ کے بعد نماز ادا کی تو قصور واری کا احساس ہوا۔ شاید یہ ریاکاری ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اس کی ڈھارس بندھی کہ جہاں سرے سے ایمان ہی نہ ہو وہاں اس سلسلہ میں ریا اور دکھاوے کا سوال نہیں اٹھتا۔ نماز اس نے یک جہتی کے جذبہ کے تحت پڑھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس گروہ کا ہم رنگ اور ہم مشرب نظر آئے جس کے ساتھ وہ سفر پر نکلا ہے۔ ہر سفر کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی حج کے سفر پر نکلے اور نماز ادا نہ کرے۔

ہنگام رخصت مبارکبادی، بغل گیری، دست بوسی اور خدا حافظی کے لئے دوست اور رشتہ دار جمع ہوئے۔ لوگ اس بات پر خوش نظر آتے تھے کہ گمشدہ میمنا دوبارہ گلہ میں شامل ہو گیا ہے۔ ایک آدھ بے تکلف دوست ایسا بھی ہے جو زیر لب مسکرا رہا ہے۔ گویا وہ کہہ رہا ہے، یہ کون سا ڈھونگ ہے جو تم نے رچایا ہے۔ انہیں کیا خبر کہ یہ کوئی مکاری ہے نہ کوئی گلہ داری۔ بس وہ بھیڑ کا بچہ جوان ہو گیا ہے۔ اور بھیڑ کی خواہش ہے کہ وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو گم کر دے اور یہ گمشدگی پہلی بار کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور کامل ہونی چاہئے۔

مکہ کی جانب سفر کرتے ہوئے جلال جس کیفیت سے دوچار ہوا اس کا ذکر کچھ اس طرح کرتا ہے۔ ستارے نیچے اتر آئے ہیں۔ آسمان بہت قریب آگیا ہے۔ میں نے

زندگی کی کوئی رات ایسی بیداری اور ہشیاری کے ساتھ نہیں گزاری۔ آسمان کی چھت اور دائمی وقت کے سائبان کے نیچے۔ میں نے ہر وہ شعر گنگنایا جو مجھے یاد تھا۔ اور میں جتنی باریکی کے ساتھ اپنی ذات کو دیکھ سکتا تھا اس کے ساتھ دیکھا۔ یہاں تک کہ صبح کا اجالا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ تنہا ایک ناکس و بے کس میقات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وعدہ گاہ تک پہنچنے والا کسی طور بھی خاص آدمی نہیں ہے۔ عوام میں شامل ایک فرد ہے۔ وقت دائمی ہے۔ زمانہ بے کنار سمندر ہے۔ میقات ہر لمحہ اور ہر جگہ موجود ہے۔ وعدہ گاہ اس کے دیدار کی وہ جگہ ہے جہاں سب جمع ہیں۔ لیکن ذات کی خلوت میں وقت کی میقات ہوتی ہے۔ وہاں ایک وقت میں صرف ایک آدمی ہوتا ہے اور باقی دیدار ہی دیدار۔ حج کا سفر شناخت کا ایک وسیلہ ہے۔ آدمی کی اوقات کو پہچاننے اور اس کی حدود کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ حد کتنی مختصر اور حقیر ہے۔ آدمی کتنا پوچ اور ہیچ ہے۔ نہ جانے وہ اپنے آپ کو کیوں اتنا بڑا اور عظیم سمجھتا ہے۔

مدینہ میں ایک راہ گیر نے باتوں باتوں میں پوچھا، آپ کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ سوال پوچھنے والا مالکی تھا۔ جلال نے اس سے پوچھا کہ تمہارے حساب سے اسلام میں کل کتنے مذاہب ہیں۔ جواب ملا۔ چار۔ جلال نے کہا، ہمارے ملک میں اسلام کو چار کے بجائے بہتر فرقوں کا مذہب سمجھا جاتا ہے میں ان میں سے ایک فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ جواب سن کر سوال پوچھنے والا غائب ہو گیا۔ مکہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ سوال ہوا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ جلال نے کہا، جی چاہتا ہے کہ میرا مذہب وہی ہو جو اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کا ہوا کرتا تھا۔ سوال پوچھنے والے کو تعجب ہوا۔ کہنے لگا پھر مکہ میں کیا لینے آئے ہو۔ سچ کہتے ہیں کہ یہ جو ایرانی ہوتے ہیں ...... اور اس نے جملہ نامکمل رکھا اور لمحہ بھر کے بعد بولا۔ ان بہتر فرقوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو وگرنہ یونہی درمیان میں لٹکے رہو گے۔ جلال نے کہا۔ میری بھی یہی کوشش ہے مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بس ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں جس نے مجھے عاجز و بے چارہ کر دیا ہے۔ حج کے موقع پر حاجی کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ اسے قدم قدم پر دوسرے حاجیوں کے عقیدہ و عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے سوالات کے جواب دینے ہوتے ہیں۔

کیا بیگانے اور کیا اپنے۔ ہر وہ عمل جلال کی بے کلی میں اضافہ کرتا ہے جو اس ذہین اور حساس شخص کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ حاجیوں کے عجیب و غریب عمل اور عقیدہ کے سلسلہ میں جلال آل احمد نے مازندران سے آئے ہوئے ایک حاجی کا قصہ بیان کیا ہے۔ وہ حج کی سختی سے اتنا مغلوب ہو گیا کہ ایک روز اس نے نالہ بلند کیا۔ ای امام حسینؓ قربانت، بیامرا از شرِّ خدا نجات بدہ۔ میں آپ کے قربان، اے امام حسینؓ، آیئے اور مجھے اس تکلیف سے نجات دلایئے۔ جس میں خدا نے مجھے مبتلا کر رکھا ہے۔

میدان عرفات میں وقوف حج کا سب سے اہم رکن ہے۔ جلال اس وقت کو بیداری اور شعور کے ساتھ صرف کرنا چاہتا ہے۔ ہمراہیوں کی مصروفیت روضہ خوانی ہے۔ وہ ڈائری میں اپنے تاثرات درج کرتا ہے۔ "اور ابھی مجلس روضہ منعقد ہو گی۔ روضہ۔ روضہ۔ روضہ۔ تھکا دیا ہے۔ یارو تم حج کے لئے آئے ہو اور خانہ خدا کی زیارت سے مشرّف ہوئے ہو۔ لیکن...... ہمارے ساتھ آئے ہوئے آخوند اور نوحہ خواں کیا کم تھے کہ آج دو آخوند کربلائی اور پیدا ہو گئے ہیں...... انہوں نے پڑھا، رقم وصول کی اور چل دیئے۔ ایک عورت آگئی...... صورتش از صوتش بہتر بود (شکل آواز سے بہتر تھی)...... مجلس میں ہجوم ہے۔ میرے لئے اب یہاں جگہ نہیں رہی۔ لازم ہے کہ میں اپنی راہ لوں۔ چلوں چل کر میدان عرفات کا چکر لگاؤں۔"

جلال لکھتا ہے کہ حج کے سفر کا آخری ہدف فرد کی عظیم گمشدگی ہے۔ ایک ایسا اجتماع جس پر مجذوبی کی کیفیت طاری ہو، اس میں گم ہو کر فرداً فرداً مگر بے اختیار ہو کر اپنے فرائض کو ادا کرنا ایک عظیم گمشدگی ہے۔ بے خودی کی یہ کیفیت دو مقامات پر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ طواف اور سعی۔ سعی میں یہ بے خودی اور گمشدگی کی کیفیت طواف کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ طواف میں سب دوش بدوش ایک ہی مرکز کے گرد ایک ہی دائرہ میں گردش کرتے ہیں۔ جیسے انسان شعاع ہستی کا کوئی ذرہ ہو جو نور کے مرکز سے متصل ہو اور اسے مدار سے رہائی نہ ملے۔ اس کے برخلاف سعی میں کوئی مرکز نہیں۔ اس کی کوئی منزل نہیں۔ بی بی ہاجرہ کی طرح حیران و پریشان چلتے رہو۔ پھر الٹے قدم واپس آجاؤ۔ دوبارہ پہلی سمت میں چلنا شروع کر دو اور ایک بار پھر لوٹ آؤ۔ لوگ ایک دوسرے

کی مخالف سمت میں آتے جاتے ہیں۔ جتنے ایک طرف جا رہے ہیں، اتنے ہی واپس آ رہے ہیں۔ ایک سفر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ ان مسافروں کی آنکھوں میں وجدان ہی وجدان ہوتا ہے۔ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سورج سے آنکھیں ملانا۔ سعی کرنے والوں کا دریا دو سمتوں میں موجزن رہتا ہے۔ فرد اس دریا میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔

حج تمام ہوا۔ وہ شخص جس نے حج پر روانہ ہوتے وقت کئی سال کے بعد پہلی بار نماز فجر ادا کی تھی اب اس بات کا افسوس کرتا ہے کہ "بزرگ ترین غبن ایں سالہای بے نمازی از دست داون صبح ہا بودہ"۔ نماز فجر سے محرومی اور دولت سحر گاہی کا غبن اس طویل مدت عمر کا سب سے بڑا خسارہ ہے جو میں نے ایک بے نمازی کی حیثیت سے گزاری ہے۔ حج کے دوران اپنے آپ کو دریافت کرنے والا شخص طوافِ وداع کے لئے جاتا ہے اور سوچتا ہے۔ میں کس کو خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ خدا کو یا خانۂ خدا کو۔ اور وہ شخص جو ادیب اور انشاء پرداز ہے لفظ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

باب شش دہم

اشعار

فارسی شعر کی بات اور ہے۔ نثر کے مقابلے میں وہ زیادہ آسان اور کہیں زیادہ پر اثر ہے۔ نثر کی طرح کوئی ناز نخرہ نہیں کہ جب پڑھو تو باقی ہر چیز چھوڑ کر صرف میرے ہو جاؤ۔ لفظ بہ لفظ، سطر بہ سطر، صفحہ بہ صفحہ جم کر پڑھو۔ ایک نشست میں پچیس تیس صفحہ سے کم پڑھا تو مطلب ہاتھ نہیں آئے گا۔ شعر ایسے کسی اہتمام کا مطالبہ نہیں کرتا۔ غریب مزاج ہے۔ وقت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ جتنا کوئی دے سکے وہ اسی میں خوش رہتا ہے۔ ایک وقت میں بس ایک غزل یا نظم کافی ہے۔ وقت اس سے بھی کم ہو تو محض ایک شعر دل آویز بہت ہے۔ دل اداس ہو تو نثر پڑھنے کی مشقت اسے اور اداس کر دے گی بالخصوص جب ہر دو ایک سطر کے بعد فارسی لغت دیکھنے کی ضرورت پڑ جائے۔ شعر کہتا ہے، مفہوم سمجھ میں آگیا ہے اس کا لطف اٹھاؤ۔ بحر، وزن، قافیہ، آہنگ کہتے ہیں ہمارے ساتھ لہرا لہرا اور جھوم جھوم کر شعر کو بار بار پڑھو۔ اگر کسی ایک لفظ یا ترکیب کا مطلب نہیں آتا تو نہ سہی۔ فوراً لغت اور گرامر کی کتاب کھول کر بدمذاقی کا ثبوت نہ دو۔ لمحہ کی فطری لذت کو کم مت کرو۔ یہ سر دھننے کا وقت ہے۔ سر کھپانے کے لئے ایک عمر پڑی ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی، استاد مرتضٰی مطہری، صادق ہدایت اور جلال احمد کو میں نے پروگرام بنا کر اور وقت نکال کر پڑھا مگر فارسی شاعری کے لئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں نے کسی سے مشورہ بھی نہیں کیا۔ شعرا کی کوئی طویل فہرست

نہیں بنی۔ فہرست کو مختصر کرنے کی مہم جو نثر کے لئے سر کرنی پڑی تھی اس کا موقع ہی پیدا نہیں ہوا۔ کسی شاعر کو پڑھنے کے لئے دن، ہفتہ یا مہینہ مقرر نہیں کیا۔ شہنشاہ کے عہد میں کلاسیکی شعرا کی کلیات کے ضخیم، نئے اور خوبصورت ایڈیشن خریدنے کے ساتھ گاہے ادبی اور نیم ادبی رسالے خریدتا رہتا تھا تاکہ شعر نو کا کچھ اتا پتا ملے۔ انقلاب کے بعد نئے شعرا کے چھوٹے چھوٹے مجموعے اور کچھ انتخاب حاصل کئے۔ جب جی چاہا چند اشعار پڑھے اور مجموعہ رکھ دیا۔ پھر کسی اور شاعر کو پڑھنا شروع کر دیا۔ چند دن بعد اسے بھی بیچ میں چھوڑ کر شعر کی دنیا میں جدھر منہ اٹھا ادھر نکل گئے۔ شعر نو کے ساتھ یہ آنکھ مچولی تین سال کھیلی تب جا کر اس کی خوبی عیاں ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو شعرا کی ایک فہرست خود بخود بن گئی تھی۔ ملک الشعراء بہار، نیما یوشیج، فریدوں توللّی، کسرائی، احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث (م۔ امید)، نادر نادر پور، منوچہر آتشی، فرخ فروغ زاد، فریدوں مشیری، اسماعیل خوئی، خسرو گلسرخی۔

ملک الشعراء بہار سے میری دلچسپی کی وجہ اقبال، پاکستان اور روایتی فارسی شاعری ہے۔ کلاسیکی فارسی شاعری کے عظیم الشان قلعہ کے آخری برج پر ملک الشعراء بہار پہرہ دے رہے ہیں۔ قلعہ کے سامنے کھلا میدان ہے۔ شعر نو نے اس میدان میں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ پرانا شعر روایت کے قلعہ میں بند ہے۔ نیا شعر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ وہاں عشق کا روگ، چشمِ بیمار اور گاہے بیمار ذہنیت۔ یہاں خیالِ تازہ، مضامینِ نو اور جہانِ دیگر۔ کھلے میدان میں پنڈال بنا ہوا ہے۔ مشاعرہ ہو رہا ہے۔ جو شاعر کلام سنا رہا ہے اس کا نام نیما یوشیج ہے۔ یہ ایک بالکل نئی آواز ہے۔ لوگ اسے بڑی حیرت سے سن رہے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے، افسانہ۔ شاعر اور کہانی کا مکالمہ ہے۔ طویل اور سنجیدہ بحث۔ افسانہ کھری کھری سناتا ہے بلکہ بعض اوقات بڑی سخت بات کہہ جاتا ہے۔ ایک بار حافظ شیرازی کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے۔ اے حافظ یہ کیا فریب اور دروغ ہے جو تم بزبان مے و جام و ساقی بیان کر رہے ہو۔ نیما کی نظم ختم ہوئی تو فارسی ادب کے مورخ نے کہا یہ شعر نو کا جنم دن ہے۔

میں نے چونکہ فارسی شاعری کو جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اس لئے یہ راز مجھ پر آہستہ آہستہ اور ایک مدت کے بعد کھلا کہ نئی فارسی شاعری میں بڑا نیا پن ہے۔ غزل کی جگہ نظم

نے لے لی ہے۔ رخصت ہوتے وقت غزل ردیف اور قافیہ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی ہے۔ قافیہ ردیف سے پرانی شکایت تھی کہ ان کی جکڑ بندی نئے موضوعات کو سرزمین شعر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ مشکل اب رفع ہو گئی ہے۔ نظم ہر طرح سے آزاد ہے۔ اس آزادی کا ذکر کرتے ہوئے اسماعیل شاہرودی کہتا ہے کہ شعر کا قالب ایک تابوت تھا۔ اسے توڑ ڈالا ہے۔ اس طرح شعر کو نئی زندگی ملی ہے۔ قافیہ نے ایک اونچی فصیل کی طرح راستہ روکا ہوا تھا۔ اسے ڈھا دیا گیا ہے۔ اب ردیف کا کام شاہ و گدا سے لیتے ہیں۔ اب شاعر اپنی عمر اور صلاحیت اس چھوٹے سے حوض میں جسے بحر کہتے ہیں، بوڑھے مینڈک کی طرح غوطے لگا کر ضائع نہیں کرتا۔

پرانی شاعری دربار کے آس پاس رہتی تھی۔ نئی شاعری کا ٹھکانہ اندرون شہر کے ایک گنجان محلّہ میں واقع ہے۔ جس کے کچھ حصے کچی آبادی پر مشتمل ہیں۔ وہ شاعری خیال کی دنیا میں رہتی تھی۔ یہ حقیقت سے بہت قریب ہے۔ خیالی محبوب کی جگہ عوام، کوچہ محبوب کی جگہ وطن، قطرۂ اشک کی جگہ لہو کی بوند، نالۂ فراق کی جگہ اعلان جنگ، وصال کی جگہ آزادی۔ شعر اس کے لئے عورتوں سے باتیں کرنے کا نام نہیں بلکہ مفاد پرستوں سے اپنے حق کے لئے لڑنے والے دلیر اور دلاور عوام کا قصیدہ ہے۔ شعر نو محفل مشاعرہ کو لوٹ لینے والا شعر نہیں بلکہ رزم گاہ حیات کا رجز، رزمیہ اور حماسہ ہے۔ شاعر کا تیور اور لہجہ دونوں بدل گئے ہیں۔ وہ گھن گرج کے ساتھ سوال پوچھتا ہے اور طمطراق کے ساتھ خبردار کرتا ہے۔

ہاں کجا است؟
پایتخت قرن؟
ما برای فتح می آییم
تا کہ ہیچستانش بکشاییم!

کہاں ہے اس صدی کا دارالسلطنت۔ خبردار ہو جاؤ۔ ہم اسے فتح کرنے آرہے ہیں۔ تاکہ تمہاری بے وقار سرزمین کو فراخی اور کشادگی عطا کریں۔

وہ عہد بڑا وحشت ناک ہو گا۔ شاعر جو ایک عمر سے شادی اور شیرینی کا راوی تھا۔

وہ فصلِ مرگ، سالہای مرگ، درۂ مرگ اور مرگِ ناصری کے عنوان سے نظمیں لکھنے لگا۔
وہ کیسا موسم تھا۔ زندگی کو راس ہی نہیں آیا۔ کمال رجاء کہتا ہے۔ یہ موسم مردان شجاع
اور دلیر کی موت کا موسم ہے۔ وہ برف باری بڑی شدید ہوگی جس نے وہ راستہ ہی بند کر
دیا جس پر فارسی شاعری صدیوں سے چل رہی تھی۔ قصہ خواں جو شہر کی سرد راتوں میں
دستِ گرمِ دوست کی داستان سناتے تھے وہ خیابانِ سردِ شب، اجاقِ سرد (ٹھنڈا چولھا) اور
قلب ہای سرد کا قصہ لے بیٹھے۔ فروغ فرخ زاد کہتی ہے۔ میں ایمان لے آتی ہوں۔ میں
موسم سرما کے آغاز میں ایمان لے آتی ہوں۔ تخیل کے ویران باغ پر ایمان، سر جھکا رکھنے
والی بیکار درانتی پر ایمان۔ اور حد تو یہ ہے کہ میں جیل کے آب و دانہ پر بھی ایمان لے آتی
ہوں۔ غور تو کرو کہ برف کتنی پڑی ہے۔

فریدوں مشیری کہتا ہے کہ دور ایک وسیع و عریض صحرا ہے جس میں کچھ بھی نہیں
اگتا۔ بس اشارہ کافی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ صحرا کہاں واقع ہے۔

در بیابانی دور
کہ نروید جز خار
کہ نتوفد جز باد
کہ نخیزد جز مرگ
کہ نجنبد نفسی از نفسی
خفتہ در خاک کسی

اس میں کچھ نہیں اگتا سوائے کانٹوں کے۔ کوئی شور و غوغا نہیں کرتا سوائے ہوا
کے۔ کوئی چیز کھڑی نہیں ہوتی سوائے موت کے۔ کوئی نفس بھی حرکت نہیں کرتا۔ سب
خاک میں سوئے پڑے ہیں۔

شعر نو ناراحتی کے اظہار اور اس سے چھٹکارا پانے کی آرزو کا نام ہے۔ شاعر کہتا
ہے۔

گر بدینساں زیست باید پس
من چہ بیشرمم اگر فانوس عمر را بہ رسوائی نیاویزم

بر بلند کاج خشک کوچہ بن بست
گر بدینسان مرد باید پاک
من چہ ناپاکم اگر ننشانم از ایمان خود چوں کوہ
یادگار جاودانی بر ترازیں بے بقای خاک

اگر اسی طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ تو پھر میں کس قدر بے شرم ہوں اگر اپنی عمر کے فانوس کو، بصد سامان رسوائی، کاج کے اس خشک درخت کی بلندی پر آویزاں نہ کروں، جو بند کوچہ میں واقع ہے۔ اگر آدمی اسی طور پاک ہو سکتا ہے۔ تو میں کتنا ناپاک ہوں اگر اپنے ایمان کی بدولت، پہاڑوں جیسی پائدار ایک ایسی یادگار قائم نہ کروں جو اس فانی خاک زاد سے برتر اور افضل ہو۔

فرخی یزدی کہتا ہے کہ شاہ اور شیخ (ملا) اور شحنہ (نگہبان شہر) تینوں نے ایک ہی استاد سے سبق پڑھا ہے۔ وہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کی باتیں اور ان کی جنگ مکر و فریب سے عبارت ہے۔ احمد شاملو دخترانِ دشت سے پوچھتا ہے۔ بتاؤ تو سہی۔ تم میں سے کون ہے جو آمان جان ترکمان شہید کے ہتھیاروں کو روز انتقام کے لئے صاف کر رہا ہے۔

ادھر فصلِ مرگ ہے۔ برف باری ہو رہی ہے۔ صحرا میں ویرانی کے سوا کچھ بھی نہیں اگتا۔ گلستان فکر خراب ہو گیا ہے۔ شاعر کا فانوس عمر کوچۂ ملامت میں آویزاں ہے۔ شاہ و شیخ و شحنہ عوام کو دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔ ادھر کلاسیکی شاعری کا نشہ ایسا ہے کہ اترنے کے بعد بھی پوری طرح نہیں اترتا اور گاہے کوئی روایت پسند شاعر اتنا خوبصورت شعر کہہ دیتا ہے۔

پیکر تراشِ پیرم و با تیشۂ خیال۔ یک شب ترا ز مرمرِ شعر آفریدہ ام۔

اے میرے محبوب۔ میں وہ بوڑھا بت تراش ہوں جس نے ایک رات خیال کا تیشہ لے کر تجھے شعر کے سنگ مرمر سے تراشا اور تخلیق کیا ہے۔

شعر کے سنگ مرمر میں بڑی صلاحیت ہے۔ اچھا بت تراش ہو تو جو شکل چاہے بنا لے۔ محبوب کا بت ہو کہ بہار کی رت۔ فصل مرگ ہو کہ موسم سرد۔ صحرائے خشک ہو

کہ فانوسِ خاموش۔ ظلم کا چہرہ ہو کہ زنداں کی تصویر۔ میں اس شاعر کی تلاش میں ہوں جس نے پہلوی دور کے جور و جفا اور ساواک کے ظلم و ستم کی بہترین نقش گری کی ہو۔ سہراب سپہری۔ نہیں۔ وہ صوفیانہ شاعری کا نمائندہ ہے۔ صوفیا ملامت اور مشقت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ فروغ فرخ زاد۔ نہیں وہ بھی نہیں۔ وہ شبستان میں صرف کئے ہوئے لمحات کا راز فاش کرنے میں منہمک ہے۔ یہ خاتون شاعرہ پہلے کپڑے تو پہن لے پھر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں گے۔ احمد شاملو۔ بے شک یہ مزاحمتی ادب کی بڑی توانا آواز ہے۔ محروم لوگوں کا ذکر کرتا ہے۔ انسان دوست ہے۔ امید صبح کا شاعر ہے۔ غم، درد، اذیت اور فرد کا شاعر نہیں۔ خسرو گل سرخی۔ شاید یہی وہ شاعر ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ شعر لکھنے کی پاداش میں گرفتار ہوا۔ جیل کاٹی۔ پھانسی چڑھا۔ لیکن وہ اپنی پھانسی کے تجربہ کے بارے میں لکھنے کے لئے زندہ نہ رہا۔ دوسروں نے اس پر بہت لکھا اور خوب لکھا۔ گلسرخی کے مرثیہ کے حوالہ سے میں بالآخر اپنی تلاش میں کامیاب ہوا۔ زنداں میں بسر کی ہوئی زندگی کی تلخی اور شکنجہ گری کی اذیت کی جو شدت میں نے ایک غیر معروف شاعر کے کلام میں پائی وہ اور کہیں نظر نہ آئی۔ رضا براہنی کا نام اور کلام مجھے کسی انتخاب میں نظر نہیں آیا۔ شعر نو کے کسی تذکرہ میں بھی نہیں ملا۔ اس کے باوجود میں رضا کو پہلوی دور کے شعرہای زنداں کا نمائندہ شاعر سمجھتا ہوں۔ اسے، پڑھتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ عہد کتنا وحشت ناک تھا۔ وہ دور کتنا بے امان تھا۔ وہ برف باری کتنی شدید تھی۔

شعر سنسر ہوا۔ مسودہ ناقابل اشاعت ٹھہرا۔ کتاب جلائی گئی۔ شاعر کی زبان بندی ہوئی۔ قابل اعتراض تحریر جس کے گھر سے نکلی اسے جیل ہو گئی۔ مشاعرہ میں شریک ہونے والے شاعر ہی نہیں بلکہ سامعین بھی دھرے گئے۔ ساواک کے عملہ نے ناخن کھینچے، دانت نکالے، ہڈی توڑی، جسم داغا، کھال جلائی، بجلی کے جھٹکے لگائے، پانی میں غوطے دیئے، سر میں سوراخ کئے، تیز دھار تلوار پر بٹھا کر چیرا اور انگیٹھی پلنگ پر لٹا کر کباب کر دیا۔ یہ تمام کام بڑی مہارت سے کیا گیا۔ عملہ نے اذیت دہی کی تربیت بین الاقوامی سطح پر حاصل کی تھی۔ کون سا ظلم تھا جو سوچنے والوں اور لکھنے والوں پر نہیں ڈھایا گیا۔

رضا براہنی کو جیل اور ساواک دونوں سے واسطہ پڑا۔ وہ لکھتا ہے کہ ساواک کے

میرِ غضب جو قیدیوں پر ظلم ڈھانے والے پیشہ ور کارندے تھے، جیل میں فرضی ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے پیشہ کا تقاضا تھا کہ کسی قیدی کو ان کا اتا پتا نہ ملے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ستم پیشہ اجڈ، ان پڑھ، بے مغز پہلوانوں کو جیل میں سب ڈاکٹر کہہ کر بلاتے تھے۔ دوا دارو والی ڈاکٹری نہیں بلکہ پی. ایچ. ڈی والی ڈاکٹریٹ۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا واسطہ اکثر طالب علم، استاد، ادیب، شاعر اور دانشور سے پڑتا تھا۔ ساواک کا خیال تھا کہ اس اعزاز کے ساتھ عملہ کو احساس کمتری سے بچایا اور قیدی کو اس میں مبتلا کیا جا سکے گا۔

رضا براہنی کی ایک سادہ سی نظم ہے۔ حسین زادہ کہتا ہے میں ساواک کا جلاد ہوں۔ پھر نام بدلتا جاتا ہے مگر خبر کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔ منوچہری کہتا ہے، رسولی کہتا ہے، شادی کہتا ہے، رضوان کہتا ہے، پرویز خاں کہتا ہے، حسینی کہتا ہے کہ میں بھی ساواک کا جلاد ہوں۔ اس کے بعد ہر ایک کہتا ہے، میں شہنشاہ آریا مہر کا جلاد ہوں۔ ساتوں جلاد اس خبر کی تکرار کرتے ہیں۔ پھر ایک مصرع پر نظم ختم ہو جاتی ہے۔ جلاد ان دیگر نمی گویند، اما ہستند۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ نہیں کرتے مگر وہ بھی جلاد ہیں۔

جہاں اتنے سارے جلاد ہوں وہاں بہت سے لوگ زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک روپوش دانشور کہتا ہے۔

من برای کتابہای درسی مدارس و دانشگاہا
ساختہ نشدہ ایم
اگر آرزو دیدن مرا دارید
از بالای "اورست" در اعماق یک چاہ نفت نگاہ کنید۔
کبریت را پائیں بیندازید
تا دنیا را بہ آتش بکشم
من موجودی زیر زمیں ہستم
تنہا آتشم بر روی زمیں ظاہر خواہد شد

میں محض ان درسی کتابوں کے لئے پیدا نہیں ہوا جو اسکول اور کالج میں پڑھائی جاتی

ہیں۔ اگر تم مجھے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو تو کوہ ایورسٹ کی چوٹی سے تیل کے ایک کنوئیں میں جھانک کر دیکھو۔ دیا سلائی جلا کر نیچے پھینکو۔ تاکہ میں دنیا کو آگ لگا کر خاک کر دوں۔ میں اس وقت زیر زمیں ہوں۔ صرف میری آگ روئے زمین پر ظاہر ہوگی۔

رضا کے ان اشعار میں ہر روپوش انقلابی کی آرزو پوشیدہ ہے۔ وہ روئے زمیں پر ایسے انقلاب کا خواہشمند ہے جو مفاد پرستوں کی دنیا کو تہ و بالا کر دے۔ لیکن وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ انقلاب کے لئے بہت سا خون بہانا پڑتا ہے۔ بہت سی جانوں کا نذرانہ دینا پڑتا ہے۔ عام آدمی بھی قربانی دیتا ہے اور خواص بھی اس نیک کام میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

خسرو گلسرخی دانشور اور انقلابی شاعر تھا۔ اس کا یہ گناہ بہت کافی تھا۔ اسے موت کی سزا دی گئی۔ رضا نے ایک مختصر مرثیہ لکھا۔

جہان ما
بہ دو چیز زندہ است
اولی شاعر
ودومی شاعر
وشما
ہر دو را کشتہ اید
اول: خسرو گلسرخی را
دوم: خسرو گلسرخی را

ہمارا جہاں دو چیزوں سے عبارت ہے۔ پہلی چیز شاعر ہے اور دوسری چیز بھی شاعر کا وجود ہے۔ اور تم نے ان دونوں کو مار ڈالا ہے۔ تم نے پہلے خسرو گلسرخی کو مارا اور اس کے بعد خسرو گلسرخی کا خون کر دیا۔

رضا نے ایک اور مرثیہ کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔ تم نے خسرو گلسرخی کو مار ڈالا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے کہ تم اس کا خون کرتے تم اسے مار چکے تھے۔ دو ہزار پانچ سو سال پہلے (جب ایران میں بادشاہت کی بنیاد ڈالی گئی اس وقت) تم نے گلسرخی کو قتل کیا

تھا۔

رضا براہنی کی ایک نظم کا عنوان ہے "خطابہ"۔ پہلے دو بند میں وہ اپنے جلادوں سے یہ سوال کرتا ہے کہ جب تم مجھ کو مار کر فارغ ہو گئے، جس وقت میرے پاؤں چوب دار پر لٹکے ہوئے نہ ہوں گے۔ جب پھانسی پانے والے گروہ میں سے جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے کوئی باقی نہ بچا۔ جب تم نے ہم کو گروہ در گروہ خاک میں دفن کر دیا۔ جب ہم اس لائق بھی نہیں رہے کہ کوئی اور اعتراف کر سکیں۔ جب تمہیں مصروف رکھنے کے لئے ہمارے پاس نہ ناخن رہے، نہ دانت، نہ پاؤں، نہ ہاتھ۔ تو پھر اے میرے عالی مرتبہ جلّادو، تم کیا کرو گے۔

اس نظم کا آخری بند یہ ہے۔

تمام قدرت پیامبری و پیش بینی انسان، بہ شما کہ می اندیشید عقیم می شود
انسان در برابر شما پژمرد، مثل گلے کہ ناگہاں بپژمرد
بہ مابگوئید
وقتی کہ ما مردہ ایم و شما ہنوز زندہ اید
شما چہ خواہید کرد۔ ای جلّادان عالی مرتبہ من!
ای جلّادان عالی مرتبہ من!
ای جلّادان عالی مرتبہ من!

انسان کی پیامبری اور دور اندیشی کی ساری صلاحیت تمہاری سوچ کے آگے بانجھ ہو کر رہ جاتی ہے۔
انسان تمہارے روبرو مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ جیسے کوئی پھول اچانک کُملا جائے۔
ذرا مجھے یہ تو بتاؤ۔
جب (تمہاری مشق ستم سہنے کے لئے) ہم زندہ نہ رہے اور تم ابھی زندہ ہوئے۔
تو اس وقت تم کیا کرو گے۔ اے میرے عالی مرتبہ جلّادو!
اے میرے عالی مرتبہ جلّادو!
اے میرے عالی مرتبہ جلّادو!

شاعر نہایت ظلم کی بات کرتا ہے۔ شاعرہ نہایت ظلمت کی بات کرتی ہے۔ رضا براہنی اپنے جلادوں سے ایک چبھتا ہوا سوال کرتا ہے۔ فروغ فرخ زاد اپنے ملاقاتی سے ایک انوکھی فرمائش کرتی ہے۔

من از نہایتِ شب حرف می زنم
من از نہایتِ تاریکی
واز نہایتِ شب حرف می زنم
اگر بخانۂ من آمدی برای من ای مہربان چراغ بیار
ویک دریچہ کہ ازاں
بہ ازدحام کوچۂ خوش بخت بنگرم

میں اس شب کی بات کر رہی ہوں جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں بے پایاں اندھیرے اور بے کراں رات کی بات کر رہی ہوں۔ اگر میرے گھر آنا ہے تو اے مہربان چراغ لے کر آنا۔ اور ہاں ایک دریچہ بھی ہمراہ لانا تاکہ میں اس ہجوم کو دیکھ سکوں جو کوچہ خوش بخت میں جمع ہے۔

شاعرہ کی خواہش بالآخر پوری ہوئی۔ مگر اس کے مرنے کے بعد۔ ایک مہربان آیا۔ چراغ لایا۔ اور دریچہ بھی۔ میں ان دنوں وہاں موجود تھا۔ میں نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا۔ ہجوم ہی ہجوم۔ ازدحام ہی ازدحام۔ لوگ کہاں جمع ہوئے ہیں؟۔ دانش گاہ تہران کے صدر دروازہ کے سامنے، خیابان شاہ رضا پر۔ یہ خیابان اس وقت کوچۂ خوش بخت بنا ہوا ہے۔ کتنے لوگ ہوں گے؟۔ بس اتنے جتنی ایران کی آبادی ہے۔

باب ہفدہم

آخرِ کار

قیام کا وقت ختم ہوا۔ رخصت کا آن لگا۔ مڑ کر پیچھے دیکھنے کا لمحہ۔ پنجوں کے بل اٹھ کر آگے دیکھنے کا موقع۔ سوچ کے لئے موزوں وقفہ۔ چہار سالہ قیام کی مدت اگرچہ چار ہی سال میں پوری ہوئی ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے میں نے ایک عمر تہران میں بسر کی ہو۔ اس احساس کا تعلق شب و روز کے شمار سے نہیں بلکہ ان کی سنگینی سے ہے۔ یہ ماہ و سال بڑے بھاری، دشوار اور پُر شور تھے۔ واقعات، حادثات اور واردات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ مردم محروم و مجبور جو اپنی محرومی اور مجبوری کو تقدیر کا کھیل سمجھتے تھے اچانک اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم اپنی تقدیر خود بنائیں گے۔ ان کا اٹھنا سیلاب کی مانند تھا۔ میں نے یہ سیلاب دیکھا ہے۔ اس سیلاب میں تقدیر اور تاریخ کو بہتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

واپسی کی تیاری ہو رہی ہے۔ نہ کوئی مشکل، نہ کوئی مشقت۔ بس دو چار گھنٹے صرف ہوں گے اور تیاری مکمل۔ سامان ہوائی جہاز سے آیا تھا۔ ہوائی جہاز سے واپس جائے گا۔ تیس کیلوگرام وزن اتنا کہاں ہوتا ہے کہ سامان باندھنے سے پہلے منصوبہ باندھنے کی ضرورت پیش آئے۔ کتابیں میں پہلے ہی پاکستان بھیج چکا ہوں۔ خطاطی کے تینوں نمونے پیک ہو چکے ہیں۔ کپڑوں کو سوٹ کیس میں بند کرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ قالین میں نے خریدا ہی

نہیں۔ اس کی بر آمد کے ضابطہ کی درد سری میں نے مول ہی نہیں لی۔ ایرانی قالین مجھے بہت پسند ہے مگر اس کے لئے ایک غلط بیان پر دستخط کرنے سے میں نے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سامان باندھنے کا کام کہیں زیادہ آسان ہو گیا۔ میرے سامان میں سب سے قیمتی اور وزنی شے ایک احساس ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کا نچوڑ۔ انقلاب کا حاصل۔ پی. آئی. اے والے اس کا وزن نہیں کرتے۔ کرایہ بھی نہیں لیتے۔ ہوائی جہاز والوں پر ہی کیا موقوف ہے، احساس اور آگاہی کو کوئی بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ بے حسی کا دور دورہ ہو تو احساس ایک ناکارہ شے ہے۔ حکومت، سیاست اور تعلیم کے شعبہ میں احساس اور تصور کو جان لیوا اور چھوت کا مرض سمجھا جاتا ہے۔ زندگی اور معاشرہ کے ہر اہم شعبہ میں اسے غیر ضروری بلکہ مضر قرار دیا جاتا ہے۔ میں طے کرتا ہوں کہ ملازمت کے جو چند سال باقی ہیں ان میں کسی سے اس دولت احساس کا ذکر بھی نہیں کروں گا جس نے مجھے مالا مال مگر ساتھ ہی ساتھ نڈھال بھی کر رکھا ہے۔ میں ایران سے جو دولت ہمراہ لے کر جا رہا ہوں اس کے سامنے نائین کے ریشمی قالین اور مظفریان کے خوش رنگ فیروزے ہیچ ہیں۔

(2)

چار سال پہلے جب میں پاکستان سے چلا تھا تو ایک کرم فرمانے کہا۔ آپ ایران کے قیام کے دوران جو کوئی خط بھی لکھیں اس کی نقل ضرور رکھ لیں۔ اور دوسروں کے جو نامے آپ کے نام آئیں انہیں بھی سنبھال کر رکھ لیں۔ اس طرح واپس آنے کے بعد آپ کی دو کتابیں مفت میں چھپ جائیں گی۔ میں نے مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ آپ کی سوچ مدیرانہ ہے۔ اور یہ وہ مدیر نہیں جو رسالہ نکالتا اور اخبار چھاپتا ہے بلکہ وہ عربی والا مدیر جو کسی چیز کو گھماتا ہے۔ چکر دیتا ہے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑتا۔ مدت ہوئی میں نے منشی عبدالرحمٰن خاں کو لکھا تھا کہ یہ جو ہر کس و ناکس کے خط شائع کرنے کی ریت چل نکلی ہے اس کی وجہ سے اب وہ لوگ خط قلم برداشتہ نہیں، بلکہ دل برداشتہ ہو کر لکھتے ہیں جو نصف ملاقات

کے شائق ہوں مگر اشاعت سے خائف۔ لوگ اگلے جہان میں نہ صرف فرشتوں کے لکھے پر بلکہ اپنے لکھے ہوئے پر بھی پکڑے جائیں گے۔ منشی صاحب نے یہ خط چھاپ دیا۔ میں خط لکھنے میں پہلے کہاں اتنا مستعد تھا، اس کے بعد میری کم نویسی کو ایک معقول بہانہ ہاتھ آگیا۔ ادب اور ادیب نواز دوست اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔ کہنے لگے، آپ کے اصول اور آپ کی احتیاط آپ کو مبارک مگر وعدہ کیجئے کہ جو خط آپ کے نام آئیں گے کم از کم ان کو آپ محفوظ کر لیں گے اور واپس آکر میرے حوالہ کر دیں گے۔ میں انہیں پڑھ کر طے کروں گا کہ کتاب بنے گی یا رسالہ کا خصوصی نمبر۔

سامان باندھنے کے مرحلہ پر مجھے یہ فرمائش یاد آئی۔ میں خطوط کے مختصر سرمایہ پر نظر ڈالتا ہوں۔ یہ جو شروع میں دو چار تہنیتی خط اور دس بیس خط تلاش روزگار کے سلسلہ میں آئے تھے وہ رسالہ والوں کے کام کے نہیں ہیں۔ ادب ان میں ذرا بھی نہیں اور انہیں بغیر اجازت چھاپنا بے ادبی کی بات ہوگی۔ بہت ڈھونڈا مگر برادرم مشتاق یوسفی کے ایک آدھ کارڈ کے سوا کچھ نہ ملا۔ مشتاق یوسفی کی تحریر کو نفسِ مضمون کے اعتبار سے سو میں سے سو نمبر ملتے ہیں۔ خوش خطی کے دس نمبر اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ کمال ہنر میں یوسفی اور اعتراف ہنر میں ان کے چاہنے والے دونوں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ہماری خط و کتابت کے امکانات کو انقلاب ایران نے پنپنے ہی نہیں دیا۔ لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ لندن آنا جانا رہتا ہے۔ ساری کسر ملاقات میں نکل جاتی ہے۔

ایک ٹھیٹھ دیہاتی دوست کا خط سامنے رکھا ہوا ہے۔ لمبے تڑنگے، سانولی رنگت، تہمد پوش۔ معصوم مسکراہٹ اور روشن آنکھیں۔ معمولی زمینداری اور واجبی تعلیم۔ غیر معمولی سوجھ بوجھ اور بڑی محبت والے۔ گفتگو بے حد دلچسپ۔ کبھی ملنے آتے ہیں تو ٹاٹ کے تھیلے میں سے تین چار ذبح کئے ہوئے تیتر نکال کر میز پر رکھ دیتے ہیں اور ہمیشہ یہ جملہ دہراتے ہیں۔ آپ میں لاکھ خوبیاں ہوں گی مگر ایک خرابی ان سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔ خامی اور خرابی یہ ہے کہ آپ شکار نہیں کھیلتے۔ جو افسر شکار نہ کھیلتا ہو اسے رام کرنے میں ہم زمینداروں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ ان کا خط نومبر 1978 کا لکھا ہوا ہے۔

"از طرف نادر خاں، جلال پور بھٹیاں، بار استہ (براستہ) حافظ آباد، ضلع گجرانوالہ۔____

یہ بدامنی نہ ہوتی تو پھر ایران رہنے کی جگہ تو بہت اچھی تھی۔ وہاں وہ آستی (ہستی) دفن ہے جس کا شہنشاہ متولی ہے۔ بندہ نے بھی ۱۹۷۲ء میں سب زیارات کی تھی۔ اب بھی دل چاہتا ہے آپ (کے) وہاں ہوتے ہوئے ایک دفعہ ــــــ آپ (کو) معلوم ہو گا کہ بندہ کو ان حستیوں (ہستیوں) کے ساتھ بہت اقیدت (عقیدت) ہے ــــــ"۔ یہ خط کئی ماہ تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد مجھے اس وقت ملا جب متولی کا تولیت نامہ منسوخ ہو چکا تھا اور وہ چھٹی کے نام پر جلاوطنی کی کیفیت سے دوچار تھا۔

یہ دوسرا خط حکومت پاکستان کے ایک سیکرٹری کا ہے۔ گھریلو باتیں، سرکاری خبریں، عام و خاص دلچسپیاں اور دوستوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں پر خلوص فکرمندی۔ "پستہ مل گیا ہے۔ میں نے صرف چکھا ہے۔ عامر اور عزیز نے جگالی کی۔ یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ مکان مل گیا ہے۔ امید ہے محفوظ جگہ پر ہو گا۔ بازار اور بنک سے دور ہو گا۔ خدا کرے تہران کے حالات بہتر ہوں۔ وسیم انڈونیشیا گیا ہوا ہے۔ پھر وہاں سے برسلز۔ یہاں سے تو خلاصی ہوئی۔ مگر وہ کوئی خاص excited نہیں ہے۔ بس دو سال گھر سے باہر گزارنا چاہتا ہے۔ نشتر کی بابت خبر ہے کہ وہ آپ کا پرانا ادارہ سنبھالیں گے۔ شیخ رؤف آئے ہوئے تھے۔ جدہ پسند نہیں آیا۔ سنا ہے اب وہ اگلا پڑاؤ منیلا چاہتے ہیں۔ تہران میں قدم جمالئے ہیں کہ نہیں۔ کچھ اثر و رسوخ کویت میں ہو تو ایک کام کہا جائے۔" جو لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی بہت بڑے معرکہ میں ساتھ ہونے کی وجہ سے دوستی گہری اور پکی ہوتی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ سر ایڈمنڈ ہیلری اور قلی شرپا تن سنگ اکٹھے کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچے مگر اس کے باوجود وہ دوست نہ بن سکے۔ یہ بات مجھے نورالحسن کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہوئے ایک طویل مدت کے بعد پتہ چلی کہ دوستی کی عمارت کا نقشہ تو حالات بناتے ہیں مگر اس کی تعمیر ہمیشہ چھوٹی اینٹ سے ہوتی ہے۔

چار سال کا سرمایہ اور اتنا قلیل۔ بس یہی دو چار خط۔ میں کیسے اپنے مدیر دوست کو یقین دلاؤں گا کہ صرف یہی چند خط میرے نام آئے تھے اور ان میں بھی کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں والی قسم کا کوئی نامہ نہیں ہے۔ دراصل قیامت خود آئی ہوئی تھی اس لئے خط کے آنے کے سارے راستے بند تھے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ یہ چند خط اس

قیامت کے باوجود مکتوب الیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر میں اپنی دلیل میں وزن پیدا کرنے کے لئے اکبراعظم کا سہارا لوں گا۔ اس کے ایک خط کا جستہ جستہ آزاد ترجمہ سناؤں گا۔ یہ خط اگرچہ اپنے زمانہ کے افلاطون، اپنے عہد کے آصف، اپنے عصر کے علامہ، شیخ ابوالفضل کی انشاپردازی کا نمونہ ہے مگر میں نے کہیں کہیں اصلاح دی ہے تاکہ پڑھنے سننے والے کے پلے کچھ تو پڑے۔ "از طرف ظل الٰہی گوہر معدن شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی بنام حضرت شہنشاہ شاہ عباس فرمانروائے کشور ایران۔ عین فصل بہار میں آپ کا کرامت نامہ ملا۔ محبت اور الفت کے گلدستہ نے یگانگت کے دماغ کو معطر کر دیا۔ مراسلت میں تاخیر کی اصل وجہ ایران کی بدنظمی اور اس ملک کا فتنہ و آشوب تھا۔ جو خدا کے حکم سے واقع ہوا۔ اس وقت جب کہ مبارک پیغام لانے والا ایلچی یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس بدنظمی میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ بالضرور اس خبر کے سننے سے ہمارے متفکر دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ خیال تھا کہ اس افراتفری کے زمانہ میں محض پوچھنا مروت اور جواں مردی کے شایاں نہ ہو گا۔ اس وقت پرسش کی جائے جب عملی طور پر مدد اور کمک دی جا سکے۔ لیکن چونکہ قندھار (افغانستان) کی مہم بیچ میں تھی اس لئے ہمارے دل میں یہ بات آئی کہ پہلے قندھار کو اپنے آدمیوں کے سپرد کر دیں پھر جس قسم کی اعانت اس قرۃ العین کے خاطر نشیں ہو عمل میں لائیں۔ آپ سے پوچھے بغیر نصرت مند افواج کا بھیجنا کوتاہ اندیش عوام الناس کی نظر میں ہمارے آپ کے عدم اتحاد کا شبہ پیدا کرتا۔ ہمارا قصد یہ تھا کہ بارگاہ جلالت کے خاص لوگوں میں سے کسی کو بھیجا جائے تاکہ وہ ایران کی قرار واقعی حالت دیکھ کر ہمارے گوش اقدس میں پہنچائے کہ ولایت کشمیر میں بغاوت ہو گئی۔ ابھی ہمارے ظفرمند علم کشمیر میں داخل نہ ہونے پائے تھے کہ نصرت مند بہادر موقع پا کر اس شروفساد کے بانی کا سر کاٹ کر درگاہ والا میں لے آئے۔ جب یہ ممالک ہماری تشریف بری کی برکتوں اور سعادتوں سے امن و امان کی منزل گاہ بن گئے تو وہاں سے مراجعت کر کے دارالخلافہ لاہور میں نزول اجلال فرمایا۔ ضیاء الملک کو روانہ کیا ہے۔ معاملات محبت کی باتیں ان کی زبان کے سپرد کی ہیں اور وہ ایران کے حالات کی حقیقت اچھی طرح سمجھ کر واپس آ کر ہم سے عرض کرے گا۔"

اصل بات اکبر اعظم نے کہہ دی اور وہ بھی صدیوں پہلے۔ ایران میں ہرج مرج تھا۔ قیام تھا۔ انقلاب تھا۔ لہٰذا ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ کوئی خط لکھے تو کس امید پر۔ لکھنے میں محنت ضائع۔ سپرد ڈاک کرنے میں اجرت ضائع۔ جواب کا انتظار کرنے میں وقت ضائع۔ نہ میرے دوست اکبر بادشاہ کی طرح دستی خط بھیج سکتے تھے نہ میں ایلچی کو تحائف دے کر رخصت کر سکتا تھا۔ دونوں طرف مجبوریاں تھیں لہٰذا خط و کتابت کو افغانستان اور کشمیر کے مسائل حل ہونے تک اٹھا رکھا۔ یہ کیسے بدقسمت علاقے ہیں کہ انہیں اکبر کے زمانہ میں امن حاصل تھا نہ ہمارے زمانہ میں حاصل ہے۔

نامہ بر فارسی شاعری میں قدم قدم پر ملتا ہے مگر میں نے ایران میں اپنے قیام کی پوری مدت میں ڈاکیہ کی شکل نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں کشور ایراں میں ہرکارہ ہوتا ہے یا مکتوب الیہ خود چل کر ڈاک. خانہ جاتا اور خط وصول کرتا ہے۔ یہاں جو حالات ہیں ان میں پاکستان جاکر خط لکھنے والے سے مل کر خط وصول کرنا شاید زیادہ آسان ہوتا۔

میرے بزرگ دوست افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کا ایک خط میرے سامنے رکھا ہے۔ اکبر اعظم کے والد شہنشاہ ہمایوں کا کیا برمحل حوالہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "میاں، ہمارے درمیان اب خط و کتابت اسی نہج پر ہو رہی ہے جیسے شہنشاہ ہمایوں کے قیام ایران اور اس کے حواریوں مقیم ہندوستان کے درمیان ہوتی ہو گی۔ امید لگائے بیٹھا ہوں کہ کوئی چیز لے کر آؤ گے مگر ادھر آؤ گے کب۔" خط میں اور بہت کچھ لکھا ہے مگر یہ دو جملے میرے دل میں کھب گئے ہیں۔ ہمایوں بھی خوب آدمی تھا۔ چودہ سال معزول اور بھگوڑے بادشاہ کی طرح آوارہ اور ناکارہ پھرتا رہا۔ بالاخر دوبارہ ہندوستان کا شہنشاہ بننے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی تخت حاصل کیا، وہ میدان جنگ میں لاشوں کو گننے اور کلہ مینار بنانے کی بجائے سیدھا اپنے کتب خانہ میں داخل ہوا۔ سیڑھیوں پر پاؤں رپٹا۔ گرا اور جاں بحق ہو گیا۔ میں نے بہت سے ایرانی کتب خانے دیکھے مگر اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ ملا کہ ایک بن بلائے مہمان کی حیثیت سے ہمایوں ایران میں اتنے طویل عرصہ تک کیا کرتا رہا۔ جس کتاب میں کچھ تفصیل ملتی ہے وہ ایشوری پرشاد کی لکھی ہوئی ہے۔

ابوالفضل صدیقی کہتے ہیں ایران سے کوئی چیز لے کر آؤ۔ میں "سفر نصیب" لے کر

آرہا ہوں مگر وہ ایران کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ میرا کوئی ارادہ معیاد ملازمت پوری کرنے سے پہلے اس موضوع پر لکھنے کا نہیں ہے۔ لکھنے کے لئے چار شرائط اس کے علاوہ ہیں۔ زندگی، صحت، فرصت، توفیق۔ یہ چاروں پوری ہو جائیں اور میں لکھنا شروع کروں تو کیا خبر کہ کتنا وقت لگ جائے۔ میں کوئی سعدی تو نہیں کہ جس دن دوست نے دامن پکڑا اور وعدہ لیا کہ وہ گلستان لکھے گا تو اس دن کے ڈھلنے سے پہلے سعدی نے ایک باب مکمل کر لیا۔ پہلا مسودہ، نظر ثانی، بیاض میں نقل۔ سارے مراحل دن بھر میں طے ہو گئے۔ اے میرے دامن گیر دوست، میں تو سہج سہج سے لکھتا ہوں۔ نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔ کیا آپ ایک طویل عرصہ تک اس تحریر کا انتظار کر سکیں گے جس کی آپ فرمائش کر رہے ہیں۔ صدیقی صاحب، شاید یہ آپ کے لئے ممکن نہ ہو۔ آپ نے مجھ سے دو چار بار بہت زور دے کر کہا تھا۔ میاں، دھمک سن رہا ہوں۔ میں نے ہر بار اس بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی کہ صدیقی صاحب اس عمر میں کان بجنے لگتے ہیں۔ یہ اس کے قدموں کی چاپ نہیں ہے جو زندگی میں ہر انسان کا آخری ملاقاتی ہوتا ہے۔ یہ آہٹ جو آپ سن رہے ہیں وہ آپ کی جوانی کی ہے۔ چونکہ دیوانی ہے اس لئے پیچھا کرتی رہتی ہے۔ جب آپ لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں یہ پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ اے میرے پرانے ساتھی۔ اے جاگیرداروں کے ہم راز شکاری۔ اے کہنہ مشق افسانہ نویس۔ میری خاطر "پی گئے" جیسا شوخ رنگ افسانہ ایک اور ہو جائے۔

(3)

ایران میں آئے ہوئے دو چار دن ہوئے تھے کہ مجھے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے بک سٹال پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں امریکی مصوّر رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چھپائی بہت اچھی، قیمت بہت زیادہ۔ موضوع غیر اہم یا مہمل۔ مکان بنایئے، گھر سجایئے، باغ لگایئے، کتے پالئے، بلیاں رکھئے، تاش کھیلئے، ناچ سیکھئے، سیاحت کیجئے، گھڑ دوڑ سے ملین ڈالر کمایئے۔ ان

کے علاوہ دو موضوع اور تھے۔ ایک ہالی وڈ، دوسرا جنس۔ خریداروں میں نوجوان ایرانی لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ پاکستان واپس جانے میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ میں یونہی بےارادہ اس جانے پہچانے بک سٹال پر جانکلا۔ وہاں سب سے نمایاں وہ چھوٹی بڑی تیس جلدیں ہیں جو تہران میں امریکہ کے سفارت خانہ پر طلبا کے قبضہ کے دوران حاصل ہونے والی دستاویزات پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ یہ خفیہ کاغذات مشین نے پرزہ پرزہ کر ڈالے تھے مگر عملہ کو انہیں جلانے کا موقع نہ مل سکا۔ سالہا سال کی دیدہ ریزی اور محنت کے بعد ان پرزوں کو جوڑ کر کتابیں اور کتابچے چھاپنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اتنی بہت سی جلدیں چھپ چکی ہیں مگر ہر دوسرے تیسرے ہفتے ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں جلد نمبر 10 کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ نظر ایک رپورٹ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے جو سیکرٹری آف سٹیٹ کے دفتر سے تہران میں سفارت خانہ کو بھیجی گئی تھی۔ شہنشاہ کی رخصت سے ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ درج ہے۔ لکھا ہے شاہ کے مخالفین کو یقین ہے کہ فوج کُودِتا کرنے والی ہے۔ بہت خونریزی اور بہت سختی ہوگی۔ اس سلسلہ میں چھ جرنیلوں کے نام لئے جاتے ہیں۔ اویسی، ربیعی، خسرو داد۔ باقی تین نام ہمارے جاسوس کو یاد نہیں رہے۔ کُودِتا کا منصوبہ خیابان شاہ عباس پر اس عمارت میں تیار کیا گیا ہے جو ریسرچ کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ اس منصوبہ کی رو سے تہران کو چھ حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جونہی ایک سگنل دیا گیا فوراً گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی اور فوجی کنٹرول سختی سے نافذ کیا جائے گا۔ میں ایک اور صفحہ کھولتا ہوں۔ اس دستاویز میں لکھا ہے کہ ریٹائرڈ کرنل سارے کے سارے انقلابی قوتوں کے ساتھ ہیں۔ یہ وہ کرنل ہیں جنہیں پڑھا لکھا ہونے کی پاداش میں نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ شاہ نے زیادہ تر ایسے فوجیوں کو جنرل بنایا جو نالائق ہیں۔ لہٰذا جنرل شاہ کے وفادار رہیں گے۔ کرنل اس سے زیادہ دباؤ برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ نوکری چھوڑ کر گھر چلے گئے۔ خمینی گروپ اب فوج کی طرف خصوصی توجہ دے رہا ہے۔

ورق گردانی بہت ہو گئی۔ میں ان دستاویزات کی دو چار جلدیں خرید لیتا ہوں۔ ان میں سے ایک آدھ میں پاکستانی فارن سروس کے سینئر افسروں کی گفتگو بھی درج

ہے۔

تہران میں امریکی سفارت خانہ کی تمام دستاویزات کو ایک ہی عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ بس جلد نمبر کا فرق ہے۔ عنوان ہے، اسناد لانہ جاسوسی۔ جاسوسی کے آشیانہ اور ٹھکانہ سے پکڑی جانے والی اسناد۔ مرزا رفیق عنایت اس عنوان سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے، فارسی میں گھونسلہ کو آلانہ کہتے ہیں۔ پنجابی میں آہلنہ کہتے ہیں۔ اس طرح پنجابی کا رشتہ براہ راست فارسی سے قائم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پنجابی میں اگر کچھ عربی اور فارسی سے آیا ہے تو براستہ اردوئے معلّےٰ آیا ہے۔

میں ہوٹل انٹر کان سے کتابیں خرید کر باہر نکلا۔ سڑک پر ایک جلوس جا رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں اتنے جلوس دیکھے ہیں کہ یہ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ یہ کیسا جلوس ہے۔ کیوں نکلا ہے۔ کدھر کا رخ ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو جلوس نکالنے کی ممانعت تھی۔ لوگ صرف جشن کے نام پر جمع ہو سکتے تھے۔ اور ہر جشن کا سلسلہ پہلوی دربار سے جاملتا تھا۔ سالگرہ کے جشن بنانے کا رواج تھا۔ خواہ وہ کسی کم سن شہزادہ کی پہلی سالگرہ ہو یا بادشاہت کے ڈھائی ہزار سال گزرنے کی خوشی میں منائی جانے والی سالگرہ۔ پہلے جلوس بند اور جشن جاری تھے۔ اب جشن بند اور جلوس جاری ہیں۔ یہی حال نماز جمعہ کا ہے۔ وہ بے نماز دن تھے۔ یہ تہران یونیورسٹی میں نماز جمعہ کے لئے باقاعدگی سے جمع ہونے والے عظیم الشان اجتماع کے دن ہیں۔ کم از کم ایک لاکھ افراد آج کل وہاں جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ شکوہِ ملک و دیں کا بڑا عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ امام جمعہ کے ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا۔ وہ جس سے بھیڑوں کو ہانکتے ہیں۔ بندوق ہوتی ہے۔ وہ جس سے بھیڑیئے خوف کھاتے ہیں۔ مخالفین باتیں بناتے ہیں کہ وہاں حاضری لگتی ہے۔ غیر حاضر کو سزا اور حاضر کو وظیفہ ملتا ہے۔ شہنشاہ بھی تو سزا دیتا اور وظیفہ جاری کرتا تھا۔ پھر وہ اتنے لوگ کیوں نہ جمع کر سکا۔

چار سال میں کتنا فرق آگیا ہے۔ اُن دنوں اعلیٰ طبقہ میں گڈ مارننگ، ہیلو اور ہاؤ ڈو یو ڈو کا رواج تھا۔ اگر کوئی سلام کرتا تو لوگ اس کی طرف حیرت بلکہ حقارت سے

دیکھتے۔ جواب کے روادار نہ ہوتے اور اگر کہیں سے جواب آتا تو وہ انگریزی یا فرانسیسی میں ہوتا۔ اب یہ حالت ہے کہ تھوڑی سی دیر کے لئے ٹی وی لگایئے تو کئی بار بسم اللہ، انشاء اللہ، الحمدللہ اور اللہ اکبر سننے میں آئے گا۔ وہ جو کٹر وطن پرست ہیں ان کی خفگی برقرار ہے۔ پہلے وہ مغرب سے بیزار تھے اور اب عالم عرب سے ناراض ہیں۔ انہیں یہ غم ہے کہ خالص ایرانی کلچر کو رائج کرنے کی کوشش کو کبھی ترقی کے نام پر اور کبھی مذہب کے نام پر نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کل اور آج میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے۔ کل غرب زدگی تھی اور آج عرب زدگی ہے۔

کل اور آج کا سب سے نمایاں فرق دو جگہ نظر آتا ہے۔ ایک بادشاہ کا محل اور دوسرا بہشت زہرا کا قبرستان۔ کل محل آباد تھا۔ بڑی رونق تھی۔ وہاں رہنے والے کے پاس بڑی قوت اور طاقت ہوا کرتی تھی۔ بے حد دولت تھی اور اس کا بے حساب نشہ تھا۔ چہار دانگ عالم میں اس شخص کا ڈنکا بجتا تھا۔ وقت نے کروٹ لی۔ شہنشاہ پہلے بے اختیار ہوا اور پھر بے وطن۔ غریب الوطنی کی حالت کچھ ایسی تھی جیسی سورۂ توبہ میں بیان کی گئی ہے۔ "یہاں تک کہ جب زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے۔" بظاہر گھر سے چھٹی پر نکلے ہوئے شہنشاہ کا عالم یہ تھا کہ دنیا کا کوئی ملک اسے بخوشی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بیمار ہونے کے باوجود وہ پاناما کے ہسپتال میں بے ہوشی کا ٹیکہ لگوانے سے اس لئے خائف تھا کہ کہیں عالم بے ہوشی میں پاناما کی حکومت اس کا بے حس جسم ایران کی انقلابی حکومت کے ہاتھ فروخت نہ کر دے۔ وہ مرا تو قاہرہ کی ایک مسجد کے حجرہ میں دفن ہوا۔ حفاظت کی خاطر وہ حجرہ اکثر بند رہتا ہے۔ بھولے بھٹکے کوئی آ جائے تو آ جائے ورنہ وہاں کوئی نہیں آتا۔

اِن چار سالوں میں بہشتِ زہرا کی اہمیت اور آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اتنے لوگ وہاں فاتحہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں کہ سڑک کا نام خیابان یاد آوراں رکھ دیا ہے۔ میں نے جب بہشتِ زہرا کا قبرستان پہلی بار دیکھا تو وہ چھوٹا سا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے ایک بار پھر دیکھنے کے لئے گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ قبرستان کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ صدر دروازہ، سڑکیں، چمن، روش، پیادہ رو۔ قبرستان مختلف حصوں میں

تقسیم ہے۔ ہر حصہ میں قبروں کی قطاریں بنی ہوئی ہیں۔ قبرستان پرانا ہے مگر قبریں نئی ہیں۔ پچھلے تین چار برس میں بے شمار لوگ یہاں دفن ہوئے ہیں۔ سینکڑوں کے حساب سے بلکہ ہزاروں کے حساب سے۔ بیشتر جوان تھے یا نوجوان۔ زندگی کا تعاقب کرنے اور لطف اٹھانے کے دن تھے کہ تاریخ، انقلاب اور موت نے انہیں آواز دی۔ وہ بے قرار اس آواز کی سمت چل دیئے۔ بالاخر یہاں پہنچ کر انہیں قرار آگیا۔

میں بہشتِ زہرا پر الوداعی نظر ڈالتا ہوں۔ انقلابِ ایران کا سب سے معتبر گواہ بہشت زہرا کا قبرستان ہے۔ بے شک انقلاب کے دنوں میں ایک گواہ اس سے بھی زیادہ اہم ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام خیابانِ شاہ رضا تھا۔ آج کل اسے خیابانِ انقلاب کہتے ہیں۔ مگر لہو دھویا گیا، لاشیں اٹھائی گئیں، جلی ہوئی عمارتوں کی جگہ نئی نویلی عمارتوں نے لے لی ہے۔ ٹریفک معمول کے مطابق اس سڑک پر چل رہا ہے۔ انقلاب کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ انقلاب اب صرف اس خیابان کے نام کا حصہ ہے۔ سڑکوں پر تیزی سے موٹر چلانے والوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ سڑک کا نام کیا ہے اور کیوں ہے۔ لیکن بہشت زہرا کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ آج بھی انقلاب کا ایک عینی گواہ ہے۔ سارا ثبوت اور ساری شہادت اس کے سینے میں دفن ہے۔ لوگ اس کی گواہی سننے اور اس کے سینے کے داغ دیکھنے کے لئے ہجوم در ہجوم یہاں جمع ہوتے ہیں۔

میں بہشتِ زہرا کے صدر دروازہ سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک آواز آئی۔ تم لینن گراڈ کے قبرستان میں اجتماعی قبروں کے اک اکیلے کتبے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انقلاب ایران کے دوران مارے جانے اور یہاں دفن ہونے والوں کا کتبہ بھی واحد ہے۔ یہاں کہیں لکھا ہوا نہیں۔ میرے کلام میں ملے گا۔ تمہیں تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ میں نے مہدی اخوان ثالث کا کلام اٹھایا۔ مصرع خود بول اٹھا۔ میں ہوں اتنی بہت ساری قبروں کا واحد کتبہ. اتنے بہت سے مرنے والوں کا واحد ترجمان۔ میں مصرع کو پڑھتا ہوں اور پھر دل میں دہراتا ہوں۔ آمّا می دانی چہ شبہائے سحر کردم۔

انقلاب کی روشنی اور اجالے میں زندگی بسر کرنے والے خوش قسمت لوگو۔ تمہیں کیا خبر کہ ہم نے کیسی بھیانک اور بے خواب راتیں بسر کی ہیں، کیسے وحشت ناک اور ڈراؤنے

خواب دیکھے ہیں، کیسے کیسے اندھیروں میں بھٹکتے رہے ہیں تب جا کر افق روشن ہوا اور موسم بہار کی صبح طلوع ہوئی۔

(4)

میں پچھلے چار برس کے واقعات پر نظر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اچانک وہ بہت دور جا نکلی۔ 1953 ء، شہر لاہور، موسم بہار کے آخری دنوں کا۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جزوی مارشل لاء لگ چکا تھا۔ مغرب کا ایک استاد اور مصنف جو اسلام میں دلچسپی رکھتا تھا لاہور پہنچ گیا۔ تحقیق کر رہا تھا۔ بہت سے لوگوں سے ملا۔ سوال، جواب اور جرح ہوتی رہی۔ ایک دن اس نے اپنے میزبان سے فرمائش کی کہ مجھے آٹھ دس نوجوانوں سے ملاؤ۔ وہ طالب علم نہ ہوں لیکن اچھے طالب علم رہ چکے ہوں۔ بیرسٹر، بینکر، ڈاکٹر، سول سرونٹ وغیرہ ہوں اور اپنے اپنے پیشہ میں ترقی کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ میزبان نے چند نوجوان جمع کیے۔ ان دنوں پنجاب سول سیکرٹریٹ میں سی ایس پی کے کل تین انڈر سیکرٹری تھے۔ وہ تینوں بھی چائے پر بلائے گئے۔ میں ان میں شامل تھا۔ گفتگو ہوئی۔ وہ دانشور اسلام کے سیاسی مستقبل پر تحقیق کر رہا تھا۔ اسلامی ممالک میں سیاست کون کون سی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ دور جدید میں شرعی سیاسی اور اقتصادی نظام کی صورت کیا ہو گی۔ اسلامی انقلاب کے امکانات کیا ہیں۔

میں نے ایم اے معاشیات کے لئے ایک مختصر اور کچا پکا درسی مشقی مقالہ اسلامی طرز حیات کے معاشی ضابطہ کے عنوان سے لکھا تھا۔ مقالہ لکھتے ہوئے اسلامی ممالک کی سیاسی صورت حال دیکھ کر مجھے کئی بار خیال آیا کہ جدید اسلامی، سیاسی اور معاشی نظام کا قائم کرنا کتنا مشکل کام ہو گا۔ چومی گویم مسلمانم بلرزم۔ کہ دانم مشکلات لاالہ را۔ جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں کانپ اٹھتا ہوں کیونکہ میں لاالہ کی عملی مشکلات کا احاطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے لاہور میں مغربی محقق سے گفتگو کے دوران اپنے مقالہ کی وجہ سے قائم

کی ہوئی رائے کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود کہ میں تحریکِ پاکستان کی کامیابی کے نشہ سے سرشار تھا میں نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے جلد نافذ ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دیر تک ہم ایک پیوندی نظام کے تحت زندگی بسر کریں گے۔ وہ طبقہ جو اسلامی نظام کی فکری اساس کے لئے قرآن اور حدیث سے حوالے پیش کر سکتا ہے وہ تو موجود ہے۔ عوام میں اس نظام کے لئے جذبہ اور خواہش بڑی مقدار میں موجود ہے۔ جب چاہو انہیں اسلام کے نام پر سڑکوں پر لے آؤ اور وقت کو روک دو یا پیچھے دھکیل دو۔ لیکن وہ طبقہ جو دور جدید کے لئے اسلامی نظام کی عملی آئینی، سیاسی معاشی اور انتظامی صورت متعین کر سکتا ہے وہ سرے سے ناموجود ہے۔ ملک میں تعلیم بہت کم ہے۔ عربی اور دین کی تعلیم اس سے بھی کم ہے۔ دینی مدرسہ دور جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اسلامی معیشت اور سیاست کی نئی تعبیر کا مطالبہ کرتا ہے۔ فرشتے تو اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں آئیں گے۔ اگر آ بھی گئے تو انہیں مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ ہندوؤں کی مخالفت کا سامنا ہو گا اور مغربی پاکستان میں فیوڈل نظام انہیں قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ فیوڈل نظام کے مفادات پر جب بھی زد پڑی اس کے نمائندے بڑی بے لحاظی اور بد دماغی سے صاف کہہ دیں گے کہ یہ فرشتوں والا پاکستان نہ ہم نے مانگا تھا اور نہ ہم اسے قبول کریں گے۔ اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم فرشتوں پر شیطان کو ترجیح دینے کے لئے تیار ہوں گے۔ شیطان سے ان کی مراد ایک ہمسایہ ملک سے ہے۔

مغربی استاد سے میں نے کہا، میری دانست میں اسلامی نظام سب سے پہلے کسی ایسے ملک میں آئے گا جس کی زبان عربی ہوگی اور جو یورپ کے قریب واقع ہو گا۔ ایسے ملک میں دور جدید کا مقابلہ اور اس کے تقاضے مجبور کریں گے کہ اس کے ذہین اور درد مند افراد اٹھیں اور ایک تازہ اور توانا اسلام کا عملی ثبوت فراہم کریں۔ اس سلسلہ میں مختلف ملکوں کا ذکر آیا۔ میں نے کہا، فی الحال مصر کو اس خدمت سے معاف رکھیں۔ قاہرہ آج کل مردہ فرعونوں کے آثار اور ننگی ناف والے زندہ ناچ گانے کے لئے مشہور ہے۔ شاہ فاروق کے جسم پر چربی چڑھی ہوئی ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مجھے دو ملک اپنے محل وقوع کی وجہ سے ایسے نظر آتے ہیں جن سے کوئی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایک مراکش اور

دوسرا الجیریا۔ لیکن ابھی تو وہ دونوں آزاد بھی نہیں ہوئے۔

میں اس وقت نوجوان تھا۔ کھل کر بات کر سکتا تھا۔ لیکن جب لاہوری چائے مذاکرہ کے ایک کم تیس برس بعد کسی نے تہران میں الوداعی ملاقات کے دوران مجھ سے وہی سوال پاکستان کے حوالہ سے دہرایا تو میں نے بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ بس یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ میں چار سال سے ملک سے باہر ہوں لہٰذا عوام کے میلان، خواص کے رجحان اور ہوا کے رخ سے ناواقف ہوں۔ سوال پوچھنے والے نوجوان نے جس نظر سے مجھے دیکھا میں اس کی تاب نہ لا سکا۔ انقلاب کے بعد ایران میں اعلیٰ عہدوں پر جوان بلکہ نوجوان فائز ہو چکے ہیں۔ سوال پوچھنے والا ان میں شامل تھا۔ میں نے کہا۔ برخوردار کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اپنی سرکاری حیثیت کو بھول کر تھوڑی سی دیر دوستوں کی حیثیت سے تاریخ پر نظر ڈالیں۔ آپ کے انقلاب کی اہمیت مُسَلَّم۔ داد اور مبارکباد قبول کیجئے۔ لیکن یہ بتایئے کہ آپ نے اس انقلاب کے برپا کرنے میں سترّ برس کیوں لگا دیئے۔ 1909 ء سے لے 1979 ء تک آپ کیا کرتے رہے۔ پانچ مجتہدین کی وہ کونسل آپ سات دہائیوں میں بھی نہ بنا سکے جس نے ضمنی آئین کی دفعہ 2 کے تحت مجلس کے بنائے ہوئے قوانین کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ شرعی ہیں یا غیر شرعی۔ اس مدت میں آپ نے بس ایک کمال کی بات کی اور وہ ڈاکٹر مصدق کی حکومت ہے جس نے تیل کے کارخانے اور کنوئیں قومی ملکیت میں لے لئے تھے۔ مگر آپ نے جس طرح ڈاکٹر مصدق کو نکالا اس کی داستان پڑھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ آیئے اب برعظیم کی تاریخ کا جائزہ لیں۔ 1909 ء میں برطانوی ہند میں مورلے منٹو آئینی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ دس برس میں لوگوں کے احتجاج نے سرکار برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نام سے 1919 ء میں مزید سیاسی مراعات کا اعلان کریں۔ لوگوں نے اس نئی صورت حال کو بھی بمشکل دس سال برداشت کیا۔ آئینی اصلاحات کے لئے سائمن کمیشن رپورٹ (1929 ء) لکھی گئی۔ تین مرتبہ گول میز کانفرنس ہوئی (32-1930) ء۔ نتیجہ 1935 ء کے آئین کی صورت میں نکلا۔ اس آئین کے تحت 1937 ء میں صوبائی حکومتیں بنائی گئیں۔ دس برس گزرے کہ برطانوی پارلیمینٹ کو اس آئین کی جگہ آزادی برعظیم کا قانون منظور کرنا پڑا۔ اس آخری

دور میں برعظیم کے پسماندہ مسلمانوں نے دو طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ تاج برطانیہ اور ملک کی خوشحال اور تعلیم یافتہ اکثریت۔ تحریک پاکستان کی خاطر سترّلاکھ مسلمانوں نے ہجرت کی اور دس لاکھ نے اپنی جانیں قربان کیں۔ یہ داستان دہرانے کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ خاکساران جہاں را بحقارت منگر۔ میں بذات خود برعظیم کی ان دو تین بے تاب اور خوددار نسلوں میں سے ایک نسل کا نمائندہ ہوں جنہوں نے خوب سے خوب ترکی تلاش میں کبھی دس برس بھی ایک حالت پر نہیں گزارے۔ دوسرا آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ ہماری حالیہ تاریخ کی سیاسی ناکامیاں کہیں آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کردیں۔ یہ خشک سالی کا موسم ہے۔ ذرانم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ تیسرا یہ کہ بڑے بڑے انقلاب ایک درجہ کامیاب ہونے کے بعد غلط رخ پر نکل جاتے ہیں۔ ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ آپ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں۔

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یوں بھی ایسا موقع روز روز کہاں ملتا ہے۔ برسبیل تذکرہ دو چار باتیں اور سہی۔ وقت ہے تو غور سے سنیں۔ شہنشاہ ایران نے ڈاکٹر شریعتی کا ادارہ حسینہ ارشاد غالباً سن ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں بند کیا تھا۔ شکایت تھی کہ یہ ادارہ بے چینی اور بغاوت پھیلا رہا ہے۔ ہمارے یہاں اس سے نصف صدی پہلے 1915ء میں انگریزوں کی حکومت نے مولانا ابوالکلام آزاد کا دارالارشاد ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بند کیا تھا۔ الزام دہی باغیانہ سوچ کو عام کرنے کا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کی تحریک بہت زبردست ہے مگر وہ غریب اور مقروض مسلمان ممالک کے لئے ماڈل نہیں بن سکتی۔ آپ کا ماڈل اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب زیر زمین تیل موجود ہو جو اپنے زور سے خود باہر آجائے جہاں تیل درآمد کرنے والے ممالک کیو بنائے کھڑے ہوں۔

اب آخری بات سن لیجئے اور وہ بھی ایک سخنور کی زبانی کہ حرف آخر جس سلیقہ سے شاعر کہہ سکتا ہے وہ نثر نگار کے بس کی بات نہیں۔ زہرا نگاہ ہماری ایک خوش خیال اور خوش آواز شاعرہ ہیں۔ ایرانی انقلاب پر جہاں اور بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں وہاں ایک نظم زہرا بہن نے بھی کہی ہے۔ ایران سے ہماری تاریخ، ثقافت، ادب اور معاشرہ نے جو کچھ مستعار لیا ہے اس کا احسان مندانہ ذکر کرتی ہیں۔ مشترک تہذیب کا حوالہ بڑی

اپنائیت کے ساتھ دیتے ہوئے آخری دو مصرعوں میں ایک بڑی انوکھی بات کہتی ہیں۔ اگر ہے فرق کہیں پر تو بےارادہ ہے۔ کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ اے میرے نوجوان انقلابی ایرانی دوست، جب تک ہم اپنے فیوڈل نظام کے تحت قائم ہونے والی بادشاہتوں اور اپنی سیاست کی کج رفتاری کی وجہ سے ریاست کے اندر جو ریاستیں بن گئی ہیں انہیں ٹھکانے نہیں لگا لیتے اس وقت تک پاکستان کے دن کیسے پھر سکتے ہیں۔

(5)

جب میں ایران آیا تھا تو دنیا تیل تیل پکار رہی تھی۔ جاپان جیسا ترقی یافتہ ملک، پاکستان جیسا ترقی پذیر ملک، جہاز، ریل اور موٹروں والے سب اس چیخ و پکار میں شامل تھے۔ جیسے دنیا کو اس کے علاوہ اور کوئی غم نہ ہو۔ اب جو میں ایران سے رخصت ہو رہا ہوں تو ساری دنیا اسلام اسلام، خطرہ خطرہ، پکار رہی ہے۔ امریکہ، یورپ، اشتراکی روس، اسرائیل اور بھارت سب شور مچانے میں مصروف ہیں۔ کچھ آوازیں بلند ہیں، کچھ پست۔ یہ جو زیرلب اس خطرہ کا ذکر کر رہے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ اسلام کا راستہ روکنے کے لئے بڑی طویل منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ لاہور میں ایک تحریک چلی اور اس کا جائزہ لینے کے لئے ایک مغربی محقق آن پہنچا۔ آج یہ حالت ہے کہ صرف ایران میں اسلام کا کھوج لگانے اور پیچھا کرنے کے لئے صحافیوں اور دانشوروں کی ایک فوج کی فوج مصروف کار ہے۔

یہ بہت پرانی بات ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ تھا۔ ایران میں ساسانی خاندان کی حکومت تھی۔ بادشاہ کا نام قباد تھا۔ اور وہ شخص جو معاشی مساوات کا نعرہ لگا رہا تھا اس کا نام مزدک تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اہورامزدا نے سب کو برابر پیدا کیا ہے۔ لیکن اہرمن نے حرص اور لالچ کو جنم دے کر انسانوں میں امیری غریبی کی اونچ نیچ پیدا کر دی۔ ہمیں چاہئے کہ فطری برابری والی حالت کی طرف لوٹ جائیں۔ لوگوں کو بات پسند

آئی۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں اس پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ بھی ان میں شامل تھا۔ جن لوگوں نے یہ بات ناپسند کی انہوں نے بادشاہ کو تخت سے اتار دیا اور اس کے بیٹے نوشیروان کو تاج و تخت کا وارث قرار دیا۔ مزدک کے ماننے والوں کو ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں قتل کر دیا۔ معاشی مساوات کا نظریہ اس تمام کشت و خون کے باوجود زندہ رہا۔ کتابوں کے اوراق میں، فلسفیوں کے دماغوں میں، غرض مندوں کی خواہشوں میں، مثالی معاشرہ کا خواب دیکھنے والوں کے خوابوں میں۔ بالآخر صدیوں کے بعد ایک خون ریز انقلاب کے صلہ میں اس نظریہ کو ایک گھر ملا۔ ایک بے رحم پارٹی کی حمایت ملی۔ اور اس نظریہ کی باقاعدہ بر آمد کا کام شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ نظریہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو گیا۔ سرمایہ دار ترقی یافتہ مغربی ممالک کے لئے یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ خطرات کی فہرست پر غور ہوا۔ اس کے دو مشیروں نے احوال جہاں کا جائزہ لیتے ہوئے کارل مارکس کو یہودی فتنہ گر کہا، روح مزدک کا دوبارہ ظاہر ہونا قرار دیا، اور اس کی شان میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ۔ نیست پیغمبر و لے دارد کتاب۔ پیغمبر نہ ہونے کے باوجود وہ صاحب کتاب ہے۔ ابلیس نے مشیروں کو ڈھارس دی۔ کہنے لگا. کمیونسٹوں کی کوچہ گردی اور انبوہ گردی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اصل خطرہ اشتراکیت نہیں اسلام ہے۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے۔ جب میں ایران آیا تھا تو اسلام فتنۂ فردا تھا۔ اب جو رخصت ہو رہا ہوں تو مشرق مغرب میں سب اسے فتنۂ امروز کہتے ہیں۔

میں نے پارک شہنشاہی میں دو تین سال بڑی باقاعدگی سے سہ پہر کی سیر کی ہے۔ سوچا جانے سے پہلے ایک بار پھر چکر لگاؤں۔ پارک کا نام بدل گیا ہے۔ سیڑھیوں کے ساتھ بادشاہوں کی مورتیاں نصب تھیں۔ اب وہاں پایہ ستون خالی کھڑے ہیں۔ کسی بادشاہ کا سر سلامت نہیں۔ بادشاہ سارے کے سارے معزول، جلاوطن یا قتل کر دیئے گئے ہیں۔ باغ میں ہریالی اور چہل پہل دونوں کی کمی ہے۔ گھاس جھلس گئی ہے۔ جو تھوڑے بہت لوگ نظر آتے ہیں وہ خاموش اور سنجیدہ ہیں۔ شاید وہ اپنی خوشی سے نہیں آئے۔ ڈاکٹر نے پارک کی سیر ان کے نسخہ میں لکھی ہے اس لئے مجبور ہو کر آ گئے۔ وہ گانے بجانے اور ناچنے والے نوجوان جن سے یہ باغ بھرا ہوتا تھا کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ

خوبصورت بوڑھا بارئیش پہلوان بھی نظر نہیں آیا جو برف کے موسم میں قمیص اتار کر وزن اٹھانے کا مظاہرہ کرتا تھا۔ انعام دینے والے نہ رہے، وہ اب یہاں آکر کیا لے گا۔ پارک کی نگہداشت کا معیار گر گیا ہے۔ جھیل خشک ہے۔ تہ کی مٹی خشک ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔ کشتیاں اس پر شگاف خشکی پر مردہ مچھلیوں کی طرح پڑی ہوئی ہیں۔ پہاڑی پر لگا ہوا بڑا ساڈش انٹینا خودرو جھاڑیوں میں چھپ گیا ہے۔ گول پنجروں میں کوئی پرندہ نظر نہیں آتا۔ دروازے کھلے ہیں۔ جالیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ مور اور مرغِ بہشتی اور رنگین طوطے سب اڑ گئے ہیں۔ پنجروں میں لگے ہوئے مصنوعی درختوں کا رنگ اڑ گیا ہے۔ بھوت پریت کے پنجر لگتے ہیں۔

الوداعی دعوت ہو رہی ہے۔ میزبان کا گھر تہران کے اس علاقہ کے قریب ہے۔ جہاں خانہ جنگی کا فیصلہ کن معرکہ ہوا تھا۔ کھانا چنا گیا۔ میزبان معذرت خواہ ہوئے اور میز سے اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف یہ کہتے ہوئے چلے کہ بیک گراؤنڈ موسیقی کے بغیر کھانے کا کیا لطف۔ انہوں نے بٹن دبایا اور آگئے۔ فیتہ صوت تھوڑی دیر بے آواز چلتا رہا۔ اس کے بعد یکایک بلند گو سے رائفل اور مشین گن چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگوں کی فریاد اس شور میں شامل ہو گئی۔ گاہے دھماکہ کی آواز آنے لگی۔ کیا گرا ہے، دیوار، گھر، ملک یا مستقبل۔ نہیں، صرف بم پھٹ رہے ہیں۔ میزبان نے بڑے فخر سے کہا میں نے خانہ جنگی کے دوران یہ آوازیں صوت بند فیتہ پر محفوظ کر لی تھیں۔ آپ اب واپس جا رہے ہیں میں نے سوچا آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ نے کس حشر سامانی میں یہاں وقت گزارا ہے۔ ہر ایک مہمان سر اٹھا کر گولیوں، دھماکوں اور چیخوں کو سن رہا ہے۔ لقمہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ ہاتھ اسے کیسے منہ تک لے جائے۔ حلق اسے کیسے نگلے۔ معدہ اسے کیونکر قبول کرے۔ دو منٹ کے بعد ایک مہمان سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا، جناب من ہم پر رحم کریں۔ ان آوازوں کو سن کر میرے پیٹ میں Cramps اٹھ رہے ہیں۔ سر بھاری ہو رہا ہے۔ کان کی لو سرخ ہو گئی ہے۔ اگر مجھے السر ہوتے تو وہ آج ضرور پھٹ جاتے۔ میزبان نے بٹن آف کر دیا۔ ٹیپ ریکارڈر بند ہو گیا۔ اس کے باوجود کسی نے رغبت کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔

کھانے کے بعد تین ایرانی نوجوانوں نے ڈرائنگ روم میں سلائیڈ پروجیکٹر لگایا۔ کہنے لگے ہمارے پاس انقلاب کے دوران کھینچی ہوئی تین ہزار رنگین سلائیڈ ہیں۔ ہم آپ کو ان میں سے سو پچاس تصویریں دکھاتے ہیں۔ وہ آوازیں کانوں کے لئے تکلیف دہ تھیں۔ یہ تصویریں آنکھوں کے لئے ان سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ خون ہی خون، جسموں کے ٹکڑے ہی ٹکڑے، لاشیں ہی لاشیں۔ جنازے ہی جنازے، قبریں ہی قبریں۔ میزبان نے پوچھا، چائے، قہوہ یا کافی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ کسی کے کہنے پر تصویروں کا سلسلہ بھی بند کیا گیا۔ روشنی کا بٹن دبانے کے بعد تصویریں دکھانے والے ایرانی نوجوان نے کہا۔ آپ نے جتنی تصویریں دیکھیں ان میں کوئی جبہ و دستار پہننے والا نظر نہیں آتا۔ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ کسی سننے والے نے کہا۔ صحیح مثال سفر اور منزل کے حوالے سے نہیں بلکہ کھیلوں کے میدان سے ملے گی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ لمبی دوڑ کے مقابلہ میں دیر تک دوسرے کھلاڑی تیز تیز آگے دوڑتے رہتے ہیں۔ جب منزل نزدیک آجاتی ہے تو یکایک ایک شخص طرارہ بھرتا ہے اور سب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ آپ کی جدوجہد برحق، قربانیاں تسلیم۔ مگر لوگ آپ کے ساتھ نہ تھے اس لئے آپ ہار گئے۔

کھانے اور تصویریں دکھانے کے بعد گپ شپ کا دور شروع ہوا۔ ایک شوخ اشتراکی انقلابی ایرانی لڑکی نے کہا۔ سنا ہے آپ نے انقلاب کے دوران ڈائری لکھی ہے۔ آپ شاید کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس میں میرا ذکر ضرور کریں۔ یہ انقلاب میری عمر کی لڑکیوں کے لئے بہت بھاری ثابت ہوا ہے۔ جوانی کے وہ سال جو عروسی خوشیوں میں گزارنے تھے وہ انقلابی جدوجہد کی نذر ہو گئے۔ جدوجہد کامیاب ہوئی مگر سکون میسر نہیں آیا۔ نوجوان کچھ بادشاہ نے مارے کچھ اس کے آنے والوں نے۔ کچھ فرار ہوئے، کچھ قید ہوئے۔ باقی جتنے بچے انہیں محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ وہاں سے لاشیں واپس آتی ہیں یا معذور۔ جنگ ختم ہونے میں نہیں آتی کہ نوجوان گھر بسانے کے بارے میں سوچ سکیں۔ میں تیس برس کی ہونے والی ہوں۔ میری جیسی لڑکیوں کی تعداد میں جن کی شادی کرنے کی عمر تیزی سے گزر رہی ہے، بہت سی نوجوان اور کم سن بیواؤں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے لئے کیا آپشن رہ گیا ہے۔ عمر بھر معذور دولہا کی وہیل چیئر دھکیلتی رہوں یا وقتی طور پر سیاہ

چوغہ کے ساتھ متعہ کر لوں۔ انقلاب انسانوں کا ہی نہیں بلکہ ارمانوں کا بھی خون بے دریغ بہاتا ہے۔

(6)

جب میں ایران پہنچا تو بے شمار ترقیاتی منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ ایٹمی بجلی گھر، کارخانے، رہائشی عمارتیں، ہوٹل، تجارتی اداروں کے دفاتر۔ کہیں بنیادیں کھودی جا رہی ہیں، کہیں بھری جا رہی ہیں۔ کہیں دیواریں کھڑی ہو رہی ہیں، کہیں چھت ڈالی جا رہی ہے، کہیں دروازے کھڑکیاں نصب کی جا رہی ہیں اور کہیں نو تعمیر عمارت میں فرنیچر رکھا اور فرش بچھایا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے تہران میں ہر دوسرا آدمی تعمیراتی کام سے منسلک ہے۔ تعمیر کی سب سے بڑی علامت کرین تھی۔ چونکہ بلند عمارتیں بنانے کا جنون تھا اس لئے جگہ جگہ پیلے رنگ کی کرین مشینیں نظر آتی تھیں۔ جیسے شہر میں زرافہ کے غول کے غول پھر رہے ہوں اور سب گردنیں اونچی کئے ہوئے آسمان کی جانب دیکھ رہے ہوں۔ ایک کرین میرے دفتر کی کھڑکی سے نظر آتی تھی۔ سارا دن حرکت میں رہتی۔ کرین خود تو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومتی اور لوہے کی تار سے بندھا ہوا کانٹا نیچے سے اوپر جاتا اور اوپر سے نیچے آتا۔ ایک بار سامان سے لدا ہوا اور دوسری بار خالی۔ میں کھڑکی سے اس مشینی نقل و حرکت کو دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک دن انقلاب آیا۔ کرین جہاں تھی وہیں کھڑی ہو گئی۔ میں ایک مانوس منظر سے محروم ہو گیا۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ پھر ایک ایک کر کے شہر کی ساری کرین مشینیں کھڑی ہو گئیں۔ میں رخصت سے پہلے دفتر کی کھڑکی سے فرح پارک کی جانب جھانکتا ہوں۔ معلوم نہیں پارک کا نیا نام کیا ہے۔ البتہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ اس پارک میں ہنرہای زیبا کے ادارہ کے لئے جو عمارت بن رہی تھی اس کی کرین تین سال سے ایک ہی زاویہ پر کھڑی ہے۔

بانڈونگ کانفرنس بہت پرانی ہو چکی ہے۔ آتش ان دنوں جوان تھا۔ اس کے ایک

ہم عمر ساتھی نے جو سفارتکار تھے اس کانفرنس میں پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ میز پر بیٹھ کر مذاکرات میں حصہ لینے والے اراکین دوسرے تھے۔ یہ نوجوان بستہ اٹھانے، پیغام پہنچانے، فون سننے اور بیگار بھگتانے پر مامور تھا۔ اس کو کانفرنس کے دوران کسی تقریب میں ایک غیر رسمی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ صدر سوئیکارنو نے بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے کہا، یہ تم کس چکر میں پھنس گئے ہو۔ سٹیل مل، بھاری صنعتوں کے کارخانے، دریاؤں کے ڈیم، نہروں کی کھدائی۔ کارخانے لگانا صنعت کار کا کام ہے۔ بند بنانا انجینئر کا کام ہے یہ کام ایک عام آدمی کر سکتا ہے۔ میرا اور تمہارا کام تعمیر ہے۔ فرد، معاشرہ، قوم اور مستقبل کی تعمیر۔ ہم نے اس آدمی کو جو کل تک بدیسی آقا کا بے زبان غلام تھا ایک خوددار اور غیر تمند انسان بنانا ہے۔ ہم کارخانہ دار نہیں۔ ہم تاریخ ساز لوگ ہیں۔ سوئیکارنو کی بات مجھے اس لئے یاد آرہی ہے کہ جب میں آیا تھا تو ایران میں لوگ خوش فعلیوں میں غرق تھے اور شہنشاہ نئے کارخانے لگانے اور ڈیم بنانے میں مصروف تھا۔ چار برس میں کتنی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ شہنشاہ رخصت ہوا۔ زمین اس پر تنگ ہوئی۔ بے وطنی میں انتقال کر گیا۔ ہر وقت حرکت میں رہنے والی کرین مشینیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ ادھر خاک بسر لوگ کپڑے جھاڑ کر سیدھے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی خود اعتمادی اور جرأت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک سپر پاور کے یرغمالیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا تصور بھی چند دن پہلے تک ناممکن تھا۔ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔ کیا فرد اور معاشرہ میں اتنی بڑی تبدیلی دو دنوں میں آجاتی ہے۔ یہ اگر انقلاب نہیں تو اور کیا ہے۔

(7)

میں مہر آباد ہوائی اڈے کے وی آئی پی روم میں بیٹھا ہوں۔ چار سال پہلے جب میں

اس اڈے پر اترا تھا تو اس کمرے میں ایک درخت کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ درخت نہیں بلکہ اس کے تنے کی تصویر۔ آج وہ پینٹنگ نظر نہیں آرہی۔ اس کی جگہ پوری دیوار پر ایک درخت بنا ہوا ہے۔ کیسا تن آور درخت ہے۔ کتنا گنجان ہے۔ اس کے پتوں میں بہت سے دائرے بنے ہوئے ہیں۔ ہر دائرہ میں انقلاب اسلامی کے کسی مشہور رہنما کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ ذرا غور کیا تو ان سب رہنماؤں میں ایک بات مشترک نظر آئی۔ یہ سب انقلاب کے دوران مارے گئے تھے۔ یہ شجرِ شہادت کی تصویر ہے۔ اس درخت پر بہار آئی ہوئی ہے۔ کامیابی کو تین سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے مگر اب بھی اس درخت میں نئی شاخیں پھوٹتی اور ان پر نئے پھول کھلتے رہتے ہیں۔ یہ انقلاب کا باغ ہے۔ اس باغ کے سارے درخت اور پودے مالی نے خون سے سینچے ہیں۔ مالی کہتا ہے، جن لوگوں نے ساری عمر اسلامی انقلاب کی جدوجہد میں گزاری ہے ان کی شہادت کوئی حیرت کی بات نہیں۔ حیرت اس وقت ہوتی اگر انہیں موت بستر پر آتی۔

میں ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوں۔ دریچہ سے باہر جھانکتا ہوں۔ جو کچھ نظر آیا اس پر تعجب ہوا۔ غزالی کا کہنا ہے کہ دل کے پانچ دروازے جنہیں حواس خمسہ کہتے ہیں وہ عالم محسوسات کی طرف کھلتے ہیں۔ ایک دروازہ اور ہے جو عالم روحانی کی طرف کھلتا ہے۔ غزالی نے دروازوں کی بات کی ہے مگر کسی کھڑکی کا ذکر نہیں کیا۔ تجربہ شاہد ہے کہ زندگی میں اگر کوئی انقلابی لمحہ آجائے تو دل میں خود بخود ایک کھڑکی کھل جاتی ہے۔ جس لمحے سے میرا واسطہ پڑا ہے وہ مدت کے حساب سے چار سال کا ہے۔ ایک کشادہ دریچہ ان چار غیر معمولی سالوں کا حاصل ہے۔ اس دریچہ سے جھانکیں تو مستقبل کا کاروانِ تاریخ رواں دواں نظر آتا ہے۔ تصویر خواہ کتنی دھندلی ہی کیوں نہ ہو یہ کیا کم ہے کہ نظر مستقبل تک جا پہنچی ہے۔ میں جامِ سفال لے کر ایران آیا تھا مگر یہاں سے جامِ جمشید لے کر جا رہا ہوں۔ حال لے کر آیا تھا، مستقبل لے کر جا رہا ہوں۔ عالمِ خاک کی خبر لایا تھا، عالمِ مثال کا پتا لے کر جا رہا ہوں۔ بند دروازے لے کر آیا تھا۔ کھلی کھڑکی لے کر جا رہا ہوں۔

جہاز نے ہوائی پٹی پر دوڑنا شروع کیا۔ جونہی اس کے پہیئے زمین سے جدا ہوئے تو جہاز کے ایرانی مسافروں نے اپنی نئی روش کے مطابق پست آواز میں مل کر نعرہ لگایا۔

اللہ اکبر۔ لمحہ بھر کے وقفہ کے بعد پھر سب ایرانی مسافروں نے نعرہ بلند کیا۔ اللہ اکبر۔ میں سوچتا ہوں، اللہ واقعی کتنا بڑا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ مشرق اور مغرب کا اللہ ہے۔ ہر رنگ اور ہر نسل کا اللہ ہے۔ ہر مسلمان کا اللہ ہے اور ہر انسان کا اللہ ہے۔ وہ صرف ایران کا اللہ نہیں ہے۔ وہ صرف پاکستان کا اللہ نہیں ہے۔ وہ ساری مخلوق اور سارے جہانوں کا اللہ ہے۔ ہر زمان اور ہر مکان کا اللہ ہے۔ عظیم اور کبیر، جلیل اور جبار، ماجد اور مجید، مالک الملک اور ذوالجلال والاکرام۔ بےشک وہ بہت بڑا ہے۔ تیسری اور آخری مرتبہ جب مسافروں نے اللہ کے نام اور اس کی عظمت کا نعرہ لگایا تو میری آواز بھی بےاختیار ان کی آواز میں شامل ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ میں نے پہلی دو بار خاموش رہنے کی قضا بھی ادا کر دی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

الحمدللہ